# قندیل علم





رانا عبد الرزاق خان

# قندیلِ علم

(علمی، ادبی و تاریخی مضامین کا مجموعہ)

مؤلف

رانا عبدالرزاق خان کاٹھگڑھی

لندن

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب : قندیل علم

مصنف : راناعبدالرزاق خان

ناشر : قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

تعداد : 500

سن اشاعت : 2017

ملنے کا پتہ :

14 Woburn Road SM 5 1RT
Carshalton Surrey London
E-mail:ranarazzaq52@gmail.com
(M) 00-44-788 630 4637

**Qandeel-e-Elam**

*A collections of articals on*
*History, Education & Poetry.*
By: Rana Abdul Razzaq Khan - London

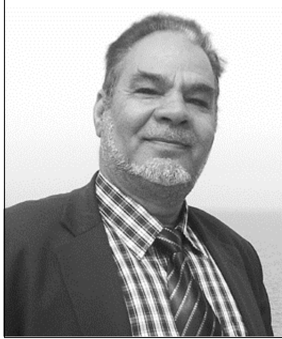
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# فہرست مضامین





# تعارف مصنف



نام : رانا عبدالرزاق خاں
تخلص : عاصی صحرائی
قوم : راجپوت گھوڑے واہ
(والدین کا اصل وطن کاٹھ گڑھ ہوشیار پور پنجاب انڈیا)
قلمی نام: اے آر راجپوت، رجل خوشاب،
ابنِ لطیف۔اے آر خاں

تاریخ پیدائش:13/اپریل 1951ء لکی نو،شورکوٹ جھنگ پنجاب پاکستان۔

تعلیم: ٹی آئی ہائی سکول ربوہ سے میٹرک، ٹی آئی کالج ربوہ سے 1970ء میں ایف اے کیا۔

تعلیم بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور (1975ء) اُردو فارسی سپیشل مضامین تھے۔

ملازمت: سپروائزر پیپر بورڈ ملز پیکیجز لمیٹڈ لاہور (1 مئی 1972ء تا 16 ستمبر 1975ء)

17/ستمبر 1975ء تا یکم مارچ 1984ء تک بحرین عربین گلف (دیوان الامیری بطور ایگریکلچر اسسٹنٹ (سلطان البحرین عیسیٰ بن سلمان الخلیفہ) مارچ 1984ء تا جولائی 2008ء نمبر دار چک نمبر 2ٹی ڈی اے خوشاب پنجاب پاکستان۔

لندن یوکے آمد:29/اکتوبر 2005ء ٹوٹنگ وانڈز ورتھ لندن۔

پاکستان میں 1991ء سے روزناموں میں مختلف شخصیات کے تعارف لکھتا رہا۔لندن میں آکر 2009ء میں فراغت ملنے پر ''بزم شعروسخن'' تشکیل دی۔پہلا مشاعرہ 2009ء میں منعقد کیا۔جس میں مبارک صدیقی،سید نصیر احمد شاہ، عامر امیر، عبدالمجید ظفر، نورالجمیل نجمی، جواد عالم، سہیل لون، آدم چغتائی اور دیگر بہت سے شعراء شامل ہوئے۔اب تک بیس عدد کامیاب مشاعرے کروا چکا ہوں۔جس میں لندن کے نامور شعراء نے حصہ لیا ہے۔ارشد لطیف، باسط کانپوری، سوہن راہی،

ایوب اولیاء، آدم چغتائی، محمود، ہارون الرشید، اقبال مرزا، پاکستان سے ڈاکٹر نکہت افتخار، فرحت عباس شاہ، لئیق عابد، محترم افتخار احمد ایاز (ایم بی ای) جرمنی سے وسیم احمد طاہر اور اسحاق اطہر بھی شامل ہوئے۔ 2011ء میں یو کے ٹائمز میں بھی کالم لکھنے شروع کئے اور گوشہ اَدب کی ادارت سنبھالی۔ جنوری 2013ء سے ''قندیلِ اَدب انٹرنیشنل لندن'' آن لائن میگزین نکال رہا ہوں جو کہ ساری دنیا میں لاکھوں قارئین تک بذریعہ ای میل اور ویب سائٹ پہنچتا ہے۔ پاکستان، لندن، امریکہ، آسٹریلیا، انڈیا کے مختلف جرائد میں چارصد سے زائد مختلف عناوین پر سیاسی، علمی، مذہبی، اور اُردو پر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ پانچ کتب بھی زیرِطبع ہیں جو کہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔

* ۔میری سرگزشت
* ۔میرے اسلامی مضامین
* ۔میرے سیاسی مضامین
* ۔قندیل ادب کا مجموعہ
* ۔میری شاعری

1۔غزل۔آج تک زیادہ تر اسی صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

2۔ پاکستان، امریکہ، آسٹریلیا اور انڈیا کے مختلف اخبارات میں میرے آرٹیکل شائع ہوتے رہتے ہیں۔

3۔ ''بزمِ شعر وسخن وانڈزورتھ'' جو کہ 2009ء سے قائم ہے۔



# عرضداشت از مصنف

خاکسار بنیادی طور پر ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1975ء میں بی اے کرنے کے بعد فکرِ معاش میں اسقدر کھوئے کہ علم و ادب سے محبت تو رہی مگر وقت کی قلت آڑے آتی رہی۔ برطانیہ میں آکر موقع ملا تو جوہر کھلے۔ یہ جو آرٹیکل بندہ نے لکھے ہیں یہ سب یقیناً اخبارات اور رسائل میں بار بار شائع ہو چکے ہیں۔ان مضامین میں کئی مضامیں میں نے بعض جگہوں سے اخذ کئے ہیں۔ جو مضمون میں نے وقت کی ضرورت جانا اسے شائع کروادیا۔

یہاں لندن میں ایسے عناوین کی ضرورت بھی تھی۔ یوکے ٹائمز میں میں نے بطور مدیر گوشہ ادب بھی کام کیا ہے۔جس سے مجھے شعر وادب سے مزید لگاؤ پیدا ہوا۔جنوری 2013ء سے میں قندیل ادب کے نام سے ایک اَدبی رسالہ نکال رہا ہوں جو کہ اِنٹرنیٹ رسالہ ہے۔جس کو سارے ممالک میں بہت پذیرائی ملی۔ساری دنیا سے مختلف احباب اپنے افسانے،غزلیں،مضامین ارسال کرتے ہیں۔وہ میں کمپوز کر کے اس میں شائع کر دیتا ہوں۔ یہ کتاب اس لئے مرتب کی ہے کہ سب کے لئے افادہ عام ہو۔اور باقی دوستوں کو بھی اس قسم کے چھوٹے اور بڑے موضوعات پر لکھنے کی ترغیب ملے اور ہماری آنے والی نسلوں کو اپنے بزرگوں کے متعلق پتہ چلے۔

خاکسار اپنے احباب اور بزرگوں کا ممنون ہے جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور معاون بھی ثابت ہوئے اور مسوّدے پر تبصرے بھی لکھے۔ پروف ریڈنگ اور کمپوزنگ میں خاکسار کی مدد کی اور کتاب کو تیار کرنے کے سب مراحل سے بخوشی گزرے۔

آپ سب کی دعاؤں کا طالب

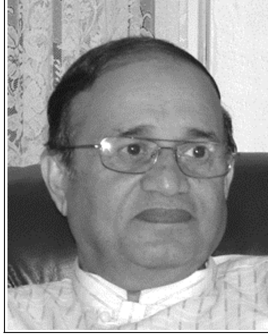
خاکسار

راناعبدالرزاق خاں



# ہمہ جہت کئی صفتوں کے قلمکار۔راناعبدالرزاق خاں صاحب

(امجد مرزا امجدؔ۔لندن)



آپ کا پورا نام رانا عبدالرزاق خاں ہے جبکہ تخلص عاصی صحرائی لکھتے ہیں۔مگرانہوں نے بےشمارمضامین وکالموں میں اپنے مختلف قلمی نام لکھے جو اے آر راجپوت، رجل خوشاب،ابنِ لطیف۔ اے آر خاں وغیرہ ہیں ۔قوم راجپوت گھوڑے واہ (والدین کااصل وطن کاٹھگڑھ ہوشیار پورپنجاب انڈیا) ہے۔تاریخ پیدائش: 13 ؍اپریل 1951ء لکی نو، شورکوٹ جھنگ ۔ پرائمری تک تعلیم چک نمبر 2ٹی ڈی اے قائدآبادخوشاب ٹی آئی ہائی سکول ربوہ سے میٹرک، ٹی آئی کالج ربوہ سے 1970ء میں ایف اے کیا۔بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور(1975ء) سے کیا،اُردوفارسی سپیشل مضامین تھے۔پھرجب ملازمت کادورشروع ہواتوسپروائزرپیپر بورڈ ملزپیکیجزلمیٹڈلاہورمیں رہے پھر بحرین میں بطور ایگریکلچر اسسٹنٹ کام کیا۔ پاکستان جاکر اپنے گاؤں مارچ 1984ء تاجولائی 2008ءتک بطورنمبردار چک نمبر 2ٹی ڈی اےخوشاب میں خدمات دیں۔پھرجب باہر آنے کاشوق اُبھراتو29؍اکتوبر 2005ءکولندن تشریف لےآئے اورٹوٹنگ وانڈزورتھ مقیم ہوئے جہاں تاحال موجودہیں۔

پاکستان میں 1991ء سےروزناموں میں مختلف شخصیات کےتعارف لکھتے رہے۔لندن میں آکر2009ء میں فراغت ملنے پر ’’بزم شعروسخن‘‘تشکیل دی جس کاپہلامشاعرہ 2009ءمیں منعقد کیا۔جس میں ،امجد مرزا امجد،شکیل مرزا،سلطان صابری، ابراہیم رضوی،عذرا ناز، ڈاکٹر صوفیہ سطوت،حمیدہ معین رضوی ،کوثر علی،فرحانہ غزالی،اقبال مجیدی ، ساجد رانا ،نورالجمیل نجمی، طیب جاذل،محمودعلی محمود،طفیل عامر،قدیرکوکب، ریاست رضوی ،مبارک صدیقی ،سیدنصیراحمدشاہ،عامر

امیر، عبدالمجید ظفر، نور الجمیل نجمی، جواد عالم، سہیل لون، آدم چغتائی، شگفتہ شفیق، سلیم فگار، ارشد لطیف، اقبال مرزا، ہارونالرشید اور دیگر بہت سے شعراء شامل ہوئے۔ اب تک ان گنت کامیاب مشاعرے کروا چکے ہیں اور یہ سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری وساری ہے۔ جس میں لندن کے نامور شعراء نے حصہ لیا۔

2011ء میں یو کے ٹائمز میں بھی کالم لکھنے شروع کئے اور گوشہ اَدب کی ادارت سنبھالی۔ مگر غالباً کچھ مدت کے بعد ہی یہ فرض مجھے سونپ دیا گیا جس کو میں نے چار سال تک جاری رکھا مگر کچھ وجوہات سے میرے ختم کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں یہ کام اجرت کے ساتھ کرتا تھا اور آپ مفت کرر ہے ہیں جو ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ جنوری 2013ء سے ''قندیلِ اَدب انٹرنیشنل لندن'' آن لائن میگزین نکالنا شروع کی جو کہ ساری دنیا میں لاکھوں قارئین تک بذریعہ ای میل اور ویب سائٹ پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان، لندن، امریکہ، آسٹریلیا، انڈیا کے مختلف جرائد میں چارصد سے زائد مختلف عنوانات پر سیاسی، علمی، مذہبی، اور اُردو پر مضامین شائع ہوئے۔ پانچ کتب بھی زیرِطبع ہیں جو کہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ جن کے عنوان ہیں:

* ۔ میری سرگزشت
* ۔ میرے اسلامی مضامین
* ۔ میرے سیاسی مضامین
* ۔ قندیل ادب کا مجموعہ
* ۔میری شاعری

آپ نے زیادہ غزل ہی میں طبع آزمائی کی ہے۔

پاکستان، امریکہ، آسٹریلیا اور انڈیا کے مختلف اخبارات میں بھی ان کے آرٹیکل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ رانا عبدالرزاق خاں صاحب سے میرا تعارف ان کے بین الاقوامی مسائل پر نہایت

پر دلائل اور ملکی حالات حاضرہ پر بڑی گہرائی میں لکھے ہوئے کالم پڑھ کر ہوا پھر چند مشاعروں میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا میرے ماہانہ منعقد کردہ مشاعروں میں بھی وہ کئی بار مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے آپ نہایت پر خلوص اور سنجیدہ طبعیت کے انسان ہیں۔ میں آپ کے تحریر کردہ کالموں سے متاثر تو تھا ہی مگر جب انہوں نے کچھ مدت پہلے اپنی ایک ضخیم کتاب کا مسودہ مجھے بھیجا تا کہ میں اسے کتابی شکل میں دے کر شائع کرواؤں تو پڑھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے کس قدر محنت، عمیق مشاہدے، مطالعے سے اور کتنی تفصیل دیکر اسے حوالہ تحریر کیا۔اس میں انہوں نے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی تاریخ کا نہایت گہرائی کے ساتھ احاطہ کیا ہے جو قارئین کے لئے بیش بہا معلومات مہیا کرتا ہے۔ میں اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بھی اپنے اس تاریخی پروجیکٹ میں شامل کیا اور اس طرح مجھے اس تاریخی خزانے سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں اس کتاب کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ وہ ابھی تک کیوں شائع نہ ہوسکی جبکہ ان کے مزید کئی مسودے لائن میں لگے ہوئے ہیں ہر کسی کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔مگر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنے اہم موضوعات کو یکجا کر کے اس قسم کی کتاب شاید برطانیہ میں ابھی تک نہیں لکھی گئی جس میں ادبی مذہبی وسیاسی اکابرین کے بارے میں معلومات کا ایک وسیع وعریض اور عمیق سمندر موجزن ہے۔جس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔اور میری مودبانہ گذارش ہوگی کہ وہ اسے منصۂ شہود پر ضرور لاکرُ دنیائے ادب میں ایک بہترین اضافے کا موجب بنیں۔رانا صاحب ایک مدت سے ادب کی خدمت میں کوشاں ہیں اپنے منعقد کردہ شاندار مشاعروں سے لے کر ویب سائیڈ پر''قندیل ادب'' جیسا شاہکار ادبی مجلہ ہر ماہ اپنے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتے ہیں جو دنیا کے بیشمار ممالک میں بڑے شوق وذوق سے پڑھا جاتا ہے۔مقامی اخبارات میں مسلسل کالم لکھتے ہیں۔لندن اور گردونواح کی ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے قلم کو اس قدر مصروف رکھا ہوا ہے کہ ان کے مزید چار پانچ مسودے اشاعت کے لئے تیار ہیں جو امید ہے منصۂ شہود پر آ کر دنیائے ادب وتاریخ میں گراں قدر

اضافہ کریں گے اور پذیرائی حاصل کریں گے۔آپ نہایت زودنویس قلمکار ہیں اور رات دن اسی کام میں مصروف رہتے ہیں۔جو برطانیہ کی ادبی فضا کے لئے ایک خوشگوار جھونکے سے کم نہیں جس سے قارئین کوفرحت ملے۔

آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو روشن ستارے کی مانند طلوع ہوکر دیکھتے ہی دیکھتے ادبی وصحافتی اُفق پر چھاجاتے ہیں۔اوراپنا مقام ہمیشہ قابل رشک رکھتے ہوئے ایک شجرِ سایہ دار کی طرح بےشمار لوگوں کوفیض یاب کرتے ہیں۔ان کے ہاں ہر کیفیت میں شدت اور جذبے کی گہرائی دکھائی دیتی ہے۔جس کے پسِ منظر میں ان کی بلند قامتی بخوبی نظر آتی ہے۔ان کے ہاں جذبہ حب الوطنی اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔آپ وطن میں پھیلی ہوئی نفرتوں کی رِدا کواُتار پھینکنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کومتحد دیکھنا چاہتے ہیں۔اپنے طویل قد کاٹھ، پُررُعب اور پرکشش شخصیت کے حامل ہوتے ہوئے بھی نہایت منکسر اور عاجزانہ رویہ کے مالک ہیں۔میں نے کبھی انہیں غصے میں نہیں دیکھا چاہے ان کے ساتھ کیسی ہی ناانصافی ہوجائے جو کئی بار ہوتے بھی دیکھی ہے مگر یہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر اسے برداشت کر کے چہرے پر مسکراہٹ لاکر اُونہہ کر کے ٹال جاتے ہیں جو آج کے دور میں بہت بڑے ظرف کی علامت ہے۔رانا صاحب ایک مخلص دوست، ہر کسی کے ساتھ تعاون کو تیار، ادب نواز دوست نواز انسان ہیں جو آج کے دور میں خال خال نظر آتے ہیں۔دوسروں کوعزت دینا اوران کا دن منانا دوسروں کو آگے لانا انہیں فوقیت دینا ان کے خمیر میں شامل ہے۔جو ایک فرشتہ صفت انسان کی پہچان ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ان کے اس جذبہ صادق کو ہمیشہ قائم رکھے اور قبول فرما کر ان کی قلم میں برکت دے۔آمین۔

دلی دعاؤں کے ساتھ

امجد مرزا امجدؔ



# راناعبدالرزاق خان



## بہت سی صفات کے حامل قلمکار،شاعر وادیب

(پروفیسرعبدالقدیر کوکب)

## عاصی صحرائی کے لئے عبدالکریم قدسی کا نذرانہ

ریختہ کی ہیں ترقی سبب | رانا صاحب اور قندیلِ ادب
اسکو عزت دیجئے جس شخص کے | خدمتِ اُردو میں گزریں روز و شب
چار سالوں کی ہے محنت کا صلہ | یہ قلم کاروں کا مٹتا فاصلہ
کھارہے ہیں حوصلہ شکنی کے تیر | رانا صاحب کا بڑا ہے حوصلہ
دُلہنِ سود و زیاں کو ایک بار | سر اُٹھا کر کبھی دیکھا نہیں
ڈھونڈتے ہیں نت نئے اہلِ قلم | اور حسابِ دوستاں رکھا نہیں

آج مجھے ایک ایسے ادیب وشاعر کے متعلق کچھ کہنا ہے جو 67۔1970 میں میرا کلاس فیلو تھا۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجوایشن کی اور میں نے قائداعظم یونیورسٹی سے میتھ میں ایم ایس سی۔ پھر ہم معاش روزگار کے چکر میں یوں سرگرداں رہے۔ یہ خلیج کی خاک چھانتے رہے۔اور خاکسار افریقہ کے صحراؤں میں۔ یہ ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔جوانی میں کبڈی کے کھلاڑی تھے۔گاؤں کے نمبردار بھی رہے اوراچھے خاصے دبنگ مقرر بھی ہیں۔یہ بارہ سال سے لندن میں مقیم ہیں۔کچھ سال پہلے لندن میں ایک دوسرے کی دریافت ہوئی۔تو میں حیران ہوا یہ دیکھ کر کہ موصوف ادبی جہاد میں مگن ہیں۔ چار سال سے ایڈیٹر قندیل ادب، یو کے ٹائمز کے کالم نگار ،گوشہ ادب کے مدیر ہیں۔کئی ادبی رسائل کے میگزین کے ادارتی بورڈ کے روحِ رواں ہیں۔ جہاں بھی مشاعرہ وغیرہ ہوتو اُس میں شامل ہونے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ادب سے انہیں جنون کی

حدتک لگاؤ ہے۔

ادبی احباب سے مل کر قندیل شعروسخن کے نام سے فورم بنایا ہوا ہے۔ ہر ماہ مشاعرے کرواتے ہیں اور اس کی نظامت بھی کرتے ہیں ۔ بڑے ہی منظم طریقے سے مہمان نوازی کرتے ہیں فوٹو گرافی، اور رپورٹنگ کا سلیقہ ان کو خوب آتا ہے اور ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے ہیں ۔ یو کے والے اکثر ادبی لوگ ان کو جانتے ہیں ۔ نوجوان شعراء اور شاعرات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔ سب کا کلام شائع کرنے کی لگن اُن کو رہتی ہے ۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ سارا کام بے لوث کرتے ہیں ۔ سب شعراء اور شاعرات کے ساتھ ادبی شام مناتے ہیں ۔ اور ان سب کو پروموٹ کرتے ہیں گوشہ ادب کے ذریعہ اور قندیل ادب کے توسط سے یہ برطانیہ اور یورپ وامریکہ وخلیج کے تقریباً ایک ہزار شعراء کا کلام اب تک شائع کر چکے ہیں ۔ اور اب بھی کمر بستہ ہیں ۔ ادب نواز اور بندہ پرور واقع ہوئے ہیں ۔ صوفی منش، سنجیدہ طبیعت پائی ہے۔

پانچ صد سے زائد کالم لکھ چکے ہیں ۔ ان کے کالم زوردار، سچ پر مبنی ہوتے ہیں ۔ جن میں حقائق اور کڑوا سچ پوشیدہ ہوتا ہے ۔ ان کے زورِ قلم کو ہر جگہ ہی سراہا جاتا ہے ۔ مضمون نگاری میں بھی بہت کہنہ مشق ہیں ۔ سوانح عمری لکھنے کے تو یہ ماہر ہیں ۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے ۔ محبِ وطن اور با کردار ہیں ۔ خود کمپوزنگ کرتے ہیں اور ٹائپ سیٹنگ بھی ۔ آج کے دور میں کمپیوٹر سے دوستی کر کے جدید دور کے صحافیوں کی صف میں زور شور سے شامل ہیں ۔ کئی کتب تیار کر رہے ہیں ۔ ماہ جنوری میں ایک کتاب آ رہی ہے ۔ ویسے تو ان کی چار کتب کے مسودات تیار ہیں جو کہ جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گی ۔ میں ان کی ان عظیم کاوشوں پر سلام کرتا ہوں ۔ اور دعا گو ہوں کہ خدا تعالیٰ ان کو صحت والی طویل فعال زندگی سے نوازے ۔ اور خوش رکھے ۔ آمین ۔

اُن کی خدمت میں چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ہر کسی کی اب زباں پر رانا جی کا نام ہے
سب قدم جب رُک رہے ہوں بڑھتا اُن کا گام ہے

شعر وشاعری میں بھی اُنکا منفرد مقام ہے
ساری تحریروں میں اول آتا ان کا نام ہے
نثر یا کالم نگاری پڑھنے میں آئے مزا
پڑھنے والوں کے دلوں کو رانا کرتا رام ہے
دعوتیں کھائی ہیں کتنی آپ سب نے اب تلک
آج جو کھانا ملے گا سب سے اعلیٰ طعام ہے
کھانا کھائیں اور دعا ان کے لئے کرتے رہیں
شعر سُن کر دادا دینا ہی ہمارا کام ہے

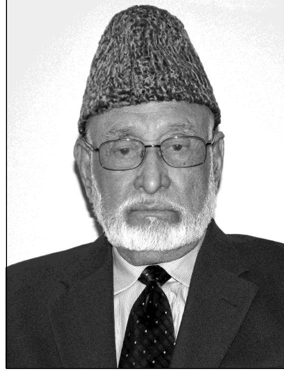


## پندرہویں صدی ہجری کے منافق پر ایک نظر

۱۔ منافق سے جب بھی دین کی بات کہوتو کہتا ہے کہ ''اصل چیز تو انسانیت ہے۔''
۲۔ جب نماز کی بات کروتو کہتا ہے کہ '' میرا لباس ٹھیک نہیں۔''
۳۔ جب روزے کی بات کروتو کہتا ہے کہ ''کیا روزے میں ہی اسلام ہے۔''
۴۔ جب زکوٰۃ کی بات کروتو کہتا ہے کہ ''بنک میں خود ہی کٹ گئی۔''
۵۔ جب جہاد کی بات کروتو کہتا ہے کہ ''اصل جہاد تو نفس سے ہوتا ہے۔''
۶۔ جب شرعی پردے کی بات کروتو کہتا ہے کہ ''اصل پردہ تو نظر کا ہوتا ہے۔''
۷۔ جب شرعی داڑھی کی بات کروتو کہتا ہے کہ ''داڑھی سنت ہے فرض نہیں۔''
۸۔ جب علماء کی بات کروتو کہتا ہے کہ ''ساری خرابیاں تو مولویوں کی پیدا کردہ ہیں۔''
۹۔ جب شریعت پر چلنے کی تاکید کروتو کہتا ہے کہ ''مولوی والی باتیں مت کرو، تم اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ یہ میرا اور میرے رب کا معاملہ ہے۔''

# تبصرہ

## محترم خان بشیر احمد رفیق خان صاحب مرحوم سابق امام مسجد لندن



غالباً دو تین سال کی بات ہے کہ ایک دن انٹرنیٹ پر میری ای میل کے ان بکس میں ایک ای میل رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی طرف سے موصول ہوا۔ میں نہ تو میں رانا عبدالرزاق خاں صاحب سے شناسا تھا اور نہ ہی اس سے قبل ان کا نام سنا تھا۔ چنانچہ بڑے اشتیاق کے ساتھ جناب رانا صاحب کی ای میل کھولی۔ تو اس میں ایک نہایت خوبصورت، دیدہ زیب اور رنگین الیکٹرانک رسالہ برآمد ہوا۔ رسالے کا نام ''قندیلِ ادب'' تھا۔ اور سرورق پر اس کے بانی ایڈیٹر رانا عبدالرزاق خاں صاحب کا نام اور فون نمبر درج تھا۔ میں نے رسالے کو بڑے شوق سے لفظاً لفظاً پڑھا۔ اور اس کے معیاری مضامین، شعر وشاعری، کے انتخاب اور رسالے کے گیٹ اَپ سے بے حد متاثر ہوا۔ لندن سے اور بھی بہت سے رسائل شائع ہوتے ہیں لیکن ''قندیلِ ادب'' نے ہر لحاظ سے ان سب کو مات دے دی ہے۔ اگلے ہی دن میں نے جناب رانا عبدالرزاق خاں صاحب کو فون کیا تا انہیں مبارکباد دے سکوں۔

رانا عبدالرزاق خاں صاحب سے بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ آپ میرے نہایت ہی پیارے دوست اور بزرگ جناب ناصر احمد بہادر شیر سابق افسر حفاظت خاص کے بھتیجے اور داماد بھی ہیں۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں ان کے منعقد کردہ درجنوں مشاعروں میں شامل ہوا۔ اور اُن کی ادبی کاوشوں سے لطف اندوز اور محظوظ ہوتا رہا۔ اور اب بھی محظوظ ہوتا رہتا ہوں۔ ''قندیلِ ادب'' اب ماشاءاللہ دو لاکھ سے زیادہ قارئین کو دو صد ممالک میں ارسال کیا جاتا ہے۔ اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ایک متاثر کُن بات یہ ہے کہ رانا عبدالرزاق خاں صاحب رسالہ کی اشاعت ہر ماہ بروقت کرتے ہیں۔ انتخاب کر کے خود ٹائپنگ کر کے تزئین و آرائش کے لئے بروقت ڈیزائننگ کے لئے بھیج دیتے ہیں اور کبھی بھی رسالے میں تاخیر نہیں ہوئی۔ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو رسالہ

انٹرنیٹ پر موجود ہوتا ہے۔'قندیلِ ادب'' کا ہر شمارہ علمی مضامین،خوبصورت شعروشاعری،معلوماتی مضامین، لطائف، افسانوں، کتب پر تبصروں،شعراء کے سوانحی خاکوں، اقوالِ زریں اور رنگین تصاویر سے مزین ہوتا ہے۔رانا عبدالرزاق خاں صاحب یہ رسالہ اپنے خرچ پر شائع کرتے ہیں اور قارئین سے کسی قسم کی مالی معاونت کی نہ تو درخواست کرتے ہیں اور ہی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔وہ بس قارئین سے یہی معاونت چاہتے ہیں کہ قارئین انہیں علمی مضامین،شعروشاعری اور معلوماتی شہ پارے بھجوائیں۔محترم رانا عبدالرزاق خاں صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ان کے کام کی وُسعت ایک ادارہ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔آپ صفاتِ حسنہ کا ایک خوبصورت گلدستہ ہیں۔آپ کہنہ مشق ادیب ہیں۔آپ کے مضامین انگلستان،اور دیگر ممالک کے جرائد ورسائل کی زینت بھی بنتے ہیں۔

آپ سینئر صحافی اور تجزیہ کار بھی ہیں۔یو کے ٹائمز اُردو لندن میں گوشہ ادب کے مدیر بھی ہیں۔ اور ہر ہفتہ اپنا سیاسی کالم یو کے ٹائمز میں لکھتے ہیں۔آپ ایک شاعر وادیب ہیں۔شاعری میں آپ کا تخلص ''عاصی صحرائی'' ہے۔آپ کا کلام قندیل ادب کے علاوہ دیگر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ رانا صاحب مشاعرے بھی کرواتے رہتے ہیں۔ان مشاعروں میں انگلستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی شعراء کرام شامل ہوتے رہے ہیں۔ان شعراء میں آدم چغتائی ، مبارک صدیقی ، جمیل الرحمن،نکہت افتخار، سہیل لون ،اقبال مجیدی، امجد مرزا امجدؔ، عبدالغفار عزم، ریاست رضوی، ارشد لطیف، عامر امیر،نورالجمیل نجمی،سوہن راہی، ایوب اولیاء اور اس کے علاوہ بہت سے شعراء شامل ہوتے رہتے ہیں۔جناب رانا صاحب کی کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے مجھے تو حیرت اس بات کی ہے کہ وہ کئی مصروفیات ہونے کی بنا پر ویک اینڈ پر اس قدر وسیع ادبی کام کے لئے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔رانا عبدالرزاق خاں صاحب نے مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے اپنے مضامین کو ایک کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔میں نے ان مضامین پر جستہ جستہ نظر ڈالی ہے اور رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی تبحر علمی سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔مجھے امید ہے کہ یہ مضامین رزاق قارئین کرام کے علم میں اضافہ کے باعث ہونگے۔انشاءاللہ اور اُردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہونگے۔

خاکسار خان بشیر احمد خان رفیق۔لندن

# تبصرہ

# مبارک احمد صدیقی - شاعر و ادیب

## پریزنٹر ایم ٹی اے - صدر TICOSA UK



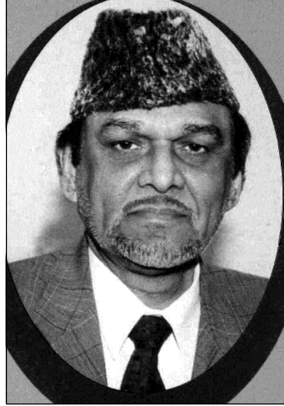
خاکسار عرصہ دراز سے رانا عبدالرزاق خان کو جانتا ہے۔ آپ نہایت ہی مخلص، محنتی، مشفق اور نیک انسان ہیں۔ کافی عرصے سے معلوماتی مضامین لکھنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ بلکہ عرصہ پانچ سال سے انہوں نے بہت ہی زوردار کالم لکھ کر عام عوامی مسائل کو بیان کرنے کی سرتوڑ جسارت کی ہے۔ مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ کالم نگاری میں بھی ان کا مقام سارا یوکے انہیں جانتا ہے۔ تاریخ سے بھی ان کو لگاؤ ہے۔ اور ادب سے بھی۔

اس کتاب کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ انہوں ہر موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ سوانح عمری، آپ بیتی، تبصرہ ان کو بہت سلیقے سے لکھنا آتا ہے۔ بہت اچھے فی البدیہہ مقرر بھی ہیں۔ اور مشاعروں میں نظامت بھی ان کا ایک فن ہے۔ سب احباب سے پیار اور محبت سے بات چیت کرنا اور ان کو اپنا گرویدہ بنا لینا ان کا وطیرہ ہے۔ سنجیدہ بھی ہیں اور ہنس مکھ بھی۔ یہ کتاب جو کہ ان کے مضامین اور کالموں پر مشتمل ہے یہ واقعی ایک علم کا ذخیرہ ہے بلکہ علم کی قندیل ہے۔ ایک ماہنامہ ''قندیل ادب'' یہ عرصہ چار سال سے نکال رہے ہیں جو کہ ساری دنیا میں لاکھوں قارئین تک جاتا ہے۔ اور بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے یہ بھی ان کی ایک عظیم ادبی کاوش ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو صحت والی لمبی عمر دے تاکہ ادبی دنیا اس عظیم علمی انسان سے مستفید ہوتی رہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قلم میں مزید برکت دے۔ آمین۔

مبارک صدیقی

لندن

# عاصی صحرائی پر آدم چغتائی کا ایک تبصرہ



یہی طے شُدہ امر ہے کہ کسی بھی دور کا سچا اور کھرا فنکار اپنی زندگی کے لئے اپنے عہد کی تاریخ سے الفاظ کی سانسیں مستعار نہیں کرتا۔ نہ ہی جغرافیائی پیمانوں سے اپنے فنی قدوقامت کا اندازہ لگاتا ہے۔ فنکار اپنی ذات میں ایک کائنات ہوتا ہے۔ اور کائنات کو اپنی ذات کی تجلیوں سے منور کرنا اس کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ فنکار آدم کی بجائے آدمیت، ذہن کی بجائے ذہنیت کا قائل ہوتا ہے۔ عاصی کی بجائے عصیان سے پرہیز کرتا ہے۔ پاکیزہ جذبات اس کی اساس ہوتے ہیں۔

اس کا فن کائنات اور ذات کے درمیان مسلسل رابطوں کا تعین کرتا ہے۔ وہ نسلی منافقت، مذہبی منافرت سے دور بھاگتا ہے۔ یہ ساری باتیں جو میں کہنا چاہتا ہوں یہ بہر حال سچ ہیں۔ جو عاصی صحرائی کی فطرت کا ایک لامتناہی پہلو ہے۔

انہوں نے محرومیوں کی طویل رات میں دُکھتی آنکھوں سے پھوٹتے اشکوں سے جو سچ کی مکمل دستاویز قائم کی ہے وہ ان کی جسارتوں کا حلف نامہ ہے۔ وہ تو اپنے عہد کے مہیب اور سکوت سے بھی شکوہ نہیں کرتے۔ اور منہ زور ہواؤں کے رُخ پر طاقِ تنہائی میں چلتے ہوئے اکیلے چراغ کی شعاع کا سفر کرتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

طالب دعا

آدم چغتائی



# سوانحی حالات

## حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ



آپ کا نام مبارک احمد شیخ تھا۔مقام کے سبب سرہندی مشہور ہوئے۔آپ کے والد بزرگوار کا نام حضرت مخدوم شیخ عبدالاحد صاحب تھا۔ بیان کیا گیا کہ آپ کا نسب نامہ حضرت عمر بن خطابؓ سے جا کر ملتا ہے ۔ ہندوستان کے معروف بزرگ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر بھی انہی کے جد امجد کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کے خاندان کے بزرگ کابل سے تشریف لائے تھے۔اور سہرہند میں اقامت اختیار کی۔جس کا قدیمی نام سرہند تھا۔آپ کی پیدائش جمعۃ المبارک 14/شوال 971 ہجری بمطابق 1563ء کی ہے۔حصول تعلیم کے لئے آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔اس وقت یہ شہر علم کا مرکز تھا۔ یہاں سے شیخ یعقوب صاحب صوفی کشمیری اور مولانا کمال صاحب کشمیری سے استفادہ کیا۔17/سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔اوراسی طرح تعلیم کے لئے لاہوراور دہلی کا سفر بھی کیا۔

آپ نے عربی اور فارسی میں کئی رسائل تحریر کئے۔آپ کا ایک مشہور رسالہ ''تہلیلیہ'' ہے۔یہ رسالہ آپ نے شیعہ مسلک کے رد میں تحریر فرمایا۔ (شیخ سرہندی مجدد الف ثانیؒ ص6)

سرہند قلعہ کی بنیاد اور آبادی کا آغاز 760 ہجری بتایا جاتا ہے۔سرہند کا قلعہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ایک زمانہ میں یہ ہندوؤں اور غزنویوں کے درمیان سرحد کا کام دیتا تھا۔ کہتے ہیں اس کے سامنے سے ہند شروع ہوتا تھا۔اس لئے اسے سرہند کہتے تھے۔سلطان محمد غوری نے سرہند کو فتح کیا۔کہتے ہیں بابر کئی بار سرہند آیا اور ہمایوں بھی یہیں سے دہلی آکر دوبارہ تخت وتاج کا مالک

بنا۔عہد مغلیہ میں اس شہر کی آبادی اور رونق کا یہ عالم تھا کہ یہاں 350 مساجد اور سرائیں تھیں ۔ الغرض حضرت سید احمد سرہندیؒ کی پیدائش سے دو سال قبل سے یہ شہر آباد چلا آتا تھا۔

(شیخ سرہندی مجدد الف ثانی ص3۔4)

بادشاہ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔جب آپ پیدا ہوئے تو ہندوستان پر جلال الدین اکبر کی حکومت تھی ۔اس نے دین الٰہی جاری کر دیا تھا۔اس میں ہر مذہب کو خوش رکھنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ 1050 ہجری میں جلال الدین اکبر کا انتقال ہو گیا۔اور اس کی جگہ نورالدین جہانگیر تخت نشین ہوا۔ جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو اپنے مستقر پر طلب کر لیا۔اور سرہند کے حاکم کو تاکید کر دی کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ کو یہاں بھیج دے ۔جب حکم ملا تو آپ پانچ مریدوں کو لے کر روانہ ہوئے ۔ بادشاہ کو علم ہوا تو اس نے امراء کو آپ کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ایک خیمہ لگوایا گیا۔ملاقات کے لئے طلب کیا۔ جب آپ دربار تشریف لے گئے تو جو آداب دربار خلاف شرع تھے وہ آپ بجا نہ لائے ۔اکبر کے دور میں سجدہ کرنا آداب دربار میں شامل کر دیا گیا تھا۔آپ نے سجدہ نہ کیا۔اس پر درباریوں نے کہا کہ آپ دربار سلطنت بجا نہیں لائے ۔بادشاہ نے بھی وجہ پوچھی۔

آپ نے فرمایا کہ میں سوائے خدا کے کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔اور نہ ہی سجدہ کروں گا۔اس پر بادشاہ سخت ناراض ہوا۔اور اس نے آپ کو گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا۔قید سے قبل بادشاہ نے افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمان مفتی کو بہت سی فقہ کی کتب دے کر آپ کے پاس بھیجا۔انہوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ سجدہ تحیہ سلاطین کے لئے آیا ہے آپ سجدہ کر لیں آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔اس کے ہم ذمہ دار ہیں لیکن آپ نے ان کی بات کو قطعاً پسند نہ کیا۔انکار سجدہ پر آپ کو قید کر دیا گیا ۔اسیری کی حالت میں آپ کی حویلی ضبط اور جائیداد ضبط کر لی گئی۔تمام ساتھی جدا کر دیئے گئے ۔قید میں آپ نے ریاضت کی اور قیدیوں کو پیغام حق پہنچایا اور ان کی تربیت کی ۔ان کی تبلیغ سے ہزاروں قیدی مسلمان ہوئے ۔اس طرح آپ نے سنت ابراہیمی پر عمل کیا۔آپ جس تاریخ کو قید کیا گیا تھا۔تقریباً ایک سال بعد ہی نامعلوم وجوہات کی بنا پر جہانگیر نے آپ کو رہا کر

دیا۔اور پھر آپ سے ملاقات کا متمنی ہوا۔اس طرح آپ کی رہائی جمادی 1029 ہجری بیان کی جاتی ہے۔ (شیخ سرہندی مجدد الف ثانیؒ ص 13 تا 16)

مولوی نواب صدیق حسن خان صاحب نے جو اپنی کتاب میں گزشتہ 13 صدیوں کے مجددین کی فہرست دی ہے اس میں لکھتے ہیں۔ کہ شیخ سرہندی مجدد الف ثانی 11 ویں صدی کے مجدد تھے۔آپ کی عظیم الشان پیشگوئی۔آپ فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ کے رحلت فرمانے سے ہزار اور چند سال بعد ایک ایسا زمانہ آرہا ہے کہ حقیقت محمدیؐ اپنے مقام سے عروج فرمائے گی اور حقیقت کعبہ کے مقام سے متحد ہوجائے گی اور اس وقت حقیقت محمدیؐ کا نام حقیقت احمدیؐ ہوجائے گا۔اور ذات احمد جل سلطانہ، کا مظہر بن جائے گی۔اور دونوں اسم مبارک اپنے مسمیٰ کے ساتھ متحقق ہو جائیں گے۔ (مکتوبات امام ربانی مکتوب نمبر 209 دفتر اول حصہ سوئم ص 141)

وفات::

یہ مرد جلیل 28 صفر 1034 ہجری دنیائے فانی سے دار آخرت کو چل دیا۔آپ نے 63 برس کی عمر پائی۔اللہ تعالیٰ آپ پر ابدی رحمتیں نازل فرمائے۔آمین۔آپ کے سات بیٹے تھے۔تین کم سنی میں فوت ہوئے۔چار کے نام یہ ہیں۔خواجہ محمد صادق صاحب۔2۔خواجہ محمد معصوم صاحب۔3۔خواجہ محمد سعید صاحب۔4۔خواجہ محمد یحییٰ صاحب۔ ❁❁

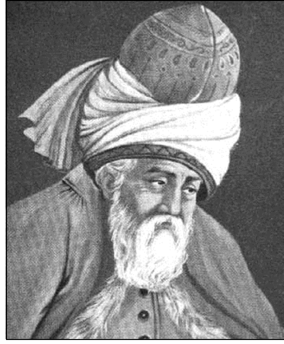
## فقیر اور محکمہ پولیس

فقیروں کو اگر محکمہ پولیس دے دیا جائے تو تفتیش کچھ اس طرح ہوا کرے گی:

''اے چور اللہ کے نام پہ بتادے کہ تو نے کہاں چوری کی ہے۔اللہ تجھے چوری کی مزید توفیق دے۔اے ڈاکو بھائی! تیرے ڈاکے چلتے رہیں اور ہمارا محکمہ پلتا رہے...سچ سچ بتا دے کہ اس ہفتے کتنے ڈاکے مارے ہیں۔اے اچھے قاتل! ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔خدا کے واسطے ہمارے کان میں بتادے کہ قتل تو نے کیا ہے...ارے ہے کوئی جو اللہ کے نام پر ہمیں لٹیروں اور دہشت گردوں کو پکڑ دے ہم اس کے اعزاز میں شاندار دعوت کریں گے۔''

# حضرت مولانا محمد جلال الدین رومیؒ

(پیدائش1207ء۔وفات1273ء)



مشہور فارسی شاعر تھے ۔اصل نام جلال الدین تھالیکن مولانا روم کے نام سے مشہور تھے ۔آپ کے نسب کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔آپ کے والد اور دادا جان کا نام بھی محمدؒ تھا۔آپ کے والد کا لقب بہاء الدین اور وطن بلخ تھا۔آپ کے والدمحترم صاحب علم اور پورے خراسان میں مرجع خلائق تھے۔آپ کے والدمحترم بعض وجوہ کی بنا پر 610ھ میں ترکِ وطن کر کے نیشاپور چلے گئے تھے۔وہاں خواجہ فریدالدین عطار سے ملاقات ہوئی۔مولانا رومؒ اس وقت چھ برس کے تھے۔آپ پر بچپن ہی سے سعادت مندی کے آثار نمایاں تھے۔خواجہ فرید الدین عطار نے مولانا رومؒ کو دیکھ کرآپ کے والدمحترم کوفرمایا۔ان صاحبزادے کے جوہر قابل سے غفلت نہ برتیئے گا۔پھرانہوں نے اپنی مثنوی مولانا کو پڑھنے کو دی۔

### ابتدائی تعلیم:

ابتدائی تعلیم کے مراحل شیخ بہاء الدینؒ نے طے کرادیئے ۔اکثر علوم آپ نے اُن سے ہی حاصل کئے ۔مولانا رومؒ اپنے والد کی وفات تک انہی سے علم کرتے رہے۔مولانا رومؒ اپنے والد کی وفات کے بعد 639ء میں شام چلے گئے ۔ابتداء میں حلب کے مدرسہ حلاویہ میں شیخ کمال الدینؒ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

قرآن وحدیث،تفسیر،منطق،فلسفہ اور دوسرے تمام علوم میں درجہ کمال تک پہنچ گئے ۔تکمیل علوم کے بعد مولانا وطن واپس تشریف لائے ۔اپنے استاد سید برہان الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔انہوں نے مولانا کو سینے سے لگایا اور پھرنو برس تک ان کوطریقت اور سلوک کی تعلیم دیتے رہے۔درس وتدریس اورفتویٰ نویسی میں مشغول رہتے تھے۔مولانا رومؒ اپنے دور کے اکابر علماء میں

سے تھےلیکن آپ ایک صوفی شاعربھی تھے۔دورِطالب علمی ہی سے علماء آپ سے پیچیدہ مسائل کے لئے رجوع کیا کرتے تھے۔مولاناشمس تبریزؒ آپ کے پیرومُرشد تھے۔مولانا رومؒ کو درسِ عشق کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ان کے قلب میں آتشِ عشق ودیعت فرمائی گئی تھی۔عاشقوں کا،درس تو ذکر محبوب ہوتا ہے۔مولانا رومؒ کا صحیفہ اخلاق ایسے پاکیزہ اور دلآویز پھولوں سے مزّین تھا کہ جن کی خوشبو سے روح تازہ ہوجاتی تھی۔ان کا زہدوقناعت،انکساری،تواضع،شب بیداری،توکل علی اللہ حلم وتحمل،جودوسخا،حق گوئی،اکل حلال،ایثار،شیریں کلامی،مخلوق خدا سے محبت اوراوصافِ حمیدہ میں مثالی حیثیت رکھتے تھے۔

**سلسلہ باطنی:**

مولانا رومؒ کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے ان کے فرقے کےلوگ جلالیہ کہلاتے ہیں۔ایشیائے کوچک،شام ومصر میں یہ لوگ ''مولویہ'' کہلاتے ہیں۔یہ لوگ نمدہ کی ٹوپی پہنتے ہیں۔جس میں جوڑ یا درزنہیں ہوتی۔مشائخ اس پر پگڑی یا عمامہ باندھتے ہیں۔

**مثنوی:**

ان کی سب سے مشہور تصنیف مثنوی مولانا رومؒ ہے۔اس کے علاوہ ان کی ایک مشہور کتاب ''فیہ مافیہ'' ہے۔علامہ اقبال مولانا رومؒ کو اپنا روحانی پیر مانتے تھے۔کشف اور وجدان کے ذریعے ادراکِ حقیقت کے بعد صوفی صحیح معنوں میں عاشق ہوجاتا ہے کہ یہ رغبت تمام محبوبِ حقیقی کے تمام احکام کی پیروی کرتا ہے۔مولانا رومیؒ نے جوہرِ عشق کی تعریف اوراس کی ماہیت کی طرف معنی خیز اشارے کئے ہیں۔صوفی کی ذہنی تکمیل کا مقام کیا ہے۔وفات۔آپ کی وفات 1273ء میں قونیہ میں وفات ہوئی۔ان کا مزار آج بھی عقیدت مندوں کا مرکز ہے۔

**وصایا حضرت مولانا رومؒ:**

1۔میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کھلےاور چھپے خدا سے ڈرنے کی۔

ب۔سونے، کھانے، بولنے میں کمی کرو۔

2۔گناہوں سے دور رہو۔ 3۔شہوتوں کو ترک کرو۔

4۔قیامِ شب اور روزوں کا اہتمام کرو۔

5۔ہر طرح کے انسانوں کی جفاؤں کو برداشت کرو۔

6۔نادانوں اور عامیوں کی ہم نشینی چھوڑو۔

7۔نیکوں اور بزرگوں کی صحبت اختیار کرو۔

8۔بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے

9۔بہترین کلام وہ ہے جو مختصر اور بادلیل ہو۔

10۔تمام تعریف وتوصیف خدائے واحد لئے ہے اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام ہو۔

## مشہور محاوارت کے درست اور سچے مطلب

☆ خود کی جان خطرے میں ڈالنا۔شادی کرنا

☆ آ بیل مجھے مارو۔بیوی سے پنگا لینا

☆ دیوار سے سر ٹکرانا۔بیوی کو کچھ سمجھانا

☆ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔بیوی کا مائیکے سے واپس آنا

☆ خودکشی پر ابھارنا۔شادی کی رائے دینا

☆ دشمنی نبھانا۔دوستوں کی شادی کروانا

☆ گناہوں کی سزا ملنا۔شادی شدہ ہوجانا

☆ خود کو لٹتے ہوئے دیکھنا۔بیوی کی فرمائشیں پوری کرنا

☆ غلطی پر پچھتاوا کرنا۔شادی کی تصویریں دیکھنا۔

☆ اپنے پیر پر کلھاڑی مارنا۔بیوی کو گھمانے لے جانا۔

# حضرت خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی



خواجہ صاحب کا نام محمد، لقب شمس الدین اور تخلّص حافظ تھا۔ 726ہجری میں بمقام شیراز (ایران) پیدا ہوئے۔اُن کا خاندان علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔آپ نے پہلے قرآن حفظ کیا پھر وقت کے مشہور مفسر مولانا شمس الدین محمد عبداللہ شیرازی سے فقہ وتفسیر کی تعلیم حاصل کی۔خواجہ صاحب کوعلم وادب سے طبعی دلبستگی تھی۔ بیشتر دورِ جاہلیت کے شعراء کا کلام انتہائی ذوق وشوق سے پڑھتے رہتے تھے۔مشہور شاعر خواجہ کرمانی کی مصاحبت میں شاعرانہ نکات ذہن نشین کرتے۔اس زمانہ میں شیراز کی مردم خیز سرزمین علم وفضل کے تابناک ستاروں کی ضیا باریوں سے روکشِ آسمان بنی ہوئی تھی۔مثلاً مولانا بہاؤالدین، قاضی مجدالدین اسمٰعیل، قاضی عضد وغیرہم، خواجہ صاحب نے انہیں اربابِ کمال سے فیض حاصل کیا۔اور رفتہ رفتہ ان کی غیر معمولی ذہانت وقابلیت کی شہرت ہونے لگی۔خواجہ صاحب نے دیکھا کہ شیراز شعرو سخن کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔گھر گھر شیخ سعدیؒ کی غزلوں کا چرچا ہے۔عوام وخواص شیخ سعدیؒ کا پرکیف و وجد آفریں کلام پڑھ پڑھ کر جھوم رہے ہیں۔

شعر وادب کی اس رنگین وعشق خیز فضا نے خواجہ صاحب کے سمندِ طبع پر تازیانے کا کام کیا۔اور وہ بادہءتغزّل کی پرسرور و دل افروز نہروں میں تیرنے لگے۔چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں خواجہ صاحب کی غزلوں نے قبول عام کے پروں سے اُڑ کر دنیا کا گوشہ گوشہ عشق ومستی کی جلوہ سامانیوں سے رشکِ طور بنا دیا۔خواجہ صاحب نے زندگی میں اپنے ملک، خصوصاً شیراز میں متعدد عظیم وآشوب انگیز انقلاب دیکھے۔سات بادشاہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تخت حکومت پر بیٹھے۔خونریز لڑائیوں کے فلک بوس شعلے بلند ہوئے اور حشر خیز خانہ جنگیوں نے اَمن وسکون کا خرمن جلا کر خاک کر دیا۔ان افسوس ناک مناظر سے دنیا کا عارضی جاہ وجلال ان کی نگاہوں میں حقیر ہو گیا۔انہوں نے درویشانہ

زندگی کوامیرانہ عیش ونشاط پر ترجیح دے کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔اور 65 سال کی عمر پا کر 791ھ میں وفات پائی۔حسن اخلاق کے باعث فقیراور تاجدار، دونوں خواجہ صاحب کے لئے دیدہ ودل فرشِ راہ کرتے تھے۔چنانچہ بعض جوہر شناس سلاطین واُمراء دربار میں اُن کی موجودگی اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھتے تھے۔اس سلسلے میں کئی بادشاہوں اور اُمراء سے خواجہ صاحب کی راہ ورسم رہی۔مثلاً شاہ ابو اسحٰق،امیر مظفر،حاجی قوام الدین حسن،شاہ شجاع،خواجہ قوام الدین عیار،توران شاہ،شاہ زین العابدین،شاہ تیمور،شاہ یحییٰ،شاہ منصور،امیر فخر الدین،امیر عبدالصمد،امیر امین الدین حسن، وغیرہ، چنانچہ کلام میں جستہ جستہ اُن کا ذکر پایا جاتا ہے۔خواجہ صاحب اپنے کلام یا بہ الفاظ صحیح تر غزل گوئی کے اعتبار سے شہرہ آفاق ہیں۔اُن کا تغزل یگانہ اور منفرد وارفع مقام پر فائز ہے۔مطالعہ غزل کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر کے میکدے میں عشق ومستی کی شراب برس رہی ہے۔غرض خواجہ صاحب کو ان کے رنگِ سخن کی نوعیت سے غزل کا بادشاہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہوگا۔فارسی کے بےنظیر غزل گو اساتذہ میں عرفی اور نظیری سرِ فہرست ہیں لیکن وہ بھی خواجہ صاحب کی تیغِ کمال کا لوہا مانتے ہیں۔

عرفیؔ کہتا ہے:

برآں تتبع حافظ رواست چوں عرفی
کہ دل بکاو دود ردِ سخنوری داند

نظیریؔ رقم طراز ہے:

تا اقتدا بہ حافظؔ شیراز کردہ ایم
گردیدہ مقتدائے دو عالم کلامِ ما

غزل کے علاوہ خواجہ صاحب نے قصیدہ،مثنوی،قطعہ،رباعی،ساقی،نامہ،ترکیب بند،ترجیع بند، وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔اور ایسے نادر وبدیع اسلوب میں کہ خود ان کا کلام خوانندوں کو اس کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے۔وہ تمام اصنافِ سخن پر اُستادانہ وبےمثال قدرت رکھتے ہیں۔خواجہ صاحب کے دیوان کی متعدد شرحیں اور تراجم موجود ہیں۔ہر شارح اور مترجم نے اپنے فہم وادراک اور نظریات

کے مطابق معانی و نکات پر روشنی ڈالی ہے۔مگر بعض شرحیں متعدد جلدوں میں ہیں اور بعض تراجم بھی اصل مفہوم سے دور جا پڑے ہیں۔ بہر حال حافظ شیرازی کا کلام بین الاقوامی طور پر جانا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب کے نظریات کو دنیا جانتی اور مانتی ہے۔آخر میں حافظ شیرازی کے چند قیمتی اشعار پیش خدمت ہیں۔

نفس بر آمد و کام از تو بر نمی آید!
فغاں کہ بختِ من از خواب بر نمی آید

(ترجمہ دم نکل گیا اور تجھ سے مراد بر نہیں آتی۔فریاد ہے کہ میری قسمت خواب سے بیدار نہیں ہوتی)

دریں خیا بسر شد زمانِ عمر و ہنوز
بلائے زلفِ سیاہت بسر بر نمی آید

(ترجمہ اس خیال میں زندگی کی عمر گزر گئی لیکن ابھی تیری سیاہ زلف کی بلا پیچھا نہیں چھوڑتی)

مقیم زلفِ تو شد دل کہ خوش سوادے دید
وزاں غریب بلاکش خبر نمی آید

(دل تیری زلف میں ٹھہر گیا کیونکہ اسے اچھا ٹھکانہ نظر آیا لیکن اس مصیبت زدہ دل کا سراغ ہی نہیں ملتا)

قدِ بلند ترا تا ببر نمی گیرم
درختِ بختِ مرا دم ببر نمی آید

(جب میں تیرے اونچے قد سے بغل گیر نہیں ہونگا میری مراد کے نصیب کا درخت پھل نہیں لائے گا)

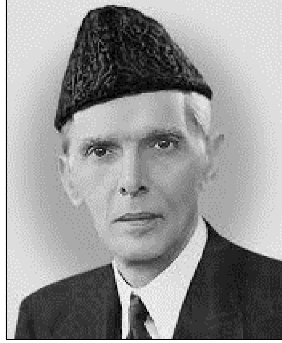
زشستِ صدق کشادم ہزار تیرِ دعا
ازاں میانہ یکے کار گر نمی آید

(میں نے سچائی کی شست سے دعا کے ہزاروں تیر چھوڑے لیکن ان میں سے ایک بھی نشانے پر نہیں بیٹھا۔)

کمینہ شرطِ وفا ترک سر بود حافظؔ
برو اگرز تو ایں کار برنمی آید

(اے حافظ!وفا کی ادنیٰ شرط سر دینا ہے اگر تجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا تو جا اپنی راہ لے)(ماخوذ)

# قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کا خاکہ



☆ولادت 25 دسمبر 1876ء کراچی۔

☆1882ء ابتدائی تعلیم کا آغاز۔

☆1892ء شادی مع عمی بائی۔

☆1893ء تعلیم کے لئے انگلستان روانگی۔

☆1897ء بمبئی میں وکالت کا آغاز۔

☆1900ء میں بمبئی میں بطور پریذیڈنسی مجسٹریٹ مقرر۔

☆1906ء بمبئی ہائی کورٹ میں بطور ایڈووکیٹ۔

☆1909ء سپریم امپیئریل کونسل کے لئے بلا مقابلہ انتخاب۔

☆1910ء قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

☆1913ء مسلم لیگ میں شرکت۔

☆1914ء کانگرس کے ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے انگلستان گئے۔

☆1916ء مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس۔لکھنؤ کے صدر مقرر۔میثاق۔لکھنؤ کی منظوری۔

☆18/دسمبر 1918 رتی نے اس شرط کو قبول کرتے ہوئے جامع مسجد بمبئی میں اسلام قبول کیا۔ایک روایت کے مطابق امیر احمد خان راجہ صاحب محمود آباد بھی ولی کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔

☆19/اپریل 1918ء کو جامع مسجد بمبئی میں نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔جس کی خبر ہندوستان کے مشہور اخبار ''TheStatesman'' میں چھپی کہ سر ڈنشا پٹیٹ کی اکلوتی بیٹی رتی بائی نے اسلام قبول کر لیا اور آج ان کا نکاح آنریبل ایم اے جناح سے ہے۔رتی جناح کو ہندوستان کے لوگ بمبئی کا گلاب کہہ کر پکارتے تھے۔قائداعظم بھی انہیں کبھی ڈولی کہہ کر پکارتے۔رتی صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ ایک گھریلو خاتون بھی تھی۔

☆مئی 1919ء میں قائداعظم اہلیہ کے ہمراہ انگلستان گئے۔

☆14راگست 1919ء کو اللہ تعالیٰ نے وہاں اس حسین جوڑے کو ایک خوبصورت بچی سے نوازا۔جس کا نام دینا جناح رکھا گیا۔

☆1919ء رولٹ ایکٹ کے خلاف بطور احتجاج امپیریل کونسل سے استعفیٰ۔

☆1920ء ترک موالات کے سلسلے میں اصولی اختلاف کی بناء پر کانگرس سے علیحدگی۔

☆1927ء مسلمانوں کے مشترکہ اجلاس دہلی کی صدارت۔

☆1922ء میں رتی جناح بیمار رہنے لگیں۔

☆3۔اپریل 1928ء کو قائداعظم انگلستان چلے گئے۔

☆20رفروری 1929ء کو اپنی سالگرہ والے دن ہی وفات پا گئیں۔قائداعظم فوراً بمبئی پہنچے۔ہر شخص سوگوار تھا۔

☆1929ء مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں چودہ نکات کا اعلان۔

☆1930ء کانگرس کی تحریک سول نافرمانی کی مخالفت۔انگلستان میں مستقل سکونت۔

☆1931ء دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت اور ہندوستانی سیاست سے عارضی کنارہ کشی۔

☆1933ء مولانا عبدالرحیم درد کی کوششوں سے ہندوستانی سیاست میں واپسی۔

☆1934 بمبئی کے شہری حلقے سے مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی۔

☆1935ء جناح راجندر پرشاد فارمولا۔

☆1936ء قانون ہند 1935ء کے تحت صوبائی انتخاب، مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا قیام۔مسلم لیگ کے مستقل صدر کی حیثیت سے منتخب۔مسلم لیگ کی نئی جدوجہد کا آغاز۔انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی۔

☆1937ء آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پہلے سالانہ اجلاس کلکتہ کی صدارت۔

☆1939 یکم نومبر کو وائسرائے کی خواہش پر ان سے ملاقات۔

☆1940ء23مارچ لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قرارداد کی منظوری۔

☆1941ءمسٹرراج گوپال اچاریہ کی پیشکش۔

☆1942ءہندوستان میں کرپس مشن کی آمد۔قائداعظم سے ملاقاتیں اور پاکستان کے اصول کوتسلیم کرلینا۔کرپس مشن کی تجاویز کا استرداد۔

☆13/دسمبر 1943ءکوتقسیم ہند کے مطالبے کی اٹل شرط کا اعلان۔

☆23/فروری1946ءکو وزارتی مشن کا دورہ ہند۔

☆24/اگست 1946ءکولارڈ ویول کی طرف سے عبوری حکومت کے قیام کا اعلان۔کانگرس کوحکومت بنانے کی دعوت۔قائداعظم کا وائسرائے کی اس تیاری پرزبردست احتجاج۔

☆21/ مارچ1947ء بطور وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہندوستان میں آمد۔ وائسرائے سے ملاقاتیں اورمطالبہ پاکستان کی منظوری۔

☆12/اپریل1947ءکوکانگرس کی طرف سے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا مقابلہ۔

☆3/جون1974ءقیام پاکستان کا اعلان۔

☆14/اگست 1947ءکو پاکستان کا قیام۔

☆1948ءیکم جولائی کو بینک دولت پاکستان کا افتتاح۔

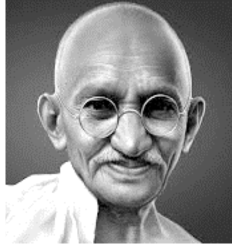
☆14/اگست1984ءجشن استقبال کے موقع پرزیارت سے قوم کے نام جرات آموز پیغام۔

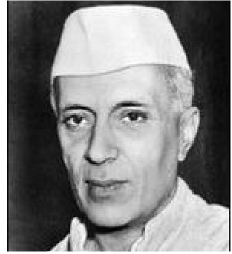
☆11/ستمبر 1948ءنو بجے شام کے قریب کراچی میں بذریعہ ہوائی جہاز آمد۔شب کودس بج کر پندرہ منٹ پرانتقال۔

☆21/ستمبر 1948ءکو چارستمبر کو چار لاکھ افراد نے نماز جنازہ پڑھی اورآپ کوکراچی میں سپردخاک کردیا گیا۔

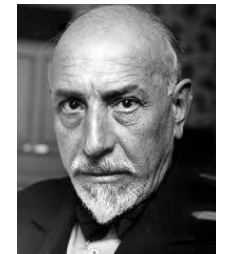


# قائداعظم محمد علی جناحؒ اور مختلف مشاہیر کرام









کسی بھی شخص کی شخصیت جاننے کے لئے اس کے کارہائے نمایاں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے برصغیر کی سیاست میں سیاسی کارناموں کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی شخصیت کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے دور کے مختلف نامور افراد کی آراء کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے آپ کی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔

**جان گنتھر:** مسٹر جناح کی زبان سحر انگیزی پر مشتمل تھی۔ پاکستان ہمارا ہے۔ دین اسلام پر نثار ہو جائیں گے۔ قائد کی زبان سے جب ادا ہوتے ہیں تو دس کروڑ مسلمان ہند فلک شگاف نعرے بلند کرتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔

**جگت نرائن لال::** وہ کسی بھی طاقت کے آگے جھکنا نہیں جانتے تھے انہوں نے ہر محاذ پر انگریزوں کو شکست دی۔

**سر تیج بہادر سپرو::** حصول پاکستان قائداعظم کا ایسا روشن کارنامہ ہے۔ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔

**لوئی فشر::** مسٹر جناح ایک ذہین پارلیمانی شخصیت ایک ہوشیار نقاد اور ایک بے لوث سیاستدان ہیں۔

**مسولینی (سابق سربراہ اٹلی)::** قائداعظم کے لئے یہ بات کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک ایسی تاریخ ساز شخصیت ہیں جو کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتی ہیں۔

**لارڈ سٹرابولگی::** قائداعظم نے صحیح قیادت دے کر واشنگٹن، گیری بالڈوگ اور بسمارک سے بھی

بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ پاکستان ایک بڑی قوم کا بڑا ملک ہے۔

**ڈاکٹر سلطان شہر یار (سابق وزیر اعظم انڈونیشیا)::** مسٹر جناح بہت پُرکشش آدمی ہیں۔ ایک مقناطیسی شخصیت، مسٹر جناح کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کی خوداعتمادی اور صاف گوئی ہے۔ وہ اپنے مدعا کے مکمل و مؤثر اظہار پر ساحرانہ قدرت رکھتے ہیں۔

**خالدہ ادیب خانم::** قائداعظم مسلمانوں کے عظیم لیڈر تھے۔ قدرت نے انہیں قیادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

**ڈاکٹر ماہ پارنوالی (ایران)::** فکر قائد کی روشنی سے عالم اسلام کو فائدہ پہنچا ہے۔ انہوں نے قوم کے مستقبل کے لئے اپنا آج کل کے لئے قربان کر دیا۔ اور اس وصف کے مدنظر، وہ تاریخ پاکستان کا ایک درخشاں باب متصور ہونگے۔

**آقائے رزم آرا (سابق وزیر اعظم ایران)::** قائداعظم اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے اصول کے مجسمہ تھے۔ انہوں نے ملت پر ان تین صفات کی اہمیت واضح کی۔ آپ ملت کے جذبہ عمل کے سرچشمہ تھے۔ ان کی تعلیمات واضح محکم اور اصول پر مبنی تھیں۔ آپ نے اپنے پیروؤں کو سیاست اور حکومت کے فن کی ایسی تربیت دی کہ ان کی وفات پر پاکستان کو ضعف نہیں پہنچا۔

**مسز اینی بسنت::** جناح جیسی شخصیت بنی نوع انسان کی آزادی کے گلے کا ہار ہے۔ جس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

**ڈاکٹر سی آر داس::** مسٹر جناح صرف مسلمانوں کی نجی دولت نہیں ہیں بلکہ وہ سارے ہندوستان کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

**لارڈ ایٹلی (سابق وزیر اعظم برطانیہ)** قائداعظم کا بے مثل جذبہ حریت اور شبانہ روز محنت ہی وہ سرمایہ ہے جس نے پاکستان جیسے ملک کی بنیاد ڈلوائی۔

**نواب وقار الملک:** قائداعظم محمد علی جناحؒ کسی بھی بے اصولی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بے اصولی ان کی چڑ تھی اور اصول ان کی خوشنودی۔ ہمیشہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو اصول

کے پابند ہوں خواہ ان کا تعلق کسی بھی طبقے سے کیوں نہ ہو۔

**سرراس مسعود::** وہ آزادی کی خاطر انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے۔ وہ آزادی کی مہم میں کسی طرح بھی غاصبانہ اقدامات کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی روایات کو کسی قیمت پر قربان کرنا انہیں گوارانہ تھا۔

**مولانا محمد علی جوہرؒ::** کاش خداوند عالم جناح کے دل میں ڈال دے کہ مسلمانوں کی راہنمائی اب اس کے سوا کوئی نہ کرسکے گا۔نواب محمد یار جنگ۔قائداعظم پاکستان کی روح رواں تھے۔ان کی تقریروں سے مسلمانوں کے بجھے ہوئے دلوں میں امید کی کرن پیدا ہوگئی۔ان کے پژمردہ دلوں پر امید کی کرنیں اور مسکراہٹیں رقصاں ہوگئیں اور اپنے دلوں میں ایک نیا عزم لئے جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام انہیں دل و جان سے چاہتے تھے۔

**حسین شہید سہروردی (وزیراعظم پاکستان)::** مسٹر جناح ان لوگوں میں سے ہیں جو ذاتی مقاصد کو لے کر آگے ہیں بڑھتے وہ بڑے دیانتدار اور راست گو ہیں۔وہ اپنا جواب آپ ہیں۔

**مولوی عبدالحق::** قائداعظم مرے نہیں۔وہ زندہ ہیں اور پاکستان کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔سرعبدالقادر۔قائداعظم مرے نہیں۔جو مشعل راہ انہوں نے فروزاں کی تھی بدستور فروزاں ہے۔وہ پاکستان کی شکل میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

**حکیم اجمل خان::** مسٹر جناح عملی طور پر وطن پرست ہیں۔اگر ایک طرف ان کا وہ جوش اور ولولہ، کہ ملک سیاسی طور پر آزاد ہوجائے اسے کسی کے سامنے سرنگوں ہونے نہیں دیتا تو دوسری طرف وہ سیاسی حالات سے بے خبر نہیں ہیں اور وہ ہر فرقے کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں اور اسی بنیاد پر ملک کی سیاسی تعمیر کے متمنی ہیں۔

**علامہ عنایت اللہ المشرقی::** قائداعظم کا عزم پائندہ اور محکم تھا۔ وہ ایک جری اور بے باک سپاہی تھے۔جو مخالفوں سے ٹکرانے کو کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔

**مولانا ابوالکلام آزاد::** قائداعظم بے جا جذباتیت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر مسئلے کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیتے تھے۔اوریہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔

**شیخ عبداللہ::** قائداعظم کو اپنے مقصد میں جو اس قدر محیرالعقول کامیابی حاصل ہوئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان ہیں۔انہوں نے قوم کے مفاد کی حفاظت کا فریضہ تندرستی سے انجام دیا۔وہ ہمیشہ انصاف و دیانت کے مسلک پر کاربندرہے۔

**سلطان سرمحمد شاہ آغا خان::** مجھے اپنی زندگی میں بے شمار سیاستدانوں سے واسطہ پڑا۔ لائیڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی، گاندھی لیکن جناح ان سب میں منفرد تھے۔میرے خیال میں کوئی شخص بھی زیادہ مضبوط سیرت وکردار کا مالک نہ تھا ہوش وتدبر،عزیمت و استقامت جو سیست کا سنگ بنیاد ہیں۔جناح میں بدرجہ اتم ہیں۔

**چودھری رحمت علی::** قائداعظم کی شخصیت بہت ہی غیر معمولی صفات کا مجموعہ تھی۔وہ ایک فلسفی کی طرح سوچتے ایک منطقی کی طرح گفتگو کرتے اور ایک ماہر قانون کی طرح پابند تھے۔

**سرسکندر حیات::** قائداعظم نے مسلمانوں کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ انہیں صحیح معنوں میں قائد اعظم کے لقب کا مستحق بنا تا ہے۔ان کے بدترین ناقد بھی ان کی عظیم صلاحیت،اخلاص اوراحساس فرض کااعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

**علامہ ڈاکٹر سرمحمد اقبال::** ہندوستان میں بحیثیت مسلمان آپ ہی کی واحد ہستی ہے جس سے ملت کو یہ توقع وابستہ کرنے کا حق ہے کہ شمالی مغربی یا شاید پورے ہندوستان میں جو سیلاب آرہا ہے اس میں آپ ملت کی صحیح راہنمائی فرمائیں گے۔

**محترمہ فاطمہ جناح::** قائداعظم گھریلو زندگی میں ہروقت ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں ہوتے باہر سخت طبیعت مگر حقیقت میں نرم طبیعت انسان تھے۔قائداعظم ایک ایسے صاحب بصیرت۔فرض شناس اور دیانت دار شخص تھے جن کا نام بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔تحریک پاکستان کے دوران مسلمانوں میں جو سیاسی تصور فکر اسلامی اور جذبہ حریت کا طوفان اُمڈ رہا تھا وہ قائداعظم کی جلیل اور

عظیم ہستی کے طفیل تھا یہ قائداعظم کی قیادت کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے انگریزوں کی مشترکہ مخالفت کے باوجود پاکستان حاصل کیا۔قائداعظم کی دیانت کے معترف ان کے دوست تو کیا دشمن بھی تھے۔

**سروجنی نائیڈو (بلبل ہند)::** میں محمد علی جناح کی دل سے عزت کرتی ہوں۔شروع شروع میں، میں نے ان کو روکا کہ سیاست ایک گندہ کھیل ہے،اس میں نہ کودیں،لیکن اب وہ سیاست کے سمندر میں کود پڑے ہیں تو میں ان کے لئے دعا گو ہوں کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوں اور بھگوان انہیں سرخرو کردے۔آپ ایسے لیڈر ہیں۔جن کو نہ خریدا جاسکتا ہے اور نہ بددیانتی پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

**مسٹر ٹرومین (سابق صدر امریکہ)::** دولت پاکستان کے معمار دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی حق بات کہنے اور منوانے والا اب اس دنیا میں دوبارہ نہیں آئے گا۔

**ماسٹر تارا سنگھ::** قائداعظم نے مسلمانوں کو صحیح عزت کا مقام دلوایا۔

**خان لیاقت علی خاں::** قائداعظم نے واقعات کی رفتار اور زمانے کی روش کو اپنی غیر معمولی ذہانت اور لازوال قومی درد سے آشنا ہو کر اس کو تبدیل کرنے میں شب وروز محنت کی اور ایک منتشر قوم کو یکجا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

**سی راجگو پال اچاریہ::** قائداعظم بلند پایہ شخصیت ہیں۔یہ کوئی معمولی انسان نہیں۔ملک میں زبردست مقبولیت کے مالک ہیں۔ان کی اندھی پیروی کی جارہی ہے۔یہی صحیح صحیح اور یہی سچی پیروی ہے۔وہ اپنی قوم کو بچانا چاہتے تھے۔وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے ایک نئی مملکت قائم کرلی۔

**لارڈ رسل (فلاسفر)::** میں تمام زندگی میں جس شخص سے زیادہ متاثر ہوا ہوں وہ محمد علی جناح کی ذات ہے۔

**سر ہومی مودی::** مسٹر جناح مدتوں سے ہماری زندگی کے ایک مہتمم بالشان نمائندہ ہیں۔ان کی روش بظاہر مجموعہ اضداد رہ چکی ہے لیکن ہر تغیر کے ساتھ وہ ایک مستقل اور بنیادی اصول پر جمے

رہے۔وہ نڈر رہیں، بے خوف ہیں صاف گو ہیں شہرت کے طلب گار نہیں۔اور سیاسی سازشوں سے بالکل الگ تھلگ۔بہت کم ہیں جنہوں نے انہیں پہچانا،اور بہت کم ہیں۔جنہوں نے ان کے تنہائی کے قلعے میں رہائی پائی۔ایک شخصیت جو دلوں کو موہ لیتی ہے تم اس کو چاہے ناپسند کرو چاہے اسے بُرا کہو مگر اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

**پی ایکس لارنس(انگریز صحافی)::** ان کا ہر ارادہ مسلمانوں کے لئے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کا حکم مسلمانوں کے لئے آخری فیصلہ ہے۔جس کی انتہائی خلوص کے ساتھ لفظ بلفظ تعمیل کی جاتی ہے۔

**دیوان چمن لال (ایڈووکیٹ جنرل بمبئی ہائیکورٹ)::** جناح ان لوگوں میں سے ہے جو ذاتی مقاصد واغراض کو پیش نظر رکھ کر نہیں بڑھتے۔ان کی دیانت پر کسی طرح حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

**سر کاؤس جی جہانگیر::** جس راستہ کو وہ صداقت،حقانیت اور انصاف کا راستہ سمجھ لیتے ہیں۔اس سے کوئی چیز بھی انہیں منحرف نہیں کر سکتی۔وہ ہمت و استقلال کے دھنی ہیں۔میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان پر کسی بھی وقت کوئی موقع پرستی اور ابن الوقتی کا الزام نہیں لگا سکتا۔انہوں نے کبھی اپنی غرض اور اپنے مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح نہیں دی۔

**مسٹر جوکم الوا(ایڈیٹر فورم)::** جناح کی جرأت اور بے ساختگی نے عدالتوں میں ان کی شخصیت کو ہی اجاگر کیا ہے۔ان کی مقناطیسی کا شہرہ ججوں سے بے خوف مقابلے اور عدالتوں میں بے لاگ قانونی موشگافیوں کے باعث دنیا بھر میں ہے۔جناح ہماری قانون دان برادری کا سب سے زیادہ باہمت انسان ہے۔کوئی منصف یا جج انہیں چکر دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

**ایف ای جیمز(سابق لیڈر یورپین گروپ سنٹرل لیج سلیٹو اسمبلی)::** سیاسی مجاہد کی حیثیت سے ہندوستان میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔وہ عوام لناس کے بے خوف اور ناقابل تسخیر راہنما تھے۔

**مولوی فضل حق::** اعلیٰ کردار اور استقامت،قائد اعظم کے بڑے ہتھیار تھے۔ان کا دل اسلام

اور مسلمانوں کی محبت سے معمور تھا۔

**سر سی پی راما سوامی آئر:**: میں جناح کے واضح نظریات اور پبلک معاملات میں ان کی بھی بے غرضی اور بے لوثی کا معترف رہا ہوں۔ انہوں نے عوام میں اپنی مقبولیت کو اپنی ذاتی فوائد کے لئے استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔

**ڈاکٹر بھیم راؤ امبید کر:**: جناح صاحب کے بڑے بڑے دشمنوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ کسی بھی قیمت پر خریدے نہیں جا سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ مسٹر جناح اپنے ارادوں میں پختہ اپنی رائے میں سخت ہیں لیکن ان کے رویہ میں کبھی کوئی لوچ نہیں پایا جاتا۔

**پنڈت جواہر لال نہرو (سابق بھارتی وزیر اعظم):**: میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ محمد علی جناح کسی قیمت پر خریدے نہیں جا سکتے۔

**ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی:**: اتنی بلند شخصیت تھے جتنی امام ابن تیمیہؒ تھے اس لئے کہ ابن تیمیہؒ نے مسلمانوں کو تاتاریوں سے بچایا جبکہ قائد اعظم نے مسلمانوں کو شر پسندوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ کیا۔

**گاندھی جی:**: میں نے قائد اعظم کی تقریر سے اندازہ لگایا ہے کہ انہیں ہندوؤں سے کوئی پُرخاش نہیں ہے۔ وہ ان کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو مسلم عوام پر بے نظیر قابو حاصل ہے۔ آپ سیرت وکردار کی ان بلندیوں پر ہیں کہ کوئی لالچ، کوئی خوف اور کوئی طعنہ آپ کو اپنی رائے سے نہیں ہٹا سکتا۔

**لارڈ ماؤنٹ بیٹن:**: راست بازی میں در یکتا، اندر باہر یکساں، انگریزی زبان کا درجہ اوّل مقرر، کمزور جسم وجاں کے ساتھ، بارُعب شخصیت، مسلمانان ہند کی اکیلے ناؤ کھینچنے والا اتنا بلند کردار اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں میں دوبارہ پیدا ہو۔

**سر ونسٹن چرچل (سابق برطانوی وزیر اعظم):**: قائد اعظم کو ایک بہترین سیاستدان اور دنیا کا ذہین وفطین لیڈر قرار دیا۔

**لارڈ کرپس::** مسٹر محمد علی جناح کے سینے میں شیر کا دل ہے۔ان کے ارادے اٹل ہیں۔

**لارڈ ویول۔(سابق وائسرائے ہند)::** مسٹر جناح اپنے ارادوں میں اپنی رائے میں بے حد سخت ہیں۔ان کے رویے میں کوئی لچک نہیں پائی جاتی۔وہ مسلم قوم کے مخلص راہنما ہی نہیں بلکہ سچے وکیل بھی ہیں۔

**سر شاب موکھم چٹی (انڈین لیجسلیٹو اسمبلی)::** وہ بلا شبہ ایک بڑے وطن پرست پارلیمانی آداب کے ماہر اور ہندوستان کی زبردست شخصیت ہیں۔جنہیں کسی ترغیب یا تحریص سے گمراہ نہیں کیا جا سکتا۔اور نہ ان کی خودداری اور آزادی چھینی جا سکتی ہے۔ان کی زبردست سیاسی شخصیت کا راز اسی اہل اور غیر فانی روح آزادی میں پوشیدہ ہے۔

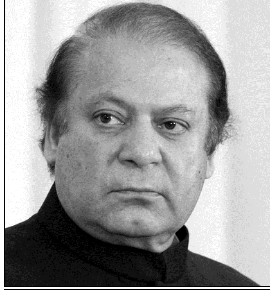
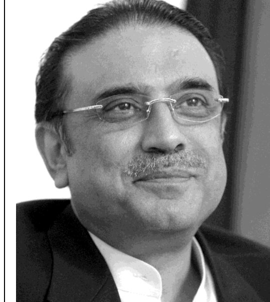
**وجے لکشمی پنڈت::** جناح نا قابل شکست تھے۔اگر مسلم لیگ کے پاس سو گاندھی ہوتے تو کانگرس کے پاس صرف ایک جناح ہوتا تو پاکستان کبھی نہ بنتا۔

**لارڈ نسلیتھگو::** مسٹر جناح کے تمام الفاظ ہیروں کی طرح قیمتی، ارادے چٹان کی طرح مضبوط وہ حقیقت میں نا قابل تسخیر ہیں۔

**نیلسن (جرنیل اور مدبر)::** مسٹر محمد علی جناح میں قدرت نے بے پناہ صلاحیتیں دی ہیں جب چاہیں جنگ کا رُخ تبدیل کر سکتے ہیں۔دس کروڑ انسان ان کے کہنے پر اپنی جان قربان کر سکتے ہیں۔



# قائداعظم اور آج کے قائدین

1 ☆۔کابینہ کا اجلاس تھا اے ڈی سی نے قائداعظم سے پوچھا کہ سر! اجلاس میں چائے دی جائے یا کافی۔قائداعظم نے چونک کر سر اُٹھایا اور کہا کہ یہ لوگ گھر سے چائے یا کافی پی کر آئیں گے۔یہ قوم کا پیسہ ہے۔وزیروں کے لئے نہیں جس نے چائے یا کافی پینی ہے وہ گھر سے پی کر آئے۔اس حکم کے بعد کابینہ میں اُن کی زندگی تک صرف سادہ پانی ہی دیا جاتا رہا۔

2 ☆۔کچھ چیزیں گورنر جنرل کے دفتر کے لئے منگوائی گئیں۔جن کا بل ساڑھے اڑتیس روپے آیا۔قائداعظم نے بل منگوالیا۔ان میں کچھ اشیاء محترمہ فاطمہ جناح نے ذاتی استعمال کے لئے منگوائی تھیں کہا کہ ان اشیاء کا بل فاطمہ جناح کے اکاؤنٹ سے لے لیا جائے اور کچھ چیزیں قائداعظم کی ذات کے لئے منگوائی گئی تھیں۔ان کے متعلق کہا کہ یہ رقم میرے اکاؤنٹ سے لی جائے۔باقی اشیاء دفتر کی تھیں اُن کے متعلق کہا کہ آئندہ فضول خرچی سے اجتناب کیا جائے۔

3 ☆۔برطانوی بادشاہ کا بھائی پاکستان کے دورے پر آرہا تھا۔برطانوی سفیر نے گزارش کی کہ آپ ایئرپورٹ پر اُس کا استقبال کریں۔فرمایا میں تیار ہوں مگر جب کل کلاں میرا بھائی لندن جائے گا تو وزیراعظم کو بھی استقبال کرنا ہوگا۔

4 ☆۔ایک روز اے ڈی سی نے ایک وزٹنگ کارڈ آپ کے سامنے رکھا قائداعظم نے کارڈ پھاڑنے کے بعد فرمایا کہ اسے کہنا کہ آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھائے۔یہ اُن کا بھائی تھا۔اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے اپنے کارڈ پر صرف یہ لکھا تھا کہ برادر آف گورنر جنرل آف پاکستان۔

5۔☆۔زیارت میں سردی پڑ رہی تھی۔کرنل الٰہی بخش نے نئے موزے پیش کر دیئے۔دیکھے تو بہت پسند فرمائے۔پوچھے کتنے کے ہیں۔بتایا کہ دو روپے کے۔قائداعظم نے کہا کہ کرنل یہ تو مہنگے ہیں بتایا کہ جناب یہ آپ کے اکاؤنٹ سے خریدے گئے ہیں۔قائداعظم نے کہا کہ میرا اکاؤنٹ بھی تو قوم کی امانت ہے۔ایک غریب ملک کے سربراہ کو اس قدر عیاش نہیں ہونا چاہیئے اور وہ موزے واپس کر دیئے۔

6☆۔زیارت ہی میں ایک نرس سے ایک بار پوچھا کہ بتایئے کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔نرس نے بتایا کہ میرا سارا خاندان پنجاب میں رہتا ہے اور میں اکیلی ہی کوئٹہ میں ملازمت کرتی ہوں۔اگر ہو سکے تو میرا تبادلہ پنجاب کے کسی بڑے شہر میں کروا دیں۔اُداس لہجے میں فرمایا کہ بیٹی یہ کام تو وزارت صحت کا ہے گورنر جنرل کا نہیں۔میں اس بارہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

7☆۔قائداعظم نے اپنے طیارے میں رائٹنگ ٹیبل لگوانے کا لکھا تو وزارت خزانہ نے اجازت تو دے دی مگر فائل پر لکھا کہ اس قسم کا حکم دینے سے پہلے گورنر جنرل وزارتِ خزانہ سے اجازت لینے کے پابند ہیں۔قائداعظم نے اس پر باقاعدہ معذرت کی اور آرڈر منسوخ کر دیا۔

8☆۔ریلوے پھاٹک والا قصہ کون نہیں جانتا۔جنرل گل حسن نے آپ کی گاڑی گزارنے کے لئے بند ریلوے پھاٹک کھلوایا۔آپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔آپ نے یہ کہہ کر پھاٹک بند کرا دیا کہ اگر میں ہی قانون کی پابندی نہیں کروں گا تو اور پھر کون کرے گا۔

یہ تھے ہمارے قائد جسے ہم سب نے قائداعظم کہہ کر پکارا اور اُسے مانا۔ذرا اُس کے عملی کردار اور اپنے محب الوطنی کا تقابلی جائزہ لیں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ فرشتہ صفت انسان جس کی ضد نے راست اقدام کر کے ہمیں ایک عظیم مملکت دے دی۔اور فخر سے برصغیر کے محروم، بسے ہوئے، اَن پڑھ طبقے کو سر چھپانے کے لئے ایک وطن مہیا کر دیا۔جسے بیش بہا لالچ دیئے گئے، بہت سی پیشکش کی گئیں، مگر اس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت اور علی کی طاقت سے یہ عظیم چوٹی سر کی۔علمائے سُو کی مسلسل مخالفت کے باوجود ہمیں ایک آزاد ملک کی نعمت سے نوازا۔اگر ہم اس کردار کا ایک ایک کر کے جائزہ

لیں تو اس عظمت کردار کا عشرِ عشیر بھی آج ہم میں اور ہمارے نام نہاد لیڈران میں نہیں پایا جاتا۔نمبر ایک۔فضول خرچی۔کیا آج کی کابینہ میں فضول خرچی سے اجتناب ہے،نہیں۔بلکہ ہر جگہ کروڑوں سے بجٹ بڑھ چکے ہیں۔اور بڑی ڈھٹائی سے قوم کا پیسہ الّلے تلّلوں میں پانی کی طرح ضائع کیا جاتا ہے بلکہ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتح پڑھی جاتی ہے۔نمبر دو۔خریدنے سے پہلے فیصلہ اور اجازت۔کیا اس فضول خرچی کی کوئی روک تھام ہے بلکہ کوئی بھی چیز خریدنے پر کمیشن کھانا قانون بلکہ حق بن چکا ہے۔اپنی ذات کے علاوہ اپنے اَقرباء کو بھی اس بہتی گنگا میں نہلانے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ذاتی اشیاء تو درکنار بلٹ پروف گاڑیوں کی خرید پر کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔نمبر تین۔استقبال یا اصول پرستی۔استقبال کے لئے تو ہم سگِ بیمار کی طرح دُم ہلاتے ہوئے بھی پہنچ جاتے ہیں۔اُن فرنگی اور سعودی ناخداؤں کے لئے تو ہم ایک کال پر بچھے جاتے ہیں کہ دنیا میں ہماری خوشامد گوئی اور چمچہ گیری کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ہمارے ہاں اصول پرستی کو ترجیح نہیں دی جاتی۔نمبر چار۔اَقرباء پروری۔اَقرباء پروری میں تو ہم نے کمال حاصل کرلیا ہے، پہلے تو لیڈر اپنے بیٹے کو پروموٹ کرتے ہیں اگر بیٹا نہ ہو تو بیٹی کو اس بھٹی میں جھونکنے سے نہیں چوکتے۔اگر وہ بھی نہ ہو تو بیوی، بھتیجے، سمدھی، اور ان کے سمدھی رشتے دار بھی مفادات کی جنگ کے لئے آزمائے جاتے ہیں۔پھر ہم مسلمان بن کر عہد فاروقی کی مثالیں دیتے نہیں تھکتے۔نمبر پانچ۔تبادلوں کی سیاست۔تبادلوں کی سیاست نے تو ہمارا بیڑا ہی غرق کردیا ہے۔

پولیس اور بیوروکریٹ ہمارے لیڈروں کے گھر کی باندی بن کر رہ گئے ہیں۔جس ایم این اے یا وزیر کے پاس یہ طاقت نہ ہوا سے مفلوج وزیر تصوّر کیا جاتا ہے بلکہ تبادلے کا تیر ہر بے کس بیوروکریٹ اور جج تک پر چلانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔نمبر چھ۔وزارت خزانہ کا مقام۔وزارت خزانہ کو آزاد ادارہ بنانے کی بجائے اسے نکیل ڈال دی جاتی ہے بلکہ اپنے سمدھی کو اس کا کرتا دھرتا بنا کر ہر سال کے دوران منی بجٹ لاکر قوم کی جیبیں تراشی جاتی ہیں اور وزارت خارجہ کا قلمدان بھی اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسلسل اس کو مستقل وزیر مقرر کرنے سے

گریز کر کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھ کر اس محکمے کی تذلیل کی جاتی ہے۔ مداخلت سے بے توقیری کی جاتی ہے۔ جب کسی معزز ہستی نے پاکستان آنا ہو تو میڈیا سے ہی وزارتِ خارجہ کو پتہ چلتا ہے۔

**نمبر سات وی آئی پی کلچر::**

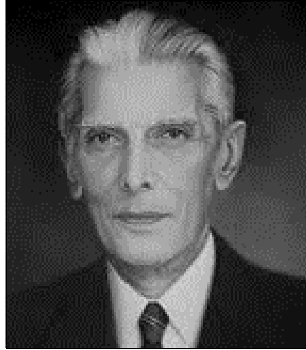
اب پھاٹک تو ایک طرف، جب کسی معمولی وزیر نے بھی گزرنا ہو تو سڑکیں اور اس کے سگنل تین تین گھنٹے قبل ہی بند کر دیئے جاتے ہیں، وی آئی پی کلچر نے اس قوم کو پاگل کر دیا ہے۔ پچاس پچاس گاڑیوں کے قافلے، اور بے شمار پولیس کارندوں کی جمعہ جنج سڑکوں پر رش لگا کر غریب شہریوں کا جینا حرام کر رہی ہے۔ اس وجہ سے کئی بسمہ راستے میں دم توڑ جاتی ہیں اور کئی رکشہ خان ٹریفک رَش میں ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ عمران خان نے تو اعلان کر دیا ہے کہ وہ خیبر پختون خواہ میں اس وی آئی کلچر کو ختم کر رہا ہے کاش باقی صوبے بھی کچھ سبق لیں۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ اے خدا ہمیں ایک اور قائداعظم عنایت کر جو ساری قوم کو وقار سے جینا سکھا دے۔ آمین۔



## تھامس کارلائل Thomas Carlyle

مشہور انگریز مصنف جو ۱۷۹۵ء کو سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ ایڈنبرا میں تعلیم پائی۔ پھر جرمن زبان، ادب اور فلسفے کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ اس فلسفے کے زیرِ اثر شخصیت پرستی کا رُجحان بڑھا۔ اور تاریخ نویسی شروع کی۔ ۱۸۳۷ء میں انقلابِ فرانس کی تاریخ لکھی۔ جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ معاشرے کو مشاہیر کی ہدایات کے زیرِ اثر شعوری طور پر بدلنا چاہیئے۔ اس نے دنیا کے متعدد مشاہیر کے حالات لکھے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کی تاریخ افراد کے گرد گھومتی ہے۔ اس نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح بھی لکھی۔

# حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ اور ویمبلڈن کی مسجد



ہماری نئی نسل سمیت کئی پاکستان کا نام لینے والے اس بات سے واقف نہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی سنوارنے کا عزم اُٹھانے کے بعد ہندوستان کی سیاست چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے اور جانے کے بعد واپس کیسے آ گئے۔ جیسے پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ویسے مسلمانوں میں سارے ہی مومن نہیں ہوتے۔

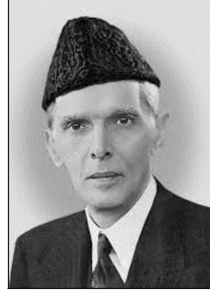
ہندوستان کے مسلمانوں میں جنہیں دولت کی لالچ تھی وہ ایک غیر قوم سے روپے لے کر منافقت پھیلا رہے تھے اور عوام کے گروح کو اکٹھا کر کے الگ ملک کے خلاف مسلمانوں میں زہر اُگل رہے تھے۔ مسلمان بھی کسی حد تک اُس وقت کے لالچیوں کے بچھائے جال میں آ رہے تھے اور محمد علی جناح اور الگ ملک کے خلاف اندر ہی اندر دشمن پیدا کر رہے تھے۔ اُن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو پاکستان بننے سے پہلے قائداعظم کو کافر اعظم اور پاکستان کو پلیدستان بھی کہتے تھے اس کے علاوہ اُنکا یہ بھی کہنا تھا کہ پاکستان تو دور کی بات ہم پاکستان کی پ بھی نہیں بننے دیں گے۔ خیر قائداعظم کے ہندوستان کی سیاست چھوڑ جانے سے مسلمانانِ ہند ایک عظیم لیڈر کی سیاست سے محروم ہو گئے تھے لیکن ہندوستان میں بعض دردمند ایسے بھی تھے جو صدق دل سے یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کی قسمت سنوارنے کی اہلیت رکھنے والا رہنما مایوس ہو کر کیوں چلا گیا؟ اس کو واپس لانا چاہئے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن دردمندوں میں سر فہرست مرزا بشیر الدین محمود احمد کی شخصیت تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قائداعظم ہندوستانی سیاست میں واپس آئیں اور مسلمانانِ ہند کی قسمت سنوارنے کا جو عزم ان کے دل میں ہے اُسے تکمیل تک پہنچائیں۔ خیر مرزا بشیر الدین نے اپنے ایک قریبی اور با اعتماد شخص مولانا عبدالرحیم درد کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا اور انگلستان روانہ کیا تا کہ وہ قائداعظم سے بات کرے اور اُنہیں ہندوستان کی سیاست میں واپس

آنے پر آمادہ کرتے۔

23مارچ 1932 کو مولانا عبدالرحیم لندن گئے اور قائداعظم سے متعدد ملاقاتیں کی۔قائداعظم نے اُنہیں اپنی بہت سی مجبوریاں پیش کیں مگر اپنی آخری ملاقات میں جو تین گھنٹے تک جاری رہی مولانا عبدالرحیم کی تلقین اور مدلل طریق کے نتیجہ میں محمد علی جناح پھر میدان سیاست میں آنے پر آمادہ ہوگئے اور یہ قرار پایا کہ اس غرض سے محمد علی جناح 6/اپریل 1933ءکو ویمبلڈن کی مسجد فضل لندن میں عید الاضحیٰ کے موقع پر، ہندوستان کے مستقبل، کے متعلق تقریر کریں گے نیز اس تقریر کا سارا انتظام اور نشر واشاعت کا اہتمام مولانا عبدالرحیم خود کریں گے،مولانا اُس وقت فضل مسجد لندن کے امام بھی تھے۔یہ تقریب بڑی دُھوم دھام سے منائی گئی اور ہر مکتبۂ فکر کے ذی اثر لوگوں نے شرکت کی۔

انگلستان کے تمام مشہور اخبارات میں اس تقریر کا بہت چرچا ہوا۔تقریر کی ابتداء میں قائد اعظم نے کہا،امام،مسجد فضل،لندن نے ترغیب دی اور اس ترغیب میں اُن کی فصاحت وبلاغت نے میرے لئے کوئی راہ فرار نہیں چھوڑی۔اُن کی پُرزور تحریک کی وجہ سے میں اس سیاسی اسٹیج پر کھڑا ہونے کے لئے مجبور ہوں،چنانچہ سنڈے ٹائمز لندن نے اپنی اشاعت 9/اپریل 1933ء میں لکھا۔ترجمہ:میلوز روڈ ویمبلڈن کی مسجد کے میدان میں ایک اور بڑا اجتماع منعقد ہوا جدھر ممتاز ہندوستانی مسلم رہنما محمد علی جناح نے ہندوستان کے مستقبل پر خطاب کیا اور اپنے خطاب میں انڈین وائٹ پیپرز پر قومی نقطہ نظر سے تحفظات کا اظہار کیا۔صدر اجلاس سر اسٹیورٹ سنڈیمن ایم پی نے اس موضوع پر مسٹر چرچل کا مؤقف اختیار کیا جس پر بعض حاضر مسلم طلبا نے کُچھ تلخ مظاہرہ کیا مگر مولانا عبدالرحیم درد نے اُنہیں رام کرلیا۔یہ تقریر پریس کی خاص توجہ کا مرکز بن گئی اور اس سے متعلق درج ذیل اخبارات نے تبصرے بھی شائع کئے۔ماڈرن میل، ہندو مدراس،ایوننگ سٹینڈرڈ، اِیجپٹیئن گزٹ الیگزنڈرا،ویسٹ افریقہ،سٹیٹس مین کولکتا،سنڈے ٹائمز لندن۔اس کے بعد قائداعظم نے انگلستان کو خیر باد کہہ دیا اور پھر ہندوستان واپس آگئے اور نئے جوش اور ولولہ سے تحریک پاکستان کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں 1947ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔❁❁

# حضرت قائداعظمؒ اور حضرت چوہدری ظفراللہ خانؓ





برصغیر ہندوپاک کی تحریک آزادی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک آزادی کے عظیم اور سرگرم لیڈر محمد علی جناح (جو ابھی قائداعظم کے قابل صد احترام لقب سے معروف نہیں ہوئے تھے) برصغیر ہندوپاک کے چیدہ چیدہ و معروف ومخلص لیڈروں سے خوب شناسا تھے اور ان عمائدین میں چوہدری ظفر اللہ خان خوب نمایاں اور فعال تھے۔ ہندوستان میں آئینی اصلاحات اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جو مساعی کی گئیں۔ لندن میں منعقدہ ''تین گول میز کانفرنسیں'' (1930ء تا1932ء) اس سلسلہ کی تین اہم کڑیاں تھیں۔ جن میں انڈیا کے چوٹی کے لیڈر شامل ہوئے اور حکومت برطانیہ کے ساتھ گفت وشنید میں حصہ لیا۔ جس کے نتیجہ میں کئی اصلاحات تشکیل پا گئیں۔ چوہدری سرظفر اللہ خان کو ان تینوں کانفرنسوں میں بھرپور عملی شرکت کا موقع ملا۔ لہٰذا قائداعظم جیسا زیرک لیڈر چوہدری سرظفر اللہ خان کی نمایاں سرگرمیوں سے خوب آگاہ تھے۔ مؤرخ پاکستان ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب ''اقبال کے آخری دوسال'' میں واضح طور پر تحریر کیا۔ ''گول میز کانفرنس کے مسلمان مندومین میں سے سب سے زیادہ کامیاب آغاخاں (وفد کے سربراہ) اور چوہدری ظفراللہ خان ثابت ہوئے۔''

(اقبال کے آخری دوسال ص16 ناشر اکیڈمی کراچی)

## ہندوستان کی مرکزی اسمبلی (1939) میں قائداعظمؒ کا ایک بیان

غیر منقسم ہندوستان میں بھی چوہدری صاحب کی ملک وملت کے لئے کامیاب سرگرمیوں کے پیش نظر قائداعظم نے چوہدری صاحب کو غیرمعمولی خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''میں اپنی اور اپنی پارٹی کی طرف سے آنریبل سر چوہدری ظفر اللہ خان کو

ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مسلمان ہیں اور یوں کہنا چاہیئے کہ میں اپنے بیٹے کی تعریف کر رہا ہوں۔ مختلف حلقوں نے ان کو جو مبارکباد پیش کی ہے۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔''

(ہماری قومی جدوجہد ص78 مؤرخ پاکستان ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی پاکستان پریس لاہور)

## پاکستان کے باقاعدہ معرض وجود میں آنے سے پہلے

''3رجون 1947 کے ہند پلان'' کے جلد بعد انگریزی حکومت نے صوبہ پنجاب میں مسلم اکثریت کے باوجود اسے تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا اور باؤنڈری کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر قائداعظم نے مملکت خداداد پاکستان کے باقاعدہ قیام سے پہلے ہندوستان بھر کے وکلاء اور ماہرین قانون میں سے خود سر چوہدری ظفر اللہ خان کا انتخاب فرمایا کہ وہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے کیس کی وکالت کریں۔ یہ قائداعظم کا چوہدری صاحب کی غیر معمولی لیاقت اور مخلصانہ جذبہ خدمت پر اعتماد کا زبردست ثبوت ہے۔ ادھر چوہدری ظفر اللہ خان کو بھی قائداعظم کا کس قدر احترام اور ان کے ارشاد کا کس قدر پاس تھا۔ اس کا ثبوت چوہدری صاحب کے ان الفاظ سے عیاں ہے۔ آپ جید صحافی منیر احمد منیر کے ساتھ اپنے انٹرویو میں بیان کرتے ہیں۔'' قائداعظم نے مجھے بھوپال سے بلا کر ارشاد فرمایا کہ پنجاب باؤنڈری کمیشن میں آپ ہمارا کیس پیش کریں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں۔''

(انٹرویو مطبوعہ آتش فشاں مئی 1981 ص23 کالم نمبر1)

## قائداعظمؒ مردم شناس تھے

تحریک پاکستان کے ایک سرگرم رکن اور سابق سفیر و وزیر سید احمد سعید کرمانی قومی ڈائجسٹ کو بیان دیتے ہوئے فرمایا۔ قائداعظم نے رائٹ مین فار رائٹ جاب چنا۔ ظفر اللہ خاں کی چائس بھی قائداعظمؒ کی تھی۔ ظفر اللہ خاں قیام پاکستان کے موقع پر نواب آف بھوپال کے آئینی مشیر تھے۔

قائداعظمؒ نے بلایا کہ آپ باؤنڈری کمیشن کے آگے مسلم لیگ آرگو کریں۔ وہاں کی اچھی خاصی تنخواہ اور مراعات چھوڑ کر آ گئے۔ مطلب یہ ہے کہ قائداعظمؒ کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی دی تھی۔

(انٹرویو مطبوعہ قومی ڈائجسٹ اگست 2002ء ص26۔27)

باؤنڈری کمیشن کے سامنے وکالت اور قائداعظمؒ کی پذیرائی۔اس سلسلہ میں وطن عزیز کے معروف صحافی منیر احمد منیر اپنے کالم مطبوعہ روزنامہ ''خبریں'' 7/جون 2003 میں تحریر کرتے ہیں۔ قائداعظم نے چوہدری ظفراللہ خاں کو پنجاب باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور جب چوہدری ظفراللہ خان یہ کیس پیش کر چکے۔ قائداعظمؒ نے انہیں شام کے کھانے کی دعوت دی۔ اور انہیں معانقہ کا شرف بخشا۔ جو قائداعظمؒ کی طرف سے کرۂ ارض پر بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ معانقہ کرنے کے بعد قائداعظمؒ نے چوہدری سر ظفراللہ خاں سے کہا۔ میں تم سے بہت خوش ہوں اور تمہارا ممنون ہوں کہ جو کام تمہارے سپرد کیا گیا تھا تم نے اسے اعلیٰ قابلیت اور نہایت احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ (از کالم مطبوعہ روزنامہ خبریں 7/جون 2003)

## اقوام متحدہ میں دو قابل ذکر کارنامے

اللہ تعالیٰ کے فضل سے قائداعظمؒ کی زیر قیادت طویل جدوجہد کے بعد مملکت خداداد پاکستان کا قیام 14/اگست 1947ء کو عمل میں آیا۔ اس لئے چوہدری صاحب کے لئے ایک اہم فریضہ پاکستان کے لئے اقوام متحدہ کی ممبر شپ حاصل کرنا تھی اور بفضل اللہ تعالیٰ یہ مرحلہ عمدگی سے مکمل ہو گیا۔ اقوام متحدہ میں دوسرا اہم کام مسئلہ فلسطین پر پاکستان کا موقف واضح کرنا اور عربوں کی بھرپور حمایت کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں چوہدری صاحب نے قائداعظمؒ اور حکومت پاکستان کی طے شدہ خارجہ پالیسی کے تحت فلسطینیوں اور بعد میں آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے مختلف عرب اور افریقی ممالک کے حق میں اقوام متحدہ کے فورم پر زبردست اور مؤثر آواز اٹھائی اور پاکستان کا نام دنیا بھر میں روشن کیا۔ چنانچہ قائداعظمؒ کے ایک معتمد ساتھی اور پاکستان کے سابق وزیراعظم چوہدری محمد علی اپنی انگریزی کتاب ''ظہور پاکستان'' کے صفحہ 380 پر تحریر کرتے ہیں:

''مسلم دنیا کی آزادی، قوت، خوشحالی اور اتحاد کے لئے زبردست جدوجہد پاکستان کی خارجہ

پالیسی کا ایک مستقل مقصد رہا ہے۔حکومت پاکستان کا ایک اولین اقدام یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں ایک خیر سگالی وفد بھجوایا گیا۔ پاکستان نے فلسطین میں عربوں کے حقوق کو اپنا مقصد قرار دیا۔اور اقوام متحدہ میں اس نصب العین کی خاطر پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان سے بڑھ کر کوئی فصیح ترجمان نہیں تھا۔ پاکستان اسرائیل کو نہ تسلیم کرنے کی پالیسی پر مسلسل گامزن ہے۔ انڈونیشیا، ملایا، سوڈان، لیبیا، تیونس، مراکش، نائیجیریا، اور الجیریا کی آزادی کی خاطر پوری تگ ودو کی گئی۔'' Emergence of Pakistan page76-edition 1976

## قائداعظمؒ کا نادرخراج عقیدت

اقوام متحدہ میں چوہدری سر ظفر اللہ خان اپنی خداداد تقریری فصاحت و بلاغت کے ذریعہ اقوام عالم کے سامنے نوزائدہ مملکت خداداد پاکستان کا مسئلہ لے جانے اور عالم اسلام خاص طور پر اہل فلسطین کے حق میں لاجواب وکالت وترجمانی میں مصروف تھے۔ کہ امریکہ میں پاکستانی سفیر کے سلسلہ میں چوہدری صاحب کو واپس (اقوام متحدہ کا سیشن بیچ میں چھوڑ کر) وطن بلایا جارہا ہے۔ چنانچہ سفیر اصفہانی صاحب نے قائداعظمؒ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔جس میں چوہدری ظفر اللہ خاں کی اقوام متحدہ میں سرگرمیوں کی اہمیت اور مصروفیات کا ذکر کیا۔اس خط کے جواب میں مورخہ 22راکتوبر 1947 کو قائداعظمؒ نے سفیر اصفہانی کو تحریر فرمایا۔

''جہاں تک ظفر اللہ کا تعلق ہے تو ہم نہیں چاہتے کہ جب تک وہاں پر (اقوام متحدہ) ان کا قیام ضروری ہے وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس آجائیں۔اور میرا خیال ہے کہ انہیں اس امر کی اطلاع بھی دی جاچکی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں قابل لوگ خاص طور پر ان جیسی اعلیٰ صلاحیت کے اشخاص کی بہت کمی ہے۔اس لئے جب بھی مختلف مسائل سے واسطہ پڑتا ہے تو ان کے حل کے لئے لامحالہ ہماری نظریں ان کی طرف اٹھتی ہیں۔ دستخط۔ ایم اے جناح''

(ترجمہ اقتباس از مکتوب قائداعظم ص166۔ایڈیشن 2001)

واقعی انہوں نے اپنا کام بہت عمدگی سے سرانجام دیا ہے۔چوہدری سر ظفر اللہ خاں رئیس الوفد

برائے اقوام متحدہ جب 1947ء کے آخر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد جب واپس پہنچے۔ جو ایم اے حسن اصفہانی کے مفصل مکتوب کے جواب میں 11 ردسمبر 1947ء کے مکتوب میں تحریر فرمایا:

''ظفر اللہ (نیو یارک) سے واپس پہنچ گئے ہیں اور میری ان سے طویل گفتگو ہوئی ہے۔ واقعی انہوں نے اپنا کام بہت عمدگی سے سرانجام دیا ہے''۔

(قائداعظم محمد علی جناح پیپرز جلد یکم اکتوبر تا 31 ردسمبر 1947)

## ایک کے بعد ایک اہم ذمہ داری

قائداعظم محمد علی جناح کی طرف سے چوہدری ظفر اللہ خاں کو باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے کیس کی وکالت اور پھر قیام پاکستان کے فوراً بعد اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کا ذکر ہو چکا ہے۔ متذکرہ بالا دونوں مواقع پر چوہدری سرظفر اللہ خاں کی قابلیت اور کامیابی کے خوب جوہر کھلے اور پھر دسمبر 1947ء میں قائداعظم نے چوہدری سرظفر اللہ خاں کو وطن عزیز کے وزیر خارجہ کا منصب سنبھالنے کا ارشاد فرمایا۔ گویا چوہدری صاحب کی لیاقت اور بے لوث خدمت پر قائداعظمؒ کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اور آپ انہیں ایک کے بعد ایک اہم تر اور وقیع تر ذمہ داری اور منصب سونپتے گئے۔ چوہدری سرظفر اللہ خاں مدیر ''آتش فشاں'' کے ساتھ انٹرویو میں بیان فرماتے ہیں۔

''قائداعظمؒ اور میرے درمیان نہ تو کبھی غلط فہمی پیدا ہوئی نہ اختلاف''۔

(انٹرویو مطبوعہ آتش فشاں مئی 1981)

## اچھا انتخاب

سابق سفیر اور سابق وزیر سید احمد سعید کرمانی بیان کرتے ہیں:

'' بانی پاکستان کے ساتھ مخلص اور معتمد ساتھی راہنماؤں، دانشوروں، وکلاء، صحافیوں اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے متعلق افراد کی شاندار ٹیم جمع ہو گئی تھی۔ قائد کو ان لوگوں کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کس آدمی سے کیا کام لینا ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان بھی قائد کا ایک اچھا انتخاب تھے۔''

(ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور اکتوبر 1999 ص 17 کالم نمبر 2)

## عمدہ رائے

قائداعظمؒ کے سابق اے ڈی سی (بعد میں پاک افواج کے سربراہ جنرل) گل حسن اپنے مشاہدہ کی بناء پر یہ گواہی دیتے ہیں۔'' قائداعظمؒ اپنی کابینہ کے وزراء میں سرمحمد ظفراللہ خان اور سردار عبدالرب نشتر کے متعلق بہت عمدہ رائے رکھتے تھے''۔

(از مضمون مطبوعہ نوائے وقت سنڈے میگزین مورخہ 5/جون 2005ء ص10 کالم نمبر 5)

## چوہدری سرظفراللہ خان کی قابلیت کا اعتراف

چوہدری صاحب کی قابلیت اور مہارت کو دیکھتے ہوئے قائداعظم نے آپ کو 25/دسمبر 1947ء کو پاکستان کا پہلا وزیرخارجہ بنایا۔سول اینڈ ملٹری گزٹ نے قائداعظم کے حوالے سے لکھا:

''یہ ایک کھلا راز ہے کہ ظفراللہ خاں نے اس عہدہ (وزارت خارجہ) کو قبول کرنے میں بڑی ہچکچاہٹ ظاہر کی۔قائداعظم کی پیشکش کے جواب میں آپ نے کہا کہ اگر آپ کو میری قابلیت اور دیانت پر پورا اعتماد ہے تو میں وزارت کے علاوہ کسی اور صورت میں پاکستان کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔اس پر قائداعظم نے یہ تاریخی جواب دیا۔

''آپ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مجھ سے ایسے جذبات کا اظہار کیا ہے۔مجھے پتہ ہے آپ عہدوں کے بھوکے نہیں ہیں''۔قائداعظم کا یہ جواب چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان کی قابلیت اور راستبازی کا ایک روشن ثبوت ہے۔''

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور 12/اگست 1952ء)

چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان کے متعلق قائداعظم اکثر فرمایا کرتے تھے:

''ظفراللہ کا دماغ خداوند کریم کا زبردست انعام ہے۔ظفراللہ پاکستان کے ایک گوہر نایاب ہیں۔'' (ہفت روزہ مسلم آواز کراچی 15/جون 1952ء)

## قائداعظمؒ کا اعتماد اُن پر آخری دم تک قائم رہا

اللہ تعالیٰ کے فضل سے چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ کے وہ خوش قسمت اور معتمد ساتھی تھے۔جن کو قائداعظمؒ کی جانب سے ہمیشہ خوشنودی اور اعتماد حاصل

رہا۔اس کا ایک بہت بڑا ثبوت قائداعظمؒ کے سیکرٹری مسٹر فرخ امین کے اس بیان میں ملتا ہے۔جو منظور حسین عباسی کی کتاب ''زندہ قائداعظمؒ'' کے ص34 پر مرقوم ہے:

''بیماری کے پورے زمانے میں قائداعظم نے اس وقت تک سرکاری کاموں کا سلسلہ جاری رکھا۔جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی تھی۔مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب انہوں نے یواین او میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان کو پورے اختیار دینے کے لئے آخری سرکاری کاغذ پر دستخط کئے۔''

(زندہ قائداعظمؒ ص34 شائع کردہ مکتبہ شاہکار، چوک اردو بازار لاہور)

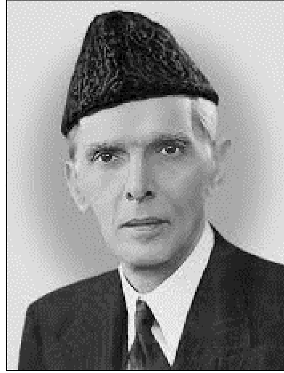
## روشنی اورعزم کے مینار

مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر جہاں اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ بفضل اللہ تعالیٰ چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان کو بانی پاکستان بابائے قوم قائداعظم محمدعلی جناحؒ تادم آخر اپنا معتمد ساتھی قرار دیتے رہے اور انہیں مملکت خداداد پاکستان کی عالمی سطح پر اعلیٰ سے اعلیٰ خدمات سونپتے رہے۔وہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قائداعظمؒ اوران کے متعدد جاں نثار و بےلوث ساتھی کسی طرح وطن عزیز کے لئے رات دن محنت اور استقلال و ایثار سے کام لیتے تھے۔تاکہ ملک وملت شروع کے نامساعد حالات کے باوجود سلامتی، خودداری، اور ترقی پر گامزن رہے۔بے شک یہ برگزیدہ اور جہاں دیدہ ہستیاں تھیں۔ایسی عظیم اورعزیز ہستیاں۔

جن کی یادوں سے رگ جاں میں دھن ہونے لگے
ذکر چھڑ جائے تو پتھر کا بھی دل رونے لگے



# حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کا تصور پاکستان



1۔ پاکستان کا طرز حکومت صرف جمہوری ہوگا۔
2۔ پاکستان میں نسل وعقیدے کا سوال نہیں۔
3۔ پاکستان میں ذات اور عقیدے کا مملکت کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔
4۔ الٰہی مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم۔
5۔ وطن عزیز کی سرزمین پر مساوات انسانی کے راصولوں کی پاسبانی کرنی ہوگی۔
6۔ جمہوریت کی بنیاد دو دینی اصول۔
7۔ حکومت ناانصافی اور جانبداری کی بنیادوں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔
8۔ اقلیتوں کے ساتھ انصاف۔
9۔ غیر مسلم ہمارے بھائی ہیں۔
10۔ پاکستان میں ذات پات کا خیال نہیں ہوگا۔
11۔ عدل ومساوات، نہ کوئی بنگالی ہے نہ پنجابی نہ سندھی نہ بلوچی۔

پاکستان کا طرز حکومت صرف جمہوری ہوگا۔ پاکستان کے مرکزی نظام کے بارے میں 21/ نومبر 1946ء کو رائٹر کے نمائندے مسٹر ڈان کیپل کے ساتھ قائداعظم نے فرمایا:۔''پاکستان کے مرکزی نظام اور اس کے نظام حکومت کا فیصلہ تو پاکستان کی مجلس دستور ساز کرے گی۔البتہ پاکستان کا طرز حکومت صرف جمہوری ہوگا۔اس کی پارلیمنٹ اس کی وزارت (جو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوگی) دونوں ہی عموماً رائے دہندگان عوام کے سامنے جوابدہ ہونگی جس میں کسی نسل، ذات یا فرقہ کی تفریق نہیں کی جائیگی اور عوام اپنی اپنی حکومت کی پالیسی اور پروگرام کے متعلق آخری فیصلہ کریں گے۔''

پاکستان میں نسل وعقیدے کا سوال نہیں۔اگر آپ لوگ باہمی تعاون سے کام کریں۔ماضی کو بھول جائیں اور گزشتہ صلوٰۃ پر عمل کریں تو یقیناً آپ کامیاب ہونگے۔اگر آپ مل جل کر اس جذبے کے تحت کام کریں کہ ہر شخص خواہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو ماضی میں آپ کے تعلقات ایک دوسرے سے کیسے ہی رہے ہوں۔اس کا رنگ، نسل، مذہب کچھ ہی ہو۔اولاً ثانیاً آخر اسی مملکت کا شہری ہے۔اس کے حقوق، مراعات اور ذمہ داریاں مساوی و یکساں ہیں۔تو ہم بے حد ترقی کر جائیں گے۔ہمیں اس جذبہ کے تحت کام شروع کر دینا چاہیئے۔پھر رفتہ رفتہ، اکثریت اور اقلیت کے مسلمان فرقہ کے تمام اختلاف مٹ جائیں گے۔

پاکستان میں ذات اور عقیدے کا مملکت کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔پاکستان مجلس دستور ساز کے افتتاحی اجلاس میں 11 راگست 1947ء کے صدارتی خطبہ میں قائداعظم نے فرمایا:

''اگر ہمیں پاکستان کی اس عظیم الشان ریاست کو خوشحال بنانا ہے تو ہمیں اپنی تمام تر توجہ لوگوں کی فلاح و بہبود کی جانب مبذول کرنا چاہیئے۔خصوصاً عوام اور غریب لوگوں کی جانب۔اگر آپ نے تعاون اور اشتراک کے جذبے سے کام کیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں اکثریت اور اقلیت، صوبہ پرستی اور فرقہ بندی اور دوسرے تعصّبات کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ہندوستان کے آزادی کے سلسلہ میں اصل رکاوٹ یہی تھی۔اگر یہ نہ ہوتیں تو ہم کبھی کے آزاد ہو گئے ہوتے۔

اگر یہ آلائشیں نہ ہوتیں تو چالیس کروڑ افراد کو کوئی زیادہ دیر تک غلام نہ رکھ سکتا تھا۔یورپ خود کو مہذب کہتا ہے لیکن وہاں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک خوب لڑتے ہیں۔وہاں کی ریاستوں میں آج بھی افتراق موجود ہے۔مگر ہماری ریاست کسی تمیز کے بغیر قائم ہو رہی ہے۔یہاں ایک فرقے یا دوسرے فرقہ میں کوئی تمیز نہ ہوگی۔ہم اس بنیادی اصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم ایک ریاست کے باشندے اور مساوی باشندے ہیں۔آپ آزاد ہیں اس لئے آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں، آپ آزاد ہیں کہ اپنی مسجدوں میں جائیں یا پاکستان کی حدود میں اپنی کسی عبادت گاہ میں جائیں۔آپ کا تعلق کسی مذہب، کسی عقیدے یا کسی ذات سے ہو اس کا مملکت کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ بات بطور نصب العین اپنے سامنے رکھنی

چاہیئے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہ رہے گا اور مسلمان مسلمان نہ رہے گا۔ مذہبی مفہوم میں نہیں کیونکہ یہ ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی مفہوم میں اس مملکت کے ایک شہری کی حیثیت سے۔ الٰہی مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم۔ قائداعظم سے اگست 1941 میں دکن میں طلباء نے سوال کیا کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں۔ تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے خود اس امر کا انکشاف کیا اور فرمایا ''جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم اور تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملاّ۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کیا ہے اپنے طور پر کوشش کی ہے ۔اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآن کریم کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

(حیات قائداعظم ص427 مصنفہ چوہدری سردار محمد جان عزیز احسن برادرز لاہور)

وطن عزیز کی سرزمین پر مساوات انسانی کے راصولوں کی پاسبانی کرنی ہوگی۔ ہم نے پاکستان کی جنگ آزادی جیت لی ہے۔ مگر اسے برقرار رکھنے اور مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی سنگین ترین جنگ ابھی جاری ہے۔ اور اگر ہمیں ایک بڑی قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ فطرت کا اٹل اور سفاک قانون ہے۔ بقائے اصل ہمیں خود کو اس نئی آزادی کا اہل ثابت کرنا ہے۔ فاشیت کے خطرات سے دنیا کو بچانے اور اسے جمہوریت کے لئے محفوظ بنانے کی خاطر کرہ ارض کے دور دراز حصوں میں جا کر آپ نے میدان جنگ میں داد شجاعت حاصل کی ہے۔ مگر اب آپ کو اپنے ہی وطن عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت، اسلامی

معاشرتی عدل اور مساوات انسانی کے اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے۔آپ کوان کے لئے ہر وقت تیار رہنا ہوگا۔ ہمہ تن ہوشیار، ستانے کا موقع ابھی نہیں آیا ہے۔یقین محکم،ضبط ونظم اورادائیگی فرض کی دُھن ایسے اصول ہیں اگر آپ ان پر کار بندرہے تو کوئی شے ایسی نہیں جسے آپ حاصل نہ کر سکیں (قائداعظم کا افواج پاکستان سے خطاب مورخہ 21/فروری1948ءازخطبات قائداعظم ص 583،582 تدوین وتہذیب رئیس احمد جعفری مقبول اکیڈمی ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور)

جمہوریت کی بنیاد و دینی اصول۔میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اُسوہ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں عطا کرنے والے پیغمبرؐ اسلام نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ہمیں چاہیئے کہ جمہوریت کی بنیاد صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔

(قائداعظم کی شاہی دربار سبی بلوچستان میں تقریر 14فروری1948ء)

مساوات اور رواداری ہمارے مذہب کی بنیاد ہیں۔جب آپ کہتے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد عمرانی عدل اوراسلامی سوشلزم کے اصولوں پر رکھی جائے۔تو بنی نوع انسان کی اخوت اور مساوات پر زبردست زور دیتے ہیں۔تو آپ محض میرے اور لاکھوں مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہیں اوراسی طرح جب آپ ہر شخص کے لئے مساوی مواقع مانگتے ہیں تب بھی آپ میرے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ترقی کے ان مقاصد کے متعلق پاکستان میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔کیونکہ ہم نے پاکستان اس لئے طلب کیا تھا۔اس کی خاطر جدوجہد کی تھی۔اوراس لئے حاصل کیا تھا۔کہ ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کوحل کرنے میں جسمانی اور روحانی طور پر قطعاً آزاد ہوں۔ اخوت، مساوات اور رواداری یہ ہے ہمارے مذہب،تہذیب اور تمدن کے اساسی نقطے۔ہم نے پاکستان کے لئے اس لئے جنگ کی تھی کہ براعظم میں ہمیں ان حقوق سے محروم کردیئے جانے کا خدشہ تھا۔

(قائداعظم کا چاٹگام میں خطاب 26/مارچ1948ء ازخطبات قائداعظم ص590 تدوین وتہذیب،رئیس احمد جعفری مقبول اکیڈمی ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور)

حکومت ناانصافی اور جانبداری کی بنیادوں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔اقلیتیں جہاں بھی ہوں ان کا انتظام کیا جائے گا۔میں نے ہمیشہ یقین کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا ایقان غلط نہیں۔کوئی حکومت اور کوئی مملکت اپنی اقلیتوں کو اعتماد اور تحفظ کا یقین دلائے بغیر کوئی حکومت اور کوئی مملکت اپنی اقلیتوں کو اعتماد اور تحفظ کا یقین دلائے بغیر کامیابی کے ساتھ ایک قدم بھی اٹھا نہیں سکتی۔حکومت ناانصافی اور جانبداری کی بنیادوں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔اقلیت کے ساتھ ظلم وتشدد اس کی بقا کا ضامن نہیں ہو سکتا۔اقلیتوں میں انصاف وآزادی،امن ومساوات کا حساس پیدا کرنا ہر انتخابی حکومت کی بہترین آزمائش ہے۔اس خلوص میں ہم دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔مجھے یقین ہے کہ جب وقت آئے گا تو ہمارے ملکی خطوں کی اقلیتوں کو ہماری روایات،ثقافت اور اسلامی تعلیم سے نہ صرف انصاف،صداقت ملے گی بلکہ انہیں ہماری کریم النفسی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ہم مول تول نہیں کرتے۔ہم لین دین کے عادی نہیں۔ہم صرف عمل پر یقین رکھتے ہیں اور صرف تدبر اور عملی سیاست پر یقین رکھتے ہیں۔

(از خطبات قائداعظم ص135 رئیس احمد جعفری مقبول اکیڈمی ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور)

## اقلیتوں کے ساتھ انصاف

پھر یہ کہوں گا کہ ہم نے جو اس سلسلے میں جو پالیسی طے کی ہے۔اس پر پوری طرح کاربند رہیں گے۔پاکستان میں جو اقلیتیں ہیں ان کی جان و مال کی حفاظت کرتے رہیں گے۔اور ان کے ساتھ انصاف کریں گے۔ہم نہیں چاہتے کہ وہ پاکستان سے چلے جانے پر مجبور کر دیئے جائیں جب تک یہ لوگ حکومت کے وفادار اور وفاکیش رہیں گے ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے گا جیسا کہ پاکستان کے اور شہریوں کے ساتھ۔کیونکہ حکومت کی اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری،عمال حکومت پر عائد ہوتی ہے۔اسلئے یہ دیکھنا ان کا فرض ہے کہ اس پر کما حقہ عمل ہورہا ہے یا نہیں تاکہ یہ الزام نہ آئے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔آپ لوگ ہی عوام اور حکومت کی نیک نیتی کا یقین دلا سکتے ہیں مجھے کامل یقین ہے کہ عمال حکومت ہمیں اس سلسلہ میں مایوس نہ کریں گے۔

(قائداعظم کا افسران حکومت سے خطاب 11/اکتوبر 1947ءاز خطبات قائداعظم ص572 رئیس احمد جعفری مقبول اکیڈمی ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور)

## غیرمسلم ہمارے بھائی ہیں

2/نومبر 1941 کوقائداعظم نے انجمن اتحاد طلباء جامعہ اسلامیہ علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیئے کہ اچھوت چھات کا مذہب میں کوئی کام نہیں۔ ہمارے ہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ اسلام انصاف، مساوات، معقولیت اور رواداری کا حامل ہے بلکہ جو غیر مسلم ہماری حفاظت میں آجائیں ان کے ساتھ فیاضی کو بھی روا رکھتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے بھائی ہیں اور اس ریاست میں وہ شہریوں کی طرح رہیں گے۔

(جناح کی تقریر ص191،190عثمانی صحرائی ادارہ اشاعت حیدرآباد دکن طبع اول1945)

## پاکستان میں ذات پات کا خیال نہیں ہوگا

پاکستان میں ایک ایسی حکومت ہوگی۔جس میں سب قوموں کی زندگی کی تمام آسائشوں کا حصہ ملے گا۔اس لئے اب تمام مسائل کا حل کر لیجئے پاکستان ایک ایسی حکومت ہوگی جہاں ذات پات کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔آخر مجھے کسی فرقہ کے خلاف جو اپنے افراد کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لئے کوشاں ہیں کیوں شکایت ہونی چاہیئے۔ ایسی کوشش کریں گے۔ اتنی ہی جلدی آپ موجودہ مسائل کا حل تلاش کر لیں گے۔

(قائداعظم کا میمن چیمبر آف کامرس بمبئی کے ایک اجتماع سے خطاب 28/مارچ 1947ءاز خطبات قائداعظم ص519)

## عدل ومساوات

قیام پاکستان جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے جدوجہد کر رہے تھے۔خدا کا شکر ہے کہ آج ایک مسلمہ حقیقت ہے اپنے لئے ایک مملکت قائم کرنا ہی ہمارا مقصود نہیں تھا۔ یہ ذریعہ تھا حصول مقصد کا۔خیال یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہونگے جہاں ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں جہاں اسلام کے عدل ومساوات کے اصولوں کو آزادی سے برسر عام آنے کا

موقع حاصل ہو۔

(قائداعظم کا افسران حکومت سے خطاب 11 اکتوبر 1947ء از خطبات قائداعظم ص50)

## نہ کوئی بنگالی ہے نہ پنجابی نہ سندھی نہ بلوچی

میں صاف طریق پر آپ کو ان خطرات سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں جو پاکستان کے قیام کو روکنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اپنی شکست سے پریشان ہو کر پاکستان کے دشمن اب مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر اس مملکت میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کوششوں نے اب صوبہ پرستی کو ہوا دینے کی صورت اختیار کی ہے۔ جب تک آپ اپنی ملکی سیاست سے اس زہر کو نکال کر نہیں پھینک دیں گے اس وقت تک آپ خود ایک حقیقی قوم نہیں ڈھال سکتے اور نہ ایسا جوش اور ولولہ پیدا کر سکتے ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ بنگالی، سندھی، بلوچی، پٹھان وغیرہ کی باتیں نہ کریں۔ آپ سب ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ (خطبات قائداعظم ص662۔663)



### کیوی KIWI

کیوی KIWI ایک پرندہ جو اُڑ نہیں سکتا اور نیوزی لینڈ کے مرطوب جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ جسم ۱۹ سے ۳۰ انچ تک لمبا اور رنگ گہرا بھورا ہوتا ہے۔ دو انچ لمبے بازو بالوں بالوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ پنجے میں چار انگلیاں ہوتی ہیں۔ یہ پرندہ اُڑ نہیں سکتا۔ لیکن حیرت انگیز تیز رفتاری سے دوڑ سکتا ہے۔ عموماً رات کو نکلتا ہے۔ کیڑے مکوڑے اس کی خوراک ہیں۔ چھ انچ لمبی اور قدرے خمیدہ چونچ کے سرے پر نتھنے ہوتے ہیں۔ جن کی مدد سے، غالباً، خوراک تلاش کرتا ہے۔ درختوں کی کھوکھلی جڑوں یا دریا کے کنارے ریت میں پتے اور گھاس پھونس بچھا کر گھونسلا بناتا ہے۔ مادہ ایک یا دو انڈے دیتی ہے۔ نیوزی لینڈ میں اس پرندے کو انتہائی مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تصاویر نیوزی لینڈ کے سکّوں، کرنسی نوٹوں، ڈاک کی ٹکٹوں حتیٰ کہ کپڑوں پر بھی نظر آئیں گی۔ لطف کی بات یہ ہے نیوزی لینڈ کے سپاہیوں کے پہلے حصے کا نام بھی کیوی KIWI رکھا جاتا ہے۔ اور اگر آپ کو وہاں کسی سپاہی کا نام معلوم نہ ہو تو آپ اسے مسٹر کیوی KIWI کہہ سکتے ہیں۔

# محترمہ رتی جناح اہلیہ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ



حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی شرافت اور فہم وفراست کی بنا پر انگریز افسران کے علاوہ ہندو اور پارسی بھی ان کی عزت و احترام کرتے تھے۔ پارسیوں میں ایک شخص سر ڈنشا پٹیٹ جو بمبئی کے رئیس تھے۔ وہ قائداعظم سے خاصی قربت رکھتے ہوئے اپنے گھر کھانے پر بلا لیتے۔ یہاں تک کہ آپ جب دار جیلنگ سیر و تفریح کے لئے جاتے تو اپنے ہمراہ قائداعظم کو بھی لے جاتے۔ قائداعظم کو اس خاندان سے خاصی قربت حاصل ہوگئی۔ سر ڈنشا پٹیٹ کی اکلوتی بیٹی قائداعظم کی تقاریر سننے کے لئے اپنی خالہ کے ہمراہ چلی جاتی۔ گھر پر بھی قائداعظم کی گفتگو اور سحر انگیز باتیں سنتی۔ قائداعظم نے جب عورتوں کے حقوق کے لئے تگ ودو کی تو سر ڈنشا پٹیٹ کی بیٹی رتی نے قائداعظم کی پُر وقار شخصیت، لطیف گفتگو اور اعلیٰ قانون دان سے شادی کا ذکر اپنے والدین سے کیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی قائداعظم سے کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن قائداعظم کو اصرار تھا کہ رتی پہلے مسلمان ہو۔ رتی نے اس شرط کو قبول کرتے ہوئے 18 / دسمبر 1918 کو جامع مسجد بمبئی میں اسلام قبول کیا۔

ایک روایت کے مطابق امیر احمد خان راجہ صاحب محمود آباد بھی ولی کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ 19 / اپریل 1918ء کو جامع مسجد بمبئی میں نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی خبر ہندوستان کے مشہور اخبار ''The Statesman'' میں چھپی کہ سر پٹیٹ کی اکلوتی بیٹی رتی بائی نے اسلام قبول کرلیا اور آج ان کا نکاح آنریبل ایم اے جناح سے ہے۔ رتی جناح کو ہندوستان کے لوگ بمبئی کا گلاب کہہ کر پکارتے تھے۔ قائداعظم بھی انہیں کبھی ڈولی کہہ کر پکارتے۔ رتی صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ ایک گھریلو خاتون بھی تھی۔ ہندوستان سے آتی مرتبہ اپنی کتابیں اور عظیم

آرٹ اورنوادرات خرید کرقائداعظم والے گھر کی زینت بنائے۔رتی جناح میں انسانی ہمدردی بھی خوب تھی۔ایک دفعہ یونیورسٹی کے سامنے پھل بیچنے والی عورت کو پولیس نے بُرا بھلا کہا تو رتی نے پولیس والے کی سرزنش کی اور اپنی جیب سے پانچ روپے دیئے۔اس وقت پانچ روپے کی بہت اہمیت تھی۔قائداعظم تو حاضر دماغ تھے ہی رتی جناح نے بھی کئی بار حاضر دماغی سے کام لیا۔یعنی اے اے رؤف نے اپنی کتاب ''میٹ مسٹر جناح'' میں لکھا ہے۔

لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے مسٹر جناح سے گہرے مراسم تھے۔انہوں نے سر کے خطاب کی پیشکش کی لیکن قائداعظم نے کہا مجھے صرف محمد علی جناح کہا جائے۔اس طرح رتی جناح سے کہا اگر آپ کولیڈی جناح کہا جائے تو رتی جناح نے کہا کہ اگر جناح سر کا خطاب قبول کرتے ہیں تو میں فوراً الگ ہو جاؤں گی۔مئی 1919ء میں قائداعظم اہلیہ کے ہمراہ انگلستان گئے۔وہاں اس حسین جوڑے کو اللہ تعالیٰ نے ایک خوبصورت بچی سے نوازا۔جس کا نام دینا جناح رکھا گیا۔1922ء میں رتی جناح بیمار رہنے لگیں۔تو جنوری 1928ء میں قائداعظم اور رتی جناح دہلی سے بمبئی واپس آگئے۔پھر دوبارہ 3/اپریل 1928ء کو قائداعظم انگلستان چلے گئے۔ہفتہ بعد رتی جناح بھی چلی آئیں۔مگر علالت کے باعث پیرس کے نرسنگ ہوم میں داخل ہونا پڑا۔وہاں 106 درجہ بخار میں بے چین تھیں۔لیکن بقول قائدؒ کے دوست دیوان چمن لال کے ان کے ہاتھ میں آسکر وائلڈ کی نظموں والی کتاب تھی۔اس نے مجھ سے اس کتاب میں سے ''کسی کا گھر'' والی نظم سننے کی فرمائش کی۔قائداعظم قانونی معاملات اور ملک کی سیاسی پیچیدہ صورت حال کو درست کرنے میں مصروف رہنے کی وجہ سے رتی جناح پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔رتی قائد کی ان اُلجھنوں کو نہ سمجھ سکیں۔لہٰذا میاں بیوی میں دوری پیدا ہوتی گئی حالات کشیدہ ہونے کے باوجود بھی قائداعظم رتی کی بیماری میں ان کے پاس رہے۔وہی کھاتے جو رتی جناح کھاتیں۔کچھ دنوں کے لئے قائداعظم دہلی گئے ہوئے تھے کہ رتی بھی بمبئی میں اپنے بھائی کے پاس آگئیں۔20/فروری 1929ء کو اپنی سالگرہ والے دن ہی وفات پا گئیں۔قائداعظم فوراً بمبئی پہنچے۔ہر شخص سوگوار تھا۔لیکن قائداعظم اپنی اہلیہ

کے لئے بہت روئے۔ان اشکبار آنکھوں کو تمام ہجوم نے دیکھا۔قائداعظم نے رتی جناح کی اسلامی رسومات کے ساتھ تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ ادا کروائی۔

قائداعظم افسردگی کی حالت میں رتی کی قبر پر پھول چڑھانے جاتے۔رتی جناح نے جن اشیاء سے گھر کی سجاوٹ کر رکھی تھی۔ان تمام اشیاء کو بکسوں میں بند کروا کر محفوظ کر لیا۔رتی جناح کی وفات نے قائداعظم کو بہت افسردہ رکھا۔لیکن قائداعظم بڑے استقلال سے اس عظیم مشن کی تکمیل کے لئے مصروف رہے اور بالآخر پاکستان کا حصول ممکن بنا دیا اور امر ہو گئے۔اس طرح ان کا نام تا ابد تک زندہ و پائندہ رہے گا۔جس شخص نے اپنے اس عظیم مقصد کی راہ میں کسی بھی چٹان کو حائل نہ ہونے دیا۔اب اس کی قوم نہ جانے اپنے قائداعظم کے افکار کو بھول چکی ہے۔



## دُنیا کی چند بڑی مساجد میں نمازیوں کی گنجائش

١۔خانہ کعبہ۔مکہ۔ ایک لاکھ پچاس ہزار افراد

٢۔مسجد نبوی۔مدینہ۔ سات لاکھ اٹھانوے ہزار افراد

٣۔مسجد المکہ۔ملائشیا۔ پانچ لاکھ اڑتیس ہزار افراد۔

٤۔مسجد صدیق اکبر۔فرانس۔ چار لاکھ پچانوے ہزار افراد۔

٥۔جامعہ عمر فاروق۔یو ایس اے۔چار لاکھ پچاس ہزاا فرادر۔

٦۔اسلامک ریسرچ سنٹر یو کے۔چار لاکھ تیس ہزار افراد۔

٧۔تاریخی مسجد۔انڈیا۔چار لاکھ افراد۔شاہ فہد مسجد۔سعودی عرب۔تین لاکھ ستر ہزار۔

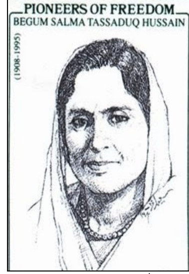
٨۔شاہ فیصل مسجد اسلام آبادد۔۔دو لاکھ پچانوے ہزار افراد۔

٩۔جامعہ مسجد عثمانی۔۔ دو لاکھ تہتر ہزاا فرادر۔

١٠۔مسجد اقصیٰ ربوہ پاکستان۔ ایک لاکھ افراد۔

١١۔مسجد بیت الفتوح۔لندن۔ دس ہزار افراد مسقّف حصے میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

# تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار



بیگم سلمٰی تصدیق حسین


بیگم رعنا لیاقت علی خان

خواتین کسی بھی معاشرے کا مؤثر اور حساس طبقہ ہوا کرتی ہیں اور معاشرے کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ قوموں کی ترقی اور زوال میں عورتوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں بڑے بڑے انقلابات برپا کرنے والی اگر خواتین نہیں ہیں تو ان راہنماؤں اور تاریخ کے دھارے بدلنے والی شخصیات کو عورت نے ہی جنم دیا۔ ان راہنماؤں کی اولین درسگاہ ماں کی گود ہی تھی۔ جہاں وہ پروان چڑھ کر انقلاب انگیز اور تاریخ ساز شخصیات کہلائے۔ برصغیر کے خطے میں اسلام کی آمد سے قبل عورت انتہائی پسماندگی میں زندگی بسر کر رہی تھی لیکن نور کی شمع نے اُجالا کر دیا اور یہاں کی مسلم خواتین نے اسلامی معاشرے کی کردار سازی میں مردوں کے شانہ بشانہ کردار ادا کیا۔ مسلم دور شہنشاہیت میں مسلم بادشاہوں کی خواتین نے کئی لحاظ سے امورِ مملکت میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ چاند بی بی تو تخت نشین بھی ہو گئی۔ انگریزوں اور سامراجی قوتوں کے تسلط کے بعد جب اس علاقے میں آزادی کی لہر آئی۔ تو کئی تحریکات شروع ہوئیں۔ اور اس میں مسلم خواتین بھی شعور بیدار کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔ اور اپنے خاوندوں، بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ تحریک جدو جہد آزادی میں شریک ہوئیں۔ تحریک خلافت کا آغاز ہوا تو مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی دوسرے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ اس تحریک کے روح و رواں تھے۔ علی برادران کی والدہ جو تاریخ میں بی اماں کے نام سے تاریخ ہندوستان میں معروف ہیں۔ وہ


امجدی بیگم


جہاں آرا بیگم


لیڈی نصرت ہارون

تحریک خلافت کے وقت خود گھر سے نکلیں اور اپنے بیٹوں کے ساتھ اس تحریک کی قیادت کی۔ مسلم لیگ کا قیام ہندوستان میں تحریک آزادی کے لئے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔اور اس جماعت کے جھنڈے تلے مسلمانان برصغیر مجتمع ہوئے۔اور بالآخر ثمر آور کوششوں کے بعد پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔مسلم لیگ جب ہندوستان میں اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ خواتین کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ جب تحریک آزادی اپنے فیصلہ کن موڑ کی جانب گامزن ہوئی تو 1935ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کی گئی۔ایسے میں مسلم لیگ خواتین کی تنظیم کا قیام بھی عمل میں آیا۔اور خواتین باقاعدہ ایک پلیٹ فارم کے تحت آ کر اس تحریک میں شامل ہو گئیں۔اور مسلم طالبات نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی تا کہ سکولوں اور کالجوں کی سطح پر پڑھی لکھی عوام میں آزادی کا شعور پیدا کیا جا سکے۔فروری 1939ء میں لاہور میں مسلم خواتین کمیٹی کا اجلاس ہوا۔اور پھر اس کی تنظیم سازی اور کام کو پورے صوبے میں شہر شہر پھیلا دیا گیا۔اور گاؤں گاؤں قریہ قریہ اور شہر شہر مسلم لیگ خواتین ونگ کا قیام عمل میں آ گیا۔

شمیم جالندھری نے جالندھر سے رسالہ ''الزھراء'' نکالا۔اور اس رسالے نے خواتین میں سماجی اور سیاسی شعور بیدار کیا۔تحریک آزادی کے اس سفر میں اگرچہ گاؤں گاؤں کی خواتین نے حصہ لیا۔ اور اپنے لئے ایک وطن کا حصول ممکن بنایا لیکن بعض ایسی خواتین بھی ہیں اور انہوں نے تحریر،تقریر اور عملی جدوجہد سے اپنی منزل کو اور بھی قریب کر لیا اور خواتین کی قیادت کی۔ مادر ملت فاطمہ جناح۔ یہ وہ نام ہے جسے کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ کی ہمشیرہ نیک اختر نے اپنے آپ کو تحریک پاکستان کے لئے ہمہ تن وقف کر دیا۔اور اپنے عظیم بھائی کی معاون اور خادمہ بن کر ان کے شانہ بشانہ تحریک آزادی کی قیادت کی اور مادر ملت کا خطاب پایا۔خواتین میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں ان کی خدمات تاریخ پاکستان کا سنہری باب ہے۔بیگم شائستہ اکرام اللہ۔ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں آپ Ph.D تھیں صرف سیاسی راہنما نہیں بلکہ ادیبہ اور مصنفہ بھی تھیں۔1945ء میں مسلم لیگ کی طرف سے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا۔اور خواتین کی قیادت کی۔آپ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔حسین شہید سہروردی وزیراعظم

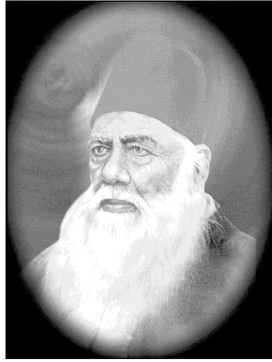
پاکستان آپ کے بھائی تھے۔آپ نے کراچی میں خواتین مسلم لیگ تنظیم سازی کے لئے نمایاں خدمات کی توفیق پائی۔بیگم جہاں آراء شاہنواز۔تحریک آزادی کی ایک عظیم مجاہدہ تھیں۔آپ محمد شفیع کی صاحبزادی تھیں۔گول میز کانفرنس میں اپنے والد کی سیکرٹری کی حیثیت سے شمولیت کی۔ متحدہ ہندوستان کی بین الاقوامی سطح پر نمائندگی کی۔تحریک آزادی میں بھرپور انداز میں حصہ لیا اور اس دوران قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔پنجاب مسلم لیگ کے لئے ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سفارتکاری کا اعزاز بھی حاصل کیا۔بیگم رعنا لیاقت علی خان۔اپنے خاوند قائد ملت لیاقت علی خان کے ساتھ مل کر تحریک پاکستان میں حصہ لیا پاکستان بننے کے بعد سفیر اور گورنر سندھ بھی رہیں۔بیگم سلمیٰ تصدق حسین۔تحریک آزادی پاکستان کے لئے غیر معمولی خدمات سرانجام دیں اور خواتین کی قیادت اور ان کی سیاسی راہنمائی میں اہم کردار ادا کرتی رہیں۔

**بیگم قاضی عیسیٰ**۔انہوں نے سندھ اور بلوچستان میں مسلم لیگ خواتین کی تنظیم سازی اور ان کی سیاسی قیادت کے لئے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

**محترمہ عفیفہ ممدوٹ**۔آپ نواب ممدوٹ کی بہن تھیں اور تحریک پاکستان کی سپہ سالاروں میں شامل تھیں۔ان کے علاوہ بہت سے قدآور اسماء ہیں جنہوں نے مسلم لیگ اور خواتین کی تنظیم سازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان میں ایک خاتون بیگم شفیع آف دہلی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔یہ صحافی خاتون تھیں۔طالبات کی لیڈر تھیں اور اپنا رسالہ اور اخبار نکالتی تھیں۔قائداعظم نے ان کے کام کو سراہا۔ان کے علاوہ سرحد میں بیگم کلثوم سیف اللہ، بیگم اصفہانی جن کا سارا خاندان ہی مسلم لیگی راہنما تھا بھی اس صف میں شامل ہیں۔جنہوں نے پاکستان کی قیادت کی۔آج بھی اگر ہماری قوم کی سب خواتین اپنے منصب اور مقام کو سمجھ لیں اور اپنے بچوں کی حقیقی تربیت کریں انتہا پسندی کی بجائے اخوت، محبت، حقوق انسانی، توقیر انسانی اور احترام آدمیت کا درس دیں۔جہاں اخروی زندگی میں جنت کی کلید ہوں گی۔وہاں ہمارے معاشرے کی کایا پلٹ سکتی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ماں کی گود ایسی درسگاہ بن جائے جہاں پرورش پانے والا جنت کا وارث ہو اور ہمارا معاشرہ جنت نظیر بن جائے۔



# معمارِ قوم سرسید احمد خان



آپ نے برصغیر کے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے عربی اور فارسی کے علاوہ حساب، طب اور تاریخ میں بھی عبور حاصل کیا۔

پیدائشی نام: سید احمد خان

ولادت: 1817ء۔ وفات: 27 مارچ 1898ء

معروف تصانیف: آثار الصنادید۔ خطبات احمدیہ، الکلام۔ سفرنامہ لندن۔ تاریخ بجنور۔ اسباب بغاوت ہند۔

سرسید احمد خان برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار پیدا کیا۔ سرسید احمد خاں انیس صدی کے بہت بڑے راہنما تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بہت بڑے جمود سے نکالنے اور انہیں بہت بڑی قوم بنانے کے کے لئے سخت جدوجہد کی۔ آپ ایک زبردست مفکر، بلند خیال مصنف اور جلیل القدر راہنما تھے۔ ''سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ وہ توپوں سے اُڑائے جاتے تھے۔ سولی پر لٹکائے جاتے تھے۔ کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ ان کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی تھی۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں تھیں۔ نوکریوں کے دروازے ان پر بند تھے۔ اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح احوال کی اگر جلد کوشش نہ کی گئی تو مسلمان '' سائیس، خانساماں، خدمتگار، اور گھاس کھودنے والوں کے سوا اور کچھ نہ رہیں گے''۔ سرسید احمد خاں نے محسوس کرلیا تھا۔ کہ اونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بگھارتے رہیں گے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے اس وقت تک وہ بدستور پستی میں رہیں گے۔ انہیں کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی

ان ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جدو جہد کرتے رہے۔ابتدائی زندگی۔سرسید احمد خان 17/اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔آبا ؤ اجداد شاہجہاں کے دور میں ہرات سے ہندوستان آئے۔دستور زمانہ کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمد خان سے حاصل کی۔ابتدائی تعلیم میں آپ نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا۔اور عربی فارسی ادب کا مطالعہ بھی کیا۔اس کے علاوہ آپ نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ سے عدالتی کام سیکھا۔ 1837ء میں آگرہ کے کمشنر کے دفتر میں بطور نائب منشی فرائض سنبھالے۔ 1841ء اور 1842ء مین پوری اور 1842ء اور 1846ء تک فتح پور سیکرٹری میں سرکاری خدمات انجام دیں۔محنت اور ایمانداری سے ترقی کرتے ہوئے 1846ء میں صدر امین مقرر ہوئے۔دہلی میں قیام کے دوران آپ نے اپنی مشہور کتاب آثارالصنادید، 1847ء میں لکھی۔ 1845ء میں آپ کا تبادلہ ضلع بجنور ہو گیا۔ضلع بجنور میں قیام کے دوران اپنی کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' لکھی۔جنگ آزادی کے دوران آپ بجنور میں قیام پذیر تھے۔اس کٹھن وقت میں آپ نے بہت سے انگریز مردوں اور عورتوں، بچوں کی جانیں بچائیں۔آپ نے یہ کام انسانی ہمدردی کے لئے کیا۔جنگ آزادی کے بعد آپ کو آپ کی خدمات کے عوض انعام دینے کے لئے ایک جاگیر کی پیشکش ہوئی۔ جسے آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

1857ء میں آپ کو ترقی دے کر صدرالصدور بنا دیا گیا اور آپ کی تعیناتی مرادآباد کر دی گئی۔ 1862ء میں آپ کا تبادلہ غازی پور ہو گیا اور 1867ء میں آپ بنارس میں تعینات ہوئے۔ 1877ء میں آپ کو امپیریل کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔1888ء آپ کو سر کا خطاب دیا گیا۔ اور 1889ء میں انگلستان کی یونیورسٹی آف ایڈنبرا نے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔1862ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔علی گڑھ گئے تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا۔انگلستان سے واپسی پر 1870ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔جس میں مضامین سرسید نے مسلمان ہند کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور ادب میں علی گڑھ تحریک کی بنیاد پڑی۔

سرسید کا عظیم کارنامہ علی گڑھ کالج ہے۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو مغربی علوم کی تعلیم کی ترویج کے لئے ایک انتھک اور مسلسل جدوجہد کر کے اپنی قوم کو باشعور قوم بننے میں مدد دی۔ جبکہ اس وقت کے علمائے ہند اسے کفر کے فتاویٰ سے، اور کافر وزندیق، نیچری کے القابات سے نواز رہے تھے۔ نیز زبان انگریزی کو پڑھنا حرام قرار دے رہے تھے۔ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا کسی بھی زبان میں خصوصاً انگریزی میں کفر گردانا جاتا تھا۔ جس طرح ایک زمانے میں عیسائیت زمین کو گول ماننے سے انکاری تھی۔ اسی طرح اس وقت ہندوستان کے بڑے بڑے جبہ پوش (جاہل) علماء نے عجیب وغریب (اپنی ناقص علمی استعداد کے مطابق حقائق کو نہ سمجھتے ہوئے) سرسید احمد خان پر فتوے لگائے۔ مگر یہ سب فتاویٰ سرسید احمد خان کے پایہ استقلال میں ذرہ بھر بھی لغزش نہ لا سکے۔ سرسید احمد خان قوم کی جہالت اور کم علمی پر ماتم کناں تھے۔ اور قوم کی نادانی سے نالاں ہو کر ہی انہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی تاکہ ان کی قوم جدید مغربی علوم پڑھ کر اعلیٰ قوم بن سکے۔ جیسا کہ آج کا مسلمان سرسید احمد خان کے 150 سال قبل سوچ کو اب سمجھ گیا ہے۔

1887ء میں ستر سال کی عمر میں پنشن لے لی اور اپنے کالج کی ترقی اور ملکی مفاد کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ 1859ء میں وہ اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ انگلستان آئے۔ تو یہاں انہیں دو مشہور رسالوں TATLER اور SPECTATOR کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ دونوں رسالے اخلاق اور مزاح کے خوبصورت امتزاج سے اصلاح معاشرہ کے علمبردار تھے۔ آپ نے مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ آپ نے 81 سال کی عمر میں 27/ مارچ 1898ء میں وفات پائی۔ اور اپنے محبوب کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔ سرسید کی تمام عمر قوم وادب کی خدمت میں گزری۔

## تہذیب الاخلاق کا اجراء

1857ء کی جنگ کی ناکامی کے بعد مسلمانان برصغیر کی سیاسی، عمل، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے سرسید احمد خاں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے انہیں مسلمانان برصغیر کبھی نہیں بھلا سکتے۔ انہیں کارہائے نمایاں میں سے ایک ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء تھا 1858ء میں سرسید احمد

خاں انگلستان آئے اور یہاں سے واپس جا کر ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔بقول مولانا حالی سرسید نے اس پرچے کونکالنے کا ارادہ انگلستان میں ہی کرلیا تھا۔کیونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جولوح چھپتی تھی اس کا ٹائپ وہ لندن سے ہی بنوا کر لائے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ وہ ''تہذیب الاخلاق'' کی لوح ہی نہیں اس کے متن کا تصور بھی انگلستان سے ہی لائے تھے۔غالباً انہیں کسی انگریز دوست نے رچرڈ اسٹیل اور جوزف ایڈیسن کے علمی اور ادبی اخبارات The Tatler اور The Spectator کے ان کارہائے نمایاں سے آشنا کیا۔جوانہوں نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کی عادات،رسوم و رواج اور قومی خیالات کو بدلنے میں سرانجام دیئے۔تہذیب الاخلاق نے انہی خطوط پر عمل کرتے ہوئے ہی خدمات انجام دیں تھیں۔تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ یکم شوال 24/دسمبر 1870ء کوشائع ہوا۔اس کے دونام تھے۔

## اردو میں تہذیب الاخلاق اور انگریزی میں دی محمڈن ریفامر

تاہم یہ اخبار مکمل طور پر اردو ہی میں ہوتا تھا۔اخبار 8 یا 12 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ہر صفحے پر دوکالم ہوتے تھے اور پورا اخبار نسخ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے موٹے کاغذ پر چھپتا تھا۔اس اخبار کے اجراء کا مقصد مسلمانان ہند کو جدید تہذیب اور برکتوں سے روشناس کروانا تھا تا کہ وہ ایک تہذیب یافتہ اور ترقی پسند قوم بن سکیں۔بالفاظ دیگر اس اخبار کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانان ہند کے خیالات کی اصلاح ہو۔اور وہ دوسری اقوام کی طرح وہ بھی حرکت میں آئیں۔اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوں۔ابتداء میں اس کی سخت مخالفت ہوئی جو کہ غیر متوقع نہ تھی۔حقیقت میں جماعتیں اور قومیں عظمت کے دور گزرنے کے بعد جمود میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔جسے توڑنا سہل نہیں ہوتا۔تہذیب الاخلاق کی زندگی کے تین ادوار ہیں۔جن میں تھوڑا وقفہ ہے۔پہلا دور دسمبر 1870ء سے اکتوبر 1875ء تک دوسرا دور مئی 1879ء سے دوبرس پانچ ماہ تک۔اور تیسرا دور اپریل 1894ء سے تین برس جاری رہا۔مجموعی طور پر یہ اخبار چھ سال سات ماہ تک جاری رہا۔اس دوران اس اخبار میں 226 مضامین چھپے۔جن میں 112 سرسید احمد خان کے تحریر کردہ تھے۔دوسرے مضمون نگاروں

میں محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی اور سید محمود کے نام نمایاں تھے۔تہذیب الاخلاق نے ذہن وفکر کی بنیادی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔ اس اخبار کی مدد سے انگریزی تعلیم کے حق میں رائے عامہ ہموار ہوئی۔علی گڑھ اور دوسرے متعدد مقامات پر علمی مدارس قائم ہوئے۔ عام الناس نے محسوس کیا کہ انگریزی زبان سیکھنا اور علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضروری ہے ساتھ ہی اردو شاعری اور نثر میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ اور سادہ اور سلیس زبانوں میں مضامین لکھے جانے لگے۔ بہرحال سر سید احمد خان اپنی قوم کے لئے ایک دردمند دل رکھتے تھے۔قوم کی تربیت اور اس کی ترقی کا انہیں بہت احساس تھا۔اور علی گڑھ کالج ان کے خلوص اور قومی درد کی یادگار ہے۔جس نے ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی برتری کا احساس پیدا کیا۔اور اس طرح احساس کمتری جو مسلم قوم میں جڑ پکڑتا جارہا تھا۔سر سید احمد خان نے اس کا خوب ازالہ کیا۔اور یہ قوم علم کی طرف متوجہ ہوئی۔ پھر اس کالج سے بڑے بڑے سکالرز نکلے۔جنہوں نے تحریک پاکستان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا اور پھر مادر وطن کی تعمیر میں ان باعلم مردان خدا نے یادگار خدمات سرانجام دیں۔اس لئے ہمیں اس معمار قوم کی خدمات کو آئندہ نسل کو بتاتے ہوئے اسے دعا دینی چاہیے۔



## پانامہ نہر

یہ وسطی امریکہ کے ملک پانامہ میں ایک بحری نہر ہے ۔جس کے ذریعے بحری جہاز بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے درمیان سفر کر سکتے ہیں۔اس نہر کی تیاری انجینئرنگ کے منصوبہ جات کی تاریخ کا سب سے بڑا اور مشکل ترین منصوبہ تھا۔اس کی تعمیر سے علاقے میں جہاز رانی پر انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوئے ۔ کیونکہ اس سے قبل جہاز برِ اعظم جنوبی امریکہ کے گرد چکر لگا کر راس بارن سے بحر الکاہل میں داخل ہوتے تھے ۔اسطرح نیویارک سے سان فرانسسکو کے درمیان بحری فاصلہ دس ہزار کلومیٹر کم ہو گیا جو کہ پہلے 22 ہزار میل تھا۔اس نہر کی تعمیر کے دوران تقریباً 275000 مزدور ہلاک ہوئے۔

# جناب مولانا ابوالکلام آزاد

## (انشا پرداز و سیاستدان)



مولانا ابوالکلام آزاد نومبر 1888ء کو مکہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا کا اصل نام محی الدین احمد کنیت ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔ آپ کا تاریخی نام فیروز بخت بھی تھا۔ آپ کا آبائی وطن دہلی اور مادری وطن مدینہ تھا۔ آپ کے والد مولانا خیرالدین 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مکہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک عرب خاتون سے شادی کر لی تھی۔ جس سے مولانا ابوالکلام آزاد پیدا ہوئے۔ مولانا نے قرآن پاک مکہ معظّمہ میں ہی پڑھ لیا تھا۔ 1898ء میں مولانا خیرالدین کلکتہ چلے آئے۔ یہاں آ کر آزاد کی والدہ فوت ہو گئیں۔ والد نے آپ کو مشرقی علوم کی ابتدائی تعلیم دینی شروع کی۔ گھریلو ماحول مذہبی اور دینی عظمت سے رچا بسا تھا۔ 15/سال کی عمر میں آزاد نے فاضل اساتذہ کے علاوہ جامعہ ازہر (قاہرہ) میں بھی تعلیم حاصل کی۔ والد نے عربی اور فارسی کی تعلیم دینی شروع کی اور اردو کتب پڑھنا ممنوع قرار دے دیں۔ تاہم آزاد چوری چھپے اردو کی کتب بھی پڑھتے رہے۔ اسی زمانے میں مولانا کو شاعری کا شوق بھی شروع ہوا۔ پہلے اردو فارسی میں شعر کہنے شروع کئے۔ تو عبدالواحد خان نے ان تخلص آزاد رکھا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم کی کتب اکٹھی کرنا شروع کیں۔ چنانچہ حکیم عبدالرحیم دہلوی اور مولوی کبیرالدین مالک اردو گائیڈ پریس کلکتہ کے کتب خانے آپ نے خرید لئے۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر اردو ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ 20/نومبر 1903ء کو کلکتہ سے ماہنامہ ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ اکتوبر 1905ء تا مارچ 1906ء تک مولانا شبلی نعمانی کے رسالے ''الندوہ'' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ 1909ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ 13/جولائی 1912ء کو شہرہ آفاق ذاتی اخبار ''الہلال'' جاری کیا۔ 16/نومبر 1914ء کو الہلال کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ 1915ء میں آزاد کو بنگال سے نکال دیا گیا۔ 1920ء تک رانچی میں قید رکھا گیا۔

1920ء میں جب آپ نظر بندی سے باہر آئے تو رولٹ ایکٹ ملک میں آگ لگا چکا تھا۔ گاندھی جی عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کر چکے تھے۔18/جنوری 1920ء کو آپ کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی۔ یہیں مہاتما جی سے آپ کی عقیدت اور خلوص کا رشتہ قائم ہوا۔ الہلال کے بعد آزاد نے ''البلاغ'' جاری کیا۔ اور ساتھ ہی قرآن کریم کا درس دینے کے لئے ''دارالارشاد'' قائم کیا۔ 10/دسمبر 1921ء کو تحریک خلافت کی حمایت کرنے پر ایک سال کی سزا ہوئی۔ 1923ء میں جیل سے واپس آئے۔ تو کانگرس میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اس اختلاف کو مٹانے کے لئے دسمبر 1923ء میں آزاد نے پہلی بار جلسے کی صدارت کی۔ 1940ء میں ایک بار پھر آزاد کانگرس کے صدر چنے گئے۔ انہوں نے ستیہ گری کی مہم میں خوب زور وشور سے حصہ لیا۔ جس کی بنا پر انہیں ایک مرتبہ پھر 18 ماہ کی جیل ہوئی۔ 1941ء میں رہا ہوئے لیکن جب ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ لگا تو پھر 9/اگست 1942ء کو گاندھی جی کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ یہ گرفتاری 45 دن تک جاری رہی۔ مولانا نے اپنے جلسوں میں ہمیشہ ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کی۔ 1947ء میں دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ عبوری حکومت میں تعلیم اور فنون لطیفہ کے وزیر بنائے گئے۔ تقسیم کے بعد آپ نے دہلی میں ہندو مسلم کے لئے مرن برت رکھا۔ 1951ء میں پارلیمنٹ میں کانگرس کے ڈپٹی لیڈر بنے اور تعلیم قدرتی گیس اور سائنسی تحقیق کے وزیر مقرر ہوئے۔ 1955ء میں آپ کو یورپ اور مغربی ایشیا کے دو ماہ کے خیر سگالی کے دورے پر بھیجا گیا۔ 1957ء کے انتخابات میں آپ دوبارہ گوڑ گاؤں (یوپی) کے حلقہ سے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور وزیر تعلیم اور سائنسی تحقیقات کے عہدے پر برقرار رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے 22/فروری 1958ء کو 70 برس کی عمر میں انتقال کیا۔ آپ کو جامع مسجد دہلی کے سامنے والے میدان میں دفن کیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، عالم دین، صاحب طرز انشاء پرداز اور قادرالکلام مقرر تھے۔ ان کی تحریر وتقریر میں روانی اور موزونیت ہوتی تھی۔ ''ترجمان القرآن'' ''غبار خاطر'' آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔



# مولانا ابوالکلام آزاد اور پاکستان

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابوالکلام آزاد ہمیشہ ہندوستان کی تقسیم کے مخالف رہے۔ وہ دوقومی نظریے کے بھی مخالف تھے۔ جو تقسیم ہند کے بعد بھارت کے وزیر تعلیم رہے۔ انہوں نے 1958ء میں وفات پائی اور ان کی تدفین جامعہ مسجد دہلی کے باہر ہوئی۔ وہ کانگرس کے ایک اہم رکن تھے اپریل 1946ء میں انہوں نے شورش کاشمیری کو انٹرویو دیا تھا جو کہ بعد میں شورش کاشمیری کی کتاب میں بھی شائع ہوا۔ شورش کاشمیری کی کتاب سے اقتباس ہے۔ ابوالکلام آزاد کی اپریل 1946ء کے انٹرویو میں کی گئی پیشگوئیاں جو صد فیصد درست ثابت ہوئیں۔ جناح اور لیاقت علی خان جب تک زندہ ہیں اس وقت تک مشرقی پاکستان کا اعتماد متزلزل نہیں ہوسکتا۔ 2 لیکن دونوں کی وفات کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ بھی اضطراب اور ناراضگی پیدا کر سکتا ہے۔2۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کا ایک طویل مدت تک مغربی پاکستان کے ساتھ رہنا ناممکن ہوگا۔4۔ دونوں خطوں میں کوئی بھی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ سوائے مسلمان ہونے کے۔

5۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان پائیدار سیاسی اتحاد پیدا ہی نہیں کر پائے۔ عرب دنیا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔6۔ مشرقی پاکستان کی زبان، رواج اور رہن سہن، مغربی پاکستان کی اقدار سے بالکل الگ تھلگ ہے۔7۔ پاکستان کے قیام کی گرم جوشی ٹھنڈی پڑتے ہی اختلاف سامنے آنے شروع ہو جائیں گے۔ جو جلد ہی اپنی بات منوانے کی حد تک پہنچ جائیں گے۔8۔ عالمی قوتوں کے مفادات کی جنگ میں یہ اختلاف شدت اختیار کر کے یہ پاکستان کے دونوں حصے الگ ہو جائیں گے۔9۔ مشرقی پاکستان کی علحدگی کے بعد مغربی پاکستان خطے میں موجود تضادات اور اختلافات کا میدانِ جنگ بن جائے گا۔18۔ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کا قومیائی تشخص بیرونی مداخلت کے دروازے کھول دے گا۔11۔ وہ وقت دور نہیں ہوگا جب عالمی قوتیں پاکستان کی سیاسی قیادت میں موجود مختلف عناصر کو استعمال کر کے اس کے حصے بخرے کر دیں گی۔12۔ جیسا

کہ بلکان اور عرب ریاستوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔13۔اس وقت ہم اپنے آپ سے سوال کریں گے کہ ہم نے کیا کھویا کیا پایا؟

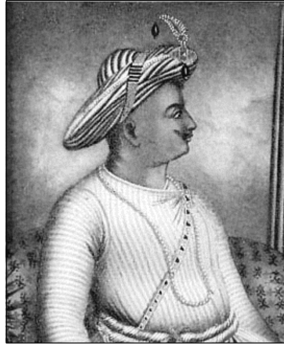
14۔اصل معاملہ مذہب کا نہیں معاشی ترقی کا ہے ۔15۔مسلمان کاروباری قیادت کو اپنی صلاحیت اور ہمت پر شکوک وشبہات ہیں۔16۔مسلمان کاروباری حضرات کو سرکاری سر پرستی اور مہربانیوں کی اتنی عادت پڑ چکی ہے کہ وہ نئی آزادی اور خودمختاری سے خوف زدہ ہیں۔17۔وہ دو قومی نظریئے کی آڑ میں اپنے خوف کو چھپاتے ہیں اور ایسی مسلمان ریاست چاہتے ہیں جہاں وہ بغیر کسی مقابلے کے اپنی معاشیت پر اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکیں۔18۔یہ دیکھنا انتہائی دلچسپ ہوگا کہ کب تک اس فریب کاری کو زندہ رکھ سکتے ہیں ۔19۔میں سمجھتا ہوں کہ اپنے قیام سے ہی پاکستان کو بہت سنگین مسائل کا سامنا رہے گا۔جن میں مندرجہ ذیل مسائل شامل ہیں۔

1۔کئی مسلم ممالک کی طرح پاکستان کی نااہل سیاسی قیادت فوجی آمروں کی راہ ہموار کرے گی۔ 2۔پاکستان پر بیرونی قرضوں کا بھاری بوجھ ہوگا۔3۔پاکستان کے پڑوسیوں سے دوستانہ تعلقات کا فقدان اور جنگ کے امکانات ہونگے ۔4۔داخلی تنازعات اور شورشیں ہونگی۔5 پاکستان کے صنعتکاروں اور نو دولتیوں کے ہاتھوں قومی دولت کی لوٹ مار ہوگی۔6۔نو دولتیوں کے استحصال کے نتیجے میں طبقاتی جنگ کا تصور پیدا ہوگا۔7۔نوجوانوں کی مذہب سے دوری اور عدم اطمینان اور نظریہ پاکستان کا خاتمہ ہوجائے گا۔8۔پاکستان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے عالمی قوتوں کی طاقتیں بڑھیں گی ۔9۔اس صورتحال میں پاکستان کا استحکام دباؤ کا شکار رہے گا اور مسلم ممالک اسے کسی طرح کا تعاون فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہونگے۔اب آپ غور فرمائیں کہ ستر سال پہلے ایک جہاں دیدہ شخص نے جو تجزیہ کیا۔کیا وہ ہم اور ہمارے نالائق سیاستدان اور علمائے سُو من وعن پورا نہیں کرر ہے۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔



# مجاہد اعظم ٹیپو سلطان

## ''شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے''



دس نومبر ٹیپو سلطان شہیدؒ کی یومِ ولادت کا دن ہے۔ ابن سید حیدر علی فتح علی سید ٹیپو سلطان رحمۃ اللہ کی مختصر سی سوانح حیات پر ایک نظر ''شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' یہ فقرہ تو آپ نے کافی دفعہ سنا ہوگا لیکن شائد آپ کو معلوم نہ ہوگا۔ یہ کس نے کہا تھا۔ یہ مشہور جملہ سلطان فتح علی ٹیپو کا ہے۔ جو بعد میں ایک ضرب المثل کے طور پر مشہور ہو گیا۔ ٹیپو سلطان 10 نومبر 1750 کو پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنے والے آخری حکمران تھے۔ آپ کا پورا نام فتح علی ٹیپو تھا۔ آپ نے اور آپ کے والد سلطان حیدر علی نے جنوبی ہند میں 50 سال تک انگریزوں کو روکے رکھا اور کئی بار انگریزی افواج کو شکست فاش دی۔ سلطان ٹیپو کی والدہ کا نام فاطمہ اور والد کا نام حیدر علی تھا۔ سلطان حیدر علی کو قدرت نے جنوبی ہندوستان میں ایک وسیع و عریض سلطنت سے نوازا تھا لیکن وہ سلطنت کے وارث سے محروم تھے۔ اس سلطنت میں آج کا بنگلور بھی شامل تھا جو بھارت میں جدید ٹیکنالوجی کا مرکز ہونے کے ناطے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ ٹیپو نام کی وجہ شہرت۔ ایک تاریخی روایت ہے کہ حیدر علی نے جنوبی ہندوستان کے شہر اوکاٹ میں ایک مشہور ولی ٹیپو مستان کے مزار پر حاضری کے دوران اللہ تعالی سے بیٹے کی دعا مانگی۔ اور مراد پوری ہونے پر بزرگ کے نام پر ہی بچے کا نام رکھنے کی نیت بھی کی اور جب 10 نومبر 1750ء کو بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام ٹیپو رکھا۔ ٹیپو کے دادا کا نام فتح محمد تھا۔ ٹیپو نے اپنے ایک بیٹے کا نام فتح حیدر رکھا جو ٹیپو کے باپ اور دادا کے ناموں کا امتزاج تھا۔ خود ٹیپو کا نام ''فتح علی خان'' مشہور ہوا جس کا پہلا لفظ ان کے دادا کا نام اور دوسرا لفظ باپ کے نام کا آخری لفظ تھا۔ تاہم

ان کا پیدائشی نام فتح علی نہیں تھا۔اور ٹیپو ان کا لقب نہیں بلکہ پیدائشی نام تھا۔اپنے بیٹے فتح حیدر کی نسبت سے ان کی کنیت ابوالفتح تھی۔آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف ایک مضبوط مزاحمت فراہم کی اور برصغیر کے لوگوں کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرنے کے لیے سنجیدہ عملی اقدامات کئے۔سلطان نیا نتہائی دُوررس اثرات کی حامل فوجی اصلاحات نافذ کیں صنعت وتجارت کوفروغ دیا اور انتظامیہ کو ازسرنومنظم کیا سلطان کو اس بات سے اتفاق تھا کہ برصغیر کے لوگوں کا پہلا مسئلہ برطانوی اخراج ہے۔نظام حیدرآباد دکن اور مرہٹوں نے ٹیپو کی طاقت کو اپنی بقا کے لئے خطرہ سمجھا اور انگریزوں سے اتحاد کرلیا۔ٹیپو سلطان نے ترکی ،ایران ،افغانستان اور فرانس سے مدد حاصل کرنے کی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوسکے۔میسور کی آخری جنگ کے دوران جب سرنگا پٹم کی شکست یقینی ہوچکی تھی سلطان ٹیپو نے محاصرہ کرنے والے انگریزوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی اور قلعے کو بند کروادیا غدار ساتھیوں نے دشمن کے لئے قلعے کا دروازہ کھول دیا اور قلعے کے میدان میں زبردست جنگ چھڑ گئی۔بارود کے ذخیرے میں آگ لگ جانے کے باعث مزاحمت کمزور ہوگئی اس موقع پر فرانسیسی افسر نے ٹیپو کو Chitaldrug بھاگ جانے اور اپنی جان بچانے کا مشورہ دیا مگر سلطان ٹیپو راضی نہ ہوئے اور اسی موقع پر آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا شیر کی ایک دن کی زندگی ، گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے۔آخرکار 1799ء میں دوران جنگ سر پر گولی لگنے سے شہید ہو گئے۔انگریز آپ کی لاش کے قریب آتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں یہ پھر نہ کھڑے ہوجائیں۔کیونکہ ان کی بہادری بہت مشہور تھی۔جب شہادت کی اطلاع انگریز جنرل کو ہوئی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔اور سلطان کی لاش کے قریب آیا اور اس موقعہ پر جنرل نے ایک بہادر سپاہی کی طرح شیر میسور کو سلیوٹ کیا اور تاریخی جملہ کہا کہ ’’آج سے ہندوستان ہمارا ہے،اب کوئی طاقت ہماری راہ نہیں روک سکتی‘‘۔اور اسکی نعش اندر محل کے زنان خانے میں بھجوائی تاکہ اہلخانہ اس کا آخری دیدار کریں اس کے ساتھ ہی آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا۔جب سلطان کی قبر کھودی جانے لگی تو آسمان کا سینہ بھی شق ہوگیا اور چاروں طرف غیض وغضب کے آثار نمودار ہوئے ،بجلی کے کوندے

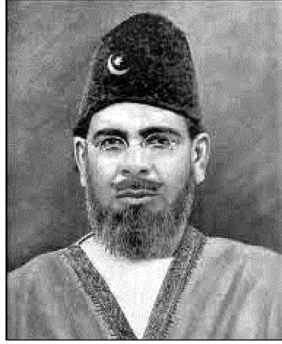
لپک لپک کرآسمان کے غضب کا اظہار کر رہے تھے۔اورآسمان بھی اس عظیم لیڈر کی شہادت پر خوب رویا۔انداز حکمرانی ٹیپوسلطان کی زندگی ایک سچے مسلمان کی زندگی تھی مذہبی تعصب سے پاک تھے یہی وجہ تھی کہ غیر مسلم ان کی فوج اور ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ٹیپو سلطان نے اپنی مملکت کومملکت خداداد کا نام دیا۔حکمران ہونے کے باوجود خود کو عام آدمی سمجھتے۔باوضو رہنا اور تلاوت قرآن آپ کے معمولات میں سے تھے۔ظاہری نمود ونمائش سے اجتناب برتتے۔ہر شاہی فرمان کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کیا کرتے تھے۔زمین پر کھدر بچھا کر سویا کرتے تھے۔علم دوست حکمران ٹیپوسلطان ہفت زبان حکمران کہے جاتے ہیں۔آپ کوعربی،فارسی،اردو،فرانسیسی، انگریزی سمیت کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔



## دوستی ایک انمول رشتہ

لوگ کہتے ہیں کہ کوئی بھی رشتہ بدن پر پہنے ہوئے کپڑے کی مانند ہوتا ہے، جسے کسی بھی وقت تبدیل کیا جاسکتا ہے۔لیکن کئی رشتے شریانوں میں بہنے والے خون کی طرح ہوتے ہیں۔جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔جان سے وابستہ انہی رشتوں میں سے ایک رشتہ ہے دوستی کا۔میری اور تمہاری دوستی کا۔دوستی ایک پھول کی مانند ہے جو اپنی خوشبو چاروں طرف بکھیر دیتا ہے۔ایک مددگار کی طرح ہے جب بھی ضرورت پڑے کام آئے۔دوستی ایک مکمل دنیا ہے۔سال کے سال گزرجاتے ہیں مگر دوستی قائم ودائم رہتی ہے۔دوستی سمندر ہے،کنارا ہے، دنیا میں جینے کا سہارا ہے، دوستی ایک ایسے بلند پہاڑ کی مانند ہے۔جسے بڑے سے بڑا طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔بلکہ اس سے ٹکرانے سے خود ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔لیکن اگر دوستی کے اس بلند پہاڑ کو کہیں سے شک کا معمولی کنکر لگ جائے تو یہ پہاڑ، ریت کے اس ٹیلے کی مانند ہو جاتا ہے۔جس میں ہوا کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہتی اور وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔کیونکہ شک کا کنکر اعتماد کی جگہ لے لیتا ہے۔

# مولانا محمد علی جوہر



وہ انگریزی زبان کے اعلیٰ انشاء پرداز، اردو کے بلند پایہ شاعر، ایک عظیم صحافی، شکسپیئر کے ماہر نقاد، جادو بیان مقرر، ایک نامور راہنما، اور سیاست دان تھے۔ شبلی مرحوم علی گڑھ میں تھے۔ ان سے کسی نے کہا کہ ایک گیارہ سال کا بچہ نہایت عمدہ اور موزوں اشعار کہتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ فی البدیہ کہتا ہے۔ شبلی بہت حیران ہوئے یقین نہ آیا۔ اس بچے کو بلوایا اور امتحان کی غرض سے ایک مصرعہ دیا کہ فی البدیہ طرحی غزل کہے۔ چند منٹ گزرے تھے کہ اس نے سات آٹھ اشعار کی غزل شبلی مرحوم کے ہاتھ میں تھمادی۔ شبلی شبلی عش عش کر اُٹھے اور کہا جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ اور پھر فرمایا جیتے رہو۔ بیٹا! تم بہت بڑے آدمی بنو گے۔ یہ بچہ محمد علی تھا جو بڑا ہو کر واقعی بہت بڑا آدمی بنا۔ انہیں بچپن میں ہی شعر گوئی کا شوق ہو گیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی ذوالفقار علی گوہر نواب داغ کے شاگرد تھے۔ نواب داغ ان دنوں رام پور ہی میں مقیم تھے۔ محمد علی اپنے بھائی کے ساتھ اکثر اُن کے گھر جاتے اور ان سے شعر و سخن کی باتیں سن کر گرہ میں باند لیتے۔

خود لکھتے ہیں:

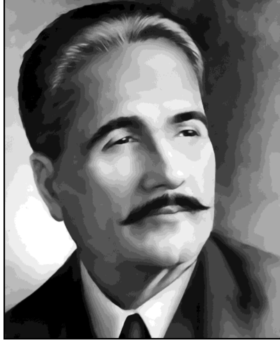
''میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں اسے ہاتھی بنا کر اس کی پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ میں دس برس کی عمر میں بامعنی و موزوں اشعار کہنے لگا تھا'' اس زمانے میں انہیں مشاعروں میں بھی شریک ہونے کا بڑا شوق تھا۔ خود گھر پر بھی مشاعرے منعقد کرتے تھے اور شعر سنا کر داد حاصل کرتے تھے۔ یہ شوق کالج کی زندگی میں بھی ان کے ساتھ رہا۔ کرکٹ کے لان میں ہر ماہ کی چودھویں کو چاند کی روشنی میں مشاعرہ منعقد کرتے۔ حسرت موہانی بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بارش کے باعث یہ مشاعرہ ڈائننگ میں منعقد کیا گیا۔ مولانا جوہر کی باری آئی تو انہوں نے غزل میں یہ شعر بھی پڑھا:

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

سب جھوم جھوم گئے اور نہ جانے کتنی بار اُن سے یہ شعر پڑھوایا اور سُنا۔اُن کے کردار کی عظمت کو دلوں میں سب سے زیادہ جاگزیں کرنے والا واقعہ وہ ہے جو ان کی وفات سے چند دن پیشتر پیش آیا۔مولانا محمد علی جوہر ان دنوں سخت بیمار تھے۔انہیں ذیابیطس کا عارضہ لاحق تھا۔ایسی بیماری میں سب ہی لوگ صاحبِ فراش ہو جاتے ہیں۔مگر مولانا محمد علی جوہر کے جسم میں چونکہ سانس کی آمد و رفت باقی تھی۔اس لئے وہ چاہتے تھے کہ یہ آخری سانسیں بھی ملت ہی کی خدمت میں صرف ہوں۔ چنانچہ 1931ء کے شروع میں گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔لوگ دبی زبان سے کہتے تھے۔کہ خاکستر اس ڈھیر میں اب کیا ہے۔مگر خاکستر کا یہ ڈھیر جب بولنے کھڑا ہوا تو سب کے سب انگشت بدنداں رہ گئے۔لوگ مارے حیرت کے ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے یا متحرک آتش فشاں! محمد علی کے نحیف جسم سے جو آواز نکل رہی تھی اس میں شیر کی گرج تھی وہ کہہ رہا تھا۔

''آزادی لینے آیا ہوں یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین میں دے دوں گا۔'' خدائے غیور نے اس کے کہے کی لاج رکھ لی اور سچ مچ محمد علی نے اپنی جان اسی سرزمین میں دے دی۔محمد علی جوہر کی کا انتقال تو لندن میں ہوا مگر ان کی تدفین بیت المقدس میں ہوئی اقبال نے خوب کہا خاک اقدس اُو بآغوش تمنا در گرفت۔موئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت مولانا محمد علی میں بے شمار خوبیاں تھیں۔وہ انگریزی زبان کے اعلیٰ انشاء پرداز، اردو کے بلند پایہ شاعر، ایک عظیم صحافی، شکسپیئر کے ماہر نقاد، جادو بیان مقرر، ایک نامور راہنما، اور سیاست دان تھے۔محمد علی جوہر اپنی زندگی میں ایک لمحہ بھر بھی اپنی قوم کو نہیں بھولا وہ ملت کا بہت بڑا راہنما تھا ایسا راہنما جو ملت کو راستہ دکھاتے دکھاتے موت کی وادی میں گُم ہو گیا مگر اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر قوم نے آخر اپنی منزل مقصود پالی۔ 

# علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ



محمد اقبال نام، اقبال تخلص 22/فروری 1873ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ ان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اقبال کو شمس العلماء مولوی سید میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ جیسے شفیق استاد ملے۔ جن کے فیضِ تربیت میں ان کی فطری صلاحیتوں اور ذوقِ علمی کی نشوونما ہوئی۔ 1905ء میں یورپ گئے اور وہاں سے پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی سندیں حاصل کیں۔ 1908 میں واپس ہندوستان آئے۔ شاعری کا شوق انہیں بچپن ہی سے تھا۔ ابتدا میں مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی بہت جلد ان کے کلام کا آوازہ بلند ہوگیا اور دنیا نے ''شاعرِ مشرق'' ''ترجمانِ حقیقت'' اور علامہ کے خطابات سے نوازا۔ 1923ء میں ''سر'' کا خطاب ملا۔ 1927 میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 30۔1931 میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اسی دوران سپین حکومت کی دعوت پر تشریف لے گئے۔ آپ نے 1930ء ہی میں آپ نے خطبہ الہ آباد دیا۔ جس میں مسلمانوں کے الگ وطن کا تصور دیا اور وہاں تاریخ مسلمانان سے متاثر ہو کر نظم مسجد قرطبہ لکھی۔ اور اٹلی میں مسولینی کی دعوت پر اس سے بھی ملاقات کی۔ 1932ء میں نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا بھی دورہ کیا۔

21/اپریل 1938ء کو لاہور میں وفات پائی۔ علامہ اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کی وُسعتوں کو سمیٹنا بہت مشکل کام ہے۔ وہ ایک بلند پایہ فلسفی اور مفکر بھی تھے اور اردو اور فارسی کے قادر الکلام اور بالغ شاعر بھی۔ ان کی شاعری جو قومی ہے سرور و نغمہ بھی ہے اور آہ و شیون بھی۔ اُن کے کلام میں سبق ہے، پیام ہے، دعوتِ فکر و عمل ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان کو خیالات اور الفاظ و تراکیب کا بڑا سرمایہ عطا کیا اور زبانِ شعر میں وہ حقائق و معارف بیان کئے، جن کو بہت سے لوگ محسوس تو کرتے ہیں، مگر

کہہ نہیں سکتے ۔ان کے بعض اشعار نے اقوام کی منازل کی راہیں متعین کی ہیں،اور استعارات اور تشبیہات سے نئی نسل کو بلند حوصلگی سے نوازا ہے ۔ اقبال کے تصور شاہین نے نوجوانوں کو بڑی جرأت اور دیدہ دلیری سے منازل پانے کا سبق دیا ہے،اور لکھوکھہا نوجوان اس تجربے میں کامیاب ٹھہرے۔ان کے فلسفہء یقین محکم و عمل پیہم نے مقاصد بشر کو قریب تر کر دیا ہے۔

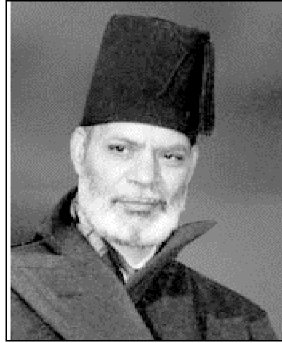
آپ نے فارسی اور اردو میں کافی شاعری کی اور کئی کتب کا ادب میں اضافہ کیا، جو کہ بہت مقبول ہوئیں ۔اور آج تک لوگوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔مثلاً ضربِ کلیم، بانگِ درا، اسرارِ بے خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، شکوہ جواب شکوہ، اور بہت سی کتب ہیں، جن کے نام خوفِ طوالت سے درج کرنے سے گریز کرتا ہوں، اور سیاست دان تھے۔محمد علی جوہرؔ اپنی زندگی میں ایک لحہ بھر بھی اپنی قوم کو نہیں بھولا وہ ملت کا بہت بڑا راہنما تھا۔ایسا راہنما جو ملت کو راستہ دکھاتے دکھاتے موت کی وادی میں گُم ہو گیا مگر اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر قوم نے آخر اپنی منزل مقصود پالی۔



## ابنِ صفی

ابنِ صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔آپ اُردو ادب کے نامور جاسوسی ناول نگار اور شاعر تھے۔آپ کے تحریراتی کاموں میں جاسوسی دنیا اور عمران سیریز شامل ہیں۔اس کے علاوہ آپ افسانے اور طنز و مزاح بھی لکھتے تھے۔ ابنَ صفی 26 جولائی 1928 کو الہ آباد، اُتر پردیش کے ایک گاؤں نارا میں صفی اللہ اور نذیراں بی بی کے گھر پیدا ہوئے ۔انہوں نے ابتدائی تعلیم نارا کے پرائمری سکول میں حاصل کی۔میٹرک ڈی اے وی اسکول الہ آباد سے کیا۔جبکہ انٹرنیٹ کی تعلیم الہ آباد کے ایونگ کرسچن کالج سے مکمل کی۔ 1947ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ بی اے کی ڈگری جامعہ علی گڑھ سے حاصل کی۔

# محسنِ پاکستان چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاںؓ



چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاںؓ 6 رفروری 1893ء میں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور پاکستان کا یہ پہلا شہر ہے جہاں بانی جماعت احمدیہ نے اپنی جوانی کے ایام بسر کئے ۔اپنے اخلاق سے اس علاقے کو متاثر کیا۔جس میں چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں کا خاندان بھی شامل رہا۔ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایسے لڑکے نے آنکھ کھولی جو بعد میں اپنے دور کا واحد قانون دان، جینئس ثابت ہوا۔ان کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں مکمل ہوئی جبکہ بی اے کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے لی۔1914ء میں انہوں نے کنگز کالج لندن سے قانون کی ڈگری اس اعزاز سے حاصل کی کہ نہ صرف وہ کالج میں سب سے نمایاں رہے بلکہ برصغیر پاک و ہند میں وہی سب سے پہلے شخص تھے جو اس اعزاز کے مستحق قرار پائے۔اپنے ہم عصر دوسری قابل قدر شخصیات کی طرح وہ Lincon Inn's Bar کے لئے مدعو کئے گئے۔پریکٹیشنیئر لائیر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی مثالی قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔چنانچہ بہت سے مشہور کیس انہی کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کی خداداد ذہانت نے پاک و ہند کے مشہور سیاست دان سر فضل حسین کو بہت متاثر کیا۔جو خود بھی ایک نابغہء روزگار شخصیت تھے۔اور پنجاب یونینسٹ پارٹی کے بانی تھے۔چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں نے 1930ء کی دہائی میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے۔اور پنجاب کے مسلمانوں کی بہبود کیلئے بے مثال کام کیا۔وہ قانون کے میدان میں نا قابل شکست پہلوان ثابت ہوئے۔انہوں نے جس میدان کا بھی رُخ کیا وہاں ہی اپنی قابلیت کی دھاک بٹھا دی اور کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔گول میز کانفرنس میں بھی مسلمانوں کے سب سے کامیاب ترین اور فتح نصیب نمائندے فقط وہی قرار پائے۔اور انہیں قانون اور سیاست کے میدان میں عقل و دانائی کے

لحاظ سے گاندھی اور جناح کے مقابلے کی شخصیت قرار دیا گیا۔1931ء میں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا۔اور گول میز کانفرنس میں بھی وہی مسلم لیگ کے واحد کامیاب ترین ترجمان کہلائے اور یورپین سیاست دانوں کی توجہ کا اس حد تک مرکز بن گئے کہ چرچل تک نے ان کی قابلیت کی داد دی۔اوران کی اصابت رائے کو تہ دل سے قبول کیا۔

اپنی بے مثال عقل اور ذہانت سے انہوں نے حکومت کے ایوانوں کو بھی فتح کیا۔انہیں وائسرائے کونسل کی سیٹ پیش کی گئی۔یہاں اعلیٰ سطح پر انتظامی کارنامے انجام دینے کا موقع ملا وائسرائے کے تحت ریلوے کے وزیر بنے۔پبلک ورکس لیبر اور لاء کے محکموں کے وزیر رہے۔ ایک مختصر وقت کے لئے لیگ آف نیشنز میں برٹش انڈیا کے نمائندہ رہے۔1942ء کے بعد چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں انڈیا کی فیڈرل کورٹ کے جج بنائے گئے۔جو مملکت کے چیف جسٹس کے برابر عہدہ ہے۔اس کے بعد قائداعظم کی ذاتی درخواست پر لبیک کہتے ہوئے ریڈ کلف کمیشن میں پاکستان کے Cause کے لئے نمائندہ بن کر پیش ہوئے۔افسوس کہ متعصب مولویوں نے جب فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں انتہائی ناشکرے پن اور مذہب دشمنی کا اظہار کیا۔تو جسٹس منیر نے مخالف ملاؤں کو سخت ڈانٹ پلائی۔اور بتایا کہ میں خود اس کمیشن کا ممبر تھا۔اور چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں نے جس بہادری شجاعت اور دیانت کے ساتھ پاکستان (باؤنڈری کمیشن) کا کیس لڑا اس پر شکریہ ادا کرنا عدالت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

25/دسمبر 1947ء کو قائداعظم نے چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں کو پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر کیا۔یو این او کے دنیا بھر میں سب سے بہترین ایڈووکیٹ بن کر ظاہر ہوئے۔جہاں انہوں نے تیسری دنیا کے مسلمان ممالک کے مسائل پر بہترین نمائندگی کی۔جس سے تمام عرب ممالک ان کے احسان مند ہوئے اور اس عمل سے پاکستان کا نام دنیا میں روشن ہوا۔چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے لئے پہلے پاکستانی جج مقرر ہوئے۔یہ اعزاز آج تک کسی دوسرے پاکستانی کو نصیب نہیں ہوا۔

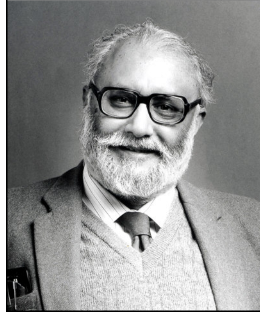
وہ یواین او کی جنرل اسمبلی کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ستمبر 1985ء میں ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔وہ بے مثال مصنف بھی تھے۔انہوں نے سیرت وسوانح حضرت محمد ﷺ پر بھی ایک کتاب تحریر کی۔کئی کتب کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔اپنی یادداشتوں پر مشتمل ''تحدیث نعمت'' کے نام سے بھی کتاب لکھی۔پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے ان کی عظیم الشان خدمات کی حیثیت رکھتی ہیں۔یہ خدمات متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے،پاکستان کے لئے اور تیسری دنیا کے مسلمانوں کے لئے تھیں۔قائداعظم کے بعد ان کی خدمات کو دوسرا درجہ دیا جاتا ہے جو وہ بطور محب وطن جیورسٹ ڈپلومیٹ ہونے کی حیثیت سے بجالائے جبکہ ان کے ہم عصروں میں نام نہاد خدمات کے بہت سے دعویدار ایسے تھے۔جو بعد میں اس ملک کی تضحیک کرنے میں پیش پیش رہے۔جبکہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ ان تمام لوگوں سے بہت بلند رہے۔کبھی بھی اس عظیم انسان کی یاد کو قومی سطح پر نہیں منایا گیا۔اور نہ قومی سطح پر ان کی خدمات پر اظہار تشکر اور احسان مندی کا رویہ دیکھنے میں آیا جبکہ اس شخصیت کے ملک خداداد پاکستان پر گراں قدر احسانات ہیں۔اس کی یاد کو اذہان سے محو کرنے کی ہر ممکن کوشش اس لئے کی جاتی رہی کہ وہ شخصیت عقائد کے لحاظ سے احمدی تھا۔



## دوزخ کا دربان

حضرت شفیق بلخیؒ ایک بار حج کو جارہے تھے راستے میں بغداد پر پڑاؤ کیا۔ہارون الرشید عباسی کا دور تھا۔اسے آپ کے ورود بغداد کا علم ہوا۔تو سلام بھجوایا اور دعوت دی۔حضرت شفیق بلخی تشریف لے گئے تو ہارون الرشید نے کوئی نصیحت کرنے کی گزارش کی تو ارشاد فرمایا۔''میرے رب نے تجھے دوزخ کا دربان مقرر کرکے تین چیزیں عطا کی ہیں۔مال ودولت اور تازیانہ۔ان سے کام لے اور لوگوں کو دوزخ سے بچا۔مال ودولت سے حاجتمندوں کی حاجت روائی کر۔تلوار سے انصاف کر اور قاتلوں سے قصاص لے اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے نافرمانی کرنے والوں پر کوڑے برسا۔ورنہ یاد رکھ کہ تجھے دوزخ کا سردار بنادیا جائے گا۔

# ڈاکٹر عبدالسلام۔نوبل لارئیٹ



سیاہ اچکن اور سفید شلوار، سر پر سفید پگڑی اور پیروں میں کھسے پہنے ہوئے وہ شخص سویڈن کے بادشاہ سے نوبل انعام لے رہا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کی قومیت پاکستانی تھی۔1926ء میں جھنگ میں پیدا ہوا۔21 رنومبر 1996ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔نظری طبیعات کی دنیا کا ایک بہت بڑا نام۔دنیا اس کے قدموں میں نگاہیں بچھاتی تھی۔اور وہ اپنے دیس کی فضاؤں اور ہواؤں کو ترستا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا۔لیکن اس کے دیس نے اسے ٹھکرا دیا۔ وہ بیسویں صدی کے اعلیٰ دماغوں میں سے ایک تھا۔لیکن ذاتی صدمات نے اسے بولنے اور چلنے سے محروم کر دیا۔اس کے باوجود وہ موت سے پہلے چند ہفتوں تک کام کرتا رہا۔ وہ لوگ جو اس کے فولادی اعصاب کے قائل تھے۔انہوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ کسی بین الاقوامی سیمینار میں کوئی پاکستانی نوجوان وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے اس شخص کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا رہا ہے۔اور اپنی مٹی سے جدائی کا غم اور اپنے دیس کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا ہے۔

سائنسدانوں کی بین الاقوامی برادری کا یہ کامیاب اور مشہور انسان دیارِ غیر میں دنیا سے رخصت ہوا۔ دل شکستہ اور دل گرفتہ۔جن فضاؤں میں رہنا اس جلاوطن کی آرزو تھی وہاں اس کا تابوت آیا۔ یہ شخص جس کا نام عبدالسلام تھا اس نے کامیابیوں کا سفر چودہ برس کی عمر میں شروع کیا۔ جب وہ پنجاب بورڈ کے میٹرک کے امتحان میں صوبہ بھر میں اول آیا۔ یاد رہے کہ اس وقت کا پنجاب تقسیم نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جس پر جھنگ کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں نے ملکر جشن منایا۔بھنگڑے ڈالے۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے دروازے اس پر کھلتے چلے گئے۔سلام نے کیمرج سے نظری سائنس میں شاندار نمبروں سے گریجویشن کیا۔ پاکستان بن چکا تھا۔نئے ملک کی

تعمیر کے جذبے سے سرشار سلام وطن واپس آئے۔اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر ہو گئے۔جلد ہی انہیں شعبہ ریاضی کا سربراہ بنا دیا گیا لیکن یہاں وہ اپنے محبوب کام یعنی تحقیق سے محروم ہوئے۔آخر کار انہوں نے دو برس بعد کیمرج جانے کا فیصلہ کیا۔اپنے اس فیصلے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے ''نیو سائنسٹ'' کی نینا ہال سے کہا تھا کہ جلد ہی یہ بات مجھے معلوم ہو گئی کہ میں پورے ملک میں نظری طبیعات کی عملی تحقیق سے جڑا ہوا واحد فرد ہوں۔کسی کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ میں کسی تحقیق میں مصروف ہوں یا نہیں۔بی اے کے طالب علموں کو ریاضی پڑھانے کے علاوہ میرے فرائض میں کالج کی فٹ بال ٹیم کی نگرانی بھی تھی۔وہ پھر پاکستان واپس آئے ان کا خیال تھا کہ وہ پاکستان میں سائنس کی ترویج اور اپنے نوجوانوں پر تحقیق کے دروازے وا کر سکیں گے۔

1961 سے 1974ء تک وہ صدور پاکستان کے چیف سائنٹفک ایڈوائزر رہے۔پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور سائنٹفک کمیشن آف پاکستان کے سرگرم رکن رہے۔سپارکو کے بانی چیئرمین ہوئے لیکن 1974ء کے بعد یہاں کی زمین ان پر تنگ ہو گئی۔وہ تیسری دنیا کی آزادی کے باوجود ان کی غربت اور امیر ملکوں کی محکومی سے کڑھتے تھے۔تیسری دنیا کے ذہین نوجوانوں کے لئے انہوں نے نظری طبیعات کے لئے اٹلی میں ایک مرکز قائم کیا۔جو آج سائنسی تحقیق میں اہم ترین اداروں میں سے ایک ہے۔وہ ''تھرڈ ورلڈ اکیڈمی'' کے پہلے صدر ہوئے۔تیسری دنیا کی اور بطور خاص مسلم دنیا کی سائنس کی تعلیم اور تحقیق سے دوری انہیں مضطرب رکھتی تھی۔1979ء میں جب نظری طبیعات میں انہیں 2 سائنسدانوں کے ساتھ نوبل انعام سے نوازا گیا۔تو اس کے کچھ دنوں بعد یونیسکو کی جنرل کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ مسلم دنیا کو ساٹھ ارب ڈالرز سے زیادہ کی سالانہ آمدنی حاصل ہوتی ہے۔بین الاقوامی معیار کے مطابق ان ممالک کو ایک ارب ڈالر سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کرنا چاہیئے۔آٹھویں،نویں،دسویں اور گیارہویں صدی میں ان کے آباؤ اجداد سائنس اور ٹیکنالوجی کی شمع روشن رکھنے والے تھے۔ان ہی کے آباؤ اجداد نے بغداد اور قاہرہ میں سائنس کی اکادمیاں شروع کیں۔ایک بار پھر سخاوت کا مظاہرہ کیجیئے۔سائنس پر ایک ارب ڈالر خرچ

کیجیے۔ایک ٹیلنٹ فنڈ قائم کیجیئے۔آخری فرق قابلیت سے ہی پڑتا ہے۔اس قابلیت فنڈ سے استفادہ صرف مسلم اور عرب ممالک تک محدود نہ رکھئے بلکہ سب ہی ترقی پذیر ممالک کے لئے عام کیجیئے۔اس فنڈ میں میرا ذاتی حقیر عطیہ ساٹھ ہزار ڈالرز کا ہوگا۔جو 10 ردسمبر کو سویڈش اکیڈمی مجھے بطور انعام دے رہی ہے۔اپنی ایک تقریر میں انہوں نے کوریا کے صدر کے اس جملے کا ذکر کیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ چین کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں پچھاڑنا کوریا کا نصب العین ہوگا۔سلام کا کہنا تھا کہ کوریا جیسے ایک چھوٹے سے ملک کے اس نصب العین کا اندازہ کیجیے جو اس نے چین جیسے ملک کے مقابل آنے اور اس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں شکست دینے کے لئے طے کیا ہے۔یہ اس طرح کی بلند حوصلگی تھی جس نے کوریا کو سائنس شناس بنا دیا۔پچھلی صدی کے آخر میں جب MEIJانقلاب رونما ہوا تھا۔تو کچھ ایسا ہی معاملہ جاپان کے ساتھ پیش آیا تھا۔جاپان کے ملکی آئین میں پانچ شقیں تھیں۔پانچویں شق تھی ''علم حاصل کیا جائے خواہ جہاں کہیں بھی ملے''علم کا مطلب جاپانیوں کے لئے تھا سائنس۔100 سال پہلے ہی صورتحال سویڈن میں ہوئی۔

کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے سویڈن میں قحط پڑتے تھے اور وہ اپنے وجود کا احساس بھی نہیں کر سکتا تھا۔؟ یہی روس میں بھی ہوا۔لینن اور اس کے بعد اسٹالن نے اسے روس کی پالیسی میں شامل کر لیا تھا۔اور روس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔کہ سائنس کو فروغ دیا جائے۔پیٹر اعظم نے صدیوں پہلے یہی فرمان جاری کیا تھا۔آج کے حالات میں مجھے ڈر ہے کہ بغیر حکومت کی مدد کے تعلیم کو فروغ نہیں دیا جا سکتا۔اپنی اس تقریر میں انہوں نے اسی سویڈن کا بھی ذکر کیا ہے جو آج دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں سے ہے جہاں سے ہر سال دنیا کی ذہانتوں کو سائنس، سماجی علوم، اور ادب کے شعبوں میں نوبل انعام دیا جاتا ہے۔یہ ایک دلدوز کہانی ہے کہ انہوں نے پاکستان میں سائنسی علوم کی ترقی اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے کیا کچھ نہ کرنا چاہا اور سرکار نے، دربار نے، جامعات نے ان کی کس کس طرح ہمت شکنی نہ کی۔آج ہم گیہوں اور دوسری اجناس کی قلت پر روتے ہیں۔غلہ دوسرے ممالک سے درآمد کرتے ہیں۔توہمیں چاہیئے کہ انہیں یاد کریں جو یہ کہتے تھے۔کہ زراعت ہماری شہ رگ ہے۔ہمیں سیم وتھور اور اور کھارے پانی کو میٹھا

کرنے کی ٹیکنالوجی پر توجہ دینی چاہیئے۔ ورنہ ہمارے ہاتھ میں کشکول ہوگا۔ اور ہم اقوام عالم میں ذلیل ورسوا ہورہے ہونگے۔ وہ یہ بات بار بار کہتے تھے کہ ہم اپنی غربت سیاس وقت لڑ سکتے ہیں جب ہم اپنی ذہانتوں کی پرورش کریں۔ حصول علم، غریب بچے کا بھی حق ہے جو اسے ملنا چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ سائنسی سوچ بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ افسوس ہم نے ان کی ایک نہ سنی اوران پڑھ انڈرمیٹرک پاس صدور، جرنیل، بیوروکریٹس کو ہم نے ملک کی باگ ڈور اسلام کے جوش میں، ان جہلاء اور غیرمحب وطن طاقتوں کو تھمائے رکھی۔ اور آج ہم ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں کہ کوئی بھی ہمارا پُرسان حال نہیں۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

اپنے اس نابغہ روزگار کو ہم نے پاکستان میں دفن ہونے کی اجازت دی۔ اس کے لئے ہمیں اس وقت کی حکومت کا شکرگزار ہونا چاہیئے اور اس بات کا شکوہ نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کی تدفین سرکاری اعزاز کے بغیر ہوئی۔ 1998ء میں ان کا نام ''پاکستانی سائنسدان'' سیریز میں داخل ہوا، اور محکمہ ڈاک نے ان کا یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔ اس کے لئے ہمیں نواز حکومت کی ''ہمت'' کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ ابن رشد سے عبدالسلام تک ہمارا اور ہمارے حکمرانوں کا اپنے دانشوروں، سائنسدانوں اور فلسفیوں سے ایک ہی رویہ رہا۔ کوئی ملحد تھا، کوئی زندیق، اور کوئی مرتد۔ علمی اور سائنسی تحقیق وجستجو کا کسی بھی فرد کے مذہب سے تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سائنسدان کا عقیدہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن سائنس سیکولر ہے۔ ہم نے یہ نکتہ صدیوں پہلے فراموش کردیا تھا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم نیم تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں ماررہے ہیں۔ سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کو خرید کر ہم سمجھتے ہیں کی ترقی کرسکیں گے۔ یہ خوش فہمیاں ہمیں زوال کی ڈھلان پر لے گئی ہیں۔ پستی کے سفر کو ہم صرف اس وقت روک سکتے ہیں جب ہم اپنی ذہانتوں کا اعتراف کریں۔ اور انہیں وہ تمام مواقع فراہم کریں جس کے بعد ہی کوئی سماج ترقی کرتا ہے۔ الکندی نے نویں صدی عیسوی میں تحریر کیا تھا۔ ''ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم سچائی تسلیم کرنے میں نہ شرمائیں۔ اور جہاں کہیں سے بھی وہ حاصل ہو اسے اپنے میں جذب کرلیں جو سچائی کی تلاش میں نکلتا ہے، اس کے لئے خود سچائی سے زیادہ کوئی شے قیمتی نہیں ہے۔ یہ اسے کبھی کم حیثیت نہیں بناتی کبھی رسوا نہیں کرتی۔'' ❁❁

# ڈاکٹر عبدالسلام (نوبل لاریئٹ) کے متعلق

## برطانوی استاد سر فریڈ رک ہوئیل کے تاثرات

سر فریڈ رک ہوئیل کا شمار بیسویں صدی کے جلیل القدر آسٹرونومر میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بگ بینگ کی سائنسی اصطلاح سے دنیا کو متعارف کیا۔ اُن کا نام سائنس فکشن رائٹر کی حیثیت سے بھی مغربی ممالک میں زبان زدِ عام ہے۔ اُن کے بعض خیالات سائنسدانوں کی عام روش سے ہٹ کر بہت عجیب قسم کے تھے۔ مثلاً 1990ء میں ایک مضمون شہرہ ءآفاق رسالہ نیچر میں شائع ہوا جس کے مطابق سورج کے اندر سن سپاٹس کی وجہ سے زمین پر انفلوئنزہ گاہے بگاہے پھیلتا ہے۔ اُن کا یقین تھا کہ سپیس مختلف قسم کی وائرسز سے بھری پڑی ہے۔ جو سن سپاٹس کی وجہ سے زمین پر پہنچ جاتی ہیں 1958ء میں انہوں نے یہ انوکھی مگر حیران کن دریافت کی کہ انسانی جسم کے اندر ہیوی کیمیکل ایلیمنٹ جیسے آکسیجن کاربن اور آئرن جو موجود ہیں وہ بڑے بڑے ستاروں کے پھٹنے سے زمین پر آئے تھے۔ گویا ہم لوگ سٹار ڈسٹ سے بنے ہیں۔ زندگی کے آخری ایام تک وہ کائنات کی سٹیڈی سٹیٹ تھیوری کے قائل تھے۔ جس کے مطابق کائنات کا کوئی معین آغاز نہ تھا۔ اُن کی کتابوں سے The Alchemy of Love اور A for Andromeda بہت مشہور ہیں۔ موخرالذکر کتاب پر ٹیلیویژن سیریز بھی بنائی گئی۔ ان کی آٹو بائیوگرافی A Home where the wind blows بہت دلچسپ کتاب ہے۔ ان کی پیدائش 1915ء میں یارکشائر میں ہوئی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں سینٹ جانز کالج میں عرصہ دراز تک پروفیسر رہے۔ 1972ء میں اُن کو سر کا خطاب دیا گیا اُن کی وفات 23/ اگست 2001ء کو برطانیہ میں ہوئی۔ جب ڈاکٹر عبدالسلام بطور طالب علم سینٹ جانز کالج میں آئے تو سر فریڈ رک ہوئیل اُن کے استاد مقرر ہوئے۔ مندرجہ ذیل مضمون انہوں نے ڈاکٹر سلام کی وفات پر لکھا جو کالج کے رسالہ The Eagle میں شائع ہوا۔

مجھے پختہ یقین نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ عبدالسلام سینٹ جانز کالج 1948-1947ء میں عین اس وقت طالبعلم بن کر پہنچا جب اس وقت غیر معمولی قسم کی سردی کے موسم کا دور دورہ تھا اس سرد

موسم کا صحیح اندازہ کرنا کہ وہ کتنا ناموافق تھا یا اس کا محض تصور کرنا اس وقت تک لامحال ہے جب تک انسان نے جنگِ عظیم دوئم کے بعد کے سالوں کا خود تجربہ نہ کیا ہو۔ ہمارے وزیرِ اعظم ونسٹل چرچل نے تو ہمیں دھوپ بھرے علاقوں کے سہانے سپنے دکھلائے تھے مگر ہوا اس کے برعکس یعنی 1947-1948ء کا بدترین موسم سرما۔ میری رہائش سینٹ جانز کالج میں نیوکورٹ والے حصے میں تھی جو اجتماعی رائے عامہ کے مطابق کالج کا بدترین حصہ تھا اس حصہ میں عمارتیں نصف انیسویں صدی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈیزائن کی گئی تھی۔ اُن کے اندر کمروں میں بڑی بڑی فائر پلیسز اور وسیع و عریض چمنیاں تھیں جو کوئلہ بُرے طریق سے ہڑپ کرتی تھی تا بوائلر رومز کو سرو کیا جا سکے۔ جو اکیڈمک انجن کو سٹیم مہیا کرتا تھا اُس کا ڈیزائن ایسا تھا صبح کے وقت کالج کو روشن کرتا تھا پھر دن کے وقت بھی یہ سلسلہ متواتر جاری رہتا۔ مگر یہ کام 48-47 کے سالوں میں جاری نہ رہ سکا۔ اگر ہم اس سردی کے موسم میں آگ جلانا چاہتے تو یہ کام خود کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ آگ جلانے کے سامان کو بھی خود ہی مہیا کرنا ہوتا تھا۔ ہاں اگر کوئلہ ختم ہوجاتا تو یہ کام جاری نہ رہتا۔ طلبہ کو 18 نیوکورٹ مین سپروائز کرنے کے لئے پورے ہفتے کا راشن کوئلوں کا ایک بیگ ہوتا تھا۔

اوپر بیان کردہ تکلیف کے برخلاف ہمارے لئے ایک عیاشی والی بات ہوتی تھی کہ کالج میں ریاضی کی تعلیم کے لئے ابھی بھی چار لیکچرار ہوتے تھے۔ Peter and white smithes اور pure math کے لئے howarth کے ساتھ میں applied math کیلئے مقرر تھے۔ howarth کا کمرہ میرے ساتھ ملحقہ تھا جو سیڑھوں کے قریب تھا۔ اس کا کمرہ میرے کمرہ سے فنی اور تکنیکی اعتبار سے بہت ایڈوانس تھا کیونکہ اس کے اندر فائر پلیس کو بلاک کر دیا تھا۔ اس کی جگہ کمرہ کے اندر گیس فائر تھی جو طلباء اس کے کمرہ میں کوچنگ کے لئے آتے تھے ان کی خاطر تواضع اس گیس فائر سے کی جاتی تھی۔ کمرہ کے باہر درجہ حرارت 20- متواتر رہنے لگا تھا اور میرے کمرہ کے اندر گیس فائر کا کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ خود کو گرم رکھنے کے لئے طلبا کو میرے کمرہ میں جو نظر آتا وہ اپنے اوپر اوڑھ لیتے۔ دوسری اشیاء کی طرح جنگ کے بعد پہننے کے کپڑے بھی راشن پر ملتے تھے۔ چنانچہ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کا ہاتھ جس کپڑے پر پڑتا وہ اسے دبوچ لیتا۔ چاہے وہ لباس کتنا ہی فرسودہ ہی کیوں نہ

ہو۔ پھر میرے طلبا نے یہ بات خوب جان لی کہ جو ملتا ہے پہن لو کیونکہ ہم تو وہاں کائنات کے لاین حل مسائل کا حل تلاش کرنے کے مقصد سے جمع ہوتے تھے۔ سیبوں پر گزارا۔

یہ وہ صورتحال جس میں عبدالسلام کیمبرج پر وارد ہوا آئندہ زندگی میں اس کو ملنے والی کامیابیوں کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے ایسے دشوار حالات میں زندہ رہنا ممکن بنالیا تھا۔ عبدالسلام انڈیا میں ریاضی کی ڈگری پہلے ہی حاصل کر چکے تھے جو کہ اس وقت کا دستور تھا۔ پاکستان قریب قریب اسی دور میں بنا جب سلام کیمبرج روانہ ہوا تھا۔ گرم علاقے سے سرد علاقے کی طرف جاتے ہوئے سرد موسم کا ضرور سوچا ہوگا لیکن انڈیا میں اچھا کھانا کھاتے ہوئے اس ملک میں کھانا نہ ملنے کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ چنانچہ کالج میں آمد پر اس کی فوڈ راشن بک آتے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس پہلے موسم سرما میں اس نے سیب کھا کھا کر گزارہ کیا۔ کیونکہ مارکیٹ میں صرف سیب ہی کوپن کے بغیر خریدے جا سکتے تھے شاید آلو بھی خریدے جا سکتے تھے مگر شاید وہ آلو پکانا نہیں جانتا تھا میں مذاق نہیں کر رہا یقین کریں 1951 ۔1952 تک ہمارہ ہفتہ وار پنیر کا راشن ایک اونس ہوتا تھا لوگ قطار میں کھڑے ہو کر پنیر کیوں لینا چاہتے تھے اس سے انگریز قوم کے مزاج کی کوئی خاص تعریف نہیں ہوتی۔ ریاضی کے شعبہ میں کالج کا سینئر لیکچرار ہونے کی بنا پر اس بات کی ذمہ داری کے طلبا کو کس گروپس میں بانٹا جائے یہ پیٹر وائٹ کے کندھوں پر پڑی۔ عموماً پانچ یا سات طلباء کے گروپس بنائے جاتے تھے۔ جو ایک سال تک برقرار رہتے تھے۔ بعض دفعہ اس میں معمولی سی تبدیلی بھی ہو جاتی لیکن اکثر ایسا نہ ہوتا تھا۔ ہر طالب علم کو دو گھنٹہ کی سپرویژن ملتی تھی۔ ایک گھنٹہ پیور میتھ میں ایک گھنٹہ اپلائیڈ میتھ میں۔ پھر ہم چاروں لیکچرارز کے درمیان بھی alternation ہوتی تھی۔ ایک ٹرم سے دوسری ٹرم تک۔ یعنی وائٹ اور سمتھز ٹرم پیور میتھ پڑھاتے اور میرے ساتھ ہاورتھ اپلائیڈ میتھ پڑھاتا اگلی ٹرم میں یہ بدل جاتا اور ہم دونوں پیور میتھ پڑھاتے تھے۔ اس طریق کار سے کالج کے لیکچرارز پر کم سے کم دباؤ اور بوجھ پڑتا تھا۔ جبکہ چھوٹے کالجز میں ایک لیکچرار پیور میتھ پڑھاتا تو دوسرا اس کے ساتھ اپلائیڈ میتھ پڑھاتا اور یوں طلباء دونوں سے پڑھتے کالج میں لیکن بعض لیکچرارز ایسے بھی ہوتے تھے۔ جو پیور اور اپلائیڈ میتھ پڑھانا پسند کرتے تھے۔ جیسے PARSLA جس کا تعلق جی کنگز کالج سے تھا اور MR

INGHAM جس کا تعلق کنگز کالج سے تھا۔ مجھے کسی نے بتلایا کہ میرے گریجویٹ طالب علموں میں سے J V NARLIKAR کنگز کالج کا آخری طالب علم تھا۔جس نے 1960ء کی دہائی میں دونوں مضامین پڑھائے تھے۔ بہرحال عبدالسلام ان نادر روزگار طالب علموں میں سے تھا جس کو صرف اکیلے پڑھایا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا کلاس میں کوئی پارٹنر نہ بن سکا تھا جیسے کہ طلباء کے گروپس بنائے گئے تھے۔ ہاورتھ نے نے فرسٹ ائیر میں اسے پڑھایا ایک روز ڈنر کے بعد شام کو کافی پینے کے دوران اس نے مجھے بتلایا کہ اس کا ایک سٹوڈنٹ انڈیا سے آیا ہے جو بہت ہی لائق وفائق ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کچھ عبدالسلام کے بارے میں کچھ معلوم ہوا۔ ہاورتھ سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ عبدالسلام کی یہ عجیب سی عادت تھی کہ وہ جھک کر کالج کے کورٹس میں اسلامی (انڈین) طریقے سے سلام کرتا تھا۔ گویا اس کے گھٹنے سڑک کی اینٹوں کو لگ جاتے تھے۔ چنانچہ leslie یا پیٹر وائٹ سلام کو سمجھاتا کہ ایسی تعظیم اورعزت کی کیمرج میں کوئی ضرورت نہیں۔ جب میرا وقت لینٹ ٹرم میں عبدالسلام کی فرداً فرداً سپرویژن کے لئے آیا تو یہ اسلامی طریقہ کم ہوکر ہاتھ ہلانے اور دور سے سلام کہنے تک محدود ہو گیا۔LENT TERM کے دوران غضب کی سردی پڑی اس کے بعد تو صرف زندہ رہنا ہی محال ہو گیا۔ کلاس روم میں بھی میں گھنٹہ ختم ہونے کا انتظار کرتا تا کہ میں کامن روم میں جاسکوں۔ جہاں آگ کمرہ گرم کرنے کے لئے جل رہی ہوتی تھی۔اورعبدالسلام اگلے سیب کا منتظر ہوتا تھا۔LENT TERM آئی اور چلے بھی گئی اور پھر جون کے وسط میں میری ملاقات عبدالسلام سے دوبارہ ہوئی۔میری یہ سرسری ملاقات اس سے سیکنڈ کورٹ کی بلڈنگ میں ہوئی میں نے اس سے سوال کیا کہ اس کے ابتدائی امتحانات کیسے رہے۔؟ اس نے جواب دیا کہ بہت خراب۔ بہت غلطیاں سرزد ہوئیں اور یہ کہہ کر قہقہ لگاتے غائب ہو گیا۔دوکلچرز کا تصادم ۔ جہاں تک ابتدائی امتحانات کا تعلق ہے کلاس میں طلباء کی لسٹ اوران کے امتحان میں نمبران کے سپر وائزر کو بھجوادیئے گئے۔عبدالسلام نے اول پوزیشن حاصل کی تھی۔اور میرے خیال میں اس فہرست میں تیسرے نمبر پر تھا۔اس کے بعد اس کا ٹرائی پوز کا سال شروع ہوا۔اور میری اس سے ملاقات پہلے سے زیادہ ہونے لگی۔ہاورتھ نے اس وقت برسٹل یونیورسٹی میں اپلائیڈ میتھ کی چیئر قبول کر لی تھی۔اور میری

عبدالسلام سے زیادہ ملاقات کی وجہ یہی تھی ۔ یہ فی الحقیقت دو کلچرز کا تصادم تھا۔انڈیا میں اس نے جس مکتب فکر میں تعلیم حاصل کی تھی اسے رامانوجن سکول کہا جاتا ہے جس کے مطابق یہ جاننا کہ حقیقت کیا ہے اس کوفوقیت حاصل ہے اس امر پر کہ اس حقیقت کو سچ کیسے ثابت کیا جائے؟ میری ٹریننگ اس کے برعکس کیمرج کے مکتب خیال میں ہوئی تھی جس کہ مطابق یہ جاننا کہ اس کی حقیقت کیا ہے اس کی زیادہ اہمیت نہیں صرف اس کو سچا ثابت کرنا زیادہ ضروری ہے چنانچہ ہم دونوں نے اس ٹرائی پوز کے بہت سارے مسائل کو جوں توں کر کے حل کر ہی لیا۔ٹرائی پوز میں درپیش سوالات کے جوابات کی صاف ستھری فائلیں تیار کرنا یہ کام جس طرح بہت سارے دوسرے کرتے تھے میری طبیعت اس جانب مائل نہ ہوسکی۔

چنانچہ اکتوبر کے مہینہ میں جملہ فرائض کو یوں بغیر سوچے سمجھے فوری طور پر کرنے پر مجھے بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ لمبی تعطیلات کے بعد میرے ذہن کو زنگ لگ چکا ہوتا تھا۔اور اب مجھے دوبارہ ہر چیز پڑھانا ہوتی تھی ۔مگر نومبر کے وسط تک یہ خوف ذہن سے مائل ہو چکا تھا اور بقیہ سال بھی یہی حالت رہتی حتیٰ کہ مئی کا مہینہ آجاتا اور ہر کام آسان لگنے لگتا تھا۔ بُرے اوقات میں میرے لئے یہ کام زیادہ بوجھل نہ ہوتا تھا۔ جب میں عبدالسلام جیسے طالب علم کے ساتھ (ریاضی) کے گھمبیر مسائل میں گُم ہوجاتا تھا بہ نسبت ایسے طلباء کے جو کلاس میں یوں ہی بیٹھے رہتے اور کھڑکی سے باہر دور فضا میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہوتے موخر الذکر طلباء کے ساتھ گویا انسان کو دو بھاری پتھر اوپر کی طرف لے جانے ہوتے تھے۔ ایک بھاری پتھر تو وہ ریاضی کا اصل مسئلہ ہوتا تھا۔اور دوسرا کند ذہن طالب علم کو وہ مسئلہ سمجھانا ہوتا تھا۔عبدالسلام کے ساتھ انسان کو صرف ایک پتھر اوپر کی طرف لے جانا ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ خود اس پتھر کو پوری قوت و استعداد کے ساتھ دھکیلتا تھا۔اس دوران زمین ایک بار پھر اپنے مدار پر گھوم چکی ہوتی تھی اور عبدالسلام سے جس کام کی توقع کی جاتی تھی ۔اس کام کو وہ سرانجام دے چکا ہوتا تھا۔یعنی میتھ کے ٹرائی پوز پارٹ دوم میں اس نے اول پوزیشن حاصل کی چنانچہ اب کی بار میری اس سے ملاقات تھرڈ کورٹ کی عمارت میں ہوئی جو کہ لائبریری کی طرف جاتے ہوئے موڑ پر واقع ہے۔اس نے مجھے پُر جوش کلام کیا۔ میں وہیں رک

گیا۔ اور پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بے اختیار چلنا شروع کیا اس نے مجھے بتایا کہ اسے ایک مشکل مسئلہ درپیش ہے جو کہ مندرجہ ذیل تھا۔ حکومت پاکستان نے اسے تھرڈ ایئر کا سکالر شپ مہیا کیا تھا اس نے سوچا کہ وہ فزکس پارٹ دوم کا اس سال مطالعہ حاصل کرنے کی بجائے میتھ پارٹ دوم کی کلاسز لے لیکن اس نے ابھی تک چونکہ تجرباتی فزکس نہ کی تھی لہٰذا اس کو اس مضمون میں دوسرے درجہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی امید نہ تھی جبکہ اگر وہ میتھ پارٹ سوم کرے تو اسے یقین کی حد تک اعتماد تھا وہ فرسٹ پوزیشن حاصل کر سکے گا۔ جس کی وجہ سے وطن عزیز میں سرکاری حکام مسرت کا اظہار کریں گے۔

اس نے مجھ سے استفسار کیا کہ مجھے اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیئے۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد میں نے بالآخر یہ کہا کہ اسے وہ مضمون پڑھانا چاہیئے جس کی پاکستان کو مستقبل میں زیادہ ضرورت ہوگی بجائے شارٹ ٹرم فائدہ حاصل کرنے کے کئے۔ جس سے میری مراد یہ تھی کہ وہ فزکس پارٹ دوم کرے (یعنی ریاضی دان بننے کی بجائے وہ فزکس کی فیلڈ اختیار کرے) بعد کے سالوں میں وہ مجھے بتلایا کرتا تھا کہ یہ گفتگو اس کی زندگی کی اہم ترین گفتگو تھی۔ چنانچہ کیونڈش لیبارٹری میں ریاضی کے ایسے ماہر کا گھومنا پھرنا، لیب میں کام کرنے والے افراد کے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ خیر کچھ بھی ہو جلد ہی عبدالسلام سے ہر کوئی متعارف ہو گیا۔ اور تھیورٹیکل فزکس میں ہونے والی تازہ بتازہ ریسرچ اور رینارمالائزیشن تھیوری میں اس کے انکشافات میں وہ ایسا انسان ثابت ہوا جس پر نت نئے آئیڈیاز ہر وقت ہر آن نازل ہوتے رہتے ہوں۔ جوں جوں سال تیز رفتاری کے ساتھ گزرتے گئے وہ دیکھتے ہی دیکھتے کالج کا فیلو مقرر ہو چکا تھا پھر یونیورسٹی کا لیکچرار۔ پھر امپیریئل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (لندن یونیورسٹی) میں تھیورٹیکل فزکس کا پروفیسر۔ مجھے ہمیشہ یہ امید بندھی رہی کہ عبدالسلام ضرور ایک روز کیمرج واپس آ جائیگا اور میرا یقین ہے کہ اگر اسے تھیورٹیکل فزکس کی چیئر پیش کی گئی ہوتی تو وہ ضرور واپس لوٹ آتا۔ ایسے دو مواقع 1960ء کی دہائی میں نمودار ہوئے لیکن دونوں مرتبہ فیکلٹی آف میتھ نے الیکٹرورل بورڈ کو ہدایت کی کہ یونیورسٹی کو Continuum Mechanics کے پروفیسر کی زیادہ ضرورت ہے بہ نسبت تھیورٹیکل فزکس کے۔ اس فیصلہ سے میں

بھی متفق نہ تھا اور یہ جملہ وجوہات میں سے ایک وجہ تھی کہ 1960ء کی دہائی کے نصف سے میرے تعلقات فیکلٹی آف میتھ کے ساتھ گرتے گرتے صفر درجہ تک پہنچ گئے۔ میں نے کیمرج کو 1972ء میں الوداع کہہ دیا اور عبدالسلام آئی سی ٹی پی کا ٹریسٹ (اٹلی) میں ڈائریکٹر مقرر ہو گیا۔ تو میں اس کے ساتھ تواتر کے ساتھ ملاقات کی غرض سے جاتا رہا۔ چنانچہ زندگی کے آخری سالوں میں میرا اس سے ملنا زیادہ ہوا۔ اس کا ایک نقطۂ نظر تھا جس کو اس نے زندگی کے آخری سانس تک سینے سے لگائے رکھا اور جس سے میں قابل ستائش سمجھتے ہوئے یہاں ریکارڈ میں لانا چاہتا ہوں۔ عبدالسلام کے نزدیک بیسویں صدی کا سب سے بڑا عظیم سائنسدان بلاشبہ پال ڈائراک تھا۔ شاید کوئی استدلال کرے کہ ہاں سینٹ جانز کالج کا ایک گریجوایٹ اسی کالج کے دوسرے گریجوایٹ کی لازماً تائید کرے گا لیکن جب میں نے اس سے استفسار کیا کہ اس فہرست میں آئن سٹائن بھی شامل ہے؟ اس کا جواب اس ضمن میں دوٹوک تھا اور وہ یوں تھا:۔

''آئن سٹائن کے لئے اس کا تمام میتھ اس کو کر کے دیا جاتا تھا جبکہ ڈائراک نے اس کو خود ایجاد کیا نہ صرف یہ بلکہ وہ ڈائراک ہی تھا جس نے یہ بات واضح کی کہ تھیورٹیکل فزکس کی طرف والا راستہ Abstract Math سے ہو کر جاتا ہے نہ کہ میتھ کو انجینئر کرنے سے۔ میرے نزدیک عبدالسلام کا یہ نقطۂ نظر بالکل درست تھا۔'' (ترجمہ محمد زکریا ورک ویکلی لاہور 14 ستمبر 2002ء)



## رونا دلیل نہیں

حضرت امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ ایک دن ایک مشہور فقیہ قاضی شریح بن حارثؓ کوفی کے ہاں کوئی گیا۔ وہاں کوئی عورت اپنے خاوند کی شکایت لے کر آئی۔ اور زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ قاضی صاحب یہ بہت مظلوم معلوم ہوتی ہے۔ پوچھا! کوئی دلیل؟ میں نے کہا کہ اس کا رونا! فرمایا۔''یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی شام کو روتے ہوئے گھر آئے تھے۔''

# ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام میری نظر میں



1۔عصرِ حاضر کی سائنس کی دنیا کا مہرِ درخشاں اور در نیوٹن تھے نہ صرف برّ صغیر پاک و ہند بلکہ اسلامی دنیا کے واحد سائنسدان جس نے طبیعات میں نوبل جیسا بڑا انعام حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فی زمانہ ذہانت صرف مغرب ہی کی میراث نہیں۔

2۔تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترویج کے لئے ایک بہت ہی بااثر وفعال کردار کی شخصیت تھے۔

3۔اپنے نافع الناس ہونے کا عملی ثبوت طبیعات کے اس بین الاقوامی ادارے (ICTP) کے قیام کی صورت میں دے گئے۔ جہاں سے اُن کی وفات تک (21رنومبر 1996ء) پسماندہ وترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے تقریباً 40000 چالیس ہزار نوجوان سائنسدان جدید سائنسی علوم سے مستفید ہو چکے تھے۔ اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

4۔علی گڑھ یونیورسٹی کے ترجمان مجلہ ماہنامہ (تہذیب الاخلاق جنوری 1986ء) رقمطراز ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے تاج محل کے متعلق لکھا: ''تاج محل ایک چشمِ عشق کا ایک منجمد آنسو ہے'' تاج محل کی طرح ICTP ہر چشمِ بینا سے خراجِ عقیدت وصول کر رہا ہے۔ اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر میں قائم اس کے جمالِ لیلیٰ علم، نورِ شمع علم، انسانیت کا سرچشمہ، ایک حساس اور دردمند دل کا خونِ جگر ہے۔''

5۔امن کا شہزادہ۔ جس نے دنیا میں ایٹمی تباہی کو ختم کرنے کے لئے اور بین الاقوامی امن قائم کرنے کے لئے کئی کمیٹیوں کی صدارت کی، اور ہزار ہا میل کا سفر طے کیا۔ چنانچہ اس مساعی جمیلہ کے اعتراف کے طور پر آپ کو UNO کی طرف سے 1968ء میں ''ایٹم برائے امن'' کا انعام دیا۔

6۔وسیع القلب اور مشفق انسان۔ جس نے دنیا بھر کے ہزاروں طلباء کی تعلیم کا ذمہ لیا، اور غریب ممالک کے تعلیمی اداروں کو اپنے بے لوث اثر ورسوخ سے سائنسی سامان کی فراہمی کو سہل اور ممکن بنا دیا۔

7۔ایک سچا اور اور بے لوث محب وطن کئی مما لک کی شہریت کی پیشکشوں کوٹھکرا کر جس نے ساری عمر سبز پاسپورٹ پر سفر کیا اور اپنے ملک کے پانچ صد سائنسدانوں کی تربیت کا بیرون مملک انتظام کیا۔اور یہ امر حقیقت ہے کہ ڈاکٹر ثمر مبارک جیسے کئی نامور سائنسدانوں کی تربیت پروفیسر ڈاکٹرعبدالسلام کی مرہونِ منت ہے۔

8۔ایک درویش صفت انسان۔یہ ایک حقیقت ہے کہ باوجود شش جہات سے ان گنت انعامات اورعنایات پانے والے پروفیسر ڈاکٹرعبدالسلام کے پاس تکبّر اورغرور تک پھٹکا نہیں اور انعامات کی رقوم سے سرے محل یا رائیونڈ محل نہیں کھڑے کئے اور نہ ہی ذاتی طمع کی خاطر ایٹم بم کی ٹیکنالوجی کسی بلیک مارکیٹ میں فروخت کی ۔اسی عظمت کی قدر سب سر براہانِ مما لک بھی کرتے تھے۔چنانچہ اس انسان دوستی کی وجہ تھی کہ کہ ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی وزٹ کرنے گئے تو یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء اُن کے استقبال کے لئے باہر آ کر کھڑے ہوگئے،اور طلباء نے گاڑی کا انجن بند کروا کر عزت افزائی کی خاطر گاڑی کو دھکیل کر یونیورسٹی کے اندر لا کھڑا کیا۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دِیدَہ وَر پیدا



## کچھ لوگ

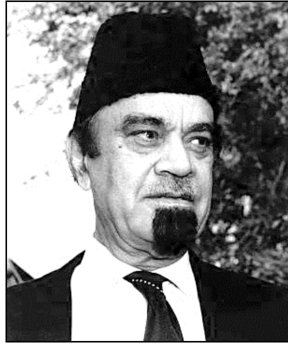
☆ کچھ لوگ خطوط کی طرح ہوتے ہیں جنھیں بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا اور دل چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمارے پاس رہیں۔

☆ کچھ لوگ دعاؤں کی طرح ہوتے ہیں ابھی ہم سجدے میں ہی سر جھکائے ہی ہوتے ہیں کہ وہ اشکوں کی طرح آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیروں میں راستے مل جاتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ گھروں کی طرح ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی بھی دور کیوں نہ ہوں دل ان کی روح میں سمٹ جانے کے لئے بے چین رہتا ہے۔

# پاکستان کا ایک مایہ ناز سپوت



ایک ذہین، دیانتدار عظیم ماہر اقتصادیات نائب صدر عالمی بینک صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب جو ایم ایم احمد صاحب سے معروف تھے۔آپ کو دس سال تک 1962ء تا 1972ء تک پاکستان کی اقتصادیات کے استحکام اور ترقی کے لئے ان تھک مساعی کی توفیق ملی۔آپ صدر محمد ایوب خاں صاحب کے دور میں منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئر مین رہے۔ پاکستان کا یہ دور معاشی لحاظ سے سنہری کہلاتا ہے۔آپ 13رجنوری 1913ء کو قادیان میں صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم قادیان سے حاصل کی۔گورنمنٹ کالج لاہور سے ہسٹری میں ایم اے کیا۔اس دوران لاء کالج میں داخلہ لیا۔1933ء میں آئی ایس آئی کے ارادہ سے لندن آ گئے۔آئی ایس آئی کے بعد ایک سال آکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں گزارا۔اور 1938ء میں واپس وطن پہنچ گئے۔اپنی ملازمت کا آغاز یو پی کے قصبہ گوڑ گاؤں سے کیا۔جہاں مسلمانوں کے لئے حفاظتی انتظامات کی توفیق ملی۔

اگست 1947ء میں امرتسر میں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے طور پر کام کیا۔قیام پاکستان کے بعد ضلع سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر لگائے گئے۔کیونکہ یہ ضلع سرحدی تھا اور مہاجرین کی آمد ورفت بہت زیادہ تھی۔مگر آپ نے نہایت مستعدی سے خدمات انجام دیں۔ایک دفعہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ مجھے پیغام ملا کہ ایک شخص مجھ سے ملنا چاہتا ہے مگر وہ اندر نہیں آ سکتا۔میں خود باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ معذور ہے اس نے مجھے بتایا کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن جو ریڈ کراس کی چیئر مین تھیں ME CENTER میں آئی ہوئی ہیں۔اور سینٹر کا سامان ریلوے کی چودہ ویگنوں میں لوڈ کروا کر انڈیا روانہ کرنے کا آرڈر دے چکی ہیں۔میں نے اسی وقت ریلوے کے ہیڈ کو فون کر کے وہ سامان رکوا دیا۔بعد میں مجھے ایک جرنیل کا فون آیا کہ تم لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے احکامات کی خلاف

ورزی کر رہے ہو۔میں نے جواب دیا کہ میں اس وقت صرف پاکستان گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔آپ ڈپٹی کمشنر میانوالی خدمات کے بعد ایڈیشنل کمشنر لاہور بنادیئے گئے ۔1851ءمیں مرکزی سیکرٹری مالیات بنائے گئے۔

1962ءمیں مرکزی حکومت میں سیکرٹری کامرس کے عہدہ پر فائز ہوئے ۔صدر محمد ایوب خاں صاحب نے آپ کومنصوبہ بندی کمیشن ڈپٹی چیئرمین نامزد کیا۔چیئرمین صدر خود تھے ۔ایوب خاں کے دور میں پاکستان میں صنعتی انقلاب رونما ہوا۔بڑے بڑے شہروں کے اطراف میں دور دور تک صنعتیں لگنی شروع ہوگئیں۔لاہور،شیخوپورہ،گوجرانوالہ،فیصل آباد کے گردونواح،کراچی حیدرآباد روڈ پرصنعتوں کا قیام جوآپ کونظرآتا ہے۔وہ ایوب خاں کے دور کی یادگار ہیں۔پاکستان جلدترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونے والا تھا کہ ایوب خان بیمار ہوگئےتوصدر عالمی بنک نے بذریعہ تارتشویش کا اظہار کیا کہ اگرآپ پانچ سال مزید اس نظام کو چلا سکتےتو پاکستان یقینی طور پرترقی یافتہ ملک بن جاتا۔اوراپنے قرضے اُتارنے کے قابل ہوجاتا۔ایوب خاں کے بعد یحییٰ خان کے دور میں آپ کوصدر پاکستان کا اقتصادی مشیر مقرر کیا گیا یہ عہدہ مرکزی وزیر کے برابر تھا۔آپ نے اس دور میں بھی پاکستان کے اقتصادی حالات کوسنبھالا دینے کی مقدور بھر کوشش جاری رکھی ۔1971ءتا 1972ءجواقتصادی بجٹ پیش کیا۔جس کو ماہرین معاشیات نے نہ صرف سراہا بلکہ بہترین بجٹ قرار دیا۔پاکستان ٹائمز نے 27/جون 1971ءکواپن اخبار میں ان الفاظ میں سرخی لگائی ۔خوداعتمادی اور کفایت شعاری کا بجٹ ۔دوسری سرخی یہ تھی بجٹ تجاویز کےحقیقت پسند ہونے کا خیرمقدم کیا گیا۔تفصیل یہ تھی۔’’ہفتے کے روز بجٹ پیش کیا گیا اس کا لاہور شہر میں بڑے اطمینان کے ساتھ خیرمقدم کیا گیا کیونکہ نئے ٹیکسوں کے متعلق جوتجاویز رکھی گئی ہیں ان کا عام آدمی پر زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا۔‘‘

روزنامہ نوائے وقت نے اپنی 27/جون 1971ءکی اشاعت میں ’’حقیقت پسندانہ بجٹ‘‘ کے عنوان سے اداریے میں لکھا:

''اس سال مشرقی پاکستان میں بغاوت وشورش کے باعث ملک وملت میں اقتصادی زبوں حالی سے دوچار ہو گئے تھے ۔ اس کے پیش نظر نئے ٹیکسوں کا نفاذ یا مروجہ ٹیکسوں میں اضافہ کا امکان کچھ ناگزیر سا نظر آنے لگا تھا اور کم وبیش ہر شعبہ زندگی کے لوگ اپنے ذہنوں کو ممکنہ ٹیکسوں کا مزید بوجھ قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ بڑے اطمینان کی بات ہے کہ نیا بجٹ تیار کرنے والوں نے خاص حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ایسے لوگوں پر ٹیکس عائد کئے گئے ہیں جو واقعی ٹیکس ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ نئے میزانیہ کا یہ پہلو بھی بڑا خوشگوار ہے کہ اس میں ہوشربا گرانی کی چکی میں پسنے والے عوام کو کچھ سہولتیں دینے کی غرض سے اقدامات کئے گئے ہیں۔''

مارچ 1970ء میں مشرقی پاکستان میں سٹیٹ بنک اور دیگر بینکوں کو لوٹنے سے نیشنل عوامی پارٹی کے کارکنوں کے پاس پاکستانی کرنسی کے انبار لگ گئے۔ وہ سمگلروں سے ملکر پاکستان سے اشیاء خریدنے اور براستہ ہندوستان مشرقی پاکستان میں لے جاتے اور باغیوں کی مدد کرتے۔ پاکستان میں افراط زر کا ایک سیلاب آنے کو تھا۔ جناب ایم ایم احمد صاحب کی فہم وفراست نے اقتصادی حالت کو بروقت بھانپ لیا۔ چنانچہ آپ نے پانچ سو اور ایک سو روپے والے کرنسی نوٹ کی قانونی حیثیت ختم کر دی ۔ جس سے پاکستان اقتصادی تباہی سے بچ گیا اور روپے کی گرتی ہوئی قدر میں ٹھہراؤ آ گیا روزنامہ نوائے وقت جناب ایم ایم احمد کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے لکھتا ہے :
''بڑے کرنسی نوٹوں کی منسوخی نے سمگلنگ ختم کرنے کا بہترین موقع پیدا کر دیا... سمگلروں کا کاروبار تباہ ہو گیا۔'' (لاہور 24/جون)

## پاکستانی روپے کا ڈالر کے ساتھ منسلک کرنے کا فیصلہ

ایوب حکومت میں پاکستانی روپے کو ڈالر سے منسلک کر دیا گیا۔ جس سے پاکستانی کرنسی پر بڑے خوش کن اثرات پڑے تھے۔ اور پاکستانی روپے کو کافی استحکام ملا تھا۔ 1972ء میں جب بھٹو حکومت برسر اقتدار آئی تو پاکستانی روپے کی قیمت بہت ہی کم کر دی گئی جبکہ اس کمی کے اثرات پاکستانی معیشت پر پڑنے لگے تو بھٹو صاحب نے جناب ایم ایم صاحب سے رابطہ کیا۔ اس سلسلہ

میں ایم ایم صاحب بیان کرتے ہیں۔ ''روپے کی قیمت میں کمی کر دی گئی اس سے پہلے ڈالر کے مقابلے میں ساڑھے سات تھی انہوں نے گیارہ روپے کر دی تو جب 11/روپے ہوئی تو صدر صاحب نے مجھے بلوایا۔ آئی ایم ایف کے ساتھ اس وقت غلام اسحاق خاں اور آفتاب قاضی نے بات کی تھی تو صدر نے مجھے بلوایا اور کہا یہ بہت زیادہ ہے میں اس سلسلے میں بات کروں میں نے آئی ایم ایف سے بات کی۔ تو انہوں بتایا کہ یہ تو پاکستان کی جانب سے بذات خود کمی کی گئی ہے۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا میں نے غلام اسحاق خاں سے بات کی کہ یہ آپ نے کیوں کیا اتنی زیادہ کمی کیوں کر دی۔ یہ تو بہت زیادہ ہے کہنے لگے ہاں میں مانتا ہوں یہ بہت زیادہ ہے لیکن یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ اگر ڈی ویلویشن کامیاب کرنا ہے تو ایک ہی جمپ میں ایسے لیول پر لے جاؤ کہ پھر دوبارہ مستقل قریب میں جلدی کمی نہ کرنی پڑے۔

(ہفت روزہ حریت اسلام آباد 2 جنوری 1997ء)

1972ء میں آپ استعفیٰ دے کر ورلڈ بینک میں چلے گئے۔ اور ''نائب صدر عالمی بنک'' اور آئی ایم ایف کے ایگزیکٹو سیکرٹری کو طور پر 1984ء تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران بھی آپ نے پاکستان کے مفاد کو مدنظر رکھا۔ جہاں بھی پاکستان کو فائدہ پہنچایا جا سکتا تھا۔ آپ اس میں عمر بھر کوشاں رہے۔ ورلڈ بنک سے ریٹائرڈ ہو کر آپ نے امریکہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور اس دوران بھی آپ وطن عزیز کی بہتری کے لئے کوشاں رہے۔ 1989ء میں جب پریسلر ترمیم سے امریکہ نے پاکستان پر اقتصادی پابندیاں لگا کر امداد بند کر دی تھی تو آپ نے یہ پابندیاں اٹھانے میں بہت کوششیں کیں بلکہ اپنا ذاتی اثر و رسوخ بھی استعمال کیا۔ آپ یہاں فرماتے ہیں:

''ہماری جماعت (امریکہ) میں چالیس کے قریب کمیٹیاں ہیں ان سب کو لکھا کہ اپنے اپنے ایم این اے حضرات اور سینیٹرز کو کہیں کہ وہ اپنا اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور کام کریں خاص کر 14 ممبرز جن کی کمیٹی بیٹھی تھی ان پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اس سلسلے میں بھرپور کوشش کریں۔ میرے اپنے امریکن دوست تھے گورنر ریٹائرڈ۔ ان سے میں نے بات کی ان کی میں نے پریسلر سے بات کروائی اس حوالے سے جو سب سے مؤثر آدمی تھا وہ ری پبلکن تھا۔ اور یہ بھی ری پبلکن تھے۔ میں

نے ان سے بھی کہلوایا تو اس نے کہا کہ تم فون کر کے آجانا اور میں اس سلسلے میں بھرپور کوشش کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس طرح میرے اور پروفیسر دوست تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ تم کیوں کرتے ہو جب تمہارے خلاف اس اس قدر زہر اگلا جاتا ہے۔ پھر تم کیوں اسقدر کوشش کر رہے ہو تو میں نے ان سے کہا ہماری مخالفت گورنمنٹ کی پالیسی سے ہے لیکن ہماری مخالفت کا کوئی بھی اور ذرہ سا حصہ پاکستان کے خلاف نہیں ہے۔ ہم ملک کے اتنے ہی وفادار ہیں جتنا کہ کسی محب وطن کو ہونا چاہیئے۔ ہم ملک کے مفاد میں ہمیشہ کام کرتے آئے ہیں اور جہاں بھی ضرورت پڑے گی ہم کام کریں گے۔''

(ہفت روزہ حریت اسلام آباد 2 جنوری 1997ء)

صدر یحییٰ خان کی بیرون ملک ایران روانگی کے موقع پر آپ کو قائم مقام صدر پاکستان ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اس دوران ایک معاند احمدیت اسلم قریشی نے آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس وجہ سے آپ زخمی ہو گئے تھے۔ آپ کو جماعت احمدیہ کے امیر جماعت امریکہ ہونے کا اعزاز تا وفات حاصل رہا۔ آپ 23/جولائی 2002ء کو امریکہ کے ایک ہسپتال میں 89/برس کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔



## ٹلہ جوگیاں

ٹلہ جوگیاں، سلسلہ کوہ نمک پاکستان کا ایک اہم پہاڑ ہے۔ اس کی بلندی 3200 فٹ ہے۔ اس کی چوٹی پر ہندوؤں کے مندر اور پانی جمع کرنے کے تالاب ہیں۔ سکندرِ اعظم، مغل بادشاہ جہانگیر، گورونانک، اور رانجھا یہاں آئے یہاں سے جہلم 30 کلومیٹر دور اور قلعہ رہتاس 5 کلومیٹر دور ہے۔ یہ ایک پُرفضا مقام ہے اس کی چوٹی پر خستہ کھنڈرات ہیں جو کہ ایک قدیمی خانقاہ کی باقیات ہیں یہاں تک پہنچنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک جیپ کا راستہ بذریعہ قلعہ رہتاس ہے اور بھی راستے مختلف اطراف سے ہیں جہاں سے یاتری صدیوں سے بیساکھی کے میلے پر یہاں پہنچتے ہیں۔

# میں پاکستان ہوں

وطن عزیز کے باسیو! میں پاکستان ہوں۔ میں تمہارا جنت نظیر پیارا وطن ہوں۔ میں اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ ہوں تم سب میری پناہ میں ہو! آزاد اور خودمختار ہو!۔ میں حضرت قائداعظمؒ کے خوابوں کا جزیرہ ہوں۔ میں شمع آزادی کے لاکھوں پروانوں کی قربانیوں کا ثمر ہوں۔ میں بیسویں صدی کا معجزہ ہوں۔ میری بنیاد دوقومی نظریہ پر رکھی گئی تھی۔ میں داغ ہجرت کی تفسیر ہوں۔

آج سے تقریباً 76 رسال پہلے کی بات ہے کہ آج ہی کے دن لاہور میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں برّصغیر پاک و ہند کے نامور مسلم قائدین شامل تھے۔ اسی جلاس میں ایک قرارداد پیش کی گئی۔ جسے میرے نام سے منسوب کیا گیا۔ یعنی قرارداد پاکستان۔ اگرچہ مجھے بنانے کا مشورہ تو پہلے ہی کافی عرصے سے چل رہا تھا۔ مگر اب 23/ مارچ 1940ء کو مجھے بنانے کا پکا ارادہ کرلیا گیا تھا۔ مارچ 1940ء کو جب مسلمانان ہند قائداعظم کی قیادت میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تو انہوں نے بادشاہی مسجد کے فلک بوس میناروں اور راوی کے سرسبز و شاداب کناروں کو گواہ بنا کر قرار داد لاہور پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی غیر ملکی حکمرانوں کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ میرا نام ''پاکستان'' میرے ایک سپوت بیرسٹر چودھری رحمت علی نے رکھا۔ قائداعظم اور اسکے رفقائے کار مسلم لیگیوں نے اس خاکے میں رنگ بھرے۔ لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، سر ظفراللہ خان، فاطمہ جناح آگے آئے۔ یہ لوگ میرے خدمت گار تھے۔ انہوں نے میرا نام روشن کیا، میرا وقار بلند کیا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ میری تحریک کے قائد تھے۔ انہوں نے قرارداد منظور ہونے کے بعد مجھے بنانے کے لئے انتھک محنت شروع کردی۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر تقریباً سات سال کے عرصے میں مجھے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ میرے بانی قائداعظم محمد علی جناحؒ ایک بہادر انسان تھے۔ وہ ایک مضبوط کردار کے مالک تھے۔ وہ اٹل، مستقل مزاج اور اصول پسند تھے۔ ان کی گفتگو مدلل اور سحر انگیز ہوتی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ ذہین پارلیمانی شخصیت ایک ہوشیار نقاد اور بے لوث سیاستدان تھے۔ ان کا بے مثال جذبہ حُریت اور شبانہ روز محنت ہی وہ سرمایہ

تھا جس نے میرے جیسا (پاکستان) زندہ معجزہ دکھا دیا۔ جسے دیکھ کر ساری دنیا حیران وششدر رہ گئی۔ان کی شخصیت غیر معمولی صفات کی حامل تھی۔ وہ مسلمانان ہند کے سیاسی مسیحا تھے۔ان کی ساری زندگی پر آج تک کسی نے انگلی نہیں اٹھائی۔غیر کیا مخالف اور دشمن بھی ان کے کردار کے معترف تھے۔وہ قائد جنہوں نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنی ذہانت سے مجھے حاصل کیا۔میں پانچ صوبوں پر مشتمل تھا۔ پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور بنگال جسے مشرقی پاکستان بھی کہتے تھے۔میرے اپنے بھی میرے قیام پر خوش نہ تھے۔قائد اعظم کو کافر اعظم کہنے والے علماءسوٗ نے مجھے پلیدستان، اور ناپاکستان کے نام سے پکارا۔اور نام نہاد فتووں سے میرے اور اسلام کے تشخص کو بگاڑنے کی بھرپور کوشش کی۔

سوائے ایک (جماعت) کے کسی بھی مذہبی جماعت نے من حیث الجماعت میری تائید نہ کی۔ علمائے سُونے غیروں کی خوب مدح سرائی کی۔ مجھے قسم ہے اگر میں جھوٹ بولوں۔تاریخ آزادی کا مطالعہ کر کے دیکھ لو۔انہی کھوٹے سکّوں نے بالآخر مجھے بدنام کر کے رکھ دیا۔ ہاں انفرادی حیثیت میں مسلمانوں نے میری تعمیر میں خوب حصہ لیا۔میرے لئے لاکھوں انسانوں نے دنیا کی عظیم ترین ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں۔نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔آگ اور خون کے دریا عبور کئے۔میرے بیٹے سروں پر کفن باندھ کر باطل قوتوں سے ٹکراتے رہے۔انہوں نے سر دھڑ کی بازیاں لگا کر یوں شمع آزادی کو روشن رکھا اسی جدو جہد میں لاکھوں دُلہنوں کے سہاگ لُٹے، ماؤں کے لال قتل ہوئے، بہنوں کے بھائی مارے گئے۔لاکھوں بچے یتیم ہوئے یہ درست ہے کہ غلامی کی اندھیری رات میں جشن چراغاں منانے کے لئے خون شہادت کے چراغ جلانے پڑتے ہیں۔نوع انسانی کے اُجڑے ہوئے گلستانوں میں خون کی ندیاں بہائے بغیر بہاروں کا سماں پیدا نہیں ہوسکتا۔قیمتی جانوں کی قربانیاں اور خاندانوں کی بربادیاں میری آزادی کے لئے خشت اول ثابت ہوئیں تب یہ آزادی ملی۔مگر میرا وجود مسلسل غیر محفوظ رہا۔میرے سر پر خطرات کے بادل منڈلاتے رہے۔ مجھے ہمہ وقت چیلنج درپیش رہے۔قائد اعظمؒ نے جن خطرات کی نشاندہی مارچ 1946ء میں کی تھی۔ وہی بالآخر ہماری تباہی اور قومی انتشار، تفریق کا باعث بنی۔انہوں نے دکھ بھرے لہجے میں

انتباہ کیا تھا۔''وہ دشمن قوتیں جو قیام پاکستان کے خلاف تھیں اپنی ناکامی کے بعد قوم کو تقسیم کرنے کے درپے ہیں۔ان کے جھانسے میں نہ آنا۔انہوں نے مزید انکشاف کیا تھا کہ بعض شرپسند عناصر دشمنوں سے پیسے لے کر انتشار پھیلا رہے ہیں۔

جو طبقہ منفی سوچ کا علمدار تھا۔اس نے مجھے دل سے آج تک تسلیم نہیں کیا بلکہ نہرو، گاندھی اور سرحدی گاندھی کے رویے طرح میرے وجود سے اب تک انکاری ہیں۔اپنی مرضیاں مجھ پر مسلط کرنے کے درپے رہے۔گروہی، لسانی، مذہبی سیاست کو فروغ دیا اور اقتداری طاقتوں کے درباری بن کر اپنے مقاصد پورے کرتے رہے۔ ماشل لاء آیا تو اسے سلام کیا اگر جمہوریت آئی تو اسے بھی سلام کر کے مفاد پرست ٹولے نے مطلب براری کو پورا کیا۔بعض جبہ پوش نام نہاد علماءِ سُو جیسے میرے نام پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ان اسلام کے ٹھیکیداروں نے مساجد کو اپنا بزنس بنا لیا۔اور اسلام کے نام پر مدرسہ جات کھول کر ایک متشدد دین کی فوج ظفر موج تیار کر لی۔ مالی امداد سعودیہ سے حاصل کی (جن وہابیوں کو یہ کتا گردانتے تھے۔نعوذ بااللہ) ان کی امدادی رقوم کو اسی گروہ نے شیر مادر سمجھ کر ہڑپ کر لیا۔اور لگے انکل سام کے سپاہی بن کر روسی یلغار کو جہاد اسلام سمجھ کر روکنے لگے۔اور پھر اس وقت کے نام نہاد مردِ مومن نے ہیروین کلچر، کلاشنکوف کلچر کو خوب پروان چڑھایا۔اوراس کے علاوہ شیعہ سنی فساد کو پھیلا کر خون کے دریا بہائے۔خود تو صاحب انجام بد کو پہنچے مگر مجھے بھی ایک مسلسل نہ ختم ہونے والی آگ میں دھکیل گئے۔مجھ پر جنگیں مسلط کی گئیں۔ 1965ء کی جنگ جیت کر مذاکرات کے میز پر ہار دی گئی۔میجر جنرل اختر علی ملک کو دوران جنگ تبدیل کر دیا گیا تا کہ جیتی ہوئی جنگ کا سہرا شرابی یحییٰ خان کے سر پر سجایا جا سکے۔بعد ازاں اگر تلہ سازش کیس کے ذریعہ بنگلہ دیش کی بنیاد رکھی گئی۔نام نہاد الشمّس اور البدر کے خدائی فوجداروں نے تشدد کو فروغ دیا اور جو کینہ ور تقسیم ہند سے اس دوقومی نظریہ کے جانی دشمن تھے۔ان کو موقع مل گیا۔ لسانی اور مذہبی سیاست کا ڈھنڈورا پیٹا گیا اور یحییٰ خان کو مرد کامل قرار دینے والوں کی بات بن گئی۔پھر ہوس اقتدار کے دیوانے آئے۔جنہوں نے جیتی ہوئی پارٹی کو حکومت بنانے کی دعوت دینے کی بجائے اُدھر تم ادھر ہم کا نعرہ لگایا۔انتہائی بُرا وقت اُس وقت دیکھنے کو ملا جب میرا ایک بازو

مجھ سے الگ کر دیا گیا۔ میرے اندرونی اور بیرونی دشمن بالآخر 1971ء میں مجھے دولخت کرنے میں کامیاب ہوئے نام نہاد قائدعوام نے لوگوں کو خوب بے وقوف بنایا۔ طلباء کو اساتذہ سے لڑایا۔ ہاری کو زمیندار سے لڑادیا۔ مزدور کارخانہ دار کے گلے پڑ گیا۔ اس طرح سب نظام چوپٹ ہو گیا۔ روٹی کپڑے اور مکان کا ایسا پرکشش نعرہ دیا کہ اسے تو ووٹ ملے مگر عوام کو کچھ نہ ملا۔ پھر اس نے اسلام کو استعمال کیا۔ اسلامی ممالک سے دولت ہتھیانے کی غرض سے اسلامی کانفرنس کا ڈھونگ رچایا کہ اسلامی یکجہتی کا مظاہرہ کرنے کی خاطر خود مفتی دین متین بن بیٹھا۔ ایک کلمہ گو فرقہ کو اپنی کرسی کے زور پر اسلام سے نکالنے کی ناکام کوشش کی۔ اور خود اسلام سے نابلد اتنا تھا کہ جب اس پر اس کے ملک کے ہائی کورٹ میں اس پر مقدمہ چلا تو اسے نام کا مسلمان قرار دیا گیا۔ پھر اسے سمجھ آئی اور اس نے جواب دعویٰ داخل کروایا کہ مذہب انسان اور خدا کا معاملہ ہے۔

مذہبی طاقتوں کو اس کی بعض حرکات کہاں پسند تھیں۔ قومی اتحاد نے مل کر ایک جنرل سے مارشل لاء لگوادیا۔ اور وہ بھی مرد مومن بننے کے چکر میں قادر مطلق بن بیٹھا۔ اس نے قائدعوام کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا۔ اور خود جہاد افغانستان کا مجاہد بن کر عالمی لیول پر اسلامی ملکوں کی نوجوان نسل کو جنت دلوانے کی خاطر روس کے خلاف جنگ میں جھونک دیا۔ لالچ اور طمع نے اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ عورتوں تک کو کوڑے مارے گئے۔ اور اسلامی شریعت نافذ کرنے کی کوشش میں سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر ایک کلمہ گو فرقہ پر اسلام دشمن پابندیاں لگادی گئیں خود کلمہ گوؤں کو مسلمان کہنے پر اور اپنی مسجد کو مسجد کہنے پر، آپس میں سلام کہنے پر تین سال قید سنادی گئی۔ اور مزید یہ کہ توہین رسالت کا مرتکب قرار دے کر سزائے موت یا عمر قید کی سزا رکھ دی گئی۔ خدائے قہار نے اسے بھی جلد ہی عذاب النار میں ڈالا۔ اور وہ نظارہ کل عالم نے دیکھا۔ بعد ازاں جمہوریت نے پر پُرزے نکالے۔ جو کہ فوج اور بیروکریسی کو راس نہ آئے۔ فوج کہتی تھی کہ وہ اصل حاکم ہے۔ اور جمہوریت کہتی کہ میں۔ بیوروکریسی دونوں سے آگے تھی۔ میرے ہم وطنوں نے خوب غیر انسانی حرکات کر کے انسانیت کی دھجیاں اڑائیں اور ان کی خوب جگ ہنسائی ہوئی۔

میرے سیاسی اور مذہبی راہنماؤں میں سے ایک بھی قائداعظم کے کردار کے مطابق نہیں۔کوئی بنیے کوسلام کرر ہا ہے۔کوئی انکل سام کو۔کوئی اپنی انانیت کا شکار ہے۔کوئی عقل کل بن بیٹھا ہے۔ اقبال کا شاہین تو کوئی نہ بن سکا مگر کووں کی صفات میں سب مشترک وعیاں ہیں۔اگر ایک قائداعظم میری قوم کوخدا تعالیٰ اور دے دیتا تو آج امریکہ اور یورپ کے لوگ میرے پاس نوکریوں کے لئے آتے۔ ہاں یہ کیسے ممکن تھا۔میرے علماء و اساتذہ مایوسی اور انگریز کی غلامی کا شکار رہے تھے۔ انہوں نے وہی درس قوم کے جوانوں کو دیا۔ بداخلاقی، چوری چکاری، کسی کا حق غصب کرنا، ظلم کرنا، کذب وافتراء سے دولت اکھٹی کرنے کے راستے بتائے۔جولیڈر بڑا فراڈ کرے وہ سب سے زیادہ عزت دار گردانا جاتا ہے۔جو ناجائز طریقے سے دولت کے انبار جمع کرے وہ بہتر شہری ،معزز مسلمان گردانا جاتا ہے۔ جو عالم بے عمل واعظ کرتے ہوئے منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے اپنے مخالف کو ناجائز لتاڑے اور بے ہودہ فتوے دے وہ قابل آفرین ہے نا کہ قابل نفرت۔جو اہل کار سب سے زیادہ رشوت لے وہ معزز کہلاتا ہے۔جو جج زیادہ بے انصافی کرے وہ بہتر منصف کہلاتا ہو اور جلد ہی بڑے کورٹ کا جج بن جاتا ہے۔جو گاؤں کا چودھری زیادہ ظالم اور زانی ہو وہ معزز کہلاتا ہے۔جو تھانیدار ہر شب کو رنگین بنائے وہ معزز کہلاتا ہے۔جو جاگیردار اپنی جیل رکھتا ہو اور لاکھوں لوگوں کا ان داتا ہو اور تھانے کچہری میں اس کی سفارش چلتی ہو وہ معزز ہے۔ یہاں اسلام کا مفہوم ہی بدلا ہوا ہے۔اسلام عمل کرنے کے لئے نہیں ستعمال کرنے کے لئے ہے۔مطلب براری کے لئے ہے۔اسی لئے تو یہ ملک کوئی اور قائداعظم پیدا نہ سکا۔کیونکہ پونجا جناح اور مٹھی بائی کردار کے لوگ اب اس معاشرے میں نہیں ہیں۔اگر ہیں بھی تو مطلب برار، بدقماش، چھچھورے، ابن الوقت، کذب بیان لوگوں کے نیچے دب گئے ہیں۔

میرے خلاف مسلسل سازشوں کے جال بُنے جاتے رہے۔میری جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کو پامال کیا جاتا رہا۔میں پڑوسیوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتا رہا۔خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب تک اپنے نام کے ساتھ زندہ ہوں۔میرے شیر دل میرے جاں نثار میرے نام پر جاں نثار ہوتے رہے۔ان شہیدوں کے خون سے میری صبح آزادی کی کرنیں پھوٹیں۔برسوں کی

جدوجہد کے بعد میرا وجود عمل میں آیا۔ پھر آمریت، وڈیرہ شاہی، جاگیرداری، ہشت گردی، ملائیت، لُولی لنگڑی سیاست، مذہبی، لسانی، گروہی سیاست، افراتفری، ہارس ٹریڈنگ، فلور کراسنگ، ہڑتال، تالہ بندی، لانگ مارچ، ٹرین مارچ اور گھیراوٗ جلاوٗ کے دور بھی دیکھے۔ جنہوں نے میری ساکھ خراب کردی بلکہ شکل بگاڑ دی۔ ان کھوٹے سکوں نے اپنی من مانی کر کے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ یہ تو اسی طرح ہوا جیسے نادان بچوں کے ہاتھ میں قینچی دے دی جائے۔

وہ لوگ دیتے ہیں درس بیداری
جن کے اپنے ضمیر سوئے ہوئے ہیں

اب میں پھر تاریخ کے ایک نازک موڑ پر کھڑا ہوں۔ میرا مستقبل خطرے میں ہے۔ مجھے میرے اپنوں نے لہولہان کر دیا ہے اپنوں نے نفرتوں کی کھیتیاں کاشت کر کے میرا پیٹ بارود خانوں سے بھر دیا ہے۔ فرقہ پرستی، کنبہ پروری اور نفسانفسی کا عالم ہے ہر کسی نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ ہر چیز ہر قسم کی ملاوٹ سے اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہے۔ دین و دنیا کے ساتھ ساتھ ہر رشتہ، خون، نسل، ایمان، جنت، دوزخ، خدا، رسول، قبلہ و کعبہ اور قرآن تک اس ملاوٹ سے محفوظ نہیں رہے۔ ووٹ فروشی، وزارت فروشی، جسم فروشی، بردہ فروشی، ضمیر فروشی اور جنت فروشی، عزتفروشی، اولاد فروشی، دین فروشی، وطن فروشی نے میرے جسم پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ مجھے خودغرض، انا پرست اور کلبی عادات والے لوگوں نے اغوا کرلیا ہے۔ میرے بیٹو! میری حفاظت کرو۔ اس خطے کو امن و امان کا گہوارہ بناوٗ۔ محبت، پیار، خلوص، اخوت دوستی اور بھائی چارے کی کھیتیاں کاشت کرو نفرتیں، عداوتیں، فاصلے، دُوریاں اور رنجشیں دور کردو۔ مجھے خوشحالی، استحکام، خود کفالت، روشن مستقبل، تعلیم، بہتر خوراک، پُرامن ماحول، بہتر ذرائع آمدن، اچھی شہرت اور مکمل تحفظ کی ضرورت ہے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں قائداعظم نے یہ ملک اسلام اور مسلمانوں کے لئے بنایا ہے۔ جبکہ سب اسلامی جماعتیں اس کے بنانے کے خلاف تھیں اور کانگرس کی حامی تھیں۔ اب 65 سالوں میں اس نے کون سا نظام دیا ہے۔ جب آپ کے عمل اسلام سے دور ہو جائیں تو ایسا ہی ہونا تھا۔ اسلام کا نظام بہت عظیم ہے۔ مگر آپ کون سا اسلام نافذ کریں گے۔ یزید کا

اسلام کہ امام حسینؓ کا اسلام۔طالبان کا اسلام،مودودی،وہابی،دیوبندی،بریلوی،رائے ونڈی برانڈ کے اسلاموں نے اس 65 سال میں میرا منہ کالا کر دیا ہے۔الٹا کشکول گدائی نے میرا امیج تباہ کر دیا ہے۔مسلمان تو دور کی بات ہے آپ انسان تو بنو۔آپ کے علماء سو بےعمل،زر پرست،زن پرست،شہوت پرست،فرقہ پرست،مردہ پرست،انا پرست،تخریب پرست،شاہ پرست اور مطلب پرست ہوکر رہ گئے ہیں۔حضرت علامہ محمد اقبال حکیم الامت پاکستان کا خواب دیکھنے والے نے اپنی قوم کی کیا تصویر پیش کی تھی جبکہ آج اس وقت سے اب حالت قوم بدترین ہے۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں یہود
یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

2011ء کا حج اسکینڈل ہی کافی ثبوت ہے۔ان متشدد طاقتوں نے عوام کو روٹی،کپڑا،مکان،تعلیم صحت روزگار دینے کی بجائے ایٹم بم دیا اور جس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔کیا ان کے دشمن نہیں ہیں کیا ایٹم بم کے بغیر دنیا کے باقی ممالک باعزت زندگی نہیں بسر کر رہے۔وہ زمانہ گیا جب طاقتور ملک کمزور ملک پر قبضہ کر سکتے تھے۔میری قوم نے ہر شہر کے چوراہوں پر جنگی جہاز اور میزائل رکھ کر اپنے جنگی جنون کا تو ثبوت دیا ہے۔مگر اسلامی اقدار اور نامور نوبل لاریٹ یا اپنے علمی سائنسی کارنامے کرنے والوں کا کوئی نام نہیں،کوئی مجسمہ نہیں کوئی داخل نصاب نہیں،نعرے ہم ہر وقت اسلام کے مارتے ہیں اور نقل ہم مغرب کی کر رہے ہیں۔کیا ہی ایک شاعر جناب امیر الاسلام ہاشمی

نے صدق دل سے آج کے پاکستانی مومن کی نقشہ کشی کی ہے۔

اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
مکاری و عیاری و غداری و ہیجان
اب بنتا ہے ان چار عناصر سے مسلمان
قاری اسے کہنا تو بڑی بات ہے یارو!
اس نے تو کبھی کھول کے دیکھا نہیں قرآن
کردار کا گفتار کا اعمال کا مومن
سرحد کا ہے مومن کوئی بنگال کا مومن
ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مومن
بیباکی و حق گوئی سے گھبراتا ہے مومن
مکاری و روباہی پہ اتراتا ہے مومن
جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا ڈر ہو
وہ رزق بڑے شوق سے کھاتا ہے مومن
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں

بلکہ ہماری موجودہ نسل اب اپنے اکابرین پر تنقیدی اور طنزیہ تبصرے کرتی ہے۔قومی دولت اور املاک کو غصب کرنا قوم کا فیشن بن گیا ہے۔ٹیکس نہ دینا معزز ہتھکنڈہ ہے۔بیوروکریسی سے مل کر بڑے بڑے قرضے معاف کروانا ہر سیاسی لیڈر کی عادت ثانیہ بن گئی ہے۔سب اداروں کو کرپشن کے عفریت نے ہڑپ کرلیا ہے۔قانون بے بس ہے۔ظلم کی حکمرانی ہے۔کسی بھی محکمہ کا الٹرا ساؤنڈ کرلیں کوئی مثبت خبر نہیں ملے گی۔کیا یہ سب کچھ فرشتے بگاڑ گئے ہیں۔اور پھر قانون حرکت میں نہیں آرہا۔کیونکہ اس کار خیر میں سب بڑے بڑے مسلمان لوگ اور جبہ پوش بھی ہی ملوث رہے ہیں۔اے میری قوم کے سپوتو! سوچو! افیمی چین میرے ایک سال بعد آزاد ہوا ہے۔آج وہ کہاں

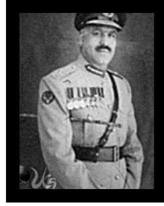
کھڑا ہے۔تم اسلام کے عظیم نظام کو رکھتے ہوئے بھی ایک ناکام ریاست کا روپ دھار چکے ہو۔اور آپ کی سب حرکتیں اسلام سے متضاد ہیں۔مسلمان ہوکر اپنے گھر میں (لالچ اور طمع کی خاطر کبھی سعودیہ سے کبھی امریکہ اور کبھی برطانیہ سے ) ڈکٹیشن لیتے ہو۔تم احساس کمتری کا شکار ہو یا تم فقیر ہو اس رویہ نے تمہارا بیڑا غرق کر دیا ہے۔تم آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو۔

نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

میں اپنے پر نظر ڈالتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔میرے بزرگوں نے جوخواب دیکھے تھے وہ نامکمل ہیں۔میں (پاکستان) بالکل ان کے برعکس ہوں۔میں سوچتا ہوں کہ میری بنیاد تو اسلام پر تھی۔میری بنیادوں میں شہیدوں کا لہو شامل ہے۔مجھے تو ایسا ملک ہونا چاہیئے تھا جو امن کا گہوارہ ہوتا۔مجھے پوری دنیا کے لئے رول ماڈل ہونا چاہیئے تھا۔میں آپ کو یہی پیغام دوں گا کہ مجھے رول ماڈل بنائیں پوری دنیا کے لئے۔میری حفاظت کریں کیونکہ میرے دم سے آپ ہیں۔مجھ سے محبت کریں کیونکہ اپنے وطن سے محبت کرنا ایک عبادت ہے۔لہٰذا میری خدمت عبادت سمجھ کر کریں۔تو آپ کے ملک یعنی میرا شمار دنیا کے امیر ترین ممالک میں ہوسکتا ہے۔مجھے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔یہاں رشوت،سفارش،اقرباء پروری،بے انصافی، بیروزگاری، ناخواندگی،غربت، بھوک، افلاس،عریانی اور بے راہروی نہیں چاہیئے قائداعظم کے افکار کو یاد کرو۔11 راگست 1947ء کی تقریر کو اپنا منشور بنالو۔اس ملک کے رہبر بنو،لیڈر بنو،مفکر بنو، ڈاکٹر عبدالسلام بنو، میں پاکستان ہوں۔میرا ایک قومی تشخص ہے اور اس تشخص کو قائم رکھنا آپ سب کی خصوصاً نوجوان نسل کی اہم ذمہ داری ہے۔ورنہ تمہاری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔



# پاکستان کا قومی ہیرو جنرل اختر حسین ملک (ہلال جرأت)



اختر حسین ملک یکم اگست 1917ء کو اٹک (سابقہ نام کیمبلپور) کے ایک گاؤں پنڈوری میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج کیمبلپور کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد 1941ء میں انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون میں تربیت کا آغاز کیا۔جس کی تکمیل پر مسلح افواج میں کمیشن حاصل کیا۔دوسری جنگ عظیم میں اختر حسین ملک نے برما کے محاذ پر جنگی خدمات انجام دیں۔اس کے صلے میں آپ کو ''برما سٹار'' کا اعزاز دیا گیا۔قیام پاکستان سے قبل آپ کا تقرر جی ایچ کیو انڈیا میں تھا۔پھر پاکستان میں ان کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور ایک انفنٹری بٹالین کے کمانڈر بنائے گئے۔1956ء میں بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی ملی۔اور ڈپٹی کمانڈنٹ سٹاف کالج کوئٹہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ازاں بعد آپ نے کمانڈنٹ انفنٹری سکول کے طور پر خدمات انجام دیں۔ 1959ء میں انفنٹری بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔جس کے بعد جی ایچ کیو میں ڈائریکٹر انفنٹری مقرر ہوئے۔ترقی کی منازل اسی طرح طے کرتے ہوئے میجر جنرل اور لیفٹیننٹ جنرل کے مقام تک پہنچے۔لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک کی تمام زندگی ایک شیر کی سی زندگی تھی۔لیکن آپ کا اس سے بڑا کارنامہ چھمب اور جوڑیاں کی فتح تھا۔ وہ پہلے جنرل تھے کہ جن کو 1965ء کی جنگ میں جرأت و استقلال کا عظیم کارنامہ انجام دینے پر ہلال جرات دیا گیا۔

خیال تھا کہ فوج کے جس حصے کی کمان جنرل اختر حسین ملک کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس تعداد میں بے حد کم اور کمزور تھا۔اس کے باوجود جنرل اختر حسین ملک نے آگے بڑھ کر اس جرأت سے حملہ کیا کہ دشمن کے تمام مورچے تباہ ہو کر رہ گئے۔اس کامیابی کا مرکزی کریڈٹ جنرل اختر حسین ملک کو ملا۔کیونکہ وہ گھمسان کی لڑائی کے دوران اگلی صفوں میں جا کر مجاہدوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔اور پلان اس حکمت عملی سے ترتیب اور انجام دیا کہ دشمن کو عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔چنانچہ

آپ کی اسی جرأت اور شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے مشہور دانشور اور شاعر و ادیب جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا:

''لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک، ملک و قوم کے ایسے ہیرو تھے کہ جن کا نام پاکستانی بچوں کو بھی یاد ہے۔ جب ان کی سرکردگی اور نگرانی میں پاکستانی افواج چھمب اور جوڑیاں کے آہنی مورچوں کو مسمار کرتے ہوئے جموں کی طرف بڑھ رہی تھیں تو لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک پاکستانیوں کی بہادری اور استقامت اور اولوالعزمی کی ایک مجسم تصویر بن کر ابھرے۔ اور اہل پاکستان کے ذہنوں پر چھا گئے۔''

(روزنامہ جنگ کراچی 9/ستمبر 1969 ص 4)

یہ امر باعث حیرت ہے کہ چھمب جوڑیاں کے معرکے سر کرنے والے اس شیر دل جرنیل کو دوران جنگ ہی محاذ سے بلا کر جی ایچ کیو میں بطور ڈائریکٹر جنرل ملٹری ٹریننگ کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ بعدازاں اسٹاف کالج کوئٹہ کا کمانڈنٹ بالآخر سیٹو (میثاق وسطیٰ) میں نمائندگی کے لئے انقرہ بھیج دیا گیا۔ ترکی میں قیام کے دوران ہی 22/اگست 1969ء کو آپ اور آپ کی اہلیہ محترمہ کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ آپ کی میت 26/اگست 1969ء کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ چکلالہ ائیر پورٹ راولپنڈی پر اتاری گئی۔ ہوائی اڈے پر میت لینے کے لئے موجود افراد میں اس وقت کے سی این سی، پاک بحریہ کے کمانڈر انچیف، پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف اور دیگر اعلیٰ فوجی و سول حکام شامل تھے۔ صدر پاکستان کی نمائندگی ان کے ملٹری سیکرٹری نے کی۔ میت کے ہمراہ سیٹو کے ملٹری ڈپٹیز کے چیئرمین، چیف آف ٹرکش جنرل سٹاف کے نمائندے لیفٹیننٹ جنرل الپکایا بھی آئے۔ جنرل الپکایا نے اس موقع پر تعزیتی تقریر میں کہا ''مرحوم اعلیٰ پایہ کے جنرل تھے اور نہ صرف پاکستان میں بلکہ دوسرے برادر ممالک میں ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔''

(رواز نامہ جنگ کراچی 26/اگست 1969ء)

اس موقع پر سی این سی جنرل عبدالحمید خاں نے کہا:

''لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک ایک عظیم سپاہی، ایک عمدہ کمانڈر، بہترین منصف اور شریف

النفس انسان تھے‘‘ (روزنامہ نوائے وقت 26/اگست 1969ء)

بریگیڈیئر ریٹائرڈ شوکت قادر 1965ء آپریشن گرینڈ سلیم کے متعلق 4/اکتوبر 2003ء کو ڈیلی ٹائمز لاہور میں لکھتے ہیں۔’’وہ ایک دلیر اور جری کمانڈر تھے جو دباؤ میں بھی گھبراتے نہیں تھے اور پُرسکون رہتے تھے اور اپنے جوانوں میں اعتماد کی جوت جگا دیتے تھے۔ نہ صرف افسروں میں بلکہ سپاہیوں میں بھی۔جس سے لوگوں کے حوصلے بلند ہو جاتے۔لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک اس طرح کی مہم GRANDSALAM کے لئے بہترین صلاحیتوں والے کمانڈر تھے۔جب شروع میں اس آپریشن کی منصوبہ بندی کی گئی تو یہ بات GHQ کے علم میں تھی کہ لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک ایک حد سے زیادہ پھیلی ہوئی ڈویژن کی کمان کر رہے ہیں۔جس پر دشمن کا بہت زیادہ دباؤ تھا۔تاہم انہیں اس مہم جوئی GRANDSALAM کے لئے منتخب کیا گیا۔حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات وہ فرسٹ کور سے بھی بڑی افواج کی کمان کرتے رہے تھے۔اس لئے حیرت کی بات ہے کہ انہیں 12 ڈویژن کی کمان سے کیوں الگ کر دیا گیا‘‘۔

(V)’’آپریشن GRANDSALAM یکم ستمبر کو صبح سویرے پانچ بجے شروع ہونا تھا۔یہ منصوبہ بندی کے مطابق شروع ہوا۔چھمب مقررہ وقت کے اندر سرنگوں ہو گیا اور پہلی روشنی کے جلد بعد صبح سات بجے کے قریب ہماری افواج نے دریا توی کو عبور کرنا شروع کر دیا۔آگے کی جنگی کاروائی تیزی سے جاری رہی اور بعد دوپہر ایک بجے تک افواج نے اپنی نفری اور پوزیشن مستحکم کر لی۔اور اب وہ اپنے مربوط خطوں میں داخل ہونے کے لئے تیار ہی کھڑی تھی۔یہاں سے روشنی ختم ہونے سے کافی وقت پہلے قریباً 3 بجے سہ پہر کو اکھنور پر حملے کا آغاز کیا جا سکتا تھا۔بہر حال اکھنور تک پہنچنا ہماری قسمت میں نہ تھا( کیونکہ جنرل اختر حسین ملک اور ان کے لشکر کو روک دیا گیا) ٹوٹی کہاں کمند۔بریگیڈیئر ریٹائرڈ شوکت قادر اپنے مضمون کے آخری حصے میں بتاتے ہیں کہ:

کامگار کمانڈر جنرل اختر حسین ملک کو واپس آنے کا حکم دے کر قیمتی وقت ضائع کر دیا گیا۔اسی دوران اکھنور کو اضافی کمک دے کر مضبوط بنالیا گیا اور وہ ہدف نا قابل حصول ہو گیا۔شائد اگر اکھنور

پر قبضہ ہو جاتا اور دشمن کی سپلائی لائن کاٹ دی جاتی تو دشمن کبھی بھی سیالکوٹ پر حملہ آور نہ ہوتا!!

(4/اکتوبر 2003ء کو ڈیلی ٹائمز لاہور)

نوائے وقت میگزین میں ڈاکٹر شبیر احمد بعنوان جنرل اختر حسین ملک کی زبان پر آخری الفاظ تھے اکھنور، کشمیر!'' اپنے مضمون میں 1965ء کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:۔

1965ء میں جب میجر جنرل اختر حسین ملک چھمب جوڑیاں سیکٹر میں آگے بڑھتے بڑھتے اکھنور پار کرنے لگے تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان صدر پاکستان تھے۔ ان جیسے محب وطن صدر کو معلوم تک نہ ہوا اور محاذ کے کور کمانڈر نے عین موقع پر جنرل اختر حسین ملک جیسے جانباز کو ایک عیاش جنرل یحییٰ خان سے بدل دیا۔ صاحبو! جیتی ہوئی بازی ہر گئی۔ جنرل اختر حسین ملک کے چند سال کچھ اس طرح کا داغ لئے گزرے۔ کہتے ہیں ترکی میں جنرل اختر حسین ملک ٹریفک کے مہلک حادثے میں زخمی ہوئے تو آخری لمحات میں ان کی زبان پر دو الفاظ تھے۔ ''اکھنور۔ کشمیر!''

(مضمون مطبوعہ نوائے وقت سنڈے میگزین مورخہ 12/جون 2005ء ص 10 کالم 4)

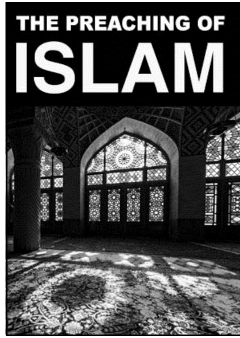
آخر پر سید ضمیر جعفری کے الفاظ میں اس قومی ہیرو اور سپوت پاکستان (ہلال جرأت) کو ہدیہ تبریک پیش ہے۔ چمکتی ہوئی توپ گاڑی پر جو تابوت ہے، چاند تارے کے پرچم میں لپٹا ہوا، ابد کی خاموشی میں کھویا ہوا، اپنی شفاف وردی میں سویا ہوا، اک جیالا، جری، نام آور، دلاور، بہادر سپاہی، سرد پیکر میں اب دل دھڑکتا نہیں، آگ جلتی نہیں، خون چلتا نہیں، جسم بے جان ہے، لیکن اے زندگی! یہ وہ انسان ہے! اک جیالا، جری، نام آور، دلاور، بہادر سپاہی، جو اپنے مقدس وطن، خطہ دلنشین، کشور بہترین کے لئے! اس زمیں پر بہشت بریں کے لئے! پاک پرچم تلے! وادیوں! جنگلوں! پربتوں میں لڑا! موت کے سامنے مسکراتا رہا، جنگ اور امن کے زخم کھاتا رہا، تا کہ یہ شہر گاؤں بستے رہیں، پھول کھلتے رہیں، باغ مہکے رہیں، کھیت ہنستے رہیں!

(ماہنامہ نیا زمانہ لاہور شمارہ جنوری 2005)



# پروفیسر آرنلڈ

## (پریچنگ آف اسلام'' کے مصنف)




پروفیسر آرنلڈ ایک یورپی تھے، جو کیمرج سے فلسفہ کی ڈگری لے کر سب سے پہلے علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے۔اس کے ساتھ وہ فارسہ،عربی،سنسکرت اور اردو کے بھی ماہر تھے۔ان کے علاوہ فرانسیسی، لاطینی، اور انگریزی پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔انہوں نے دس سال تدریسی فرائض انجام دیئے۔1998ء میں لاہور چلے آئے۔یہیں اقبالؔ پر اُن کے تاثرات ہوئے۔پروفیسر آرنلڈ بہت اسلام دوست تھے۔علیگڑھ میں قیام کے دوران انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا لیکن ان میں تنگ نظری یا تعصب کو بالکل نہ تھا۔وہ ایک انصاف پسند محقق تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب سرولیم میور نے اپنی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں آنحضرتؐ کی زندگی پر اعتراض کئے تو پروفیسر آرنلڈ نے ان کا جواب دیا۔

عیسائیوں کے اس اعتراض پر کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تو انہوں نے ''پریچنگ آف اسلام'' جیسی عظیم کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ اسلام تلوار کی بجائے تبلیغ سے پھیلا ہے یہ کتاب اسقدر ٹھوس دلائل پر مبنی تھی کہ اس کے بعد کسی کو یہ جرات نہ ہوسکی۔پروفیسر آرنلڈ کے مسلم راہنماؤں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔وہ ایک انسان دوست ملنسار انسان تھے۔سر سید احمد خاں پروفیسر آرنلڈ کو اپنے قریبی دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ان کے تعلقات شبلی نعمانی کے ساتھ بھی بہت گہرے تھے۔آرنلڈ نے شاگردوں کی حیثیت سے زبانوں کا مطالعہ کیا۔پروفیسر آرنلڈ نے ایک ''انجمن اخوان الصفاء'' کے نام سے قائم کی جس میں وہ عربی لباس پہن کر جایا کرتے تھے۔انسان دوستی ہی کے باعث جب وہ انگلستان جانے لگے تو الطاف حسین حالیؔ نے ان کے اعزاز میں ایک

الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا۔جس میں بڑے پیار،محبت اورانس کا اظہار کیا گیا۔علامہ اقبالؔ سے ان کو اس قدر محبت تھی کہ انہیں اپنا دوست خیال کرتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ جو زندگی بھر قائم رہا۔علامہ شبلی نے اپنے سفرنامہ شام ومصروروم میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جب وہ اپنے جہاز میں سوار تھے۔علامہ شبلیؒ دوڑے دوڑے پروفیسر آرنلڈ کے پاس پہنچے توانہیں مطالعہ میں غرق پایا۔ پروفیسر آرنلڈ کو جھنجھوڑا اور بتایا کہ جہاز ڈوبنے والا ہے۔اور آپ آرام سے مطالعہ میں مصروف ہیں۔اس پر پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا۔''میں انجن کے بارے میں بخوبی واقف ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی کے آخری لمحات بھی مطالعہ میں صرف ہوں۔''



## انمول موتی

اللہ کے خوف سے علم اور عزت ملتی ہے۔جب کسی عالم کو بادشاہ کے ہاں جاتا دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ چور ہے۔ برداشت عقلمند آدمی کا وہ صبر ہے جس کا مظاہرہ وہ جاہل کی باتوں سننے کے وقت کرتا ہے ۔آنسو بہاؤ اور خوب بہاؤ یہ سوچ کر نہیں کہ خواہشات پوری نہیں ہوئیں۔ بلکہ یہ سوچ کر کہ ہم اپنی خواہشات کے کس قدر غلام ہیں۔

انسان کو دریا کی طرح سخی،سورج کی طرح شفیق اور زمین کی طرح فراخ دل ہونا چاہیئے۔ دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے۔لیکن لوگ محنت دنیا کے لئے کرتے ہیں اور آخرت کو نصیب پر چھوڑ دیتے ہیں مگر اصل بات تو یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کے فضل سے ہی ملتا ہے۔ عاجزی کا تعلق دل سے ہے نہ کہ ظاہری حرکتوں سے۔جب عالم کو ٹھوکر لگتی ہے تو اس سے اک دنیا کو ٹھوکر لگتی ہے ۔اللہ تعالیٰ ہر پرندے کو رزق دیتا ہے لیکن رزق اس کے گھونسلے میں نہیں پہنچاتا۔زبان میں کوئی ہڈی نہیں لیکن یہ پھر بھی کچل ڈالتی ہے۔جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے سچ بول کر ہار جاؤ۔

# خان لیاقت علی خاں



خان لیاقت علی خاں یکم اکتوبر 1895ء کو کرنال مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام نواب رُستم علی خاں تھا۔ خان لیاقت علی خاں کے آباء واجداد نے ابتدا میں لاہور میں سکونت اختیار کی۔ بعد ازاں جب مغلیہ دور میں آگرہ ہندوستان کا دارالحکومت بنا تو یہ آگرہ میں منتقل ہو گئے۔ 1911ء میں خان لیاقت علی خاں ایم اے او کالجیٹ سکول میں چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ 1919ء میں علی گڑھ سے گریجوایشن کی۔ اور اسی سال لندن چلے گئے۔ 1921ء میں آکسفورڈ سے انہوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ آکسفورڈ ہی میں تھے کہ آپ نے سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی۔ 1923ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1928ء میں انہوں نے اتنی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے انہیں دہلی میں ہونے والی کل جماعتی کانفرنس میں شمولیت کے لئے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ 1932ء میں آپ یوپی اسمبلی کے نائب صدر منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد جب 1935.36 کے بجٹ پر بحث ہو رہی تھی تو خان لیاقت علی خاں نے حکومت کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی کہ مالیے میں اضافہ کر کے مزید سرمایہ جمع کیا جائے۔

دسمبر 1945ء کے انتخابات میں انہیں واضح کامیابی ملی۔ خان لیاقت علی خاں کو 4530 ووٹ ملے جبکہ ان کے مخالف کو 2722 ووٹ ملے تھے۔ خان لیاقت علی خاں نے 1947ء میں جو بجٹ پیش کیا اس کی بنیاد سماجی انصاف پر تھی۔ ان کا یہ بجٹ غرباء کا بجٹ کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس میں ٹیکسوں کا سارا بوجھ سرمایہ داروں اور صنعتکاروں پر ڈالا گیا تھا۔

خان لیاقت علی خاں کو وزیرخزانہ بنانے کی تجویز ڈیسائی نے دی تھی۔ 1947ء کا بجٹ خود خان لیاقت علی خاں نے بنایا تھا۔ خان لیاقت علی خاں نے 15/اگست 1947ء کو وزیراعظم کا حلف اُٹھایا۔ اس کے بعد آپ کو امریکہ اور روس کی طرف سے دورے کی دعوتیں ملیں۔ آپ نے امریکہ کا

دورہ کیا۔آپ نے سارے پاکستان میں مہاجرین کی آبادکاری میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔خان لیاقت علی خاں نے 7/مارچ 1949ء کو قرارداد مقاصد پیش کی۔ جسے پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ میں سنگِ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کی منظوری کے بعد فوری طور پر 12/مارچ 1949ء کو کمیٹی قائم کی گئی۔1950ء میں اصلاحات کمیٹی قائم کی گئی۔1947 میں انہوں نے بجٹ کے موقع پر کہا ''میں مسلم اور غیر مسلم سرمایہ داروں میں امتیاز نہیں کرسکتا۔میں ان کے ہاتھوں پاکستان کا استحصال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔اگر ایسا ہوا تو میں وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دوں گا۔ پاکستان ایک سرمایہ دار ملک نہیں ہوگا نہ ہی یہ کمیونسٹ ملک ہوگا۔یہ ایک ایسا ملک ہوگا جس کی بنیاد یقینی طور پر سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم پر قائم ہوگی۔''

خان لیاقت علی خاں کے دور میں پاکستان کی مالی حالت اس قدر بہتر ہوگئی تھی کہ اس نے برما کو پانچ سو ہزار پونڈز کا قرضہ دیا تھا۔ وہ پاکستان جو خان لیاقت علی خاں کے بعد رشوت ستانی میں ساری دنیا میں بدنام ہوا۔اس کے پہلے وزیراعظم کے اکاؤنٹ میں مرتے وقت ایک ہزار روپے بھی نہ تھے۔اس سے اُن کی خدمت اور خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔خان لیاقت علی خاں نے مصر،شام،عراق،اور ایران کا بھی دورہ کیا۔جہاں کے عوام نے اُن کا پُرجوش استقبال کیا۔1950ء میں موسم بہار میں شہنشاہ ایران نے اُن کی دعوت پر پاکستان کا دورہ کیا۔پاکستان کے لئے یہ ایک بڑا اعزاز تھا۔اپنی شہادت سے چند ماہ قبل انہوں نے یومِ آزادی کے موقع پر ایک شاندار تقریر کی انہوں نے کہا۔'' قوم نے مجھ پر اعتماد کیا ہے میں اس کا بدلہ کس طرح ادا کروں گا،دولت میرے پاس نہیں، جائیداد کا میں مالک نہیں، میں خوش ہوں کہ میں ان اشیاء سے محروم ہوں، کیونکہ یہ وہی چیزیں ہیں جو انسان کے ایمان کو کمزور کرتی ہیں۔میرے پاس میری زندگی ہے جسے میں پاکستان کے لئے وقف کرچکا ہوں۔میں قوم کو اس کے سوا اور کیا دے سکتا ہوں کہ اگر پاکستان کے دفاع کے لئے خون بہانا پڑا تو خان لیاقت علی خاں کا خون اس میں شامل ہوگا۔'' 16/اکتوبر 1951ء میں پاکستان کے اس عظیم انسان کو راولپنڈی کے ایک جلسے میں ایک ملک دشمن نے گولی مار کر شہید کر دیا۔وہیں سے اس قوم کی بدقسمتی شروع ہوئی۔



# چودھری رحمت علی



تحریک پاکستان کے اولین جرنیل خالق لفظ پاکستان چودھری رحمت علی نے کب برِصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خودمختار عظیم تر ریاست کا نقشہ بنایا تو اس کا نام پاکستان رکھا۔ چودھری رحمت علی زمینی حقائق سمجھتے تھے وہ کشمیریوں کی بے بسی اور مشکلات سے بخوبی آگاہ تھے۔ چودھری رحمت علی ایک عرصہ محمد دین فوق کے ''کشمیر میگزین'' میں مظلوموں پر ہونے والے مظالم پر آواز بلند کرتے رہے۔ ان کے حق میں لکھتے رہے وہ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے اس دست جفاکش کو بے نقاب کرتے رہے ہیں جس نے روح آزادی کشمیر کو پامال کیا تھا وہ اپنے فردوس بروئے زمیں پر بسنے والے بھائیوں کی مظلومی، مجبوری اور محکومی پر سخت رنجیدہ خاطر رہتے اور ان کی آزادی اور بلند بختی کے لئے جدوجہد بھی کرتے رہے۔ خطۂ جموں و کشمیر کے دردمندوں کا ہمدرد چودھری رحمت علی سولہ نومبر 1897ء مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کی تحصیل گڑھ شنکر کے گاؤں ''موہراں'' میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حاجی شاہ محمد چوہدری متوسط زمیندار اور اسلام کے پابند آدمی تھے۔

چودھری رحمت علی نے اپنی ابتدائی تعلیم کے مراحل گھر ہی سے طے کئے اور پرائمری بھی اپنے موضع ''موہراں'' سے پاس کیا ''موہراں'' مڈل کا امتحان گورنمنٹ سکول ''راہوں'' سے پاس کیا جبکہ میٹرک گورنمنٹ اینگلو سنسکرت ہائی سکول جالندھر سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ آپ مزید تعلیم کے لئے لاہور آ گئے۔ چونکہ لاہور تہذیب وتمدن کا گہوارہ، علم وادب اور سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں چودھری رحمت علی نے گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا اور ساتھ ساتھ طلباء سیاست میں دلچسپی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ طلباء کے بنیادی مسائل ان کے حقوق کے حصول کے لئے پیش پیش رہتے۔ اپنے آپ کو طالب علم راہنما کی حیثیت سے منوایا۔ کالج کی تعلیم کے دوران کالج کے مجلہ ''دی کریسنٹ'' کے مدیر بھی رہے۔ بہت جلد لاہور میں کالج ڈبیٹ یونین

کے سیکرٹری، ٹیوٹیریل گروپ کے نائب صدر اور سٹوڈنٹ یونین کے صدر بھی رہے۔اور آپ نے اپنے کالج کے ساتھیوں سے ملکر 1915ء میں ''بزمِ شبلی'' کی بنیاد رکھی۔اسلامیہ کالج سے بی اے کرنے کے بعد ایچی سن کالج میں لیکچرارشپ چھوڑ کر عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔آپ ہی نے 1926ء کے انتخابات میں سر چودھری شہاب الدین کو اپنے آبائی حلقے ضلع ہوشیارپور سے پنجاب اسمبلی کا ممبر بنوایا تھا۔کیونکہ سیالکوٹ کے ڈسکہ کے حلقے میں ان کی پوزیشن چودھری ظفراللہ خاں کے مقابلے میں کمزور تھی۔اس کے علاوہ آپ نے مختلف اخبارات و جرائد میں لکھنا شروع کر دیا۔ ان کی تحریر نے برِصغیر کے مسلمانوں کے اندر بیداری اور قومی غیرت کی لہر پیدا کر دی آپ کے مضامین میں ملک و ملت کا درد بھرا ہوتا۔اور ان کی ناگفتہ بہ حالت سنوارنے کی تجاویز ہوتیں چودھری رحمت علی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے اکتوبر 1930ء کو انگلستان آ گئے۔یہاں آ کر بھی آپ اپنی قوم سے بھی بے خبر نہیں رہے۔اور نہ ہی اپنی تعلیم کا حرج ہونے دیا۔کیونکہ آپ کو بھی جلوہ دانش وفرنگ خیرہ نہ کر سکا۔آپ نے کیمرج سے بارایٹ لاء اور DUBLIN سے ایم اے کے امتحانات امتیاز سے پاس کئے 1932ء میں آپ نے یہاں ہی لفظ ''پاکستان'' وضع کیا تھا۔اور اپنے چند ذہین و فطین باکردار ساتھیوں کے ساتھ ملکر 1933ء کو پاکستان نیشنل موومنٹ کی بنیاد رکھی تھی اور اپنا شہرہ آفاق کتابچہ Now or Never شائع کیا تھا۔چودھری رحمت علی سے معروف ترک ادیبہ مصنفہ خالدہ خانم نے ملاقاتیں بھی کیں تھیں۔1937ء اور 1940ء میں آپ پاکستان آئے تھے۔اپنی تحریک کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے اور اپنے مجوزہ وطن کے لئے عام لوگوں کا ذہن ہموار کرنے کے لئے ہفت روزہ جریدہ پاکستان کا اجرا بھی کیا تھا۔حکیم الامُت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (جن کے ساتھ آپ کا تعلق کالج کے ہی زمانے سے قائم ہو گیا تھا اور وہ جب لندن آتے تو چودھری صاحب ان کی میزبانی کرتے) نے اپنا قطعہ چودھری رحمت علی کی نظر کیا تھا۔چودھری رحمت علی کا علامہ اقبالؒ کے ساتھ عقیدت کا رشتہ تھا۔

نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

نشانِ راہ جو دکھاتے تھے ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ دان کے لئے

1940ءکو جب آپ کراچی آئے اور پاکستان نیشنل موومنٹ کی سینٹرل کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کیا تھا۔ جب قائداعظم محمد علی جناحؒ کو پتہ چلا کہ چوہدری رحمت علی آئے ہوئے ہیں تو قائد اعظم نے آپ کو فروری 1940ءکومختصر خط لکھا کہ ہمیں باہمی ملاقات کے لئے وقت نکالنا ہوگا اور مسلمانوں کے لئےعلیحدہ وطن کے لئے تبادلہ خیال کرنا ہوگا مگر بدقسمتی سے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے بانی پاکستان اور''خالق ونقاش پاکستان'' کی ملاقات نہ ہونے دی۔ چوہدری صاحب انگلستان آ گئے۔ یہاں آ کر چوہدری رحمت علی نے برٹش پارلیمنٹری ہندوستان سے آئے ہوئے سیاسی زعماءاورطلباء سے ملاقاتیں کیں اورانہیں اپنے مجوزہ وطن کے بارے میں آگاہ کیا اورمسلمانوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کو بیان کیااس کےعلاوہ آپ نے انڈیامیں مقیم بااثر خاندانوں کوخط ارسال کرنا شروع کر دیئےاورانہیں پسے ہوئےغریب طبقہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی۔

1947ءکو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیااور چوہدری صاحب بھی انگلستان سے سب کچھ چھوڑ کر اپنی حسین جنت پاکستان میں آ گئے۔ یہاں جیل روڈ لاہور میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے لی۔ یہاں چوہدری صاحب کی رہائش گاہ پرلوگوں کا تانتا بندھا رہتا لوگ پریشان تھے مہاجریں کی آبادی کا مسئلہ تھا۔ادھر چودھری صاحب اس غیر منصفانہ تقسیم پر ناخوش تھے اس دوران انہوں نے کراچی، لائلپور دیگر علاقوں کے دورے بھی کئے ان کو اتنا اپنے علاقے ہشیار پور کے اُدھر رہ جانے کا دُکھ نہیں تھا۔جتنا انہوں نے مظلوم مسلمانوں کا غم کھایا۔انہوں نے لاہور میں صحافیوں ،طلباء، وکلاء،سول سوسائٹی اورمہاجرین کے وفود سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ ہماری زراعت کشمیر ہی سے نکلنے والے دریاؤں اور نالوں سے سیراب ہوتی ہے۔ پنجاب اور دیگر علاقوں کی خوشحالی اور ہریالی کا انحصار جموں وکشمیر پر ہے جموں وکشمیر میں قائم کارخانوں ،شال بافی اورخیمہ دوزی کی صنعتوں نے ہی پاکستان کی معیشت کوسہارا دینا ہے۔اس خطہ کی تہذیب وتمدن شریف النفس محنت کشوں اور تر

دماغ اور تیز دست ہنرمندوں ہی سے متاثر ہوکر اہل نظر نے اس کو ایرانِ صغیر سے تعبیر کیا تھا۔ ہمیں اب پھر NOW OR NEVER کی بنیاد پر کام کرنا ہوگا۔ چوہدری رحمت علی نے اقوامِ متحدہ کو اور پاکستان کے لیڈروں کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ہمارے سیاسی رہنما چوہدری رحمت علی جیسے بہادر، مدبر، دیانت دار اور دُور اندیش انسان سے کوئی راہنمائی لیتے بلکہ اُلٹا خفیہ پولیس کو ان کے پیچھے لگوا دیا۔ ان کو تنگ کرتے رہے آپ کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ بالآخر آپ دل برداشتہ ہو کر دوبارہ انگلستان آ گئے۔

3رفروری 1951ء کو یہ عظیم آدمی مسلمانوں کا مخلص راہنما مختصر علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اور کیمرج کے نیو ما کیٹ روڈ قبرستان کی قبر نمبر 8330 بی کیمرج میں امانتًا دفن ہیں۔ پاکستان کی بیوروکریسی نے تحریک پاکستان کے اکثر کارکنان سے ایسا ہی احسان فراموشانہ سلوک روا رکھا ہے۔ اسی لئے تو ناعاقبت اندیش لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے، جاگیرداروں، تاجروں کی خود خدا بننے کی خواہش نے ملک پاکستان کو اپنی منزل سے بھٹکا کر سارے عالم میں جائے تمسخر بنا دیا۔ علماءِ سو نے تو دل سے اسے قبول ہی نہیں کیا۔ قربانیاں دینے والے مہاجرین پسِ پشت ڈال دیئے گئے اور نام نہاد مجنوؤں نے چُوری خوب کھائی۔ خدا تعالیٰ ہماری قوم کو محسنوں کی قدر کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔



# پروین شاکر۔عہد ساز منفرد شاعرہ

عکسِ خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی



پروین شاکر 24رنومبر 1952ءکو کراچی میں پیدا ہوئی۔انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔انگلش ادب اور زبان میں ڈبل ایم اے کیا،اور بنک ایڈمنسٹریشن میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔محکمہ کسٹم میں سول سروس میں آنے سے قبل وہ نو سال شعبہ تدریس سے منسلک رہیں۔سی ایس ایس کرنے کے بعد 1986ءمیں آپ کا بطور سیکنڈ سیکٹر یری سی بی آر اسلام آباد تقرر رہوا۔آپ نے 1991ءمیں ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ سے ایم کی ڈگری بھی لی۔آپ نے شاعری کی متعدد کتب تحریر کیں۔جن میں''خوشبو''(1976 میں)''صد برگ'' (1980 میں)''خود کلامی''(1980 میں)''انکار''(1990)''ماہِ تمام''(1994 میں)''کفِ آئینہ'' منظرِ عام پر آئیں ہیں۔

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

آپ کی پہلی کتاب خوشبو نے آدم جی ایوارڈ حاصل کیا۔بعد ازاں انہیں حکومت نے پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ بھی دیا۔26دسمبر 1994ءکو دفتر جاتے ہوئے ان کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔یوں ہم ایک جدید اردو شاعری کے روشن ستارے سے محروم ہو گئے۔آپ کا قلمی نام''بینا''تھا اور وہ احمد ندیم قاسمی کو اپنا استاد مانتی تھیں۔آپ کی شادی ڈاکٹر ناصر احمد سے ہوئی۔جبکہ وفات سے تھوڑا عرصہ قبل آپ نے طلاق لے لی تھی۔آپ کا ایک بیٹا ہے جس کا نام مراد علی ہے۔پروین شاکر کی رومانی شاعری منفرد اور مقبول عام تھی۔بہت ہی تھوڑے وقت میں،اور بہت جلد ان کی شاعری قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

آپ بہترین کالم نگار بھی تھیں۔ گوشہ چشم کے نام سے کالم لکھتی رہیں۔ اردو شاعری کو نئی جہت اور نئی تماثیل دے کر نوجوان نسل کے دل میں گھر کر جانے والی پروین شاکر جلد ہی اس دنیا سے رُخصت ہو گئیں۔ پروین شاکر کی طرح ابھی بھی کچھ سر پھرے ادبی مجنوں یا لوح و قلم کی پرورش کی مرض میں مبتلا اپنے خونِ جگر سے ادب کے لالہ زاروں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ بقول شاعرِ مشرق۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!



## مسکرانا منع ہے...

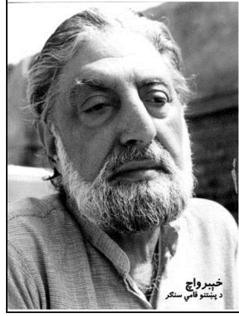
**بھوک کی شدّت**۔ ایک پٹھان نے پیزا کا آرڈر دی۔ ویٹر بولا'' جناب! پیزا کے 4 پیس کر دوں یا 8؟'' پٹھان بولا:'' آٹھ پیس کرو چار سے کیا خاک پیٹ بھرے گا۔''

**خانہ خراب**۔ بچوں کے کمرے میں ایک ہی الماری تھی جس میں انہوں نے خانوں کو تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک دن حمزہ دانیال سے بولا۔'' دانی جلدی آؤ! اسامہ تمہارا خانہ خراب کر رہا ہے۔''

**وزن**۔ ایک خاتون پھل فروش کی دوکان پر پہنچی اور کہنے لگیں! تم نے میرے بیٹے سے دو کلو آم کے دام وصول کر لئے لیکن جب میں نے آم تولے تو وہ صرف ایک کلو ہی نکلے۔ دکاندار بولا۔ محترمہ ذرا اپنے بیٹے کو بھی تول کر دیکھ لیں...

**آج کل کے وزیرِ صحت**۔ انچارج ڈاکٹر: (وزیر صحت سے) سر آپ کو ہمارا ہسپتال کیسا لگا۔ وزیرِ صحت۔ کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ ڈاکٹر: وہ کیوں سر؟ وزیر صحت: میں نے یہاں جتنے بھی لوگ دیکھے ہیں وہ سب کے سب بیماروں کی طرح بستروں پر پڑے ہیں۔

# قلندرمومند۔سپوتِ پاکستان



پشاور پریس کلب کے بانی چیئرمین اورخیبر یونین آف جرنلسٹس کے سابق صدرقلندرمومند جن کا اصل نام صاحبزادہ حبیب الرحمن تھا پشاور کے ایک سرحدی گاؤں بازید خیل میں یکم ستمبر 1930ء میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد صاحبزادہ سیف الرحمن خان جوخود ایک اچھے شاعراور دینی درس وتدریس سے وابستہ تھے اور جامع فتح پور بھارت سے فارغ التحصیل تھے کی وجہ سے آپ کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا،جس کے سبب بچپن ہی سے لکھنے لگے تھے۔صرف بارہ سال کی عمر میں ایک ہفت روزہ ''الحق'' کے نام سے نکالنا شروع کیا جو درجنوں کی تعداد میں ایک دستی پریس پرخود شائع کرتے اورصوبے کےعلاوہ ہندوستان میں بھی اس کے خریدار تھے۔

حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد بھی ہفت روزہ ''الحق'' کےخریداروں میں شامل تھے۔آپ نے پشاورشہر میں خالصہ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی جس میں آج کل فرنٹیر کالج فارویمن قائم ہے۔ میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔ 1947ء میں ایف اے پاس کیا۔اُس زمانہ میں فارسی کا طوطی بولتا تھا۔اپنے اکابرین کےنقش قدم پر چلتے ہوئے آپ نے فارسی اور پشتو میں امتیازی نمبروں میں منشی فاضل کیا پھر 1957ء میں پشاور یونیورسٹی سے گریجوایشن کے بعد ایم اے انگلش کیا،اور 1967ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔اور جوان العمری میں ہی اشترا کی تحریک سے وابستہ ہوگئے،اور گورنمنٹ کالج پشاور ہی میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوگئے،لیکن بعدازاں جلد ہی (1960ء میں) مارشل لاء کے دوران آپ کے سیاسی نظریات کی بدولت آپ کوملازمت سے برخاست کردیا گیا تھا۔آپ نے 1973ء میں پشاور یونیورسٹی سے قانون (ایل ایل بی) کی ڈگری حاصل کی لیکن عملی طور پرقانون کے پیشہ سے وابستہ نہ ہوئے۔روزگار کےطور پرآپ نے صحافت کا رُخ کیا اورمعروف انگریزی اردو اخبارات خیبرمیل (انگریزی)' انجام' بانگِ حرم' شہباز (اردو)

اور پشتو جرائد (لار ښنگیا لے' راہبر ) کے عملہ میں شامل ہوکر خدمات انجام دیں۔ اورژوند کے نام سے ذاتی مجلہ بھی نکالا۔ سیاسی طور پر قلندر مومند پختون قوم پرست تحریک میں بھی نہایت سرگرم رہے اور خان عبد الغفار خان کے نہایت قریبی معتمد سمجھے جاتے تھے۔ اپنے سیاسی نظریات کی خاطر انہیں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں۔ ایوب خان کے دور میں انہیں ایک سال تک شاہی قلعہ میں بھی قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا جبکہ سیاسی نظریات کے باعث انہیں پنجاب پختونخواہ اور سندھ کی مختلف جیلوں میں بھی طویل عرصے تک قید رکھا گیا۔ جب حیدرآباد سازش کیس میں نیشنل عوامی پارٹی کی ساری قیادت پر مقدمہ قائم کر دیا گیا تھا، تو قلندر مومند اس مقدمے میں خان عبدالولی خان اور ان کے دیگر ساتھیوں کے وکیل تھے۔

قلندر مومند کو بیسویں صدی کے پشتو ادب میں ایک نابغہ کی حیثیت حاصل ہے۔ پشتو زبان و ادب کے جدید دور پر ان کی شخصیت اور فن کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ انہوں نے شاعری سے لے کر افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، مضمون نویسی، انشاء پردازی، لغت نویسی، تحقیق، تنقید اور ترجمے تک میں نئی جہتیں متعارف کرائیں۔ ان کی شائع شدہ کتابوں میں سباوُون اور رنڑائی کے نام سے دو شعری مجموعے اور گجرے کے نام سے ایک افسانوں کا مجموعہ شامل ہے۔ تحقیق میں رحمان بابا کی کلیات اور دیوانِ ابوالقاسم کی اشاعت ان کا نمایاں کارنامہ ہے، جبکہ تنقید میں پٹہ خزانہ فی المیز ان اور دخیر البیان تنقیدی مطالعہ ان کی معرکتہ الآرا تصانیف مانی جاتی ہیں۔ ''دریاب'' کے نام سے پشتو کی اولین جامع لغت کی تالیف کا سہرا بھی محترم قلندر مومند کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے پشتو رسم الخط میں بھی تبدیلیاں تجویز کیں۔ اولسی ادبی جرگہ اور بعد ازاں دساھولیکونکیو مرکہ کے تحت پختون شعراء و ادباء کو فعالیت کی ترغیب و تحریک دینا اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کی تربیت کے لئے پلیٹ فارمز کی فراہمی ان کا ایک اور نمایاں کارنامہ ہے۔ آپ 1980ء میں گومل یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ساتھ بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہو گئے اور جب اسے لاء کالج ڈیرہ اسماعیل خان کا درجہ دیا گیا تو آپ 1981ء میں اسکے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پشتو ادب کے شعبے میں آپ کی خدمات کے پیشِ نظر 1980ء میں آپ کو ''صدارتی اعزاز

برائے حسن کارکردگی'' عطا کیا گیا اور 1989ء میں محترمہ بےنظیر بھٹو اقتدار میں آئیں تو بحالیٔ جمہوریت کے لئے قلندر مومند کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں وزیراعظم کی طرف سے قومی ایوارڈ برائے بحالیٔ جمہوریت سے نوازا۔ آپ عربی' فارسی اور پشتو کے ممتاز عالم تھے اور ہندی، سنسکرت، عبرانی اور لاطینی کے علاوہ بنگلہ، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور برصغیر کی مختلف دیگر زبانوں پر معقول حد تک عبور رکھتے تھے۔ آپ کو 1982ء میں حکومت صوبہ سرحد نے ایک جامع پشتو لغت مرتب کرنے کے منصوبے کا سربراہ منتخب کیا۔

آپ نے ابتداء میں (1982ـ1991ء) اس منصوبے میں ڈائریکٹر کے طور پر اور پھر 1991ء کے بعد بطور مشیر خدمات انجام دیں۔ آپ کے علم وفضل' محنت ومستقل مزاجی اور انتہائی کوششوں سے کی بدولت 1994ء میں ''دریاب'' اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ پہلی یک لسانی (پشتو سے پشتو) جامع لغت ہے، جس سے زبان کے رسم الخط اور الفاظ کے تلفظ کی معیار بندی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ لغت صوتیا' الفاظ' ان کی اشتقاقیات' جامع معنی اور مترادفات' پودوں اور درختوں کے نباتاتی اور جانوروں کے حیواناتی ناموں جیسی بہت سی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔1996ء میں ادب (تالیفِ لغت) کے شعبے میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان سردار فاوق احمد خان لغاری نے قلندر مومند کو ''ستارہ امتیاز'' کا اعزاز عطا کیا۔آپ نے ایک طویل عرصے تک پشاور سے شائع ہونے والے اخبارات روزنامہ مشرق اور روزنامہ آج میں مستقل کالم نگاری کی۔ آپ کے افسانوں کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں پشاور یونیورسٹی میں آپ حیات وخدمات پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔(جالاوان مومند) قلندر مومند کا شمار صوبہ سرحد کے عظیم پشتون ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم بازید خیل میں ہی حاصل کی۔میٹرک پشاور سے پاس کیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی قوم پرستی کا رجحان غالب تھا اور ساتھ ساتھ صحافت سے بھی والہانہ لگاؤ تھا۔آپ کا شمار پشتو ادب کے ترقی پسند لکھاریوں میں ہوتا ہے۔حق گوئی، نیک نیتی اصولوں پر عمل پیرائی سے آپ کی زندگی عبارت تھی۔منافقت، دقیانوسی، خوشامد آپ کی ذات سے کوسوں دور تھی۔جس بات کو حق جانا فوراً کہہ ڈالا۔آپ ایک لمبا عرصہ درس

و تدریس سے منسلک رہے ۔گورنمنٹ کالج پشاور، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں بطور پروفیسر خدمات انجام دینے کے بعد گومل یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی سے وابستہ ہو گئے، اور لاء کے شعبہ کے انچارج بھی رہے۔1982ء میں گورنمنٹ نے آپ کو''پشتو ڈکشنری'' منصوبہ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا۔آپ کی شب وروز کی محنت سے 70 ہزار الفاظ پر مشتمل ''پشتو ڈکشنری'' 1991 میں شائع ہوئی ۔قلندر مومند کا شمار بیسویں صدی میں پشتو کے بہترین ادیبوں میں ہوتا ہے ۔ہم عصر ادیبوں نے قلندر مومند کی خدمات کے اعتراف میں ان کو بیسویں صدی کا ''بایزید'' کا خطاب دیا ہے۔ آپ درجن بھر کُتب کے مصنف تھے ۔آپ 4رفروری 2003ء کو پشاور میں فوت ہوئے۔

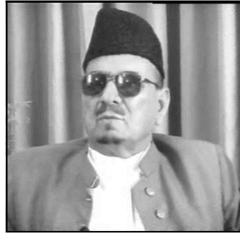
خدا رحمت کندا ایں عاشقانِ پاک طینت را



## مشکل کُشا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے

میں نے زمین سے اپنے غم کی بات کہنا چاہی۔تو زمین خود ہی اپنے غم واندوہ سے لرزنے لگی ۔زمین کو پست حوصلہ جان کر آسمان سے رجوع کرنا چاہا کہ یہ تو بلند حوصلہ ہوگا۔لیکن آسمان مجھے اپنا ہی غم سنا کر بارش کی صورت میں رونے لگا۔میں نے پھر حوصلہ کر کے ستاروں سے اپنے کرب کا اظہار کیا تو تارے آسمان کی وسعتوں میں گُم ہونے لگے۔جب چاند سے اپنی بات کہی تو چاند بھی بادلوں میں منہ چھپانے لگا۔میں نے چاند سے پھر التجا کی تو اس نے مجھے اپنے سینے کے داغ دکھا دیئے کہ دیکھ میں بھی تیری طرح داغ رکھتا ہوں۔پھر میں پریشان ہو کر درختوں کے پاس گیا کہ شاید یہ میرے غم کا بوجھ ہلکا کر دیں۔میری داستان سُن کر کہنے لگے کہ ہم بھی تو مظلوم ہیں میرے ان زرد پتوں سے ہماری داستان غم سُن دیکھو۔پھر بھی تمہیں ان خزاں رسیدہ پتوں میں پناہ مل سکتی ہے تا کہ لوگوں کے قدم تجھے روندتے رہیں۔پھر بھی میری تسلّی نہ ہوئی تو آخر کار پھول کے پاس گیا اس سے اُس سے اس کا حال پوچھا تو انہوں نے طنزیہ لہجے میں ہنس ہنس کر بولا'' کٹ رہی ہے زندگی ان چبھتے ہوئے خاروں میں۔

# ثاقبؔ زیروی



نام محمد صدیق ولد حکیم مولوی اللہ بخش قوم راجپوت وطن زیرہ ضلع فیروز پور (بھارت) تاریخ پیدائش 11/اپریل 1919ء تاریخ وفات 13/جنوری 2002ء بمقام لاہور۔قدرت نے ادبی وصف کا بیج روزِ اول سے ڈال دیا تھا آنرز ان اردو 1947ء میں اور بی اے 1950ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔''گنجینہ اردو'' کے نائب مدیر بھی رہے، جبکہ مدیر احسان دانش تھے۔پھر اپنے مرشد کے کہنے کے مطابق مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر جیسے کہنہ مشق صحافیوں سے تربیت حاصل کی۔

کتب: ہندوستان کی مٹی (افسانہ)۔کاربنکل کی تشخیص۔پنجابی میری زبان۔دورِ خسروی۔شہابِ ثاقب۔نویدِ منزل۔آہنگ حجاز مجموعہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

ثاقب کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی ہے اس کی طبیعت میں شرافت، سعادت، شرمِ حضوری اور دیانت فکر وعمل کی بنیادیں گہری ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہیں نوجوانی اور جوانی کے دونوں زمانوں میں کبھی بے نفسی بے راہ روی یا فکری آوارگی کا شکار نہیں ہونا پڑا۔اور وہ ہمیشہ بندھے ٹکے اسلوب زندگی پر کاربند رہے ہیں۔چنانچہ ان کی شاعری کو دیکھیئے فکر میں جدت تو ہے ابتذال نہیں دین اور حمیت دین تو ہے ملائیت نہیں۔عشق تو ہے لیکن فسق کا شائبہ تک نہیں، غریبوں کی مصیبتوں پر آنسو ہیں۔موجودہ نظام عدم مساوات کے خلاف طیش ہے۔لیکن کمیونزم نہیں۔یہی اعتدال کا رستہ اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔خوش گل، خوش گلو، سرو قامت، مقطع داڑھی، شیروانی پوش، ثاقب زیروی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔اعلیٰ مشاعروں میں جہاں چیدہ لوگوں کا اجتماع ہو، ثاقب زیروی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے تھے۔وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں انتہا پسند نہیں تھے۔وہ ہر اعتبار سے میانہ رو، سلامتی پسند اور غیر حاسد قسم کے آدمی تھے۔ان کی یہی خصوصیت انہیں حلقہ احباب میں مقبول بنائے رکھتی تھی۔ثاقب زیروی کا شاعر ہونا اور اس حد تک دھانسو شاعر ہونا تاریخ ادب کا

ایک عجیب وغریب واقع ہے۔عنفوانِ شباب میں ثاقب سب انسپکٹر تھے۔لیکن کون جانتا تھا کہ یہی سب انسپکٹر شاعری کی دنیا میں مقبول خاص وعام ہوجائے گا۔

میاں محمد شفیع کہتے ہیں کہ ثاقب زیروی انجمن اسلام کے ایک جلسے میں موجود تھے۔جب ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی گئی تو اپنے اشعار اور گداز ترنم کے بل پر پورے جلسہ پر چھا گئے اور اس دن سے ثاقب زیروی کے سامنے ایک اعلیٰ ادبی مستقبل اُجاگر ہوگیا۔خلوص اظہار،سوز وگداز اور خیال واسلوب کی ہم آہنگی ثاقب زیروی کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔خاص طور پر ان کی نعتیں حضوری قلب کا بہترین اظہار ہوتی ہیں۔اور اس مرحلہ پر اردو کے بہت شعراء ان کی برابری کرتے ہیں۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ثاقب زیروی طبیعت اور فکر کے اعتبار سے مذہب پرست ہیں،اور وہ نعتیں خانہ پُری کے لئے نہیں لکھتے بلکہ احتیاج طبیعت اور طبعی رجحان کے ماتحت لکھتے ہیں۔اور یوں ان میں صداقت،خلوص اور جذبہ کا رچاؤ بھرپور انداز میں موجزن ہوتا ہے۔

تو حبیبِ ربِ جلیل ہے تیری عظمتوں کا جواب کیا
تو مقامِ فخرِ خلیل ہے تیری حُرمتوں کا حساب کیا
کہاں تو کہ باعث کُن مکاں کہاں فکر ثاقبِ خستہ جاں
بلا مدحتِ شہ اِنس وجاں کرے مجھ سا خانہ خراب کیا

اس ایک نعت سے ہی ثاقب زیروی کے وفورِ جذبات اور عشقِ رسول کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ثاقب کے ہاں اسی قدرونوعیت کی اور بھی کئی نعتیں بھی ملتی ہیں۔ثاقب زیروی شعروسخن کی عظیم رفعتوں پر فائز تھے اور خصوصاً نعت رسولؐ کے بارے میں اپنے عاشقانہ رنگ،جذبہ فدائیت،جدت استعارات،لطافتِ تخیل،تشبیہ کی خوبی،مضامین کی جامعیت،اور والہانہ اندازِ بیان میں آپ کا کلام اپنی نظیر آپ ہے۔نعت گوئی کے وصف میں یکتائے روزگار تھے،عشق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا سرمایہ حیات تھا۔یہی وجہ ہے کہ شمع حُبِ نبویؐ آپ کے دل ودماغ میں پوری آب وتاب سے روشن تھی۔ ثاقب زیروی کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے متفرق اور متنوع ہوتی ہیں لیکن اس میدان میں ان کا جذبہ حُب الوطنی کے گرد گھومتا ہے۔صبح دیانت،وطن،یاددہانی اور مجاہد وغیرہ یہ تمام نظمیں ملکی حالات

کے متعلق ہیں۔المختصر ثاقب کی شاعری پاکیزہ باسلیقہ اور سلامت رو ہونے کے ساتھ ساتھ غنایت کی بھی حامل ہے۔ان کی شاعری ایک اعلیٰ کلچرڈ کی طبیعت کی عکاسی کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں تاثر کا عنصر بدرجہ کمال پایا جاتا ہے،اور ہر سامع ان کے اشعار سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

باکمال صاحبِ قلم پر، پُرشکوہ ستاویزی اشاعت شائع کرنا ہر ادارے کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے،اور جس کی 60 سالہ قلمی زندگی کی طویل صبر آزما جدو جہد کی داستاں کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔پھر بھی کچھ سر پھرے ادبی مجنوں یا لوح وقلم کی پرورش کی مرض میں مبتلا اپنے خونِ جگر سے ادب کے لالہ زاروں کی آبیاری کررہے ہیں۔بقول شاعرِ مشرق۔

ع نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

ثاقب زیروی جیسی شخصیت پر لکھنا اس لئے بھی دشوار ہے کہ بقولِ ثاقب صاحب کہ''ہم جو تھے وہ نہیں رہے جو بننا چاہتے تھے وہ بن نہیں پائے''ایسی شخصیت جس نے برصغیر کی ریاستوں کے عروج وزوال اور عزت دار گھرانوں کو گردشِ لیل ونہار کے باعث گم نام ہوتے دیکھا ہو۔جس نے خاندانی خون کے الرغم قول وفعل کے تضاد کو دیکھا اور اپنے جذبات کو اشعار میں قلم بند کیا۔ایسے شخص کے متعلق لکھنا اس لئے مشکل ہے کہ جس نے اپنی سیاسی بصیرت کو ہمیشہ فطرتی وکائناتی حقائق کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔جس نے اعتدال کے ساتھ ساتھ محبت و بھائی چارے کے وسیع کینوس پر اپنے نقشِ محبت کو اپنے عمل سے ثبت کیا۔جسے قدرت نے وصف عطا کیا کہ''کسی کی تحریر کے چند فقرے اور گفتگو کے چند مکالمے اس کے معیار وفا کے نقش بن کر ثاقب صاحب کے ذہن میں اُجاگر ہوجاتے تھے اور اس نقش کے مطابق ثاقب صاحب نے جس سے جو بھی تعلق قائم کیا اس کو ہمیشہ اس پر ناز رہا''یہ محض ان کے خالق و مالک کا فضل تھا،جس نے الفاظ کی پہچان اور ان کے اوزان کی صلاحیت انہیں ودیعت کی۔اسی کے فیض نے ہمیں ایک اچھا مصنف،اچھا شاعر وادیب عطا کیا اس کے علاوہ ایک انسان دوست دیا جو بے غرض اطاعت اور بے پایاں محبت کا مجسمہ شاہکار ثاقب زیروی کی شکل میں دیا۔جس نے ہمیشہ اپنی تحریر لکھتے وقت ان باتوں کو مدنظر رکھا کہ''اس فقرے

کے ملکی حدود میں کیا معنی کئے جا سکتے ہیں اور ملکی حدود سے باہر کیا؟ میرے دین کے لئے کیا مفہوم رکھتا ہے، اور بعد میں میری قوم پر کیا اثر چھوڑے گا، ایسی مستند تحریر لکھنے والی شخصیت پر لکھنا کچھ آسان نہیں۔''

بانی ہفت روزہ ''لاہور'' ثاقب زیروی نے اردو صحافت کی اعلیٰ روایات کو جس طرح زندہ تابندہ رکھا۔ وہ اپنی جگہ مسلم لیکن وفا اور وضع داری کے اس پیکر کی ساری زندگی تا مرگ، ہر لمحہ ایک ہی لگن اور ایک ہی مشن پر قائم رہی ''اعلیٰ دینی اقدار کا قیام و استحصالی نظام کا خاتمہ رہی۔ ثاقب زیروی صاحب سولو صحافت کا نادر نمونہ تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی صحافت کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو کوئی مؤرخ آپ کے نام کا ذکر کئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے گا۔ تن تنہا پچاس سال تک ہفت روزہ ''لاہور'' سورج کی سی باقاعدگی سے نکالتے رہے۔

ثاقب زیروی نہ جانے کیا شے تھے۔ وہ مقدمات بھی بھگتتے رہے، مبارک بادیں بھی سمیٹتے رہے، گالیاں بھی سنتے رہے، دعائیں بھی لیتے رہے، وہ مشاعروں کی جان تھے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں شائقین کی آنکھوں کے تارے تھے، اور دلوں کی دھڑکن، وہ جہاں صاحبانِ اقتدار کا دوست تھے اسی طرح غریبوں کا مونس و غمخوار بھی وہ کبھی بڑے بڑے شاعروں کی موجودگی میں مشاعروں کو الٹ دیا کرتے تھے، اور کبھی پٹے ہوئے مشاعروں کو جما دیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز بھی آئے، مگر وہ ویسے کے ویسے ہی رہے۔ اُن کی باتوں سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا وہ تہہ بہ تہہ کھلتے تھے، مگر کم کم احباب پر، اور جن پر کھلتے تھے اُن کو اپنی محبتوں اور شفقتوں میں سمیٹ لیا کرتے تھے، اور وہ اُن محبتوں شفقتوں کا محور دیکھتا رہ جاتا کہ ایسا کس وجہ سے اور کیوں؟ آپ کے ہم عصروں میں فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، بابا کمل پوش، کلیم عثمانی، طفیل ہوشیار پوری، مولانا صلاح الدین، حکیم سعید، احسان دانش، ساغر صدیقی، سیف الدین سیف، مصطفیٰ زیدی، عدم، تاثیر، تبسم اسد ملتانی، کوثر نیازی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، تلوک چند محروم، رام لعل، مولانا تاجور نجیب آبادی، جگر مراد آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، سردار دیوان سنگھ مفتون، م۔ش۔ مجید نظامی، ن۔م راشد، نذیر

شیخ، دوست جالندھری، مجید لاہوری، مولانا ظفر علی خان، سردار راجندر سنگھ بیدی، تھے۔ جن کا گاہے گاہے ذکرِ خیر چلتا رہتا تھا۔ ثاقب زیروی صاحب کی شخصیت اگر چہ نمایاں طور پر تبلیغ دین، شاعری، صحافت اور ادارت پر مشتمل تھی۔ اس کے آگے دو پہلو تخصیص کے حامل یہ تھے کہ انہوں نے مشکلات کے باوجود اپنا مشنری ذوق ابلاغ عمر بھر جاری رکھا اور صحافت میں انہوں نے اردو صحافت کا سب سے مشکل پہلو ''یک رُکنی'' صحافت کا اختیار کیا تھا۔ دنیا کی کسی زبان میں بھی ایسی صحافت مشکل ترین ہی ہوتی ہے لیکن اس طرح کی صحافت اردو میں اس لئے خاص اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ مدیر کو باوصف نظریاتی اخلاص کے زندگی کے سبھی پہلوؤں پر یکساں گہرائی کی نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جس کے لئے مشاہدے اور مطالعہ کا ہمہ وقت مجاہد بننا لازم ٹھہرتا ہے۔

اس روایت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' مولانا محمد علی کا ''ہمدرد'' مولانا حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ''، اتنی بڑی مثالیں ہیں، کہ بعض دفعہ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ثاقب زیروی صاحب نے 1952ء جیسے نامساعد حالات میں اپنے لئے اسقدر مشکل راستہ کیوں اختیار کیا لیکن ''لاہور'' کے پچاس سال گواہی کے لئے موجود ہیں، کہ انہوں نے نہ صرف انتخابِ درس کیا تھا بلکہ پورے تقاضوں اور شان بان کے ساتھ اسکو پورا رکھا اور جو سابق رواج خلوصِ کار اور ذاتی پاکیزگی کا تھا، اسے تابانی سے جاری رکھا۔ ایسے دقیق مگر اوصافِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ ثاقب صاحب سے ملنے والے تمام لوگ یہ بھی گواہی دیں گے، کہ وہ شرح محمدؐیہ پر پورے طور پر تمام عمر کاربند رہے۔ اور ساری عمر ایک سالک صوفی اور باعمل عالم کے طور پر گزاری۔ ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں گل وبلبل، لب ورخسار، ہجر ووصال، شمع و پروانہ کا رونا نہیں رویا بلکہ انسان پر انسان کے ظلم کی داستان بھی بیان کی ہے۔ انسان کی چیرہ دستیاں اور انسان کی مجبوریوں پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں حسن وعشق کے ساتھ ساتھ غربت کے چھپے ہوئے ناسوروں کو بھی ننگا کیا ہے۔ مذہب کے مقدس نام پر خوں ریزی کرنے والے جعلی مولویوں کو وطن دشمنوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ ثاقب زیروی ایک درویش صفت شاعر ہیں۔ اُن کے ساتھ ادیب، صحافی، اُمراء روساء کی خوشامد کر کے کروڑوں روپے، کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بن گئے مگر ثاقب

زیروی نے نہ کوئی کوٹھی بنائی اور نہ کوئی کار خریدی۔

پاکستان بننے سے قبل وہ تحریک پاکستان کے صفِ اول کے مجاہد تھے اور پاکستان کے لئے انہوں نے شب و روز کام کیا، اوران کے بہت سے عزیز تقسیم کے وقت شہید ہوئے۔1952ء میں لاہور کی صحافت پر ایک ایک نئے روشن ستارے کی طرح طلوع ہوئے اور آدھی صدی تک لوگوں کے دلوں میں اپنی نثر، اور شاعری سے جگمگاتے رہے۔آخر شہابِ ثاقب بن کر ٹوٹے، فضا میں روشنی بکھیرتے ہوئے اپنی حسین یادیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔اُن کے قلم میں جادو تھا۔دوست نواز، عظیم شاعر، باکمال صحافی، ہنس مکھ ساتھی، غمگسار رفیق، بہترین استاد و دوست تھے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہ مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر ویرانے پہ کیا گزری

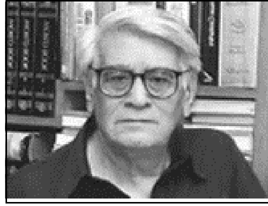


## پاکستان کا قومی ترانہ

جنوری ۱۹۵۴ء میں دُھن کے مطابق حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا قومی ترانہ منظور کرلیا گیا۔اسی سال احمد جی چھاگلہ کی بنائی ہوئی دُھن کو منظور کیا گیا۔ ۷ راگست ۱۹۵۴ء کو قومی ترانہ کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۳ راگست ۱۹۵۴ء کو حفیظ جالندھری کی آواز میں ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا۔ حفیظ جالندھری نے ترانہ لکھنے میں چھ ماہ لگائے۔اور تین ماہ تک اس کے ہر لفظ پر نہایت غور کیا۔ پاکستان کے قومی ترانے کی شاعری مخمس شکل میں ہے۔اس میں کل پندرہ مصرعے ہیں قومی ترانے کی دُھن مرتب کرتے وقت ۲۱ آلات اور ۳۸ ساز استعمال کئے گئے ہیں۔ پورا قومی ترانہ بجنے میں ایک منٹ اور ۲۰ سیکنڈ صرف ہوتے ہیں۔قومی ترانے میں ''کا'' کے سوا اُردو کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔تمام الفاظ فارسی کے ہیں ۱۴ راگست ۱۹۵۵ کو حکومت پاکستان نے ابوالاثر حفیظ جالندھری سے قومی ترانے کے تمام حقوق خرید لئے تھے۔

# جناب عبید اللہ بیگ صاحب مرحوم

## مشہور شاعر، دانشور، ٹیلی ویژن میزبان، کالمسٹ، ناول نویس



گزشتہ دنوں شاعر، دانشور، ٹیلی ویژن میزبان میزبان کالمسٹ عبید اللہ بیگ انتقال کر گئے۔ ٹیلی ویژن اور علم وادب کی دنیا ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گئی جس کا کوئی بدل نہیں ۔ وہ 1970ءاور پھر 1990ء کی دہائی میں معروف ٹی وی پروگرام ''کسوٹی'' کے ذریعہ اہل علم و دانش کے قلوب پر راج کرتے رہے۔ ابتدا میں ان کی جوڑی افتخار عارف کے ساتھ بنی اور بعد میں وہ غازی صلاح الدین اور قریش پور کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا جادو جگاتے رہے۔ انہوں نے دو ناول لکھے اور شاعری میں اپنی خدا داد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انہیں 2008ء میں ان کی ادبی خدمات پر پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا۔ انہوں نے پسماندگان میں تین لڑکیاں چھوڑی ہیں جو کہ ان کی طرح ذہین ہیں، اور ٹیلی ویژن اور فنون لطیفہ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ عبید اللہ بیگ 1938ء میں رام پور انڈیا میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد کراچی میں آباد ہوئے۔ کراچی ہی کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ قدرت نے انہیں بلا کا حافظہ دیا تھا۔ وہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور علم کے دوسرے شعبہ جات میں بہت علم رکھتے تھے۔

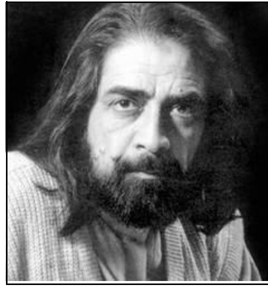
عبید اللہ بیگ کے انتقال پر ان کے دیرینہ ساتھیوں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ غازی صلاح الدین نے کہا کہ میں نے اُن کے ساتھ نصف صدی سے زائد عرصہ کام کیا ہے۔ پورے ملک میں عبید اللہ بیگ کا نام بہت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ انسانی درجے کے، قناعت پسند اور بے غرض انسان تھے۔ انہیں دولت اور نمود و نمائش سے کوئی پیار نہ تھا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والے انسان تھے۔ وہ فنون لطیفہ اور سائینس کے بارے میں حیرت انگیز علم رکھتے تھے اور معلومات کا خزانہ تھے۔ جس سے دوسروں کو فیض پہنچاتے تھے۔ پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ ان کی موت ہمارے لئے صدمہ عظیم ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب ہم سب ان کی رہائش پر اکھٹے ہو کر دنیا کے

سب موضوعات زیرِ بحث لاتے تھے۔ ہمارے ساتھ ممتاز سعید، جون ایلیا اور غازی صلاح الدین ہوا کرتے تھے۔ یہ علمی و ادبی محافل اب ماضی کا قصہ بن گئیں۔ معروف کمپیئر طلعت حسین نے کہا کہ وہ ایسے شخص تھے کہ جسے ماڈل قرار دیا جاسکتا ہے۔ معروف ٹی وی اینکر پرسن ضیاء محی الدین نے بھی انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایسی صلاحیتیں بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ پروفیسر ترابی نے کہا کہ وہ ہمارے یہاں ٹک کلچر کے نمائندے تھے۔ جواب تیزی سے معدوم ہوتا جارہا ہے۔ عبیداللہ بیگ اولادِ نرینہ سے محروم تھے، مگر انہوں نے کبھی بھی اس کا غم نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب وہ باپ بننے والے تھے، تو اس وقت بھی انہوں نے بیٹی کے لئے دعا کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بیٹیاں باپ کے لئے ہوتی ہیں، اور بیٹے بیویوں کے لئے۔ بیٹی بالعموم باپ کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔ ان کی ایک بیٹی امریکہ میں ہے دوسری بیٹی نیوز چینلز کے لئے کام کرتی ہے۔ جبکہ سب سے چھوٹی آرٹسٹ ہے اور ایک خبر رساں ایجنسی میں کام کرتی ہے۔ عبیداللہ بیگ نے 1951ء میں بریلی کے اسلامیہ کالج سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد پاکستان آکر کراچی میں اسلامیہ کالج ہی میں داخلہ لیا اور گریجوایشن کی۔ مختلف ملازمتیں کرتے رہے۔ اسی دوران ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے۔ اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اسی دوران ایک ناول ''اور انسان زندہ ہے'' بھی لکھا۔ وہ بہت دھیمے انداز میں مسکراتے، مشکل سوالات کا یوں جواب دیتے کہ ناظرین داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے ایک دیرینہ دوست کے مطابق جن دنوں اُن کا شو عروج پر تھا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پاکستان کی کسی گلی سے گزر جائیں اور لوگ انہیں نہ پہنچانیں۔ علمی و ادبی حلقوں کا کہنا ہے کہ ''عبیداللہ بیگ کا انتقال ایسا ہی ہے جیسے ہمارا ملک ایک روشن اور خوبصورت دماغ سے محروم ہوگیا ہو۔''

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



# عبیداللہ علیم کی زندگی پر ایک نظر



پاکستانی ادب کی تاریخ میں کچھ صفحات پر اس قدر سیاہی پھیلی ہوئی ہے کہ وہاں نور کی ایک آدھ کرن بھی نظر نہیں آتی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں صفحات پر کچھ نام اتنے درخشاں رہے ہیں کہ یہ سیاہی بھی انہیں چھپانے میں ناکام رہی ہے، اور وہ نام اس سیاہی کے دامن سے بھی نمایاں طور پر جھلک اٹھے ہیں۔ انہیں میں سے ایک نام عبیداللہ علیم کا بھی ہے۔

آج جب عبیداللہ علیم کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ہندستان میں پیدا ہونے کے سبب انہیں ہندستانی لکھوں، یا پاکستان میں متحرک رہنے کی وجہ سے پاکستانی۔ بہر حال عبیداللہ علیم کی پیدایئش 12/جون 1938ء کو ہندستان کے شہر بھوپال میں ہوئی تھی۔ انکے والد سیالکوٹ کے ایک بٹ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی جو انہیں اس سرزمین تک کھینچ لے گئی ہوگی، جو بعد میں ہندستان سے الگ ہوکر پاکستان کے طور پر وجود میں آئی۔ حقیقت جو بھی رہی ہو، لیکن انہوں نے اپنا پوسٹ گریجویشن کراچی یونیورسٹی سے پورا کیا اور بطور پروڈیوسر ریڈیو کراچی سے وابستہ ہو گئے۔ بعد میں جب ٹیلی ویژن وجود میں آیا تو وہ کراچی ٹیلی ویژن میں منتقل ہوگئے۔ ایک انسان کی اپنی زندگی سے جو کچھ توقعات ہو سکتی ہیں، عبیداللہ علیم کو ان کی زندگی نے وہ سب کچھ دیا تھا۔ 1970ء میں نگار یاسمین سے ان کی شادی بھی ہوگئی۔ ان کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں لیکن وقت نے جو کروٹ بدلی تو ایک ایسا زلزلہ آیا کہ اپنے پیچھے تباہیوں کی ایک داستان چھوڑ گیا۔

قانونی طور پر وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری اور بعد میں ان کے سیاسی قتل کے بعد کٹّر اسلامی مطلق العنان فوجی حاکم جنرل ضیاالحق نے پاکستان کی باغ ڈور سنبھال لی اور اس کے ساتھ ہی پاکستان میں افراط وتفریط اور خوف وہراس کا ایک طویل دور شروع ہوگیا۔ اس

بہیمانہ تعصب اور ناانصافی کے دور میں پاکستانی عوام اور بطورِ خاص تخلیقی فنکاروں، مصنفین وشعرا پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ 1978ء کا یہی وہ دور تھا، جب عبیداللہ علیم کو احمدی ہونے کے جرم میں اپنی نوکری سے استعفیٰ دینے کے لئے مجبور کر دیا گیا۔اُن کی پہلی کتاب 'چاند چہرہ ستارہ آنکھیں' اس سے چار سال پہلے ہی منظرِ عام پر آ کر مقبولیت کی بلندیوں کو چھو چکا تھا، اور اسے پاکستان کا بلند ترین انعام 'آدم جی پرائز' سے نوازا گیا تھا لیکن اس حادثے کے بعد ان کی ذہانت اور فنی صلاحیتوں کو جم کر نظرانداز کیا گیا۔ وہ دور اسلامی فنڈامنٹلزم، مذہبی تعصب اور بے جا پابندیوں کا دور تھا۔ اس ماحول سے متاثر پاکستانی سماج، خوشامد پرست تنقید نگاروں، میڈیا اور سوشلائٹس کی طرف سے انہیں ٹھنڈا رسپانس ملا۔ جس نے انہیں مایوس کر دیا۔

1982ء میں انہوں نے احمدیہ رہنما حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کی یاد میں ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا ''خورشید مثال شخص''، ان کا دوسرا مجموعۂ کلام 'ویراں سرائے کا دیا' 1986ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں، 1990ء میں عبیداللہ علیم نے دوسری شادی کی، اور اسی دوران انہوں نے کئی بار انگلینڈ کا دورہ کیا۔وہ 1991ء میں، 1993ء میں، 1994ء میں، 1996ء میں اور پھر 1997ء میں انگلینڈ گئے۔ 1997ء کے مارچ کے مہینے میں انہیں زبردست دل کا دورہ پڑا جس کے سبب انہیں ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ وہاں علاج سے حالت میں ذرا سدھار ہوا تو وہ اپنے گھر مکان نمبر 4، ناظم آباد، کراچی آ گئے۔ 1998ء میں دوسرا دل کا دورہ ان کے لئے جاں لیوا ثابت ہوا، اور اس طرح 18رمئی 1998ء میں ادب کی دنیا کا یہ ستارا ڈوب گیا۔ عبیداللہ علیم کی مختلف غزلوں کو پاکستان کے اعلیٰ ترین گلوکاروں کی آواز کی رہبری حاصل ہوئی ہے۔ کچھ جھلکیاں پیش ہیں۔ غلام علی نے اپنی آواز کی ضیا سے جن غزلوں کو روشن کیا ان میں۔

عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

اور......

کچھ دن تو بسو مری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا

جس غزل کوفریدہ خانم نے اپنی آواز سے سجایا وہ ہے۔

کچھ عشق تھا کچھ مجبوری تھی
جو میں نے جیون ہار دیا

تو ملکۂ ترنم نور جہاں نے جس غزل کو اپنی ریشمی آواز کی ساحری سے نا قابلِ فراموش بنا دیا وہ ہے۔

تیرے پیار میں رسوا ہو کر جائیں کہاں دیوانے لوگ
جانے کیا کیا پوچھ رہے ہیں یہ جانے پہچانے لوگ

اس کے علاوہ بھی عبیداللہ علیم کے انگنت اشعار ہیں، جو عوام کے دلوں پر نقش ہیں، اور اس طرح وہ آج بھی اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں، اور جب تک ان کے اشعار فضاؤں میں گونجتے رہیں گے، انشااللہ زندہ رہیں گے۔



## سقراط۔(۴۶۹۔۳۹۹ق م)

یونان کا عظیم فلسفی اور مصلح ایک سنگ تراش کا بیٹا تھا۔ ایتھنز میں پیدا ہوا۔ ابتداء میں باپ کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن بعد میں فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ سچائی اور ایمانداری کا دلدادہ تھا۔ اور لوگوں کو بحث اور مکالموں کے ذریعہ سچائی کی ترغیب دیتا تھا۔ سقراط کے مخالفین نے اس پر الزام لگایا کہ وہ بے دین ہے۔ اور دیوتاؤں کو نہیں مانتا۔ اس کی تعلیم سے شہر کے نوجوان خراب ہوتے ہیں ایتھنز کے سینٹ میں اس پر مقدمہ چلا اور سقراط نے اپنی وکالت آپ کی، سینٹ نے اسے موت کی سزا دی۔ اس نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا اور زہر کا پیالہ خوشی خوشی پی لیا۔ سقراط کا سب سے ممتاز شاگرد افلاطون تھا۔

# سیّد امتیاز علی تاجؔ

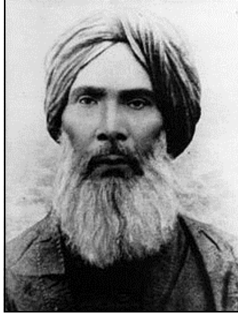


سید امتیاز علی تاجؔ اُردو کے عظیم ادیب و نقاد 1900ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شمس العلماء مولوی ممتاز علی صاحب کا تعلق دیوبند بھارت سے تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔ کالج کے زمانہ میں کئی ایک بلند پایہ انگریزی ڈراموں کا اُردو ترجمہ کر کے سٹیج پر پیش کیا۔ 1918ء میں ایک ادبی رسالہ ''کہکشاں'' جاری کر کے اسے تین سال تک کامیابی سے چلایا۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کا ترجمہ کیا۔ 1932ء میں ''انارکلی'' لکھا جو اُردو ڈراموں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ''چچا چھکن'' کے نام سے مزاحیہ سکیچ لکھے اور اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ نیز زنانہ رسالہ ''تہذیب النسواں'' اور بچوں کے ماہنامہ ''پھول'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ اوّل الذکر رسالہ آپ کی والدہ نے جاری کیا تھا۔ جو خود بھی ایک بلند پایہ ادیبہ تھیں۔ سید امتیاز علی تاج صاحب نے ریڈیو کے لئے دو درجن سے زائد ڈرامے اور فیچر لکھے۔ اور ان میں پارٹ بھی ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور ریڈیو سے اس زمانے کا مقبول پروگرام ''پاکستان ہمارا ہے'' شروع کیا۔ ایک درجن سے زائد فلمی کہانیاں لکھیں۔ آخری ایام میں ''مجلس ترقی ادب لاہور'' کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ 9/اپریل 1970ء کو کسی نامعلوم شخص نے آخر شب آپ کے گھر میں گھس کر آپ کو قتل کر دیا۔ آپ مغربی لٹریچر سے متاثر تھے۔ ان کے طرزِ تحریر کی نمایاں خوبیاں یہ ہیں۔ سلاست و روانی، اعلیٰ درجہ کی کردار نگاری، واقعاتی مزاج، خود کلامی، اور بلند آہنگ وقہقہہ وغیرہ۔

آپ نے اُردو ادب کی بہت خدمت کی۔ آپ کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے تھا۔ ایسے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ ہمیں ایسے ادیبوں اور نقادوں کی خدمات پر اُن کی خدمات کو سراہتے رہنا چاہیئے۔



# امیر مینائی

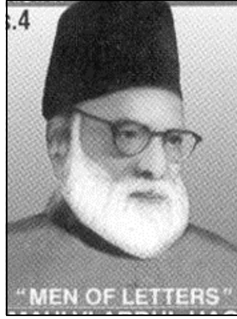


منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ان کی تاریخ ولادت 16 شعبان 1244ھ ہے انہوں نے منشی مظفر علی اسیر سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور کچھ عرصہ اودھ کے دربار سے منسلک رہے۔ پھر رام پور چلے گئے۔ جہاں نواب کلب علی خاں نے اپنا کلام امیر مینائی کو دکھانا شروع کر دیا۔ان دنوں حسنِ اتفاق سے رام پور میں اچھے اچھے انشاء پرداز اور عالم جمع ہو گئے تھے۔مثلاً علامہ عبدالحق خیر آبادی، مفتی سعید اللہ، امداد علی بحر، اسماعیل حسین منیر، امیر اللہ تسلیم، ضامن علی بلال، نواب میرزا خاداغ اور آفتاب الدولہ قلق۔نوابانِ رام پور ہر طرح سے علماء اور انشا پردازوں کی دلداری کیا کرتے تھے۔علاوہ ازیں رام پور میں جو پُرلطف صحبتیں شعراء کو میسر آتی تھیں وہ رام پور ہی سے مخصوص تھیں۔

امیر مینائی کی بہت سی تصانیف ہیں۔ان میں دیوانِ خمخانہ عشق وشعری تخلیقات میں زیادہ مشہور ہے۔نثر میں ان کا ایک نایاب تذکرہ شعرائے رام پور کا ہے۔جس کا نام انتخاب یادگار ہے۔امیر مینائی کے کلام میں وہ تیکھا پن اور نوک پلک موجود نہیں جو داغ کا حصہ ہے۔لیکن کبھی وہ نہایت بلند رتبہ شعر کہتے ہیں وہ طبعاً متقی تھے۔اور ایسے ماحول میں تربیت پائی تھی کہ رندانہ محفل آرائیوں کی طرف بالکل مائل نہ تھے۔ان کے معاشقہ کی کوئی داستاں مشہور نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں جو خالص تغزل کے شعر ہیں ان کی بنیاد محض تخیل پر ہے۔ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں وہ چیز مفقود ہوتی ہے جسے جذباتی صداقت کہتے ہیں۔



# بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب




اُردو ادب کے مشہور ادیب اور نامور نقاد 1870ء میں غازی آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ 1894ء میں علیگڑھ کالج سے بی۔اے پاس کیا۔ جہاں آپ شبلی نعمانی، سرسید احمد خاں سرِ راس مسعود، محسن الملک، پروفیسر سید محمود، ٹی ڈبلیو آرنالڈ، بابو مکرجی سے صحبت یاب ہوئے۔ آپ نے 1903ء میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد ڈالی جس کے پہلے صدر پروفیسر آرنالڈ اور شبلی نعمانی فرسٹ سیکر ٹری تھے۔ مولانا عبدالحق نے انڈین سول سروس میں بھی سروس کی۔جس میں آپ چیف ٹرانسلیٹر دہلی کے عہدے پر تھے۔آپ کو اورنگ آباد ڈسٹرکٹ کا انسپکٹر سکولز بھی لگا دیا گیا تھا مگر پھر آپ کو اُسی سال آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سیکرٹری بھی مقرر کر دیا گیا۔آپ اورنگ آباد کے عثمانیہ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔مولوی عبدالحق پھر اُردو یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی سے وابستہ ہو گئے۔آپ کے نام کے ساتھ مولوی اس لئے لکھا جاتا ہے کہ حیدرآباد میں گزٹیڈ آفیسر کے ساتھ یہ لفظ احتراماً استعمال ہوتا تھا۔

اس میں سارے مضامین اُردو ہی میں پڑھائے جاتے تھے اس کے بعد مولوی عبدالحق حیدرآباد دکن اُردو کی خدمت کے لئے چلے گئے۔وہاں آپ نے سائنسی علوم بھی پڑھے۔مولوی عبدالحق کانگرس اور گاندھی کے بہت بڑے نقاد تھے۔اور 1930ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔تقسیم ملک کے بعد کراچی آ گئے آپ نے اُردو ڈکشنری پر بہت کام کیا۔آپ کی تصنیفات میں انگلش اُردو ڈکشنری، چند ہم عصر، مکتوبات، قواعد اُردو،، موجود ہیں۔آپ نے 1959ء میں کراچی میں ایک بہت بڑی اُردو کانفرنس بھی کی۔آپ نے صحیح معنوں میں اپنی زندگی کو اُردو زبان کے لئے دل و جان سے وقف کیا ہوا تھا۔دو سہ ماہی رسالے''اُردو''اور''سائنس'' جاری کئے۔اور رسالہ''ہماری زبان'' بھی جاری کیا۔آپ کا اُردو کے لئے کیا ہوا کام قومی اثاثہ ہے۔آپ کوئی مولانا یا دینی عالم نہ تھے۔ہاں

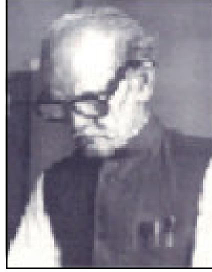
بابائے اُردو کو صرف ایک مصنف، مؤلف، اہل قلم، ایک عظیم الشان ثقافتی تحریک کے علمبردار، ایک بڑے قومی کارکن، اُردو زبان کے ایک زبردست خدمت گذار، محقق، مبلغ، محافظِ اور شہتیر سمجھنا چاہیئے۔ وہ تحریک جس نے اُردو پر جو ہندوستانی مسلمانوں میں ایک علیحدہ قومیت کا احساس پیدا کرانے کا سب سے پہلا اور بہت بڑا سبب بنی۔ جس کا ہر وار اس نے اپنے سینے پر لیا، ہر موقع پر اُسے آگے بڑھایا، اور اُسے آگے بڑھانے کے مواقع نکالے، اور اُن مواقع سے اُردو زبان کو فائدہ پہنچایا۔ مولوی عبدالحق بلا شبہ اُردو کے زبردست خدمت گزار بلکہ اوّلین معماروں میں سے تھے۔ آپ صحیح معنوں میں بابائے اُردو تھے۔ آپ کی وفات 16 ر اگست 1961ء کو کراچی میں ہوئی۔ حکومت پاکستان نے آپ کے نام کا ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا تھا۔



## قیامت کی 20 نشانیاں

۱۔ زرداری غریب ہو جائے گا۔ ۲۔ الطاف حسین کراچی آئے گا۔ ۳۔ مشرف کو جیل ہو گی۔ ۴۔ شیریں رحمن پردہ کرے گی۔ ۵۔ چوہدری شجاعت کو بولنا آجائے گا۔ ۶۔ شیخ رشید کی شادی ہوگی۔ ۷۔ عمران خان وزیر اعظم بنے گا۔ ۸۔ رحمان ملک سچ بولے گا۔ ۹۔ قائم علی شاہ بھنگ چھوڑ دے گا۔ ۱۰۔ ملاں جھوٹ بولنا چھوڑ یگا۔ ۱۱۔ پاکستان میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا دور دورہ ہوگا مسجد امن کا گہوارہ ہوگی۔ ۱۲۔ ملک میں اسلامی نظام آجائے گا۔ ۱۳۔ پاکستان میں گھٹ تول تے جھوٹ بول ختم ہوجائے گا۔ ۱۴۔ پاکستان میں عدل فاروقی آجائے گا۔ ۱۵۔ سب لوگ بھائی بھائی بن جائیں گے۔ ۱۶۔ پاکستان عرب و دیگر ملکوں کی خوشامد سے باز آجائے گا۔ ۱۷۔ پاکستان میں چھوٹا اور بڑا، کالا اور گورا، برابر ہوجائیں گے۔ ۱۸۔ پاکستان میں صحت تعلیم اور بجلی عام بلکہ وافر ہوجائے گی۔ ۱۹۔ پاکستان میں اقرباء پروری، لالچ، سفارش، رشوت، قتل، ڈکیتی، اغواء برائے تاوان، مہنگائی، ملاوٹ، بے ایمانی ختم ہوجائے گی۔ ۲۰۔ پاکستان جنت نظیر ملک بن جائے گا۔

# مبارک مونگیری ایک عظیم شاعر



آپ بھارت کے شہر مونگیر میں 1914ء میں پیدا ہوئے اور 6/ اکتوبر 1988ء کو کراچی پاکستان میں انتقال کر گئے۔آپ ایک ممتاز شاعر تھے۔آپ کی زندگی میں ہی آپ کے کلام کا پہلا مجموعہ کلام ''صحرا سے گلستاں تک'' 1984ء میں شائع ہوا۔انکے انتقال کے بعد دوسرا مجموعہ کلام ''ذکرِ ارفع'' جوکہ نعتیہ کلام پر مشتمل ہے،شائع ہوا۔پھر تیسرا مجموعہ ''بوجھو تو جانیں'' 1994ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد چوتھا مجموعہ ''سیلِ خون'' 2000ء میں اور آخری ''ختم ہوا افسانہ بھی'' 2004ء میں شائع ہوا۔مبارک مونگیری کو حال ہی میں ایک اور اعزاز ملا ہے، کہ جب پی ایچ ڈی کا مقالہ ''مبارک مونگیری حیات وشاعری'' شائع ہوا۔یہ ڈگری ڈاکٹر شرف الدین کو بھارت کی متھلا یونیورسٹی نے تفویض کی۔

## اہلِ قلم کی آراء مبارک مونگیری کے بارے میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اُن کی نعتیہ شاعری پر دادِ تحسین دیتے ہوئے لکھا ہے۔''مبارک مونگیری نے عربی میں سعدی کے چار مصرعوں'' بلغ العلے بکماالہِ'' سے متعلق جن کے قافیہ اُردو میں ناپید ہیں۔کمالِ زبان دانی کی معرفت عربی کے قوافیے کے مماثل اُردو میں جس طرح ایجاد کیا ہے۔وہ اُن کے خلاق شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔''اس ضمن میں مبارک مونگیری کی طویل تضمین کا پہلا بند پیش ہے۔

کوئی کر سکے تیری مدح کیا کہ نہ تاب ہی نہ مجال ہی
نہ رسا ہو ذہنِ بشر کبھی نہ گذر کناں ہو خیال ہی
تیرے مرتبے سے ہے آشنا وہی ربّ عزّ جلال ہی
کہ ہے رفعنالك ذکر پہ گواہ صدقِ مقال ہی
بلغ العلے بکما الہ کشف الدجے بجما الہ
حسنت جمیع و خصا الہِ صلو علیہ وآلہِ

ڈاکٹرجمیل جالبی کہتے ہیں:

مبارک مونگیری غزل اورنظم پر یکساں قدرت رکھتے تھےلیکن غزل میں خاص کراُن کے ہاں ایک ایسا لہجہ ملتا ہے جواُن کے اشعار کودل آویزاور پُراثر بنادیتا ہےملاحظہ ہو:

گمنام آدمی کا دنیا میں کارنامہ
منسوب ہو رہے گا مشہور آدمی سے

رئیس امرہوی اور مبارک مونگیری 1914ء میں بھارت میں پیدا ہوئے وہیں تعلق ہوا،قربت بڑھتی رہی، پاکستان ہجرت کے ساتھ یہ دوستی اور مضبوط رہی،دونوں کا انتقال ایک ہفتہ کے وقفہ سے 1988ء میں ہوا۔ یوں اگر دونوں کوہمعصر کہا جائےتو غلط نہ ہوگا۔

رئیس امرہوی کہتے ہیں کہ غزل کا لطف یہ ہے کہ اثر انداز بھی ہواوراثر اندوز بھی۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک شاعر کے احساسات اپنے نہ ہوں اور اس کی روح کی گہرائیوں سے نہ اُبھرے ہوں ۔روایتی غزلیں تو کہی جاتی ہیں، اور کہی بھی جاتی رہیں، گی مگر ان کی حیثیت کاغذ کے پھولوں سے زیادہ نہیں،خوشنما مگر بےرنگ ۔مبارک مونگیری کے کلام میں اُن کی رُوح جھلکتی ہے،جس نے شاعر کے لہجے میں تشخص پیدا کردیا ہے ملاحظہ ہو۔

آتا ہے دھیان ان کا یوں دشتِ زندگی میں
ظلمت میں شب کی جیسے ہو جلوہء سحر سا

اسی غزل کا کیا یادگار شعر ہے۔

اک آہ میں ڈھلی ہے روداد زندگانی
عمرِ طویل کاہے افسانہ مختصر سا

یہاں مختصر کا جواب نہیں۔غزل کا کمال یہ ہے کہ ہرشعراپنی جگہ مکمل ہوتا ہےاس سے لطف اندوز ہونے کے لئےکسی لاحقے یاسابقے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ان کا ایک شعرضرب المثل بن گیا ہے۔

دامانِ کرم راہ کے اشجار بنے ہیں
ہے دھوپ اگر تیز تو سائے بھی گھنے ہیں

یہ کیا عجب محاورہ ''لوہے کے چنے'' کیسی برجستگی اور پُرکاری کے ساتھ نظم کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

جو سانس بھی آتی ہے گزرتی ہے قیامت
دن زیست کے یارب ہیں کہ لوہے کے چنے ہیں

رئیس امروہوی مزید کہتے ہیں کہ اُن کی غزل روایتی نہیں جن کے مضامین اور موضوعات لگے بندھے ہوتے ہیں۔ایک حقیقت پسند شاعر ہونے کے ناطے مبارک مونگیری کی نظر حقائقِ زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ بات بڑی مستحسن ہے۔ممتاز نقاد احمد ہمدانی کہتے ہیں۔مبارک مونگیری پختہ مشق ہی نہیں بلکہ پختہ کار شاعر بھی ہیں۔ان کا کلام پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ان کی زندگی کا ماحصل ہے۔ملاحظہ ہو:

اب سوچتا ہوں عمرِ دوروزہ سے کیا ملا دنیا کو کیا دیا مجھے دنیا سے کیا ملا

ایک اور ممتاز نقّاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی کہتے ہیں۔مبارک مونگیری کو زبان اور بیان پر قابلِ قدر فنّی استعداد حاصل تھی،نظم ہو یا غزل،یا قطعہ نگاری،وہ ہر صنف میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔اصحاب ذوق کے علم کے لئے مبارک مونگیری کی شاعری پر احمد ندیم قاسمی،وزیر آغا،پروفیسر منظور حسین شورؔ،محشر بدایونی،پروفیسر نظیر صدیقی،ڈاکٹر حنیف فوقؔ،افسر ماہ پوری،ڈاکٹر انور سدید،ڈاکٹر اسلم فرّخی،شان الحق حقّی،شہزاد منظر،ادیب سہیل،مسعود ارمان،مشفق خواجہ،علی حیدر ملک،پروفیسر آفاق صدیقی،سلیم کوثر،پروفیسر جاذب قریشی،پروفیسر مجنوں گورکھپوری،پروفیسر شاہدہ حسن صاحبہ اور دیگر اہل قلم کی آراء ان کے کام اور علم کو سراہ رہی ہیں۔مبارک مونگیری کے والد مکرم مولوی عبدالمجید صاحب جج پٹنہ ہائی کورٹ کی خط وکتابت حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے رہی جس کا ذکر تاریخ احمدیہ میں موجود ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے بعد آپ قادیان آئے اور حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے دست مبارک پر بیعت کی۔چونکہ مولوی عبدالمجید صاحب کئی زبانیں جانتے تھے اسی لئے پھر وہ تبلیغ دین کی خاطر مولوی چراغ دین صاحب کے ساتھ سنگاپور بھی تشریف لے گئے۔اور سماٹرا اور جاوا کے جزائر میں بھی تبلیغ دین میں مصروف رہے۔اب اُن کے بڑے بیٹے مبارک مونگیری کے بیٹے اقبال مجیدی جو کراچی نارتھ میں مقیم تھے جو کہ اب لندن میں آگئے ہیں بہت کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ❁❁❁

# لوئی پاسچر

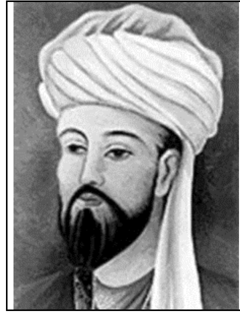


دیوانے کتے کے کاٹنے کا علاج دریافت کرنے والا لوئی پاسچر ایک چمڑا رنگنے والے کا بیٹا تھا۔ وہ 27/دسمبر 1822ء کو پیدا ہوا۔ اس کی شہرت کا باعث یہی تھا کہ اس نے دیوانے کتے کے کاٹنے کا علاج دریافت کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ مرض لا علاج تھا۔ لوگ اس سے دہشت کھاتے تھے۔ لوئی پاسچر 1947ء میں گریجوایٹ ہوا۔ پھر اس سے پہلے وہ طبیعات کا پروفیسر ہوا۔ پھر کیمسٹری پڑھانے لگا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ بیئر اور شراب سے بعض بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کی وجوہ کیمیا دانوں کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ پاسچر یہ معلوم کرنے میں مصروف ہو گیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کی بعض نہ نظر آنے والے جراثیم نے خمیر پیدا کرتے ہیں۔

چنانچہ 1876ء میں اس نے اپنا مقالہ لکھا اور شائع کیا۔ 1865ء میں جنوبی فرانس میں ریشم کے کیڑوں میں جب بیماری پھیل گئی اور صنعت خطرے میں پڑ گئی۔ تو پاسچر نے خورد بین سے اس کا سبب معلوم کر لیا۔ یہ بعض جراثیم تھے، جن کی دوا تجویز کر دی گئی۔ اس طرح ریشم کی صنعت تباہی سے بچ گئی۔ پاسچر نے حیوانات کی ایک خطرناک بیماری بھیڑ تپ اور مرغیوں کے ہیضے کا ٹیکا بھی دریافت کیا۔ پاسچر نے پہلے دیوانے کتے کے کاٹنے کا علاج کتوں پر آزمایا اور اس کے بعد 1885ء میں ایک انسان پر بھی آزمایا۔ 28/ستمبر 1895ء میں پاسچر کا سینٹ کلاڈ کے مقام پر انتقال ہوا۔



# جابر بن حیان - بابائے کیمسٹری



بچو! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے 1400 سو سال پہلے علم کی اہمیت اور فرض کا بار بار ذکر کیا تھا۔ جس پر عمل کرتے ہوئے سینکڑوں مسلمان سائنسدانوں نے دنیا میں نئے علوم متعارف کروائے۔ جن پر اب بھی عمل کیا جارہا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''اللہ، فرشتے، پہاڑ پر چیونٹیاں اور پانی میں مچھلی بھی اس شخص پر رحمتیں بھیجتے ہیں۔ جو دوسروں کو مفید علم سکھاتا ہے۔'' حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''علم حاصل کرو اور لوگوں تک پہنچاؤ''۔ ان احادیث پر عمل کرتے ہوئے ابوموسیٰ جابر بن حیان نے دنیا کو کیمسٹری متعارف کروائی اور بہت سے تیزاب بنانے کے طریقے دیئے (کلورک ایسڈ، نائٹرٹ ایسڈ، سلفورک ایسڈ) آپ 721 کو تس ایران میں پیدا ہوئے اور 815 کو، کوفر عراق میں وفات پائی۔ آپ کیمسٹری، علم بہت جاننے والے (Astronams) کمیاگر (Alcheirst)، انجینئر، فلاسفر، فزسٹ (Phyhicist)، فارماسسٹ، جغرافیہ دان، علم نجوم اور سیاح کے ماہر تھے۔ وہ یورپ میں Gaber کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد حیان الاضر قبیلے سے تعلق رکھتے، جن کو خلیفہ نے جابر بن حیان کی پیدائش کے بعد پھانسی دے دی۔ آپ کے اُستاد جعفر ابن محمد تھے۔ آپ نے ترآہ پاٹ حساب اور دوسرے مضامین حربی الجمادی سے سیکھے۔ آپ نے طب کی پریکٹس ہارون الرشید کے وزیر کی رہنمائی میں شروع کی۔

## ایجادات:

جابر نے تین ہزار مضامین لکھے ہیں اور دوسو کے قریب کتابیں بھی لکھیں۔ وہ علامہ اقبالؒ کے شاہین تھے۔ 1۔ توازن کا اصول (میزان)۔ 2۔ گرم ٹھنڈے نمی اور خشکی کی صفات۔

3۔ ستارے انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں جن کو دعا سے انسان کے قابو لایا جاسکتا ہے۔

4۔ سونے کو دوسری دھاتوں سے الگ کرنا۔ 5۔ مرکری کی صفات (صما کتاب)

6۔نمکیات کو پانی میں حل ہونے والی قسم۔ 7۔الکلی (Alkali) کا نام تعارف کروایا۔

8۔نائٹرٹ ایسڈ،سلفورک ایسڈ،کلورک ایسڈ کی تیاری۔9۔قلم پذیری

10۔ایلومینیم،سلور نائٹریٹ اور دوسرے کیمیائی مادوں کوقلم پذیری سے علیحدہ کرنے کا اصول متعارف کروایا۔11۔آرسینک ایسڈ کی تیاری۔12۔چینی،نمک،پوٹاشیم نائٹریٹ کی تیاری۔

13۔گلاس کی تیاری،مینگا نیز ڈائی آکسائیڈ (Mn-2) کوگلاس کی تیاری میں متعارف کروایا جواب بھی استعمال کیاجاتا ہے۔

14۔لیبارٹری آلات:ان کواستعمال کر کےفلٹریشن،ڈسٹلیشن (Distitlation) یا تھ اور آگ کی بھٹی کی تیاری میں مدد لی جاتی ہے۔15۔تکمیل کی تفتیش۔16۔تکمیل کا مجموعہ۔17۔الرازی نے ان کے طریقے سے Ethanal بنائی۔18۔آپ نے کتاب زہرہ (وینس) خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں لکھی۔19۔کاسٹک سوڈا کی تیاری۔

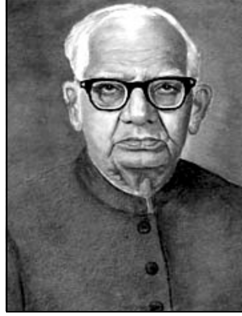
20۔بلاشبہ جابر کیمسٹری کے بابا ہیں جنہوں نے کیمسٹری کوتو ہم پسندی سے نجات دلا کر بہت کچھ دیا۔اس کے علاوہ طب،فلسفہ،فارسی اور مذہب کی اہمیت کوبھی روشن کیا۔جابر نے دنیا کو پرفیوم بنانے کے اصول ایجاد کئے۔ یاد رکھومسلمان سائنسدانوں کا علم آپ کی وراثت ہے جب بھی انٹرنیٹ پر بیٹھیں تو15 منٹ کم ازکم ان کے متعلق پڑھیں جابر اخلاق کے ماہر بھی تھے۔

’’جب تک ایک لفظ نہیں بولتے ،تم ماسٹر ہواور جب لفظ بولا تو اس کے غلام ہو۔‘‘ جابر نے عقل کے پانچ اصول بیان کئے ہیں: پہلا قدم خاموشی،دوسرا توجہ سے سننا،تیسرا یاد رکھنا،چوتھا اس پر عمل اور پانچواں قدم دوسروں کوسکھانا ہے‘‘

پیارے بچوعلامہ اقبالؒ نے فرمایا:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم سے اگر تو، تو نہیں خطرہ افتاد

# اُردو ادب کا امام وسحر نگار علّامہ نیاز فتح پُوری



علّامہ نیاز فتح پُوری جو متواتر نصف صدی سے زائد عرصہ تک برّصغیر پاک و ہند کے اُفقِ ادب پر چھائے رہے۔ وہ عجیب وغریب اور حیرت انگیز انسان علم وادب کے میدان میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا۔ مگر ان بلندیوں تک پہنچنے کے لئے اس نے نرالی راہ نکالی۔ دنیا میں تین ہی قسم کے لوگ معراجِ شہرت کو پاتے ہیں۔

1۔ روحانی رہنما، جنہیں آسمان کی تائید ونصرت حاصل ہوتی ہے اور جن کی راہ کی رکاوٹوں کو فرشتے دور کرتے ہیں۔ 2۔ سیاسی لیڈر۔ جو جماعت اور جتھے اور سیاسی افکار وذہانت کے بل بوتے پر اپنی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ یا پھر فاتحین عالم جو انسانی لاشوں کے میناروں پر کھڑے ہو کر اپنی عظمتوں کا بگل بجاتے ہیں لیکن علّامہ نیاز فتح پُوری نے بالکل نرالی اور انوکھی راہ اختیار کی۔ اس راہ پر ان کے قدم ارادی طور پر اُٹھ گئے تھے یا غیر ارادی طور پر، اس سے بحث نہیں۔ لیکن لاریب وہ ایک نرالی راہ تھی۔ وہ متواتر پچاس سال تک بّرصغیر کے مذہبی علماء کے دلوں کی پھانس بنا رہا۔ اور اُردو ادب کے شہسواروں کا سرخیل رہا۔ آج اُردو زبان کا کوئی ادیب زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے مگر اس کے نہاں خانہء دل کے گوشوں اور احساس کی تہوں میں چھپا ہوا ہے۔ یہ اعتراف موجود ہے کہ علّامہ نیاز فتح پُوری نے اپنے سارے دَور میں اُردو ادب کی صدارتی نشست کے قریب بھی کسی کو پھٹکنے نہیں دیا۔ علّامہ نیاز فتح پُوری نے ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ اور مدرسہ عالیہ رام پور میں تحصیل علم کے بعد پولیس اور محکمہ تعلیم کی ملازمتوں میں سے گزرتے ہوئے ایوانِ اُردو میں قدم رکھا اور 1920ء میں اپنا مشہور ومعروف رسالہ ''نگار'' شائع کیا جو 46 طویل سال گزرنے کے بعد مرحوم کی وفات تک اتنے تواتر اور باقاعدگی اور اتنی شان کے ساتھ شائع ہوتا رہا کہ اُردو ادب کا کوئی پرچا اس کے مقابلہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ''نگار'' کے صفحات میں علّامہ نیاز فتح پُوری کے قلم سحر نگار نے وہ گلہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں کہ عقل محوِ حیرت ہو جاتی ہے کہ ایک اکیلا شخص علم وادب کے ہر میدان میں کس طرح عمر بھر دوڑتا رہا۔ یوں کہ تعاقب کرنے والے تھک تھک کر واپس ہو جاتے رہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ علّامہ نیاز فتح پُوری کے مذہبی خیالات اور رجحانات کیا تھے۔

اور نہ ہی اس سے کوئی غرض ہے کہ مذہبی مسائل میں نیاز کی راہِ حقیقت کے پسندانہ تھی یا نہ تھی لیکن ان کو جاننے والا ہے کوئی انسان جو حقیقت کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ نیاز نے جو راہ اختیار کی وہ اس پر مضبوطی سے قائم نہ رہا۔ بلا شُبہ وہ ایک مضبوط ارادے اور غیر متزلزل کردار کا مالک تھا۔ آپ اسے خاطی کہہ سکتے ہیں۔ آپ اسے غلطی خوردہ کہہ سکتے ہیں آپ اسے جادہ مذہبِ حقیقی سے منحرف ہونے والا کہہ سکتے ہیں لیکن آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اُس نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں اس کی مضبوط قوتِ ارادی کارفرما تھی جو قُدرت کی طرف سے خاص انسانوں کو ودیعت کی جاتی ہے۔ ہندوستان بھر کے علماء کے بالمقابل وہ تنِ تنہا متواتر پچاس سال تک اپنے قلم کی تلوار لئے کھڑا رہا۔ اور **ھل مِن مُبَارِز** ؟ کا نعرہ لگاتا رہا۔ وہ ایک نرالے حُسنِ بیان کے ساتھ، ایک انوکھے اسلوبِ تحریر کے ساتھ، ایک حیرت انگیز طریقِ تخاطب کے ساتھ نگار کے صفحات میں چھپتا رہا۔ اس کی تحریر کی سج دھج میں وہ کشش تھی کہ علم دوست طبقہ اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔

اس کے قلم میں وہ مقناطیسیت تھی کہ ادب نواز حلقے اُسے اُردو ادب کا امام مانتے تھے۔ پھر دل پر ہاتھ رکھ کر کہیئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نیاز کو کافر و ملحد کہنے والے بھی ہر ماہ ''نگار'' کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ اُس نے مخالفتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں سے گزر کر اپنے لئے روشنی کے مقامات مردانہ وار پیدا کئے اور اپنے عزم و ارادے کی مضبوطی اور جرأتِ رندانہ کے بل پر اپنے لئے ایک مقام پیدا کیا، جو صرف اور صرف نیاز ہی کے لئے مخصوص تھا۔ اور جو 24رمئی 1966ء کو اسی کے ساتھ دفن ہوا۔ یوں تو نگار کے ہزاروں صفحات اپنے دامن میں ادبِ اُردو کے شہ پارے سمیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن نیاز کے قلم کی جولانیاں دیکھنی ہوں تو ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''من ویزداں'' کے اوراق میں جوش مارتی ہوئی نظر آئیں گی۔ علم کے ہر موضوع پر نیاز نے خامہ فرسائی کی ہے، اور اسے ہر موضوع پر پڑھتے وقت ایک قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ انسائیکلو پیڈیا پڑھ رہا ہے۔ قوتِ تحریر اور اسلوبِ نگارش کے ایسے ہتھیار قدرت نے نیاز کو عطا کئے تھے، جن سے یہ اپنے ہر قاری کے دل پر گہرا زخم لگاتا تھا۔ بہر حال دُنیائے علم و ادب کی حیرت انگیز اور عظیم شخصیت اس دنیائے فانی سے اُٹھ گئی مگر اپنے پیچھے منطق اور استدلال کے بے شمار نقوش چھوڑ گئی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (بدر 2رجون 1966ء)

# ہماری ذہنی بے حسی

انگریزوں کا رسوائے زمانہ قول ''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے'' اس قول کے تناظر میں ہم اہلِ فرنگ کی ذہنیت کا اگر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف یہ قول ہے بلکہ ان کا فعل بھی اسی قول پر صادق آتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس مختصر سے قول میں اخلاقِ رذیلہ کا ایک جہان معنی آباد ہے۔ اس سے ان کے اخلاقی بحران کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ مغرب کی نقالی میں بنا سوچے سمجھے جہاں کسی کا بس نہ چلا ناکامی نامرادی شکست نظر آرہی ہو فوراً اسی قول کو دہراتے ہوئے خود پر لاگو بھی کرلیں گے۔ گویا ثابت کریں گے کہ جنگ ہو کہ محبت، فریب، فراڈ، دھوکہ، دھونس، دھاندلی، خودغرضی، مطلب پرستی، طوطا چشمی، احسان فرموشی، تشدد، ظلم و زیادتی، دھمکی، بلیک میلنگ، درندگی، خیانت، شیطانیت اور تمام کے تمام وہ اخلاق رذیلہ جنہیں ہر ذی شعور قابلِ نفریں قرار دیتا ہے۔ محبت جیسے شیریں میٹھے جذبے، الوہی پاکیزگی یہ سب حاصل کرنے کے لئے سب کچھ جائز ہے۔ اعلیٰ اخلاقی اور معاشرتی اقتدار کو جھوٹ قرار دینا یہ قول ابلیسیت کا پرتو نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ شیرِ میسور سلطان ٹیپو شہید کے سامنے کسی نے انگریزوں کا یہی قول دہرایا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ تو جواب میں اس عظیم المرتبت انسان نے جو کچھ کہا وہ نہ صرف سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے بلکہ انسانیت کی معراج ہے۔

سلطان ٹیپو شہید نے کہا کہ یہ انگریزوں کا قول ہے۔ ہم تو اس بات کے پابند ہیں کہ جنگ اور محبت میں جو کچھ ہو جائز ہو گویا انہوں نے اپنے آپ کو اعلیٰ اخلاقی اقتدار کا پابند قرار دیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ اخلاق، وفا، شرافت، مروت، خلوص، یگانگت، رواداری اور وہ تمام خوبصورت اقدار جن سے بہترین بلند پایہ انسان اور بہترین معاشرہ تشکیل پاتا ہے وہ سب سلطان ٹیپو شہید کی شخصیت کا پرتو تھا۔ آج ہمارا معاشرہ ابتری کا شکار کیوں ہے۔ افراطِ زر، لوٹ کھسوٹ، رشوت خوری، اقرباء پروری بامِ عروج پر ہے۔ قرآن کی صورت میں ہمارے پاس جو دستور العمل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے آنحضرت ﷺ سے مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لئے شرف

کا موجب ہے۔یعنی اس کتاب پر جوعمل کرے گا اللہ تعالیٰ اسے بڑی عظمت اور بزرگی عطا فرمائے گا۔اس عظیم الشان تعلیم کونظر انداز کر کے ہم یورپ اور امریکہ کی جانب کیوں تکتے ہیں۔ہماری سوچ کی بے حسی کا سرسری اندازہ مقامی اخبار میں چھپنے والے کالم بعنوان ''القائدہ کا آئندہ ہدف پرل ہاربر'' کے کالم نگار کی تحریر سے کیا جاسکتا ہے۔اپنے اس کالم میں کالم نگار تحریر بلکہ انکشاف فرماتے ہیں۔

1797ء میں جنگ پلاسی میں جنرل کلائیو نے سراج الدولہ کوشکست دی۔ہم نے اس کا الزام میر جعفر پر لگایا۔یہ نہ سوچا وہ سپریم کمانڈر جو اپنے ماتحت کمانڈروں کی ناکامیاں پرکھنے میں ناکام رہے اس کی سزا کتنی کڑی ہونی چاہیئے۔ہم نے سراج الدولہ کونہیں میر جعفر کومطعون کیا ہے۔یعنی مثال 1797ء میں سرنگا پٹم میں سلطان ٹیپوشہید کی شکست پر صادق آتی ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

سراج الدولہ،ٹیپواور بہادرشاہ ظفر میں مردم شناسی کا ملکہ مطلوبہ سطح سے کم تھا۔بایں ہمہ اس کا کیا علاج کہ یہ تینوں شخصیتیں ہماری ہیرو ہیں۔ہم شکست خوردہ ہیروز Follen Heroes کی الا ماشاء اللہ ایک طویل تاریخ رکھتے ہیں۔(روزنامہ ریاست کراچی 9/ مارچ 2003ء) نکلتا ہے کہاں اس میں کوئی تعمیر کا پہلو۔معزز قارئین! آپ نے دریدہ دہنی اور ذہنی بے حسی ملاحظہ کی۔سلطان ٹیپو جیسے ذی وقار، جواں ہمت، بلند کردار،صاحبِ ایماں، اسلامی تعلیم کے تمام زریں اصولوں پر عمل پیرا صاحب کردار عزم و ہمت اور عمل کا کوہِ گراں جس کی عظمتوں، صلاحیتوں اور بہادری کا اعتراف بدترین دشمنوں نے بھی کیا۔آج اس کی ذاتی نیک نامی بہادری،شرافت، مروت، رواداری سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہمارے کالم نگار اسے شکست خوردہ ہیرو بطور طنز فرماتے ہیں۔

ہمارے گذشتہ قومی ہیروز کے ساتھ ہمارا سلوک کس قدر ذلت آمیز ہے۔تاریخ سے ایک اقتباس پیش ہے۔جس دن سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبی عیسائیوں کے ساتھ پہلی جنگ لڑنے کے لئے چلا تو اس کے باپ نے اس سے کہا'' جو قوم اپنے شہیدوں کو بھول جاتی ہے اس قوم کوخدا

بھول جاتا ہے۔ دنیا اس کے لئے جہنم بن جاتی ہے اس کی عبادت گاہیں اصطبل اور بیٹیاں دشمن کی عیاشی کا سامان بن جاتی ہیں۔ تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم انسانوں کے عارضی شکست کے پیچھے بہت بڑی فتح ہوتی ہے۔'' ہمیں ان کی شکست کے اسباب تلاش کرنے کی بجائے اپنی معاشی ابتری کا جائزہ اپنے اخلاق وکردار کی روشنی میں ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارے وہ عظیم ہیرو شکست خوردتھے یا کہ ہم۔ ہماری سوچیں ہمارے افکار قول وفعل ہمارا اپنا ہے کہاں؟ اسے تو ہم رہن رکھ چکے ہیں۔ اہل مغرب کے پاس اور ہمارے پاس سوائے مغرب کی نقالی اور امریکہ کی غلامی کے اور کیا ہے؟ ہمارے ہاں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو بولتے تو سمندروں کی طرح ہیں مگر ان کی سوچ جوہڑوں کی طرح محدود ہے۔



## پاکستان کے 8 قلعے... بلند وبالا

پاکستان قدرتی حسن سے مالا مال ملک ہے اور اگر آپ کے ذہن میں صرف بلن وبالا گلیشیر اور ہرے بھرے علاقوں کے مناظر محفوظ ہیں تو پھر شاید آپ یہاں موجود کچھ فن تعمیر سے مزین تاریخی عمارتوں سے لاعلم ہیں۔ ا۔خپلو قلعہ نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔ گلگت بلتستان میں واقع یہ یہ قیمتی قلعہ سیاحوں کے لئے بڑی دلکشی کا باعث ہے۔ ۲۔ مخصوص بناوٹ کی وجہ سے رام کوٹ کا قلعہ خطہ کشمیر کے اہم قلعوں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ 3۔ وادی ہنزہ میں موجود بلت قلعہ کی تاریخ 700 سال پرانی ہے۔ ۴۔ عظیم الشان قلعہ مغل دور کی شان وشوکت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ۵۔ صحرائے چولستان کے قلب میں کھڑا اوڑ قلعہ بہاولپور کا طرہ امتیاز ہے۔ ٦۔ راولپنڈی کا روات قلعے کو گھکڑوں نے سولہویں صدی میں تعمیر کیا تھا۔ ۷۔ جہلم شہر کے قریب روہتاس قلعہ کو تعمیر کرنے میں آٹھ سال لگے۔ اس قلعے کے 12 مختلف دروازے ہیں۔ ۸۔ گلگت بلتستان کی سب بڑی تاریخی یادگار شکار ٹاور کے نام سے مشہور التیت تقریبا 1100 سال پرانا ہے۔

(روزنامہ یوکے ٹائمز لنڈن 12 فروری 2016ء)

# برطانیہ میں جمہوریت کا سفر



برطانیہ پارلیمنٹ کی تاریخ 795 سال پرانی ہے۔برطانوی پارلیمنٹ کو Mother Parliment of The World کہا جاتا ہے برطانوی پارلیمنٹ نظام عوامی جدوجہد کا ثمر نہیں۔ 1215ء میں کنگ جان کے مظالم کے خلاف امراء اور جاگیرداروں نے بغاوت کی،اور لندن پر قبضہ کرلیا۔اس بغاوت کے نتیجے میں بادشاہ نے تاریخی عہدنامے ''میگنا کارٹا'' پر دستخط کردیئے۔جسے عظیم برطانوی منشور بھی کہا جاتا ہے۔اس برطانوی منشور میں عوام کی آزادی اوران کے حقوق کوتسلیم کرنے کا عہد کیا گیا ہے۔میگنا کارٹا برطانیہ کی پہلی آئینی دستاویز تھی۔جس کے بعد نہ توکبھی آئین تحریری طور پر مرتب کیا گیا۔اور نہ اس کے لئے تحریک چلائی گئی۔میگنا کارٹا پر دستخط کے بعد برطانیہ میں دوایوان ''دارالعوام اور دارالامراء'' وجود میں آئے۔شروع میں پارلیمنٹ کے ایوان کودارالامراء سے کہیں زیادہ اختیارات حاصل تھے۔14 صدی عیسوی میں بادشاہ ایڈورڈ کے زمانے میں یہ اصول تسلیم کیا گیا،کہ ملک میں کوئی بھی ٹیکس پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر لاگونہیں کیا جائے گا۔17 ویں صدی میں بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان کشیدگی پھر بڑھ گئی۔جس کے نتیجہ میں بادشاہ چارلس اول کا سرقلم کردیا گیا۔1660ء میں جب بادشاہت دوبارہ بحال ہوئی۔تو اس میں پالیمنٹ کی بالادستی کوتسلیم کیا گیا۔19 ویں صدی تک ووٹ کا حق صرف صاحب ثروت لوگوں کوہی تھا۔یعنی صرف تین فیصد اشرافیہ کو ووٹ کا حق تھا۔عام شہری ووٹ نہیں ڈال سکتا تھا۔صرف زمین اور جائیداد کے مالک ہی ووٹ ڈال سکتے تھے۔عورتوں اور 21 سال سے کم لوگوں کو ووٹ کا حق نہ تھا۔1918ء میں 21 سال کے تمام افراد کو ووٹ کا حق دے دیا گیا۔مگر عورتوں کے لئے 30 سال کی عمر کی شرط رکھی گئی۔

1969ء میں تمام افراد کی ووٹ کی عمر 18 سال کر دی گئی۔ برطانوی دارالعوام غیر منتخب ادارہ ہے۔جس کے اراکین میں 26 عہدیدار چرچ کے بھی شامل ہیں۔جنہیں روحانی لارڈز کہا جاتا ہے 1997ء میں جب ٹونی بلیئر وزیر اعظم بنے تو انہوں نے دارالامراء کو دوسرا منتخب ادارہ بنانے کا عہد کیا تھا لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ٹوری پارٹی کی تاریخ۔کنزرویٹو یا ٹوری پارٹی جس کے ارکان پارلیمنٹ کو''ٹوریز'' بھی کہا جاتا ہے۔برطانیہ کے اشرافیہ کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ٹوری پارٹی 1997ء سے اپوزیشن میں ہے۔اس کے سربراہ ڈیوڈ کیمرون تھے۔ٹوری پارٹی کی ابتداء انگلستان، سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے تخت سے بادشاہ جیمز دوم کو ہٹانے کی تحریک سے ہوئی۔ملک کا جاگیردار طبقہ جو''ٹوری'' کہلاتا تھا نے کنگ جیمز کی حمایت اور پالیمنٹ کی مخالفت کی۔برطانیہ میں ٹوریوں کے مقابلے میں سرمایہ دار اور کاروباری طبقہ تھا جو''وگ'' کہلاتا تھا۔ٹوری پارٹی نے اپنے آپ کو قدامت پسند کہلانا پسند کیا۔اور یہ بنیادی طور پر شاہ پرست پارٹی جانی جاتی ہے۔19ویں صدی کے وسط میں ٹوری پارٹی میں انقلابی تبدیل آئی۔جب ایک صنعتکار رابرٹ پیل پارٹی سربراہ بنے۔رابرٹ پیل نیکارن لاء کے تحت کاشتکاروں کے مفادات کے تحفظ کی تمام مراعات ختم کر دیں۔رابرٹ پیل کے اس فیصلے سے پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور فیصلے کے مخالفین نے ایک نئی جماعت لیبر پارٹی بنالی۔

19ویں صدی کے آخر تک ٹوری پارٹی بڑی حد تک جاگیرداروں اور اشرافیہ کی پارٹی مانی جاتی تھی۔20ویں صدی میں جب برطانیہ میں جب عام لوگوں کو حق خودارادیت دیا گیا تو اس پارٹی نے اپنے مفادات کی خاطر پینترے بدلے۔1930ء کا عشرہ ٹوری پارٹی کے لئے بحرانوں کا عشرہ ثابت ہوا۔ٹوری وزیر اعظم ونسٹن چرچل کی قیادت نے برطانیہ کو دوسری عالمی جنگ کی فتح سے ہم کنار کیا۔ 1945ء کے انتخابات نے ٹوری پارٹی کے مقابلے میں لیبر کی بھاری جیت نے دنیا کو حیران کر دیا۔ 1951ء میں ٹوری پارٹی پھر برسر اقتدار آئی۔اور چرچل وزیر اعظم بنے۔ٹوری پارٹی 13 سال تک اقتدار میں رہی اور چرچل کے بعد پارٹی قیادت میکلین نے سنبھالی۔1964ء کے انتخابات میں

ٹوری ہار گئے اور لیبر پارٹی کے ہیرالڈ ولسن وزیر اعظم بنے۔ 1970ء کے انتخابات میں عوام نے لیبر پارٹی کی بساط الٹ دی۔ اور اقتدار ٹوری لیڈر ایڈ ورڈ ہیتھ کے سپرد کر دیا۔ 1974ء کے انتخابات میں ٹوری ہار گئی اور پھر ہیرلڈ ولسن دوبارہ وزیر اعظم بنے۔ 1989ء کی انتخابات میں ٹوری ایک نئی سر براہ مارگریٹ تھیچر کی قیادت میں میدان میں اتری۔ تھیچر نہ صرف پہلی برطانوی خاتون وزیر اعظم تھی بلکہ تین دفعہ اس منصب پر فائز رہیں۔ تھیچر نے جس انداز سے ملک میں بڑے پیمانے پر نجکاری کی اور ٹریڈ یونینوں کی طاقت کو کچلا اسے سوشلزم کے خلاف جہاد سے تعبیر کیا۔ تھیچر کی پالیسیوں کے نتیجے میں ملک میں بیروزگاری بڑھی جس نے لوگوں کو بدحال کر دیا۔ 1997ء میں ٹوری ہار گئے اور لیبر پارٹی کے سر براہ جان میجر نئے وزیر اعظم بنے۔ لیبر پارٹی کی تاریخ، برطانوی پارلیمنٹ میں محنت کشوں کے حقوق منوانے کے لئے 1823ء میں تحریک شروع کی گئی۔ 1880ء کے عشرے میں اس تحریک کی حمایت اور فروغ کے بائیں بازو اور سوشلسٹ دانشوروں نے کئی تنظیمیں قائم کیں۔ ان تنظیموں میں سب سے نمایاں 1884ء میں جارج برنارڈ شا کی قائم کردہ تنظیم فبیئن سوسائٹی تھا۔ 1893ء میں مزدور راہنما کیری ہارڈی نے ''انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی'' کے نام سے تنظیم قائم کی۔ اس پارٹی نے 1895ء کے انتخابات میں پہلی بار 28 امیدوار کھڑے کئے لیکن صرف ہارڈی کامیاب ہو سکے۔ 1900ء میں ہارڈی کی کوششوں کے نتیجے میں تمام سوشلسٹ تنظیموں اور فبیئن کا لندن میں تاریخی اجتماع ہوا۔ جس نے لیبر ری پر سنٹیشن کمیٹی قائم کی۔ 1916 میں لبرل پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔ تو لیبر پارٹی اقتدار کی دعویدار کی حیثیت سے ابھری۔ 1924ء میں لیبر پارٹی انتخاب جیت گئی لیکن جلد ہی برطانوی اینٹیلی جنس اداروں کی سازش کا شکار ہو گئی۔ ایم آئی فائیو کے دباؤ پر برطانوی اخبارات نے لیبر پارٹی پر روس کی کمیونسٹ پارٹی سے تعلق کا الزام لگایا گیا اور کمیونسٹ راہنما ''زنوویو'' کا جعلی خط شائع کرایا گیا۔ اس سازش کے نتیجے میں لیبر پارٹی کی حکومت کو صرف نو ماہ بعد ہی اقتدار چھوڑنا پڑا۔ 1929ء میں لیبر پارٹی نے لبرل پارٹی کے اشتراک سے عنانِ اقتدار سنبھالا۔ بحران کے نتیجے میں لیبر وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے بادشاہ جارج

پنجم کو استعفیٰ پیش کر دیا۔ بادشاہ نے استعفیٰ مسترد کر دیا۔ اور ریمزے کو ٹوری اور لبرل پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت قائم کرنے کی پیشکش کی۔ ریمزے نے قومی حکومت کی پیشکش قبول کر لی۔ لیکن ان کی جماعت نے ان کے فیصلے کی مخالفت کی، اور ریمزے کو پارٹی سے نکال دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران چرچل برطانیہ کے وزیراعظم تھے۔ تو لیبر پارٹی کے سربراہ کلیمنٹ ایٹلی کو نائب وزیراعظم بنایا گیا۔ اگرچہ چرچل دوسری عالمی جنگ کے ہیرو تھے۔ مگر اس کے باوجود 1945ء کے انتخابات ہار گئے۔ لیبر پارٹی کی فتح نے سب کو حیران کر دیا۔ لیبر پارٹی کے کلیمنٹ ایٹلی وزیراعظم بنے۔ جن کے سامنے عالمی جنگ سے تباہ حال ملکی معیشت سمیت کئی چیلنجز تھے۔ اگرچہ کلیمنٹ نے کئی انقلابی اقدامات کئے۔ مگر اس کے باوجود وہ 1951 کے انتخابات ہار گئے۔ 13 سال بعد 1964ء میں لیبر پارٹی دوبارہ برسر اقتدار آئی، اور ہیرالڈ ولسن وزیراعظم بنے۔ ولسن کا دور اقتصادی خوشحالی کا دور تھا، لیکن جلد ہی عالمی معاشی بحران کی وجہ سے برطانوی معیشت ابتری کا شکار ہو گئی۔

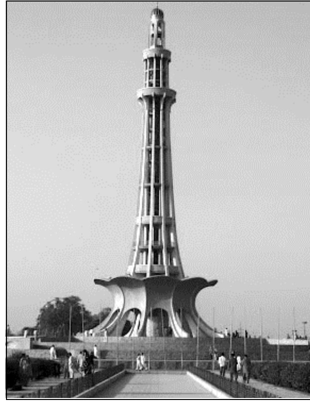
1970ء کے انتخابات میں ولسن ہار گئے اور ٹوری پارٹی کے ایڈورڈ ہیتھ وزیراعظم بنے۔ 1974 کے انتخابات میں لیبر سربراہ ولسن دوبارہ وزیراعظم بنے لیکن اچانک استعفیٰ دے کر وزارت عظمیٰ سے علیحدہ ہو گئے۔ ہیرالڈ ولسن کے استعفیٰ کے بعد لیبر پارٹی کے جیمز کلیگن نئے وزیراعظم بنے۔ جیمز کلیگن کا دور داخلی انتشار اور بحرانوں کا دور تھا۔ جس کی وجہ سے برطانوی معیشت قرضوں کے بوجھ تلے دب گئی۔ 1979ء کے انتخابات میں لیبر ہار گئے۔ اور ٹوری پارٹی کی مارگریٹ تھیچر نے فتح کے جھنڈے گاڑے۔ تھیچر کا دور بہت طویل تھا۔ جس نے وہ فلاحی مملکت جس کی بنیاد کلیمنٹ ایٹلی نے رکھی تھی کا ڈھانچہ ہی مسمار کر دیا۔ کلیگن کے بعد مائیکل فٹ نئے پارٹی سربراہ بنے۔ جن کے دور میں چار لیبر وزراء جنہیں چار کا ٹولہ کہا جاتا تھا نے استعفیٰ دے کر پارٹی سے علحدگی اختیا کر لی۔ 1997 سے لیبر پارٹی اقتدار میں رہی۔ پہلے جان میجر پھر ٹونی بلییئر اور گولڈن براؤن وزیراعظم رہے۔

لبرل ڈیموکریٹس کی تاریخ۔ لبرل ڈیموکریٹس کی بنیاد اگرچہ 1988ء میں رکھی گئی تھی۔ مگر اس کی جڑیں برطانوی سیاسی تاریخ میں بہت دور تک پھیلی ہیں۔ لبرل ڈیموکریٹس کی مادر جماعت لبرل

پارٹی کی جڑیں 1630ء میں چارلس دوم کے دور میں ''وگ پارٹی'' سے ملتی ہیں۔ ''وگ پارٹی'' اشرافیہ کی جماعت تھی۔ جو بادشاہ کے اختیارات میں تخفیف اور پارلیمنٹ کے اختیارات میں اضافے کی زبردست حامی تھی۔

وگ پارٹی پہلی بار 1830ء میں برسر اقتدار آئی اور 1832ء میں پہلی اصلاحات کا قانون منظور کیا۔اس زمانے میں ریڈیکل جان رسل نے وگ پارٹی کے روشن خیال اراکین پر مشتمل لبرل پارٹی قائم کی۔لبرل پارٹی برطانیہ کی پہلی سیاسی جماعت تھی۔جو بادشاہ اور چرچ کے اختیارات میں تخفیف اور شخصی آزادی کی زبردست حامی تھی۔اس روشن خیالی کی وجہ سے لبرل پارٹی 1868ء میں گلیڈ اسٹون نے چار بار انتخاب جیتا۔اور لبرل پارٹی 30 سال تک اقتدار میں رہی۔پہلی جنگ عظیم کے بعد لبرل پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔اور اس کا ایک بڑا حصہ نئی جماعت لیبر پارٹی سے جاملا۔1950ء کے عشرہ میں ملک بھر میں لیبر پارٹی کے صرف اڑھائی فیصد ووٹ رہ گئے۔اسی دوران لیبر پارٹی کو ٹوری پارٹی میں ضم کرنے کی افواہیں بھی عام ہوئیں۔1960ء کے عشرے میں پوری لیبر پارٹی تانگہ پارٹی بن گئی۔جو گریمنڈ نئے پارٹی سربراہ بنے تو ان کی، کی گئی اصلاحات کے نتیجے میں پارٹی کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہوا،اور پارٹی مقامی کونسلوں کے انتخابات جیت گئی۔1974ء کے انتخابات کے بعد وزیراعظم ہیتھ نے لبرل پارٹی کو ٹوری پارٹی کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے کی پیشکش کی۔جسے لبرل پارٹی کے سربراہ جیری تھارپ نے ٹھکرادیا۔جیری تھارپ کی قیادت میں لبرل پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔اور 1974ء کے انتخابات میں اس کے ووٹ 20 لاکھ سے بڑھ کر 60 لاکھ ہوگئے۔1979ء کے انتخابات میں لیبر پارٹی کی شکست نے برطانوی سیاست کا نقشہ دل دیا۔ لیبر پارٹی کے چار وزیروں جن کو چار کا ٹولہ کہا جاتا تھا نے نئی سیاسی جماعت سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بنائی۔1983ء کے انتخابات میں لیبر پارٹی اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا انتخابی اتحاد ہوا۔اس اتحاد نے 25 فیصد نشستیں حاصل کیں۔2/مارچ 1988ء کو یہی اتحاد انضمام میں بدل گیا اور اس طرح ایک نئی جماعت لبرل ڈیموکریٹس وجود میں آئی۔ 

# میرا شہر لاہور



**ایک ایسا شہر**۔ جہاں دیانت اور خیانت میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ ایک ایسا شہر۔ جہاں ناموس اور بے حیائی ایک ہی ترازو میں تلتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا۔ جہاں روکھے پن کا نام شہریت، بے رُخی اور بے پروائی کا نام مصروفیت اور تاجرانہ رکھ رکھاؤ کا نام خلوص ہے۔

**ایک ایسا خطہ**۔ جس کے باشندوں کے حلق سے نیچے کوئی چیز اُترتی ہی نہیں جو صرف ذوق سماع ہی کے قائل ہیں! جہاں گرمیوں میں باغ، پارکوں میں سونے والوں کے سر پتھروں سے کچل دیئے جاتے ہیں۔ جہاں منجمد کرنے والی سردی سے اکڑ کر اکثر مفلوک الحال مسافر اور فقیر فُٹ پاتھوں پر اور پُلوں کے کناروں پر مر جاتے ہیں لیکن ان اُمراء کے ہیٹروں کے switch اور سپلٹ یونٹوں کے ریموٹ اوف نہیں ہوتے۔ جہاں مروت، بیوقوفی کا دوسرا نام ہے، جہاں امیر کے جنازے کو کاروں کا جلوس اور بے بس کی ریڑھے پر لد کر جانے والی میت کو بیگار کہا جاتا ہے۔ جہاں ہر چیز اور قدر کا بھاؤ ہر پانچ دس منٹ کے وقفے کے بعد گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ بڑے بڑے وکیلوں، بیرسٹروں سے لے کر میانی صاحب کے جنازہ خوان تک۔ جہاں شاعروں سے متشاعر زیادہ ہیں اور محسوس کر کے کہنے والے صاحبوں کی کثرت ہے۔ پھر ان سے بھی زیادہ ناقدین ادب کی ٹولیاں ہیں۔

**ایک ایسا شہر**۔ جہاں بیٹیوں کی عصمت فروشی کی اور قوم کے لاوارث و یتیم بچوں کو بھیک مانگنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

**ایسا شہر جس میں**۔ جہاں کوئی باہر سے آئی نقدی ہضم کرنا چاہیں۔ ایسا شہر جس میں۔ جہاں کرتے ہوئے بیوپار کو سنبھالنا چاہے۔ ایسا شہر جس میں۔ جہاں کسی فلم کا افتتاح کرنا چاہیں۔ ایسا شہر جس میں۔ جہاں غصب کردہ املاک کے ماتھے پر جعلی لیبل چسپاں کرنا چاہیں۔ ان سب کے لئے

ایک ہی نسخہ شافی استعمال ہوتا ہے۔اسلام،رسول،خدا۔

بھلا اس شہر سے بھی کسی کو محبت ہو سکتی ہے؟ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ سب لکھنے کے قصے ہیں۔میں نے آج تک کسی ''لاہور'' میں رہنے والے کو سچے دل سے اپنی معمول کی زندگی میں تعریف کرتے نہیں سنا۔باقی رہی یہ بات کہ محبت کا احساس تو اُس وقت ہوتا ہے جب لاہور سے باہر جانے کا اتفاق ہو۔ یہاں شاہی سطوت کی یادگاریں ہیں جہاں بھی کھڑی کر دیتے جنگل میں منگل ہو جاتا۔ جہانگیر کے مقبرے، شالامار باغ،شاہی مسجد، اور شاہی قلعے والے لاہور کا...اس میں لاہور کو کیا فضیلت، یہ تو بنانے والوں کے اُس وقت کے اقتصادی مسائل کا تقاضا تھا...یا حضرت داتا گنج بخشؒ ،حضرت میاں میرؒ،حضرت شاہ ابوالمعالی اور حضرت شاہ محمد غوثؒ کا لاہور؟ ...لیکن کیا آپ نے کبھی ان مقدس مقامات کے عرسوں کے موقع پر جلوے دیکھے ہیں دور سے کھڑے ہو کر نہیں۔اندرون خانہ میں گھُس کر کونوں کھُدروں میں چھُپ کر مجاوروں،متولیوں اور ان کے شرعی دلالوں کے محرم راز بن کر۔نہیں!...تو پھر آپ نے لاہور نہیں دیکھا۔سودا بازوں نے اُس پر جعلی تجارت اور کھوٹے سکوں کے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔کم فہم اور کٹھ پتلی مُلاؤں نے اُس پر نفس پرستی اور حرص و آز کی دبیز چادریں سی ڈال رکھی ہیں۔ابن الوقتوں اور وطن دشمن لیڈروں نے اُس کی فضاؤں میں محض نعروں کی جھنکار بسا رکھی ہے۔ جھوٹے ادیبوں خامکار نقادوں اور جعلی مصنفوں نے پراپیگنڈے کا ملمع کر کے اس کی معنویت کو مٹیالا سا کر دیا ہے ۔ جہاں علماءِسُوء کی طرف سے دین کے نام پر رنگے برنگے فتاویٰ فرقہ واریت کو ہوا دینے کی خاطر دیئے جاتے ہیں۔ جہاں مساجد اور امام بارگاہوں میں نہتے اور معصوم شہریوں پر اسلام ہی کے نام پر گولیاں برسا کر خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔سب گھناؤنے کاروبار اسلام کے نام پر کئے جاتے ہیں۔ضمیر فروشان نے لاہور شہر کے ساتھ ساتھ سارے ملک کی زمامِ اقتدار کو تھامنے والوں نے سارے ملک کو اخلاقی ، اسلامی، روحانی، معاشرتی، معاشی ،سیاسی،طور پر کنگال کر دیا ہے۔قحط الرجالی کا یہ دور دیکھنے کو ملا کہ کوئی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے لیے ناخدا نہیں مل رہا۔مولوی، وکلاء،ڈاکٹر، جاگیردار، جج،

شرفاء، تاجر، پیر، چشتی، قادری، نقشبندی، مفتی، رائے ونڈی، دیوبندی، بریلوی، گدی نشین، بیوروکریٹس، 65 سالوں میں یہ سب مل کر ایک جناح یا مردِ مجاہد پیدا نہ کر سکے جو ماؤزے تنگ، چو این لائی، مصطفیٰ کمال پاشا کا کردار ادا کر سکے۔ بقول حکیم الاُمت۔

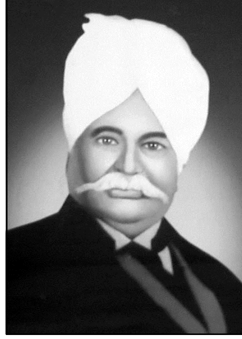
بتوں سے تجھ کو اُمید مجھ سے نا اُمیدی
بتا تو سہی اور کافری کیا ہے



## آئزک نیوٹن

نیوٹن خدا کو واجب الوجود مانتے تھے۔ لیکن وہ عیسائی مذہب کے عقیدہ تثلیث سے متفق نہ تھے بلکہ انہوں نے بائبل پر تنقید بھی لکھی۔ وہ اس وقت کے پادریوں سے ناخوش تھے۔ ۱۷۰۳ء میں نیوٹن رائل سوسائٹی کے صدر چُنے گئے۔ ۲۰۰۵ء میں رائل سوسائٹی نے کافی غور وغوض کے بعد اعلان کیا کہ نیوٹن ایک سائنسدان کی حیثیت سے آئن سٹائن سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے مائیکل ہارٹ نے نیوٹن کو تاریخ انسانی کا سب سے زیادہ پُراثر سائنسدان مانا ہے۔ اور انکو اپنی سو کی فہرست میں دوسرے نمبر پر قرار دیا ہے۔ نیوٹن کے دو مشہور اقوال ہیں۔ نمبر ا۔ اگر میں اس قابل ہوا کہ دور تک دیکھ سکوں تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں طویل القامت انسانوں کے کاندھوں پر کھڑا تھا۔ نمبر ۲۔ مجھے نہیں معلوم کہ دنیا میرے متعلق کیا سمجھتی ہے لیکن میں تو اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے بچے کی طرح سمجھتا ہوں جو ساحل پر بیٹھا چند خوش رنگ سپیوں اور گھونگھوں سے کھیل رہا ہو جبکہ اس کے سامنے حقائق کا ایک گہرا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو وہ سمندر جس کی اتھاہ میں نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا ہے۔ گیلیلو سے لے کر نیوٹن تک کے زمانے کا کام انقلاب سائنس کہلاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیوٹن کی فکر نے عالمی انسانی معاشرہ پر بہت گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اور پچھلے پانچ سو برسوں میں سائنس میں جو کام ہوا ہے اس پر کہیں نہ کہیں نیوٹن کی چھاپ ضرور ہے یہاں تک کہ آدم سمتھ کے نظریات، جس نے جدید علم معاشیات کو جنم دیا وہ بھی نیوٹن کی فکر سے متاثر تھے۔

# سرگنگارام



سرگنگارام شمالی ہندوستان سے پنجاب میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ سرگنگا رام ایک چھوٹے سے گاؤں ننکانہ صاحب پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ایک طرف وہ پروفیشنل سول میکینیکل انجینئر آبپاشی تھے۔ دوسری طرف ان کی اصلاحات تھیں جو وہ بدلتے ہوئے حالات میں برصغیر کے اندر کر رہے تھے۔ انہوں نے سرمایہ دار ہونے کے ناطے جو بھی دولت کمائی وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کر دی۔ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ترغیب اور سہارا بھی دیتے تھے۔ انہوں نے بہت سی عمارات کی ڈیزائننگ بھی کی، جن میں گورنمنٹ کالج لاہور، عجائب گھر، ایچی سن کالج لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، دیگر مال روڈ کی عمارات جن میں ڈنگا سنگھ بلڈنگ وغیرہ، ان کی ڈیزائن کردہ عمارتیں طرزِ تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنا پہلا بنگلہ بنایا جس میں پہلے کالج آف کامرس قائم ہوا۔ اس عمارت کو انہوں نے خود وقف کیا۔ مزنگ میں زمین خرید کر اس میں ڈسپنسری بنائی اور پھر اس میں سرگنگا رام ہسپتال بنایا۔ جو آج تک دکھی انسانیت کی خدمت پر مامور ہے۔ ماڈل ٹاؤن بننے سے قبل اس کی پلاننگ سرگنگارام نے کی تھی۔ پنجاب کی نہریں، اپر چناب اور لوئر چناب کی ڈیزائننگ بھی آپ نے کی تھی۔ وہ انگریزی دور میں پہلے غیر انگریز چیف انجینئر پنجاب تھے۔ ان کی بہتر کارکردگی پر ان کو ''سر'' کا خطاب ملا تھا۔ سرگنگارام ایک روشن خیال انسان تھے۔ اس لئے انہوں ایک دوسرا بڑا کارنامہ اپنے دھرم کے خلاف کیا کہ جو ہندو خواتین بیوہ ہو جاتی تھیں انہیں ہندو مذہب کے مطابق دوبارہ شادی کا حق نہ تھا۔ سرگنگا رام نے اس فرسودہ رسم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور پنڈتوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ اور ''وڈو میرج ایسوسی ایشن'' بنا ڈالی۔ اور بیوگان کو معاشرے میں اعلیٰ مقام دلوایا۔ وہ سادھوؤں اور درویشوں کو مانتے تھے۔ وہ انتہا پسندی کے خلاف اور برداشت کے قائل تھے۔

# مادام تساؤ کا عجائب گھر دنیا کی تاریخ کا عینی شاہد



لندن کا مادام تساؤ کا عجائب گھر کسی عجوبے سے کم نہیں۔
مادام تساؤ کا عجائب گھر اصل اس بچی کی کہانی ہے جس کا اصل نام'' میری گروشو'' (Groshoitz Marie) تھا۔ اس نے ڈاکٹر فلیس کریٹس سے عجیب و غریب مومی چیزیں اور مجسمے بنانے کی مہارت حاصل کی تھی۔ صرف 9 برس کی عمر میں فرانس کے شاہ لوئیس 16 کی چھوٹی بہن کو آرٹ کی تربیت دینے پر مامور ہوگئی۔ میری نے سب سے پہلے فرانس کے ہلاک ہونے والے بادشاہ اور اس کی ملکہ کے چہرے کے ماسک بنائے۔ جسے انقلابیوں نے بہت پسند کیا۔ اور پھر میری کو اس کام کے لئے ہی مخصوص کر دیا گیا۔ میری کی مجسمہ سازی کی شہرت اور مہارت دور دور تک پھیل گئی۔ اسی دوران ایک فرانسیسی بادشاہ فرانسکو تساؤ نے ''میری'' کی شخصیت اور فن سے متاثر ہو کر اس مجسمہ ساز لڑکی کو شادی کی پیشکش کر دی جو کہ اس نے قبول کر لی۔ اس طرح 1795ء میں فرانسکو تساؤ سے شادی ہوگئی۔ اور یوں ''میری'' کو نیا نام مادام تساؤ مل گیا۔ اس دوران ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔

اس کے بعد وہ اپنے کام میں اس قدر مگن ہوگئی کہ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کو بھی خیر باد کہہ دیا اور 1807ء میں مادام تساؤ نے قانونی طور پر علیحدگی حاصل کر لی۔ اور پیرس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر لندن آ گئی۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لندن لے آئی۔ 1802ء میں اس نے ''مادام تساؤ'' میوزیم کی بنیاد رکھی۔ برطانوی حکومت نے اس سے کہا کہ وہ منہ مانگے داموں انقلاب فرانس کے بارے میں نہ صرف ہلاک ہونے والوں بلکہ جنگی عمل کو بھی اپنے فن کی صورت میں قبول کر لے۔ اپنی انہی مصروفیات میں مصروف رہنے کے بعد 1850ء مادام تساؤ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ کافی عرصے بعد اس کے پوتے نے اس کے کام کو 1884ء میں آگے بڑھایا۔ اور اپنی دادی کے گھر کو مومی مجسموں کی یادگار بنا دیا۔ اور اس جگہ پُرشکوہ عمارت تعمیر کروائی۔ جو خود فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی۔ مادام تساؤ

نے لندن آنے کے بعد کئی بادشاہوں کے مجسمے بھی بنائے تھے۔آج میوزیم میں ملکہ برطانیہ اور شاہی خاندان کی تمام شخصیات کے مجسمے موجود ہیں۔ اس میوزیم کے اندر ایک کمرہ ایسا بھی ہے، جہاں پرنس آف ویلز کے علاوہ اس کے درباری اور مصاحبین نظر آتے ہیں۔ یہاں پر ملکہ برطانیہ کی والدہ کا مجسمہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔مومی میوزیم میں رکھا ہوا مادام تساؤ کا مجسمہ اس کی موت سے آٹھ سال قبل 1842ء میں بنایا گیا تھا۔ مادام تساؤ کے میوزیم میں مہاتما گاندھی کا مجسمہ بھی موجود ہے میوزیم میں جنوبی افریقہ کے عظیم لیڈر نیلسن منڈیلا کا مجسمہ 1991ء میں بنایا گیا تھا۔اس کے علاوہ پوپ جان پال دوم کا مجسمہ بھی موجود ہے۔لیڈی ڈیانا کا مجسمہ 1996ء میں بنایا گیا۔ مادام تساؤ کے خاص چیمبر میں ان لوگوں کے ماسک بھی رکھے گئے ہیں جن کے سر انقلاب فرانس میں قلم کئے گئے تھے۔ امریکی صدر کنیڈی کا مجسمہ بھی میوزیم کی زینت ہے۔ان کا مجسمہ 1961ء میں شامل کیا گیا۔اس کے علاوہ عالمی ہیوی ویٹ چیمپین محمد علی کلے، کیوبا کے لیڈر فیڈل کاسترو بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مادام تساؤ کے مومی عجائب گھر میں دنیا بھر کے تمام مشہور شخصیتوں مثلاً سربراہان مملکت، بادشاہ، وزیراعظم، سائنسدان، عالم لیڈر، کھلاڑیوں، اور شوبز سے تعلق رکھنے والوں کے مومی مجسمے موجود ہیں۔ ❁❁

## کیا آپ جانتے ہیں؟

چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے۔ہماری زمین کی ثقل کشش چاند سے چھ گنا زیادہ ہے۔ چاند کی فضا کسی بھی قسم کی گیس سے پاک ہے۔ پہلے کسی وقت میں چاند پر ہوا اور پانی موجود تھے۔لیکن قدرت نے اسے بالکل بنجر کر دیا چاند کی عمر زمین سے کہیں زیادہ ہے۔ چاند کی روشنی ہماری زمین تک ڈیڑھ سیکنڈ میں اور سورج کی روشنی سوا آٹھ سیکنڈ میں پہنچتی ہے۔ چاند پر قدم رکھنے والا پہلا انسان نیل آرمسٹرانگ تھا۔اس نے ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو چاند پر قدم رکھا خلائی جہاز اپالو ۱۱ کے ذریعے چاند تک پہنچنے والے آرمسٹرانگ، کولن اور آلڈرن تھے۔ چاند کی مٹی کا رنگ سُرمئی ہے۔چاند کا قطر ۲۱۶۳ میل ہے۔

# اُردو، ادبی مضامین

## زبانِ اُردو کا اِرتقاء کثیر اقوامِ ہند کی مشترکہ زبان

ایک جدید تحقیق کی رُو سے موجودہ اُردو زبان ہندوستان کی اس قدیم ہریانوی زبان کی اصلاح شدہ شکل ہے۔ جو سولہویں سترہویں صدی میں دہلی کے انواع واطراف اور ماحول میں ہریانوی برج اور راجستانی کا امتزاج اور سنگم تھی، اور جس میں اہلِ دہلی کے محاوروں اور تاجدارانِ سُخن کے تصرفات نے اضافوں میں تغیّرِ عظیم برپا کر ڈالا۔اسی زبان کی بازگشت حیدرآباد دکن، گجرات کاٹھیاواڑ۔لکھنؤ، کلکتہ اور پنجاب میں سنائی دینے لگی۔(پنجاب میں اُردو تالیف علامہ حافظ محمود شیرانی محمود) دنیا کی اس عظیم الشان زبان کی تجدید اور روزمرّہ اضافوں اور ترقی وارتقاء کے ہر مرحلہ میں مسلمان بزرگوں اور ادیبوں کے دوش بدوش ہندو نیتاؤں، سکھ سورماؤں بلکہ فاضل عیسائیوں نے بھی پورے جوش وخروش سے حصہ لیا۔اسے پالا، پوسا، سینے سے لگایا۔دل میں سجایا اپنے خونِ جگر سے اس کے گلستاں کو سینچا اور طویل جدوجہد کے بعد اسے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کرنے میں قابلِ رشک حد تک کامیاب ہو گئے اور جہاں ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ (شکاگو) کے حالیہ اعدادوشمار کے مطابق دنیا سے پچاس سے نوے فیصد تک زبانیں ناپید ہو رہی ہیں وہاں ہمارے نزدیک اُردو کی عالمی مقبولیت میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہو رہا ہے۔

آسمانِ اُردو کے ممتاز ستارے، اُردو ادب کے محسن اور مورّخ رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ (1894.1951) بریلی کی مشہورِ عالم کتاب ''تاریخ ادبِ اُردو'' میں اس حقیقت پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح یہ زبان ملک کے اصل باشندوں کے علاوہ ڈاکٹر جان کلگرسٹ (1759.1841) قائم کردہ کلکتہ فورٹ ولیم کالج کی پشت پناہی میں جلد جلد ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے مسلم ہندو، سکھ اور عیسائی ادب نوازوں کے ذریعہ پروان چڑھی ہے۔اس ضمن میں مسلمان اہلِ قلم اور سخنوروں کے ادبی کارناموں کی تفصیل برِّ صغیر کے مشہور محقق و ادیب ڈاکٹر جمیل

جالبی نے تاریخِ ادب اردو میں جناب حامد حسین قادری نے ''داستانِ تاریخ اُردو'' میں اور جناب ڈاکٹر ابوسعید نورالدین نے ''تاریخِ ادبیاتِ اُردو'' میں مطالعہ کی جاسکتی ہے۔ جونہایت معلومات افروز اورسیر حاصل ہے۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالہ میں ان قدیم اور ممتاز ہندو اور سکھ اربابِ ذوق اور اُردو ادب کے ''پرستاروں'' کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ جن کی علمی خدمات ہمیشہ آسمانِ ادب پرستاروں کی طرح جگمگاتی رہیں گی، اور جوں جوں اردو کونقشہ عالم میں وسعت وشوکت حاصل ہوگی ان کا نام بھی فضاؤں میں نئی شان سے شہرت پا تا رہے گا۔ ڈاکٹر رام بابوسکسینہ کی کتاب میں بڑی شرح وبسط سے بتایا گیا ہے کہ برّصغیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ہندو یا سکھ اردو نوازوں نے اردو کا پرچم بلند سے بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کیا ہو۔ مثلاً دکن میں مہاراجہ چندولال، راجہ گردھاری پرشاد باقی، مہاراجہ سرکشن پرشاد،، دہلی میں پروفیسر رامچن رپروفیسر ریاضی دہلی کالج، لالہ سری رام ایم اے دہلوی، منشی ہرگوپال، نہال چند، فیض آباد پنڈت منوہرلال زتشی، کانپور میں منشی دیاراین نگم، سیتا پور میں جوالا پرشاد برق، لکھنو میں پنڈت رتن ناتھ سرشار پانڈے پور، (بنارس) بنارس میں دھنپت رائے پریم چند، الہ آباد میں چرن جی لال، بدایوں میں منشی پرشادسحر، آگرہ میں ماسٹر بنسی دھر پنڈت گوراج کشوردت اورلاہور میں پنڈت ہری چنداختر دیوانمرناتھ اکبری، پنڈت رادھاکشن، پنڈت شیونرائن شمیم، لالہ لاجپت رائے منشی، سورج نرائن مہر، وغیرہ اہلِ قلم پیدا ہوئے۔

(نقوش لاہور نمبر جولائی 1962 ص 949.916)

**چھاپہ خانے:** مطبع نولکشور لکھنؤ کے مالک منشی نولکشور صاحب کو (سی آئی اے) متوطن بستوضلع علی گڑھ (1895۔1936) بھی ہمیشہ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جن کے مطبع نے ہزارہا اردو، عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کا بیش بہالٹریچر شائع کرنے کا جنوبی ایشیا میں ایک مثالی ریکارڈ قائم کیا۔ اس شاندار روایت کومنشی نولکشور آنجہانی کے لائق وہونہار فرزندوں منشی پراگ نرائن صاحب اور منشی بشن نرائن صاحب بھارگو نے پوری شان سے قائم رکھا، اور اردو کی خوب خدمت کی اس کے علاوہ بھائی بہادر سنگھ کے وزیر ہند پریس نے تواریخ گوروخالصہ مولفہ گیانی گیان سنگھ ہی نہیں اور بہت سارالٹریچر شائع کیا۔ اسی طرح جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز پبلشرز وتاجران کتب متی

بازار لاہور کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اردو رسم الخط میں نہایت دیدہ زیب طباعت اور کتابت سے آراستہ و پیراستہ ''سری گورو گرنتھ صاحب آد'' شائع کیا اور حاشیہ میں سینکڑوں گورو مکھی الفاظ کے اردو معانی بھی زیبِ قرطاس کر کے اُردو دان طبقہ کو اس سے استفادہ کی راہیں آسان کر دیں۔ یہ قدیم و قیمتی اور نایاب نسخہ بھی موجود ہے۔

تراجم مذہبی کتب

اُردو زبان میں وید کے تراجم بھی ایک ادبی کارنامہ ہے۔ چنانچہ سام وید، یجر وید، رگ وید، بھومکا اور الکھ پرکاش کو اُردو میں بالترتیب انند سروپ، دھرم پالی، رام جگن ناتھ، رام موہن اور کنھیا لال نے منتقل کیا۔ اسی طرح کلنکی پران کا آتما لال نے، ماکنڈی پران کا رگھو لال نے، اتم پران کا دیوان چند نے، وشنو پران کا، پنڈت امر ناتھ مدن دہلوی نے، شیو پران کا سیوا سنگھ نے اور گنیش پران کا (منظوم) اردو ترجمہ شنکر دیال نے کیا۔ ویدک شاستر کے مترجم بہاری لیل اور مجموعہ اپنشد کے بابو بہاری لال تھے۔ منوسمرتی کے تراجم، ماسٹر آتما رام، دھرم پال رام بھروسہا سوامی دیال اور کرپا رام شرما جگرانوی کے قلم سے شائع ہوئے۔ بھگوت گیتا کے بہت اردو تراجم ہوئے۔ چند مترجمین کے نام یہ ہیں۔ آتما رام، دوارکا پرشاد اُفق، رام سہائے تمنا، جانکی داس دہلوی، سوامی دیال شیام سندر لال، پربھو دیال عاشق، شنکر دیال فرحت، بشیشور پرشاد لکھنوی و منظوم ترجمہ، مہا بھارت اور رامائن کے بھی بیسویں صدی میں اُردو تراجم اشاعت پذیر ہوئے اور اُردو کے شائقین میں بہت مقبول ہوئے۔ پچھلی صدی میں سکھ مت کا اُردو لٹریچر بھی نہایت کثرت سے چھپا، اور خصوصاً پنجاب میں بہت ذوق شوق سے پڑھا گیا۔ مثلاً تاریخ دربار صاحب امرتسر (مولفہ سردار ادھم سنگھ) پوتھی شبد نادین محل (تیجا سنگھ سوڈھی) دھرم بچار (جواھر سنگھ) سکھ مت کی تعلیم (دلجیت سنگھ کنور) گرو گوبند سنگھ کا جیون چرتر (دولت رائے) عطر روحانی ترجمہ جپ جی (سردار عطر سنگھ) سچا بلیدان (گوپال سنگھ) گورو ارجن مہاراج کی سوانح عمری (مطبوعہ نولکشور) سکھوں کا روحانی انقلاب (لابر سنگھ)

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قاموس الکتب اردو ص 1172.1101ء ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی۔ اشاعت اول جون 1961ء)

## اُردوصحافت کے شاہکار

اب ہم متحدہ ہندوستان کی اردوصحافت پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہندو اور سکھ دونوں تاریخی قوموں کی اُردونوازی کا ایک نیا اور حیرت انگیز باب کھل جاتا ہے۔تاریخ ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدِ حکومت میں 1832ء سے 1939( دوسری جنگ عظیم تک )جاری ہونے والے اخبارات و رسائل( مع ان کے مالکان یا مدیران کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔(ماخذ'' صحافت پاکستان و ہند میں'' تالیف ڈاکٹرعبدالسلام خورشید۔ ناشرمجلس ترقی ادب لاہور۔پنجاب میں اردوصحافت کی تاریخ مرتبہ ڈاکٹرمسکین علی حجازی ناشر سنگ ِمیل پبلیکیشنز لاہور 1977ء)1822ء جامِ جہاں نما( کلکتہ )مدیرمنشی سداسُکھ ۔1845ءقران السعدین( دہلی )رائے بہادر پنڈت دھرم نرائن،فوائد الناظرین (دہلی) ماسٹر رام چندر پانی پتی بنارس اخبار (بنارس) گووندرگھوناتھ۔1846ءخیالی (لکھنو)منشی خیال رام۔1847ءمحب وطن ماسٹر رام چندر۔روائد الشائقین( دہلی) پربھودیال، بنارس گزٹ( بنارس )بابورگھوناتھ ٹھاٹھے۔گوالیا اخبار( گوالیار) خیراتی لال۔1850ءزائرین ہند( آگرہ )مالک لالہ ہربنس رام پنجاب( گجرانوالہ) ہفت روزہ ایڈیٹر سکنڈمل۔1852ءنورمغربی(دہلی) ایڈیٹر بلورسنگھ۔گوالیار اخبار (گوالیار)کچھمن داس۔ 1853ءآفتاب ہند( بنارس) پہلے ایڈیٹر پرکاش داس پھر بابونورعلی نور( سیالکوٹ)منشی دیوان چند۔1859ء۔چشمہ فیض گوبندرناتھ سیالکوٹ منشی دیوان چند۔1860ءگنجِ شائقان (لاہور) جاری کردہ منشی ہرسُکھ رائے مدیر پنڈت سورج بھان۔1861ءخیرخواہ'' پنجاب'' مدیرمنشی گیان چند شوق۔1866ءآفتاب پنجاب (لاہور) دیوان بوٹا سنگھ۔ستارہ ہند(سیالکوٹ)منشی دیوان چند، ماہنامہ کوہِ طور( گوجرانوالہ)منشی دیوان چند ماہنامہ مجمع العلوم چشمہ فیض( گجرانوالہ)منشی گیان چند۔1870ء اتالیق پنجاب ،ایڈیٹرمنشی پیارے لال۔1880ء وکٹوریہ پیر(سیالکوٹ) مدیرمنشی گیان چند۔ 1884ءآئینہ ہند ( لاہور) رنگی رام کی زیرِ ادارت1885ءشیخ چلی ( لاہور) مان سنگھ 1891ء سیالکوٹ پیپر( سیاکوٹ) مالک و مدیرٹوڈرمل۔1895ء پنجاب آرگن(وزیرآباد) دیوان آتما۔1905ءانڈیااور پٹوارگزٹ،ایڈیٹرشمشیرسنگھ بی۔اے۔1913ءٹمپرنس گزٹ ماہنامہ

(گجرانوالہ) میالا سنگھ سنسار۔1914ء ہفت روزہ کھشتری (گجرانوالہ) مالک و مدیر سیٹھ چرن داس۔1918ء ماہنامہ حکمت سنیاس (گجرانوالہ) مدیر لکھمن سنگھ گجرانوالہ وار گزٹ (گجرانوالہ) لالہ خوشی رام ہیڈ ماسٹر۔1919ء پرتاب (لاہور) مہاشہ کرشن۔1920ء بندے ماترم (لاہور) لالہ لاجپت رائے۔1921ء روزنامہ کیسری (لاہور) شاملال کپور۔پریم بیلاس (گجرانوالہ) سرسٹامی مترسین۔1922ء ہفت روزہ رام گڑھیاں شیر (گجرانوالہ) گوپال سنگھ رام گڑھی۔نہنگ (لاہور) مدیر ٹھاکر سنگھ۔1923ء ملاپ (لاہور) مہاشہ خوشحال چند خورسند سابق مدیر ''آریہ گزٹ''

1924ء ریاست (دہلی) دیوان سنگھ مفتون۔1926ء ہفت روزہ پنجاب گزٹ ڈاکٹر دیال چند مالک مدیر صداقت (گجرانوالہ) گیانی جے سنگھ۔1928ء ویر بھارت (لاہور) سوامی گنیش دت گجرانوالہ گزٹ (گجرانوالہ) مدیر جہانگیر چند۔1930ء ندھڑک (گجرانوالہ) مدیر جہانگیر چند۔حقیقت مدیر جہانگیر چند رام لال ولد کرم چند مالک و مدیر۔رگڑا (گجرانوالہ) حویلی رام ولد مکند لال۔ 1931ء گورو نانک خالصہ کالج میگزین انگریزی۔ اردو ہندی اور گورمکھی پر مشتمل مجلہ (گجرانوالہ) مدیر باوا نرائن سنگھ۔1932ء ڈسٹرکٹ گزٹ (گجرانوالہ) مدیر و مالک دیال چند پنجاب ایڈووکیٹ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔ اکالی گزٹ (گجرانوالہ) ٹھاکہ سنگھ۔ تجارت (گجرانوالہ) مالک و مدیر رام لعل۔ملاپ خالصہ (گجرانوالہ) ایشر سنگھ۔

1933ء پنجاب موٹر گزٹ (گجرانوالہ) دیال چند۔ماہنامہ برہمن سندیش (گجرانوالہ) رام لعل۔دیہات سدھار (گجرانوالہ) بیدی شیر سنگھ انسپکٹر آف سکولز۔نشان خالصہ (گجرانوالہ) ٹھاکر سنگھ۔1934ء ہندو ہیراڈ ہندو ملاپ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔1935ء روزنامہ ہندو (لاہور) بھائی پرمانند ہندو سبھائی لیڈر۔ڈسٹرکٹ گزٹ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔ جوبلی (گجرانوالہ) سرداری لعل۔1936ء سیوک (گجرانوالہ) اننت رام نارنگ۔1937ء پریم (گجرانوالہ) ہنس راج وید۔منزل (گجرانوالہ) مدیر و مالک رام لبھایا۔خالصہ (گجرانوالہ) کرتار سنگھ مالک و مدیر۔منشی فاضل ایس طالب مدیر تھے ۔انکم ٹیکس گزٹ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔ماہنامہ حکیم (گجرانوالہ) ڈاکٹر کرم چند مالک و مدیر۔1939ء ماہنامہ رنجیت (گجرانوالہ) بلبیر سنگھ گیانی۔ماہنامہ راجپوت (گجرانوالہ) سوہن لال سوہترہ۔(ماخوذ)

# اُردو کی اِرتقائی منازل اور مختلف نام

اُردو ایک ایسی پیاری اور دلکش زبان ہے کہ اُس کی زلف گرہ گیر کے اَسیر ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اُردو کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس گلستاں کی سیر کرنے والا کبھی تشنہ نہیں رہ سکتا۔ اُردو کو اُردو کہنا بقول کسے صرف اُردو کے ساتھ بے اِنصافی ہی نہیں، پورے برّ صغیر کی تہذیب، تاریخ اور باہمی میل ملاپ سے زیادتی ہے۔ اُردو کو جینے کا ایک سلیقہ، ایک طرزِ زندگی اور ایک اسلوبِ زیست کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

معروف ادیب جناب رضا علی عابدی اپنی کتاب ''اُردو کا حال'' میں لکھتے ہیں:

''رشید احمد صدیقی کیسے بھلے آدمی ہیں انہوں نے لکھا تھا کہ زبان کے علاوہ اُردو بہت کچھ اور بھی ہے۔ جیسے ایک قیمتی ورثہ، ایک قابلِ قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کُن نغمہ،، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا، یا اس طرح کی کتنی اور باتیں، جو محسوس ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو پاتیں۔''

(اُردو کا حال از رضا علی عابدی سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور)

اُردو ایسا ہی ایک مسحور کُن نغمہ ہے کہ جو لسانی اور سماجی اختلاط وارتباط سے وجود میں آیا۔ جسے ہر چاہنے والے من پسند نام سے پکارا۔ اَمیر خسرو نے اُسے ہندوی یا دہلوی کے نام سے پکارا۔ اُردو نے جتنی بھی ارتقا کی منازل طے کیں۔ اتنے ہی اس کے نام بنتے چلے گئے اور مختلف ادوار میں یہ نام بدلتے بھی گئے۔ ناموں کی اس تبدیلی کے پس پردہ لسانی اور تہذیبی خصوصیات بھی تھیں۔ اس شیریں زبان کو کبھی ہندوی کہا گیا۔ تو کبھی ریختہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ کبھی اُسے اُردوئے معلّٰی بھی کہا گیا اور کسی زمانے میں اُسے دکنی اور گجراتی کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔ اُردو کے ناموں کا یہ سفر بالآخر اُردو پر ہی اختتام پذیر ہوا۔ انہی ناموں کی مختصر کہانی درج ذیل ہے۔ ہندی یا ہندوی۔ فصیح الملک نواب مرزا داغ نے اپنی ایک مشہور غزل کے مقطع میں یوں سخن آفرینی کی تھی کہ:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اب تک کی لسانی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ داغ نے جس اُردو پر ناز کیا تھا وہ یہ اُردو نہ تھی۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی سے لے کر موجودہ زمانے کے لسانی محققین کی اکثریت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی نسبت اسے ہندی یا ہندوی کہا جاتا رہا ہے۔اس نام کی شہادت قدیم لغات اور ادبی تصانیف میں بھی ملتی ہے۔ریختہ۔ غالبؔ نے میر کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

دراصل ریختہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جو مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً بنانا، ایجاد و اختراع کرنا، نئے سانچے میں ڈھالنا، اور موزوں کرنا وغیرہ۔لیکن ہندوستانی ادبیات میں بالکل نئے معانی میں استعمال کیا گیا۔اُردو کے نغمے جب راگ رنگ کی محفلوں میں سماں باندھنے لگے تو اسے ریختہ کہا جانے لگا۔ چنانچہ بعد میں مختلف زبانوں اور بولیوں کے اختلاط کی بناء پر بطور استعارہ اُردو کو بھی ریختہ کہا جانے لگا۔مولانا محمد حسین آزاد اپنی تصنیف ''آبِ حیات'' میں ریختہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ سے پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں ' 'گری پڑی پریشان چیز'' چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں۔اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔

(آبِ حیات از مولانا محمد حسین آزاد سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور)

## اُردوئے معلّٰی

دہلی کا پہلا مسلمان حکمران قطب الدین ایبک ابتدا میں شہاب الدین غوری کا غلام تھا۔ وہ جلد ہی اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر فوج کا جرنیل بن گیا۔اس نے 1193ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اسی فوج کے متعلق ہمیں لفظ اُردو کا استعمال تاریخی کتب میں نظر آتا ہے۔اس لشکر کو اُردوئے معلّٰی یعنی عسکرِ اعلیٰ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔اسی مناسبت سے یہ نام اُردو زبان کو بھی دیا گیا۔ جو مرورِ زمانہ

کے ساتھ ساتھ صرف اُردو ہی رہ گیا۔محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔''ترکی میں اُردو بازارلشکر کو کہتے ہیں۔اُردوئے شاہی اوردربار میں ملے جُلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا'' (آبِ حیات از مولانا محمد حسین آزاد بحوالہ اُردو ادب کی مختصر تاریخ ص 49) میر تقی میرؔ کے صاحب زادے میر کلو عرشؔ سے جو شعر منسوب ہے اس میں بھی اُردو زبان کو''اُردوئے معلّٰی''ہی کہا گیا ہے۔

ہم ہیں اُردوئے معلّٰی کے زبان دان اے عرش
مستند ہے جو ارشاد کیا کرتے ہیں

(اُردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر ص 56)

## دیگر مختلف نام

اُردو کے مختلف ناموں کے ضمن میں اکثر ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کی نسبت سے اُردو بعض اوقات دکنی، گجراتی، گوجری، لاہوری، دہلوی، ہریانی، ہندوستانی اور پنجابی وغیرہ کہلاتی رہی ہے۔ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے اب صرف اُردو ہی کا لفظ مروج ہے۔اور باقی سب متروک قرار پا چکے ہیں۔اس ساری بحث کے آخر پر فرازؔ کا شعر یاد آرہا ہے۔جو اس حوالے سے انتہائی موزوں ہے کہ

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو نام بھی تجھ سا رکھے

(ماخوذ)



# اُردوزبان کےادواراورفضیلت

جب ہم علم لسانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے میل جول سے ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے۔اور اختلاط کا یہ سلسلہ صدیوں تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔یہی نظریہ اس دور کی عالمگیر زبان اور لینگوئج افرانکا میں ثابت ہوتا ہے۔کہاں سے یہ زبان چلی اور کہاں آ کر ٹھہری۔یہ زمانے کی ضرورت بھی تھی اور ایک عالمی حیثیت اختیار کرگئی۔ہماری قومی زبان اردو نے بھی موجودہ دور تک پہنچتے پہنچتے بہت سے ادوار دیکھے۔ایک خاص خطے میں بولی جانے والی یہ زبان جو اپنے ساتھ کئی زبانوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے سفر پر نکلی۔اردو زبان اس دور کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔یہ اپنے اندر فارسی عربی اور ہندی کو سموئے ہوئے ہے۔کہتے ہیں کہ ہندوستان میں آریہ قوم 1500 سو ق م پہلے آکر آباد ہوئی۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ قوم پھیلتی چلے گئی۔اور اس کی زبان میں بھی فرق آتا گیا۔اور آخر ان کو ایک ایسی زبان کی ضرورت آن پڑی جو منظم اور ٹکسالی حیثیت رکھتی ہو۔لہٰذا اس ضرورت کے لئے سنسکرت وجود میں آئی۔وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان کو بھی عروج ملا۔اور مگر ساتھ ہی اسے دو اہم نقصان بھی اُٹھانے پڑے۔الف۔اس زمانہ میں اتنی ادبیت آگئی کہ عوام نے اسے استعمال کرنا ترک کر دیا۔ اس طرح یہ ایک خاص طبقہ تک محدود ہوکر رہ گئی۔

ب۔یہ کہ گوتم بدھ اور مہابیر سوامی والوں نے بھی اس زبان کی بجائے مقامی زبانوں میں مذہب کی ترویج واشاعت کی۔نتیجتاً عوام میں ان کی مقبولیت زیادہ ہوگئی۔اب تو سنسکرت ایک خاص طبقہ تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔عوام نے ہمیشہ ایک مخلوط زبان رکھی۔جو تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف خطوں میں مقامی زبانوں کے طور پر رائج ہوگئیں۔اور برابر چلتی رہیں۔جن کو پراکرت کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ان پراکرتوں میں سے ایک ادبی شکل پالی تھی۔جس کا ذکر اشوک کی لاٹوں میں یا پھر بدھ یا جین مت والوں کی مذہبی کتابوں میں نظر آتا ہے۔مذہب اور انسان کا رشتہ ہمیشہ سے ہی بڑا قریب کا رہا ہے۔مذہب نے زبانوں کی ترویج میں بہت کردار ادا کیا ہے۔علماء صوفیاء

اورواعظین نے ہرزبان میں نئے الفاظ کا اضافہ اوراس کا استعمال اس طرح کیا کہ آخروہ زبان کا ہی حصہ بن کر رہ گئے۔انگریزی زبان کی بھی تاریخ میں بھی یہ بات نمایاں ہے کہ عیسائی مبلغین نے اس کی اشاعت اور ترویج کے لئے بہت کام کیا۔اس زبان کے بولنے والوں پر سخت سے سخت حالات آئے مگرانہوں نے اسے زندہ رکھا۔دوسری زبانوں کے الفاظ کا ذخیرہ اس میں شامل ہوا، اردوزبان نے بھی یہ تدریجی دورخوب دیکھا۔جن کا ذکراوپرآیا ہے ان کے متعلق یہ بھی یاد رہے۔ بعض ایسی پراکرتیں جوسنسکرت کی طرح ادبی حیثیت اختیار کر جاتیں۔عوام انکومتروک کر کے پھر آپس میں ملی جلی زبان کوایک خاص انداز سے پیش کر کے ایک نئی زبان اختیار کر لیتے۔جس میں وہ اپنا مفہوم آسانی سے ادا کر سکتے تھے۔اس میں سے ایک ذکراپ بھرنش کا ہے۔اہل زبان نے اسے حقارت سے دیکھا اوراسی لئے اس زبان کو بھرنش کا نام دیا گیا یعنی بگڑی ہوئی زبان۔اب بھرنش کے وجود کے بعد راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کے زیراثر گجرات،راجپوتانہ،اور دوآبہ کی بولیاں جب اس سے مل جل گئیں تو اس کو اتنا فروغ ملا کہ 500ء سے 1000ءتک دوآبہ کی شورسینی اپ بھرنش تمام شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی۔جوموجودہ اُردو یا کھڑی بولی کا سبب بنی۔پھر مغربی ہندی جودہلی،میرٹھ اوراس کے گردونواح کی اب بھرنش کا نتیجہ تھی کا وجود ہوا جومسلمانوں کی آمد سے پہلے پنجاب میں رائج تھی۔712ءمیں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے عربی وفارسی کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں تیزی سے بڑھتے گئے۔امیرخسرواورخواجہ سعدسلمان (وفات 1125ء) کی شاعری اس بات پر گواہی دیتی ہے۔قطب الدین ایبک نے جب دہلی کودارالسلطنت بنایا تو یہاں لاہوری کی بجائے دہلوی زبان تھی۔جوکئی زبانوں سے متاثر ہوکراپنی ایک انفرادیت مسلمانوں سے قبل راجپوتی عہد میں قائم کر چکی تھی۔یہی وہ زبان تھی جس کی بنیاد پراردوکا وجود قائم ہوا۔جوزیادہ تراپ بھرنش کا اثر لئے ہوئے تھی۔

پنجاب سے مسلمان فارسی آمیز پنجابی بولتے ہوئے دہلی آئے مگر یہاں برج بھاشا کی نسبت کھڑی بولی اور ہریانی صوتیات اورصرف ونحو کو پنجابی سے ملتا جلتا پایا اور جلد اس کوسیکھ گئے۔شاہ

جہان کے دور میں آگرہ والوں کا اثر ہونے کی وجہ سے لب ولہجہ میں فرق آ گیا۔ اور بدّ ل، لتّا، گڈّی کی بجائے بادل، لوٹا، اور گاڑی کہنے لگے۔فوجیوں نے بھی زبان دانی میں بڑا حصہ ڈالا۔فوج میں اس وقت کھڑی بولی کا اثر زیادہ رہا۔ کیونکہ وہ انبالہ، کرنال، حصار، اور دہلی کے جنوب سے بھرتی ہوتے تھے۔ جہاں وہ جاتے تھے۔ یہ زبان لے جاتے۔ دہلی کی مرکزیت سارے ہندوستان پر چھا رہی تھی۔اس لئے لوگ اس کی زبان کو بھی اہمیت دینے لگے اور جلد سیکھتے تھے۔ان تمام ادوار سے گزرتی ہوئی یہ کھڑی بولی جو اردو زبان کی بنیاد بنی، ترقی کرتی رہی اور بابر کے ہندوستان آنے پر یہ ایک زبان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ زبان بابر اور ہمایوں کے دور میں آگے بڑھی۔مگر اکبر کے دور میں اس کی ترقی کو نقصان ہوا۔ کیونکہ بعض وجوہ کی بنا پر اسکو آگرہ کو آگے رکھنا پڑا۔ مگر شاہجہان نے آگرہ چھوڑا تو دہلی آباد کیا تو دہلوی زبان کو عروج ملا تب یہ شاہجہانی اردو بن گئی۔اورنگزیب کے زمانے میں اسے سب سے زیادہ اہمیت ملی۔ اور اس کا نام اردوئے شاہی ہونے لگا۔اب مسلمان شعراء مثلاً عبدالرحیم خان خاناں نے برج بھاشا کو ترک کر کے اسی اردوئے شاہی کو اپنانا شروع کر دیا۔ یوں شمالی ہند میں اردو کا بیج بویا گیا اور جب محمد تغلق نے دیوگیری شہر کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور ہر شخص کو دہلی سے دکن جا کر آباد ہونے کا حکم دیا تو مال و اسباب کے ساتھ یہ زبان بھی وہاں ساتھ گئی۔ دکنی لوگوں نے اسے اس قدر پسند کیا کہ جلد ہی قبول کر لیا۔ اور یوں دکنی اردو کا باب کھل گیا۔اس زبان میں تحریریں بھی ملنے لگیں۔ ہر خاص و عام ولی و صوفی نے اس زبان سے کام لینا شروع کر دیا اور خدا نے بھی اسے اپنے فضل سے یوں بخشا کہ اب اس کا ڈنکا تمام جہانوں میں گونجنے لگا ہے۔اور اہل اردو بہانگِ دہل یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ:

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(ماخوذ)



# اَدب اور اُس کی تعریف

اصولی طور پر ہر زبان کا ادب اپنی ادبی اقدار اور اسالیب کی پاسداری کے اعتبار سے ایک ہی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جہاں پر زبان ایک ہوگی وہاں پر اسالیب اظہار خیال ہم رنگ اور ایک ہی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ابتداً لفظ ادب کی تعریف ان گنت معنوں میں کی جاتی رہی ہے۔ اپنے عربی اصل کے پیش نظر ہر خُلق کی خوبی کو ادب کہا گیا ہے۔ چنانچہ آداب مہمان نوازی اور اکرام ضیف کو بھی ادب کہتے ہیں۔ تعلیم و تدریس کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی ادیب معلم ہے اور ادب سے مراد تعلیم و تدریس ہے۔ اس لئے تمام علوم خواہ وہ معاشرتی ہوں یا سائنسی ان کا پڑھنا، سیکھنا ''ادب'' کے دائرے میں آتا ہے۔ مگر ایک عرصہ گزرنے پر اصحابِ علم و ادب نے یہ احساس کیا کہ اگر ادب کا دائرہ کار الفاظ اور اُن کے معانی تک محدود رہے تو لفظ کے معانی ہمیشہ ایک نہیں ہوتے۔ لفظ کبھی تو اپنے حقیقی معنوں کو بیان کررہا ہوتا ہے اور کبھی مجازی معنوں کو۔ یعنی معانی مستعار کو جیسا کہ لفظ ''چاند'' ہے کہ حقیقی معنوں میں نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے۔ مگر مجازی معنوں میں محبوب یا دل پسند ہستی ہے۔ ادب میں حسن، لفظ اور معانی کے ارتباط اور تناسب سے پیدا ہوتا ہے یہ ربط اور تناسب ایک شعوری لذّت بھی پیدا کرتا ہے اور اپنے آہنگ کے ساتھ تختۂ گل کی طرح سے رنگ و روپ بھی بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم ادبیہ کا موضوع محاسن کلام کی تلاش اور تعین ہے۔ علم معنی اور علم بیان علم صنائع اور بدائع اس محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اور علاماتِ حسنِ بیان کی نشاندہی میں ممد اور معاون ہوتے ہیں۔ آخرالامر یہ ہے کہ لفظ و معنی میں حسن تخلیق کرنا ہی وہ قدر ہے جو کہ ''ادب'' کی تعریف کو متعین کرتی ہے۔ اور اُس کو دیگر انسانی علوم اور دانش وری کے بیان سے ممتاز کرتی ہے۔ ادب میں صرف لفظ ہی حسن پیدا نہیں کرتا بلکہ جن معانی پر دلالت کررہا ہوتا ہے وہ بھی ادبی کاری میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اور اسی اختلاط اور ارتباط سے حسن کی تخلیق ہوتی ہے۔ ان اصولی اقدار ادب کی تفصیل میں ذیل طور پر اور بھی بہت سی اقدار ادب ہیں۔ جن کا قیام ادبِ عالیہ کی تخلیق کے لئے از بس ضروری قرار دیا گیا ہے۔ تاہم چند ایک اقدار ادب ایسی ہیں جن کا بیان زیرِ قلم موضوع

سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

اوّل۔ یہ قبول کیا گیا ہے، کہ ادبِ عالیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ آفاقی مضامین اور مواد کا حامل ہو۔یعنی وہ ہر انسان کی فطرتی اور قلبی جذبات اور تمناؤں کی عکاسی کرے۔

دوم۔ یہ کہ مشاہدات صدق پر مبنی ہوں صدق کا عنصر ادبی تخلیق میں جزوی اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔حسن کا بیان ہو یا قلبی کیفیات کا اظہار اس میں ادبی حسن و جمال پیدا کرنے کے لئے لازم ہے، کہ مشاہدات اور جذبات حقیقت پر مبنی ہوں، اگر ایسا نہیں تو وہ کلام ایک دیو مالائی افسانہ ہوتا ہے اور قلب ونظر کو مسخر نہیں کرتا۔اس بنیاد پر تیسری ادبی قدر ہے، جس کو تاثیر کا نام دیا گیا ہے۔ادب میں تاثیر لفظ و معانی کے حسن و جمال سے پیدا ہوتی ہے۔اور اگر کہا جائے کہ ادب عالیہ کی پہچان اس کی تاثیر ہی پر قائم ہے تو بالکل درست ہوگا۔کیونکہ ادب کا غائت اور مقصود ابلاغ کامل ہی ہے۔اور ابلاغ موثر کلام ہی سے پیدا ہوتا ہے۔اس لئے جس کا حاصل کرنا تمام ادبی تخلیقات کا مطلوب اور منشا ہوتا ہے۔

ادب کے عالائم و رموز۔لفظ کے دو معنی کئے جاسکتے ہیں ایک وضعی یا حقیقی اور ایک مجازی یعنی غیر حقیقی۔لفظ کا یہ مفہوم دراصل علامتی مفہوم ہے۔گویا کہ مجاز لفظ کے معنی میں تجاوز کا نام ہے۔یہ بھی کہا گیا تھا کہ شعری ادب کی دنیا میں لفظ کی دلالتوں اور معانی کو وسعت دینے کے لئے شعر میں اکثر و بیشتر لفظ کو مجازی یا معانی مستعار کے اظہار کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔اس عمل کو ادبی انتقاد میں شعر کے علائم و رموز کہتے ہیں رموز رمز کی جمع جو کہ پوشیدہ اشارے یا کنائے سے تعبیر ہے اور علائم علامت کی جمع ہے۔جس میں ادب میں معانی مستعار مراد ہوتے ہیں۔لفظ کی اس دورنگی کو غالب نے بہت ہی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ ساغر کہے بغیر

**اَبیات**:: ابیات دراصل مثنوی کا ہی دوسرا نام ہے۔اس طرزِ کلام میں ہر شعر اپنے بحر اور وزن کے اتحاد کے باوجود اپنا جداگانہ قافیہ رکھتا ہے۔اس لئے ان کو ابیات کا نام دیا گیا ہے۔ مثنوی کے موضوعات تاریخی واقعات اور روایتی حکایات کے ساتھ اخلاقی اور صوفیانہ درس وتدریس بھی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مثنوی رزمیہ بھی ہوتی ہے۔عشق ومحبت اور صوفیانہ داستانوں کے بیان کے لئے بھی اختیار کی جاتی ہے۔فردوسی کی مثنوی رزمیہ ہے۔جسے زبانِ پہلوی کا شاہکار مانا جاتا ہے دوسری مشہورِ عالم مثنوی مولانا روم ہے۔فارسی شاعری میں ابوسعید ابوالخیر کے بعد رومیؔ اور سنائی ہی ایسے شاعر ہیں جو مجاز سے صرف نظر کرتے ہوئے منازلِ سلوک اور محبتِ الٰہی کو بیان کرتے ہیں۔ مثنوی واقعات کے بیان اور درس وتدریس کی صنفِ شعر ہے۔اس لئے اسلوبِ بیان کے اعتبار سے اس کی فنی اقدار میں ترتیب بیان اور وارداتِ ذہنی اور قلبی کو سلاست اور وضاحت سے بیان کرنا بنیادی اقدارِ فن ہیں اور یہی دو صفات ہیں، جن کی بنا پر فردوسی اور رومی کی مثنویوں کو شاہکار اور لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

**قصیدہ**:: فارسی سرمایہ شعر میں ابیات کی صنف اپنی وسعت بیان اور فنی اعتبار سے ایک اہم مقام رکھتی ہے۔فارسی شعر میں مثنوی کے طرز میں لاتعداد کلام ہے۔تاریخ، وعظ ونصیحت، عشقیہ حکایات اور اخلاقیات سب اس صنف کے موضوعات ہیں اس لئے فارسی شاعری کی فنی اقدار اور کلاسیک اسلوبِ زبان کی تعیین بہت حد تک اسی صنفِ شعر کی مرہونِ منت ہے۔فردوسیؔ، رومیؔ سعدیؔ اور جامیؔ اور اس منصب کے بہت سے شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کر کے اساتذہ فنِ شاعری کہلاتے ہیں۔دوسرے الفاظ میں مثنوی کی طرزِ نگارش فارسی اسلوبِ بیان کا ایک مستحکم ستون ہے۔فارسی ادب میں ''ابیات'' کے بعد قصیدے کا مقام ہے۔

ابیات و قصیدہ غزل را     فردوسیؔ و انوریؔ سعدیؔ

دراصل فارسی شعر میں ابیات وقصیدہ ہی دو ایسی اصناف ہیں جن سے دیگر اصناف نے جنم لیا ہے۔کیونکہ ان دو اصنافِ شعر میں غزل اور مرثیہ، رباعی اور قطعہ اور دیگر اصناف رزم و بزم کے مضامین بھی شامل ہوتے ہیں۔قصیدہ عربی شاعری کی اہم ترین صنف ہے۔فارسی زبان میں اسی

توسط سے آیا ہے۔ حقیقت میں فارسی اور اُردو شاعری نے عربی قصیدہ ہی میں جنم لیا ہے۔ اور ان کی تمام اصنافِ شعر اسی عربی صنفِ شعر کی رہینِ منت ہیں۔

اپنی ہیئت کے اعتبار سے اس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے، اور باقی اشعار میں مصرعہ ثانیہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ ادبِ عربی کے دستور کے مطابق اس کا اول رکن ''تشبیب'' کہلاتا ہے۔ جس میں تذکرہ شباب اور محبوب کی صفات بیان ہوتی ہیں۔ دوسرا رکن ''گریز'' کہلاتا ہے۔ یعنی اول ذکر کے بعد چند اشعار میں روئے سخن ممدوح کی طرف کیا جاتا ہے۔ اور تیسرے رکن میں ''مدح'' کو بیان کیا جاتا ہے اور چوتھے مرحلے میں دعا ہوتی ہے۔ کہ ممدوح کی عمر دراز ہو، اور فتح و کامرانی نصیب ہو اور مطلوب بھی بیان ہوتا ہے۔ فنی اعتبار سے قصیدے کا یہی ڈھانچہ ہے جو قدیم سے اب تک قائم ہے۔ فارسی شاعری عربی شاعری کی پروردہ ہے اور اردو شاعری نے ان دونوں کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اسی لئے وراثتی طور پر فارسی اور اردو شاعری کا اسلوب ادب عربی نقش و نگار رکھتا ہے۔ تاہم فارسی زبان تک پہنچنے تک قصیدے کی وہ ہیئت نہیں رہی جو عربی کلاسیکی ادب میں تھی اس تبدیلی کی اہم وجہ تو یہ ہے کہ فارسی زبان میں قصیدہ تو سلاطین کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اور بادشاہوں کی مدح سرائی ان کا اولین موضوع بن گیا اس لئے عربی دستور کے مطابق تشبیب اور گریز کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ مدح اور حسنِ طلب کے عناصر قائم رہے۔ یہ چند وجوہات ہیں جن کی بنا پر فارسی قصیدے کی ہیئت میں تبدیلی ہوئی۔

**غــزل::** اُردو اور فارسی شعراء ادب کا باوا آدم عربی قصیدہ ہے، اور اس امر پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ غزل کی جداگانہ صنف کی تخلیق اُن عشقیہ اشعار کی مرہون منت ہے جو عربی قصیدہ کی ابتدا یا تمہید میں مرتب کئے جاتے ہیں جن کو تشبیب یا تنسیب کہتے ہیں ایرانی شعراء نے قصیدے کی تشبیب کو ایک مستقل صنفِ شعر کے طور پر اختیار کر لیا اور اس کو موضوع کی پاسداری میں غزل کا نام دیا اور اس صنف میں عظیم الشان ادبی شاہکار پیدا کئے۔ معنوی اعتبار سے غزل کا موضوع محبوب مجازی کے حسن و جمال اور اس سے وارداتِ عشق و محبت کا بیان ہے۔

(ماخوذ از ادب المسیح)

# تقسیم ہند سے قبل مشاہیر کرام اور اُردو زبان

بعض مشاہیر نے اُردو زبان کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ چند ایک ملاحظہ ہوں۔

1۔**رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو:** اُردو زبان ہندو مسلمانوں دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے مشترکہ و مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً نا قابلِ تقسیم ہے۔

2۔ **پنڈت جواہر لال نہرو:** اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان قرار دینا بے معنی بات ہے۔ اُردو زبان سرزمینِ ہند میں پیدا ہوئی۔

3۔**رائٹ آنریبل سری نواس شاستری:** مدراس کے ایک کالج میں ایک قومی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے موصوف نے فرمایا۔ بہت سی مادری زبانوں کی بھیڑ سے قومی زندگی کی سرسبزی کی کھنڈت ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ہندوستانی اُردو کبھی نہ کبھی یہ حیثیت حاصل کرلے گی۔

4۔**مسٹر گارسنوتاسی۔ یورپین سیاح:** اُردو زبان نے سارے ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ جو فرانسیسی زبان نے یورپ میں۔ یہی وہ زبان ہے جو سب سے زیادہ استعمال میں آتی ہے ۔عدالتوں اور شہروں میں اسی سے کام لیتے ہیں۔

5۔**سر ہنری گڈنی:** بے شک کامل غور کے بعد میری یہ رائے ہے کہ انگریزی کے بعد اُردو ہی ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہے۔ مجھے تو مشرق و مغرب کی تمام زبانوں میں اُردو سب سے پیاری لگتی ہے۔

6۔**سر آروشیر ولال:** جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) میں آپ نے ایک ایسے کام کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اس میں بڑی حد سے کامیابی حاصل کر لی ہے۔ جو اس ملک کی تعلیمی تاریخ میں بے مثل ہے۔ غیر زبان میں تعلیم دینے کے نظام کی خامیوں کو پورا کرتے ہوئے مثلاً طلباء کے حافظے پر بے جا بار پڑنا۔ حدّت کا پامال ہونا، تعلیم یافتہ جماعتوں اور عوام میں ایک نا قابلِ عبور خلیج کا حائل ہونا، آپ ایک ایسی جامعہ کا قیام عمل میں لائے جس کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ یہ آپ کی وسیع النظری اور اعلیٰ ہمتی کی دلیل ہے۔ آپ نے نہ صرف طلباء کو غیر زبان کے جوئے سے آزاد کیا ہے۔ بلکہ اُردو زبان اور ادب کو پروان چڑھانے میں ایک زبردست تحریک عمل بہم پہنچائی ہے۔

7۔**سر پرشوتم داس ٹھاکر داس:** جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) تمام ہندوستان میں میں اپنی قسم کا واحد اور کامیاب تجربہ ہے۔ جہاں ایک ہندوستانی زبان ذریعہ تعلیم ہے۔

8۔**پنڈت برج موہن وتا تریہ کیفی:** یہ شرف اُردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ وہ بلحاظ جغرافیائی ہندوستان کے ہر حصہ ملک کا مشترکہ سرمایہ ہے، اور اس زبان کی بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ ہندو مسلم تمدن کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

9۔**ڈاکٹر تارا چند سیکٹری ہندوستانی اکادمی:** ''ہمیں تمام زبانوں پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔ ادبی ہندوستان میں جو زبانیں رائج ہیں وہ ایسی ہیں، کہ کل ہندوستان کی زبانیں نہیں بن سکتیں کیونکہ ان میں اتنی لچک نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان کی تمام زبانوں میں کچھ تو مقامی ہیں۔ جیسے پنجابی وغیرہ اور کچھ ایسی ہیں جو ہر جگہ بولی اور سمجھی نہیں جاتیں۔ اس لئے تمام لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اردو ہی سارے ہندوستان کی زبان بن سکتی ہے۔ اس میں بڑی استعداد اور لچک ہے اردو کو ترقی دینے کے لئے دونوں قوموں کو یکساں کوشش کرنا چاہیئے۔

10۔**سر رادھا کرشن (وائس چانسلر جامعہ بنارس)** ''ہندوستانی اردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کی ملک کے گوشے گوشے میں مختلف کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن یہ حقیقت باعثِ دلچسپی ہوگی کہ جامعہ عثمانیہ میں مادری زبان ہندوستانی جو ملک کی عام زبان ہے ان کے حصول کے تشفی بخش مواقع موجود ہیں۔ ان گراں قدر تجربات سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔''

11۔**مسٹر راج گوپال اچاری:** حیدر آباد نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر ہندوستان کی مشترکہ زبان کی نہایت اہم خدمت انجام دی ہے۔ اور اردو میں تعلیم دینے کا یہ کامیاب تجربہ عزم و ہمت کا اُن کا کارنامہ ہے۔ جس کے کل ہند ہونے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے''۔

12۔**پنڈت رگھو پتی سہائے فراقؔ (گورکھپور):** اردو کا مستقبل اب تاریک نہیں۔ وہ اس ہندوستانی کی شکل میں جو دراصل اردو ہی سارے ہندوستانوں کے لئے باہمی ربط کا ایک موثر اور لازمی ذریعہ ثابت ہوگی۔ ہندوستان سے باہر بھی اردو کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔

13۔ **رائے بہادر بابو رام کول (ساہی):** اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی، ایسا کہنے والوں کو میں ملک اور وطن کا دشمن سمجھتا ہوں، اور اس کو سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دینا ملک اور قوم کے ساتھ ایسی غداری ہوگی جس کو مورخ ذلیل ترین عنوانات سے تاریخ کے صفحات میں پھیلائے گا۔''

14۔ **جناب بھگوت شرن اوپادھیائے:** اُردو زبان ہندو مسلمانوں کے پُر محبت تعلقات کی یادگار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کچھ لوگ فرقہ وارانہ تعصّب سے اس قدر مدہوش ہورہے ہیں، کہ اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں، اور اس کی جگہ وہ عجیب و غریب زبان رائج کرنا چاہتے ہیں، جو سرتا سرنا قابل فہم الفاظ پر مشتمل ہے۔

15۔ **پروفیسر آر سبا راؤ:** زبان کسی ملک کی زندگی کی روح ہوتی ہے۔ اُردو مشترکہ زبان کو اس وسیع ملک تمام طول و عرض میں آسانی کے ساتھ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ قومی اتحاد کو مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔'' (رسالہ ہماری زبان دہلی یکم مئی 1945ص 9)

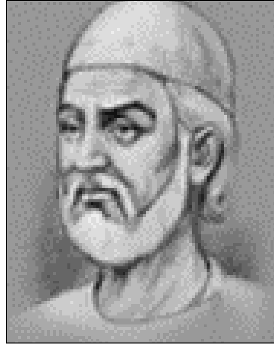


## دُنیا۔امام غزالیؒ

دنیا تجھ سے ظاہر کرتی ہے کہ تیرے ساتھ وفا کرے گی اور کسی کے پاس نہ جائے گی۔ اور فوراً تجھے چھوڑ کر تیرے دشمن کے پاس چلے جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ گویا وہ ایک بیسوا ہے جو مردوں کو لبھاتی ہے۔ اپنا عاشق بناتی ہے۔ تب اپنے گھر لے جاتی ہے اور موت کا مزہ چکھاتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے دنیا کو کشف میں ایک بڑھیا عورت کی صورت میں دیکھا، پوچھا تو نے کتنے خاوند کیئے کہا کہ اس کثرت سے کہ شمار نہیں پوچھا وہ مر گئے یا طلاق دی کہنے لگی میں نے سبھی کو مار ڈالا۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا ان احمقوں سے کہ دیکھتے ہیں کہ تو نے اوروں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور یہ احمق لوگ پھر تیری طرف آنے سے نہیں رُکتے۔

# زبان اُردو

## فقیروں کے لگائے ہوئے پودہ کی آبیاری اور صوفیاء ہند



دہلی کے شہرہ آفاق صوفی حضرت خواجہ میر درد دہلوی (1721ء۔1785ء) نے ایک بار فرمایا:

''اے اردو گھبرانا نہیں تو فقیروں کا لگایا ہوا پودہ ہے۔خوب پھلے پھولے گی۔تو پروان چڑھے گی۔ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ قرآن حدیث آ کر تیری آغوش میں آرام کریں گے۔بادشاہی قانون اور حکیموں کی طباعت تجھ سے آئے گی۔اور تو سارے ہندوستان کی آواز مانی جائے گی۔'' (میخانہ درد صفحہ 152۔153)

ایک مرتبہ جناب ناصر نذیر فراق ساکن کوچہ چیلاں بارہ دری خواجہ میر درد دہلی۔حیدر برقی پریس دہلی اشاعت مارچ 1910ء) برصغیر کے صوفیا عظام نے اردو کے پودہ کی جس شان وشوکت سے آبیاری کی اور اسے سدا بہار درخت بنانے میں پوری عمر کی صلاحیتیں صرف کر دیں۔اس کی تفصیل پاکستان کے مؤرخ ودانشور جناب ڈاکٹر سلیم اختر کے قلم سے ہدیہ قارئین کی جاتی ہے۔آپ کہتے ہیں۔مشرقی تہذیب اور ثقافت میں دربار مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔اور بادشاہ وقت کی ذات اس کی زندہ علامت، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مخصوص ادوار میں مخصوص اصناف کی ترقی یا تنزل میں دربار اور شاہ کا بالواسطہ تعلق ضرور رہا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کی سرپرستی اور مربیانہ دلچسپی سے فنکار پرورش پاتے تھے اور ادب وفن کو ترقی حاصل ہوتی اتفاق سے دکن میں ادب پرور بادشاہوں کی کمی نہ رہی اور اردو ادب نے جلد ہی منازل ترقی طے کر لیں۔ گو شاہانِ بہمنی (748ھ۔932ھ) سے اردو ادب کے آثار تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن اصل ترقی قطب شاہی خاندان (916ھ۔1098ھ) اور عادل شاہی خاندان (898ھ۔1098ھ) کے بادشاہوں کی ادب

پروری کی مرہون منت ہے۔گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کے بیشتر بادشاہ خودبھی شاعر تھےاور اس لئے ان کے دربار میں علماء،فضلاء اور ادباء دور دور سے کھنچ کھنچ کر آتے اور کمالِ فن کی داد پاتے جبکہ بیجاپور میں عادل شاہی خاندان کے بیشتر بادشاہوں نے تو اردوکو( جواس وقت''دکھنی'' کہلاتی تھی ) سرکاری زبان مقرر کیا۔سرکاری سرپرستی کے ساتھ ساتھ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اس سے بھی پہلے صوفیاءکرام نے رشدوہدایت کے لئے جب اس مقامی زبان کو وسیلہ بنایا تو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ بالواسطہ طور سے اردو کی خدمت بھی کر گئے۔ان کی کیونکہ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے .....والی بات ہوتی تھی۔اورعوام کی سطح پرآ کرعوامی زبان سے بڑھ کراورکوئی ذریعہ اظہار زیادہ مؤثر نہیں ہوسکتا۔علاوہ ازیں اوربعض صوفیاءشاعری اورموسیقی کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔اس لئے نادانستہ طور سے وہ حمدوثناءاوراخلاقی پرچار میں ادب بھی تخلیق کرتے گئے۔اس ضمن میں صوفیاءکو صرف جنوبی ہند سے مخصوص نہیں کیا جاسکتا۔بلکہ ہندوستان بھر میں وہ تبلیغ کےساتھ ساتھ اردوزبان کی مقبولیت اورادب کی ترقی کا باعث بھی بنے۔

چنانچہ مولوی عبدالحق کی تالیف(اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاءکرام کا حصہ)کے مطالعہ سے اس امر کا اندازہ لگانا دشوارنہیں رہتا۔مولوی مرحوم اردو کے اولین نمونوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔''افسوس کہ باوجودتلاش کےہمیں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا کوئی معتبرقول ہندی زبان میں نہیں ملا۔لیکن ان کی عالمگیرمقبولیت کودیکھتے ہوئےیقینی امر ہے کہ وہ ہندی زبان سے بہت واقف تھے کیونکہ ہندوبھی انکے مسلمانوں سے کم معتقدنہیں''ہندالولی'' کی ترکیب اور''غریب نواز'' کا لقب خودان کی عام مقبولیت کی صاف شہادت دے رہے ہیں۔البتہ شیخ فریدالدین شکر گنجؒ کے متعددمقولے ملتے ہیں۔(ص9)اس ضمن میں ان صوفیا کرام کےاسماءگنوائے جاسکتے ہیں۔حضرت سیدمحمدحسینی بندہ نواز گیسودراز(1422ء۔1321ء)''معراج العاشقین'' معروف ترین تصنیف ہے۔ان کے والدمحترم شاہ راجور یاسیدراجہ۔متوفی731ھ ہندی کے شاعر تھے۔شاہ میراں جی شمس العشاق۔پیدائش1496ء(خوش نامہ،ارشادنامہ،شہادت الحقیقت)ان کےفرزندشاہ امین

الدین اعلیٰ (رموز السالکین) شیخ عبدالقدوس گنگوہی (945ھ860ھ) محبوب عالم شیخ جیون متوفی1004ء (فقہ ہندی، محشر نامہ) شاہ برہان الدین جانم وفات (1583ء) شاہ علی محمد جیوگام دھنی (وفات 972ء) زین الدین الہ آبادی متوفی (771ھ) سید محمد اکبر حسینی متوفی (823ھ) صدرالدین چشتی متوفی 876ھ عبداللہ حسینی متوفی838ھ ۔میراں جی حسن خدا نمامتوفی 1070ھ میراں یعقوب متوفی1078ء شیخ حمیدالدین ناگوری، حضرت بوعلی قلندر، امیرخسرو، شیخ لطیف الدین دریا نوش، شیخ سراج الدین عثمان، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شاہ منیرالدین، شاہ برہان الدین، شیخ احمد لکھنوَ، قطب عالم، شاہ عالم سید محمد جونپوری، شیخ بہاء الدین باحق، شاہ محمد غوث گوالیاری، شیخ علی متقی، شیخ رزق اللہ، شیخ وجیح الدین، احمد العلوی، شیخ بہاء الدین برناوی، سید شاہ ہاشم الحسنی العلوی، سید میراں حسینی، قاضی محمود دریائی، بیر پوری، میاں خوب محمد چشتی، بابا شاہ حسین اورشاہ محمد معشوق اللہ۔ (رسالہ جواہرالاسرار)

صوفیاء کی یہ فہرست تمان ہندوستان پرمحیط ہے اگرجنوبی ہند کے صوفیاء کی تخصیص کرتے ہوئے اردو کی ابتدائی نشوونما میں ان کا مقام متعین کرنا ہوتو بقول رام بابوسکینہ جہاں تک کہ تمام قدیم ترین نمونے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں۔ان سے پتہ چلتا ہے کہ نثر اردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے...شیخ عین الدین گنج العلم متوفی795ھ کی تصانیف اور'' معراج العاشقین'' مصنفہ خواجہ گیسودراز گلبرگوی جو اگرچہ کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتی مگر پھر بھی اس زمانہ کی زبان کا حال بخوبی اس سے معلوم ہوتا ہے۔اورآپ کے نواسے عبداللہ الحسینی، نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر کے رسالہ نشاط العشق کو'' دکھنی'' میں ترجمہ کیا۔اسی طرح شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری نے شرح'' مرغوب القلوب'' لکھی اوران کے فرزند شاہ برہان الدین جانم متوفی 990ھ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں سے دو کے نام'' جل ترنگ'' اور'' گل پاس'' ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو کی نشوونما میں صوفیاء کے کرداراوراس کی لسانی اہمیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔'' یہ صوفیاء کرام برعظیم کے مختلف علاقوں میں رشدوہدایت کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔

بابا فرید شکر گنج ملتان کے رہنے والے ہیں، شیخ حمید الدین ناگوری وسط ہند کے، بوعلی قلندر پنجاب و ہریانہ کے، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار و بنگال کے، امیر خسرو دہلی کے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی اودھ کے۔ جو پنجاب میں تھا۔اس کی زبان پر وہاں کی بولی کا اثر ہے۔ جو بہار میں تھا اس کی زبان پر ماگدھی کا اثر ہے۔ کسی پر برج بھاشا کا اثر ہے۔ کسی پر کھڑی بولی کا اثر ہے۔ کسی پر سرائیکی کا اثر ہے۔ تو کسی پر زبان گجرات کا۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس زبان کا کینڈا، رنگ ڈھنگ بنیادی طور پر ایک ہے۔ اور ابھی چونکہ یہ زبان اپنی تشکیل کے عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ اس لئے یہ اثرات الگ الگ دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ ان نمونوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ زبان اس دور میں ضرورت کی زبان بن کر سارے برعظیم میں پھیل چکی تھی‘‘

(اردو ادب کی مختصر تاریخ صفحہ 74 تا77 ناشر سنگ میل پبلیکیشن اردو بازار لاہور طبع ششم )

(الفضل ربوہ 9 ستمبر 2011ء)

## زبان اردو اور جماعت احمدیہ

اردو ایک زندہ زبان ہے۔ اردو زبان کی تاریخ ،اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی خوبصورت اور شیریں زبان کا ملخص کسی شاعر نے خوبصورت اور جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔

گلریز و گلستاں ہے میری زبان اردو　　صورت گر جناں ہے میری زبانِ اردو

آزاد کی حکایت اقبال کا فسانہ　　غالب کی داستاں ہے میری زبانِ اردو

اردو زبان کی تاریخ میں آزاد، غالب اور اقبال بلا شبہ اُن ادباء و شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنے کلام کے ذریعہ اردو زبان کو ایک نئی زندگی بخشی۔ اہلِ لکھنؤ اور اہالیان دلی کا اس زبان پر گرانقدر احسان ہے۔ جنہوں نے ریختہ کو اپنے خون سے سینچا۔ اور آج یہ جو شجر سایہ دار نظر آتا ہے۔ تو ان دو بڑے شہروں کے ادیبوں کا کمال اور محنت ہے۔ اس نوزائیدہ زبان نے مرور زمانہ کے کئی مشکل ادوار بھی دیکھے مگر اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ آخری دور مغلیہ میں اس زبان کو دربار شاہی تک رسائی مل گئی تھی۔ سرسید احمد خان

نے بھی اس کی کافی خدمت کی اور یو پی کے صوبے نے تو اسے خوب پروان چڑھایا۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پہلی بار کسی ملک کی قومی زبان ٹھہری۔مگر پھر بھی پاکستان کے دور دراز دیہی علاقوں تک اس زبان کی رسائی مشکلات کا شکار رہی۔اور لوگوں نے اپنی علاقائی زبانوں کو مقدم رکھا۔یہ قدرتی امر ہے۔پاکستان میں تو خوب اسے ترویج وترقی ملی۔تعلیم اداروں اور نصاب تعلیم نے بھی اسے خوب پنپنے کا موقع فراہم کیا۔مگر دیار غیر میں بین الاقوامی طور پر اس کے فروغ کے لئے ایک تنظیم نے بے بہا خدمات انجام دی ہیں۔جس کی مثال ساری دنیا کی تنظیموں میں تلاش بسیار کے بعد بھی ملنا ناممکن ہے۔میری مراد جماعت احمدیہ سے ہے جس نے ساری دنیا کے 200 سے زائد مختلف ممالک میں اس زبان میں بھی اور دیگر زبانوں میں کروڑوں قرآن مجید اور اسلامی کتب اور لٹریچر کروڑوں ہوٹلز، لائبریریوں کی زینت بنایا۔ جماعت احمدیہ کے دوسرے خلیفہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کی معرکۃ الآراء تفاسیر اردو میں لکھیں۔اور ہزاروں خطبات اردو زبان میں دیئے۔اور اردو زبان کو چار چاند لگا دیئے۔اب ساری دنیا کے ممالک سے سینکڑوں ادبی اور اسلامی اردو زبان میں روز نامے ہفت روزے، ماہنامے، سہ ماہانہ اور سالانہ سووینیرز اور مجلہ جات شائع ہوتے ہیں جن کے ناموں کے تذکرے کے لئے یہ سطور ناکافی ہیں۔



## مہکتی کلیاں

☆سوچ گہری ہو جائے تو فیصلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔☆غم کا علاج مصروفیت ہے۔ ☆اپنے ہر خیال، ہر عمل میں نیک بنو۔☆ آدمی کا بہترین استاد تجربہ ہوتا ہے۔اور زندگی کی ٹھوکریں اعلیٰ ذریعہ تعلیم۔☆سب سے اچھا دوست وہ ہے جو تمہیں تمہارے عیوب سے آگاہ کرے اور دُشمن وہ ہے جو منہ پر تعریف کرے۔☆وقت صرف ان سے وفا کرتا ہے جو اس کی قدر کرتے ہیں۔☆کسی انسان کی عظمت،شرافت پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ دیکھیں کہ اس کا روّیہ ان لوگوں سے کیسا ہے جو اسے کچھ نہیں دے سکتے۔

# غزل۔اُردو شاعری کی ایک اہم صنف

اگر یہ سوال کیا جائے کہ غزل کی تعریف کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں ہر شعر کا دوسرا مصرعہ ہم قافیہ و ردیف ہوتا ہے عام طور سے ہر شعر اپنے موضوع کے لحاظ سے دوسرے سے علیحدہ ہوتا ہے۔(ویسے مسلسل غزلیں بھی لکھی گئی ہیں ) غزل کا آخری شعر مقطع ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے، لیکن یہ باتیں شعر کی فارم یا ہیئت سے تعلق رکھتی ہیں۔اس کے مزاج اور روح کو ان کے ذریعے سمجھا نہیں جاسکتا۔ ہماری شاعری میں غزل غنائیہ شاعری کا نمونہ ہے لیکن اس کی ترکیب میں اس کے علاوہ اور بھی عناصر شامل ہیں۔لغت نویسوں نے غزل کے معنی ''بازی کردن از جوانی وحدیث محبت، وعشق زناں'' بتائے ہیں اگر ہم کچھ دیر کے لئے غزل کو انہی معانی کا پابند بنالیں تو بھی اس کے مزاج کا اندازہ لگانے میں کچھ نہ کچھ مدد مل سکتی ہے۔''بازی کردن از جوانی'' سے ظاہر ہے کہ جذبات کی شدت اس میں ایک بنیادی عنصر ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ'' نازک ادا محبوبوں اور معشوقوں کی حدیثِ محبت وعشق میں بھی نازک ادائی اور عشق کی گرمی شامل ہو جاتی ہے، اور اس طرح غزل کے عناصر واضح اور متعین ہو جاتے ہیں۔غنائیت،شدت جذبات،نزاکت ادااور سوز و گداز انہیں چار عناصر سے غزل کا خمیر اُٹھتا ہے۔حدیثِ دیگراں،اپنی حدیث اور غمِ دوراں اپنا غم بن کر اُمنڈ پڑتا ہے لیکن غزل کا غمِ جاناں دراصل سارے غمِ دوراں کی جھلک ہے۔

آلام روز گار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

محض شاعرانہ بات نہیں ایک حقیقت کا اعتراف اور ایک مزاج کا اظہار کہیئے؟''بازی کردن از جوانی'' کے علاوہ غزل کے دوسرے لغوی معانی ''بننا'' اور'' کاتنا'' بھی ہیں غزل کے بارے میں شمس قیس رازی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرن کے پیچھے جب شکاری کتے بھاگتے ہیں اور بھاگتے بھاگتے جب ہرن عاجز آجاتا ہے،تو اس وقت اس کے حلق سے جو دلدوز چیخ نکلتی ہے۔اسے غزل کہا جاتا

ہے۔انہیں لغوی معانی کوسامنے رکھ کرکوئی غزل کی زبان پر زور دیتا ہے،کوئی موضوعات پراورکوئی سوز وگداز پر۔حقیقت یہ ہے کہ غزل کے مزاج کوصحیح طور سے سمجھنے کے لئے فارسی غزل کاایک سرسری جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ سالہا سال کے تجربہ سے جو چیزیں فارسی غزل میں داخل ہوئی ہیں، وہی غزل کا مزاج بن گئی ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔لیکن یہ چیز یاد ررکھنے کے قابل ہے، کہ یہ جنس خاص ایران کی پیداوار ہے ویسے قصیدے کی صورت میں اس کا وجودعرب میں بھی مل جاتا ہے،لیکن مستقل شکل غزل کوایران نے ہی عطا کی عرب میں بعض اوقات قصیدے کی تشبیب میں غزل کے مضامین بیان کئے جاتے تھے۔ایران میں بھی عربوں کے زیر اثر ایک عرصے تک قصیدے کا رواج رہا۔فارسی غزل کا باقاعدہ رواج سامانی دور سے ہوتا ہے۔اس دور کی شاعری کوخراسانی دبستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔خراسانی دبستان کی غزل گوئی کی خصوصیت جذبات سادہ کا اظہار ہے۔اس وقت غزل چونکہ جذباتی موضوعات تک محدودتھی،اس لئے اس کی زبان بھی جذباتی ہے۔یہیں سے فارسی غزل کی بنیاد پڑتی ہے،اوراس وقت سے یہ روایت قائم ہو گئی کہ غزل کے لئے موضوع خواہ کسی قسم کا منتخب کیا جائے لیکن اس کی زبان اور فضاءعشقیہ اور جذباتی ہی ہونی چاہیئے۔

غزل کی ترقی کا زمانہ تصوف کا زمانہ ہے۔تصوف کی ابتداءاگرچہ تیسری صدی کے آغاز سے ہوتی ہے۔لیکن پانچویں صدی میں اسے عروج حاصل ہوااور یہی غزل کی ترقی کا پہلا دور ہے۔ دبستان عراق کےغزل گوشعراء میں پہلا نام حکیم سنائی کا اورآخری نام مولانا رومؒ کا ہے۔حکیم سنائی نے غزل کوخوب ترقی دی تخلص کا رواج بھی غزل کےمقطع میں سب سے پہلے ان کے ہاں ہی پایا جاتا ہے۔وارداتِ حقیقت کومجاز کی زبان سے ادا کرنا حکیم سنائی سے ہی شروع ہوتا ہے۔عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔اورحدی مراغی نے غزل کو جذبات سے لبریز کردیااوراس کےساتھ زبان کی روانی،سلاست،صفائی اورنزاکت بھی پیدا کی۔ اس دورکا شاندار کارنامہ مولانا رومؒ کا ہےاُن کےکلام میں والہانہ مستی پائی جاتی ہے۔یہ لوگ باعمل صوفی تھے جو وارداتِ قلبی پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے،لیکن اس دور کی غزل محض مجازی عشق کے

اظہار کا وسیلہ ہی نہ رہی اب گل وبلبل کے پیمانے میں مسائل تصوف بھی بیان ہونے لگے تھے۔ یہیں سے غزل میں علامتوں کا استعمال شروع ہوتا ہے۔منگولوں کے بعد جو دور آتا ہے، اسے شیرازی دبستان کہا جاتا ہے۔اس زمانہ میں ایران میں سیاسی ابتری پھیل گئی اور یہ خیال عام ہوگیا کہ زندگی بسر کرنے کی چیز نہیں ہے۔حالات کے زیر اثر غزل میں بھی ایک المیہ فضا پیدا ہوگئی یہی وجہ ہے کہ اس دور کی غزل میں سوز وگداز کا عنصر نمایاں ہے۔اس مرحلہ پر تصوف کو اور زیادہ ترقی ہوئی ۔غزل کی عشقیہ زبان جو ابتداء میں ہی بن چکی تھی اسے قائم رکھتے ہوئے تصوف کو زیادہ وسعت دی گئی۔اس وقت شعروشاعری سے دلچسپی لینے والا دوقسم کا طبقہ تھا ایک وہ جو عیش وعشرت کا دلدادہ تھا اور دوسرا وہ جو تصوف کا حامی تھا۔اس لئے ایسی شاعری نے جنم لیا جس میں دونوں قسم کے جذبات کی ترجمانی تھی کہ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق لطف اُٹھا سکے اس لئے بعض اصطلاحات سے کام لیا گیا ان اصطلاحات نے غزل میں جان ڈال دی سعدی اور حافظ اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں۔حافظؔ نے غزل کو بہت ترقی دی انہوں نے غزل میں اخلاق ،فلسفہ، پندوموعظت، سیاست غرض ہر قسم کے مضامین بیان کی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی غزل کی خاص زبان اور اس کے جو شیرینی، رعنائی اور رنگینی درکار ہے، اسے قائم رکھا، ہر قسم کے دقیق خیالات ان کی غزل میں آکر رنگین بن جاتے ہیں بقول عرفی ؎

درد دل ما غم دنیا ، غم معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہء ما

فارسی غزل کے ان ادوار کو سامنے رکھ کر غزل کے اجزاء کا اندازہ ہوسکتا ہے۔1۔غزل کا بنیادی موضوع، عشق وعاشقی کے جذبات ہیں۔2۔ایک داخلی صنف سخن ہے، اس میں واردات قلبی کا بیان ضروری ہے۔3۔اس کی زبان سادہ اور صاف، نرم وشیریں اور شگفتہ ہونی چاہیئے۔4۔سوز وگداز غزل کے بنیادی عناصر میں سے ہے۔5۔دوسرے موضوعات بھی غزل کی زبان میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔6۔علامات اور اصطلاحات کا استعمال غزل کی زبان کا لازمی جزو ہے۔فارسی کے زیر اثر غزل اردو میں داخل ہوئی ہے اور اس کے ساتھ فارسی غزل کی یہ روایات اردو غزل میں رواج

پذیر ہوتی ہیں غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔اسی لئے رشید صدیقی نے اسے اردو کی آبرو کہا ہے۔ان کے خیال میں غزل ہماری تہذیب اور تہذیب ہماری غزل میں ڈھلی ہے اگر امیر خسرو سے شروع کی جائے تو غزل کی روایت چھ سو سال پرانی ہے اور ہر دور کی تہذیب کی جھلکیاں ہماری غزل میں نظر آتی ہیں۔اردو شاعری کے متعلق جوشؔ صاحب کا یہ کہنا ہے کہ ؎

رنگ و بو آب و نمک نور و ضیا کچھ بھی نہیں
چند نرم و گرم غزلوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مخفی تعصب کی بنا پر ہے۔ہندوستان میں غزل نے وہ مرتبہ حاصل کیا جو کم ہی کسی اور صنف کو حاصل ہوا ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہندوستان کا ماحول غزل کے لئے بہت سازگار رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:۔

غزل ہمارے مخصوص ماحول کی پیداوار ہے اور ہمارا مخصوص ماحول غزل کی پیداوار۔



## جنت دوزخ کی زبانیں

ایک بوڑھا روسی پارک میں بیٹھا عربی زبان کی ابتدائی کتاب پڑھ رہا تھا۔''کے جی بی''(خفیہ ایجنسی) کے ایک ایجنٹ کی نظر اس پر پڑی تو وہ ٹھٹھک کر رہ گیا اور بوڑھے سے پوچھا کہ یہ کون سی زبان پڑھ رہے ہو؟ بوڑھا بولا کہ میں نے سنا ہے کہ جنت میں عبرانی زبان بولی جاتی ہے ۔ ایجنٹ( مسکراتے ہوئے )مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم جنت میں نہ جاؤ۔بوڑھے نے برجستہ جواب دیا تو کیا فرق پڑے گا۔ مجھے روسی زبان بھی آتی ہے۔

# تشبیہ وتمثیل

بیان میں جوسحر پیدا ہوتا ہے اچھا شعروسخن رُوح وقلب کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔اگر اس کا تجزیہ کیا جائے کہ یہ تاثیر شعر میں کہاں سے پیدا ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اثر بہت حد تک تشبیہ کا کارنامہ ہے۔علامہ اقبال اگر اپنے کلام میں تشبیہ وتمثیل سے کام نہ لیتے تو حکمت پُرسوز ودلروز شعر کا فرق کبھی تسلی بخش طریقے سے واضح نہیں ہوسکتا تھا۔علاوہ ازیں جذبات کی زبان تشبیہی ہوتی ہے۔شاعری زیادہ تر جذبات کے اظہار کا نام ہے۔اس لئے مؤثر شعر وہی ہوتا ہے جس میں کوئی دلنشیں تشبیہ استعمال کی گئی ہو۔''جب دل کسی جذبے سے لبریز ہوتا ہے تو پیمانہ کسی تشبیہ ہی میں چھلکتا ہے۔کمالِ لذت کا اظہار بھی خود بخود تشبیہ کے ذریعے سے ہوتا ہے۔درد واَلم بھی تشبیہی اور شاعرانہ زبان واضح کر لیتا ہے۔'''' عارفِ رومیؒ تشبیہ وتمثیل کے بادشاہ تھے۔بات زیادہ دلنشیں اور یقین آفرین اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی تشبیہ یا مثال کے ذریعے سے مطلب کو واضح کرے۔

مثنوی حکمت وعرفان کا بحرِ ذخار ہے۔شاعری کو آپ نے بحیثیت فن نہیں برتا۔جو بات طبیعت میں جس طرح اُبھرتی اسی طرح سپردِ قلم کر دیتے۔فطرت نے آپ کو یہ غیر معمولی ملکہ عطا فرمایا کہ ہر باریک نقطے کی وضاحت کے لئے ان کو دلنشین تشبیہ سُوجھتی جو یقین آفرین بھی ہوتی اور وجد آفرین بھی میں کیا ہوں اور مقصدِ حیات کیا ہے؟ یہ زندگی کدھر سے آتی ہے کدھر کو جاتی ہے؟ خالق اور مخلوق کا تعلق کس قسم کا ہے؟ ان سوالات کا جواب تمثیل کے انتہائی پُرکشش اور دل میں اُتر جانے والے اسلوب میں اخلاق وحکمت ،تصوف اور روحانیت اور انسان وکائنات کے لاتعداد مسائل ذہنوں میں آسانی سے اُتار دینا مثنوی کا کھلا معجزہ ہے۔



# محاورے اور ضرب الامثال

زبان اُردو کے بے بدل شاعر داغؔ نے کسی زمانے میں یوں سخن آرائی کی تھی کہ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

حسن وخوبی میں یکتا، شیرینی و دل نشینی میں بے مثال، سلاست، نرمی و روانی میں اپنا ثانی نہ رکھنے والی زبانِ اُردو اپنے جلو میں زبان و بیان کے تمام لوازمات رکھتی ہے۔ جودتِ الفاظ، خوش بیانی، خوش بیانی، اور جملہ لوازم سے اردو آراستہ و پیراستہ ہے۔ گویا دامنِ اردو طرح طرح کے پھولوں سے مہک رہا ہے۔ محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں مرکزی نقطہ فکر و عمل، یعنی محاورہ کسی زبان کا ہو وہ مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ جو باوجود مختصر ہونے کے اپنے ارد گرد پھیلی بہت سارے حقائق کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ کہاوتیں یا ضرب الامثال انسان کے صدیوں کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ جن میں کسی بات یا سچائی کو مختصراً بیان کر دیا جاتا ہے۔ جو بعض دفعہ اپنی توجیہہ میں کوئی لمبا چوڑا واقعہ بھی رکھتی ہے۔

جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص دریا میں ڈوب رہا تھا ڈوبتے ہوئے وہ چیخنے چلانے لگا کہ ''مجھے نکالو نہیں تو جگ ڈوبا'' لوگوں اس کی جان بچائی اور پوچھا کہ یہ تو بتاؤ تمہارے ڈوبنے سے جگ کیسے ڈوب رہا تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ ''جہان ہے تو جہان ہے'' یہ بات دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی ضرب المثل کے طور پر بیان ہوتی ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں ''من زندہ جہان زندہ'' اسی طرح انگریزی اور دیگر زبانوں میں اسی بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے میر تقی میر نے اس بات کو یوں شعر میں ڈھالا ہے:

میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

**مرغ کی ایک ہی ٹانگ**

یعنی ایک ہی بات کی رٹ لگائے رکھنا۔ کہتے ہیں ایک خانساماں نے مرغ پکا کے مالک کے

سامنے رکھا تو مالک نے پوچھا ''اس کی دوسری ٹانگ کہاں ہے''؟ خانساماں نے کہا جناب اس مرغ کی نسل ہی ایسی تھی جس کی ایک ٹانگ ہوتی ہے۔ مالک اس وقت چپ ہوگیا۔ جب کھاپی کر ٹہلنے لگا تو دیکھا سامنے ایک مرغ ٹانگ سکیڑے کھڑا ہے۔ خانساماں نے فوراً کہا یہ مرغ بھی اسی نسل کا ہے۔ مالک نے ہش کہا تو مرغ نے دوسری ٹانگ بھی نیچے زمین پر لگالی، خانساماں نے کہا کیا خوب! آنجناب اگر اس وقت بھی ایسا ہی کرتے تو وہ مرغ بھی دوسری ٹانگ نکال دیتا۔ اس واقعہ کے بعد یہ ضرب المثل وجود میں آئی کہ ''مرغ کی ایک ٹانگ'' یعنی بے جا بات پر اڑے رہنا۔ ایک ہی بات کی رَٹ لگائے رکھنا۔

**میں کمبل کو چھوڑوں کمبل مجھے نہ چھوڑے**

یہ محاورہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ اس محاورے کو اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑ جائے۔ آپ کا وقت ضائع کرے اور آپ کے پیچھے پڑ جائے۔ اس محاورے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ دو دوست دریا کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ ان کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ تھا۔ اچانک ایک شخص کو دریا میں کمبل بہتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنے دوست سے کہا وہ دیکھو کمبل، میں اسے میں نکال لاتا ہوں، اسپر اس نے چھلانگ لگا دی۔ جب وہ کمبل پکڑنے میں کامیاب ہوگیا تو دیکھا کہ وہ ریچھ ہے اور ریچھ نے اسے پکڑ لیا۔ دریا کنارے کھڑے دوست نے کہا تم کمبل کو چھوڑو اور باہر آجاؤ اس دوست نے جواب دیا۔ ''میں کمبل کو چھوڑوں کمبل مجھے نہ چھوڑے۔''

**ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور**

روئے زمین پر آباد جانوروں میں ہاتھی ایک بہت بڑا اور عظیم الجثہ جانور ہے۔ جسامت کے لحاظ سے بھاری بھرکم، طاقت کے لحاظ سے بھرپور اور پھر بڑے بڑے سفید دانت۔ یہ دانت ہاتھی کی خوبصورتی بڑھانے کے علاوہ اور کسی کام نہیں آتے۔ البتہ اس کے اندر والے دانت غذا چبانے کے کام آتے ہیں۔ یعنی منہ کے اندر والے دانت کھانے اور باہر والے دانت دکھانے کے۔ جب کوئی شخص اندر سے کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کرے تو ایسی صورت میں یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔

# اُردوزبان میں روزمرّہ اغلاط اوراُنکی تصحیح

اُردوزبان کے الفاظ حروف اور جملوں کی لکھائی، پڑھائی، ادائی، اور گویائی میں ہم کئی غلطیاں کرجاتے ہیں۔ یہ غلطیاں ہجوں، تلفظ سے متعلق ہیں۔ ہجہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی حرف کا اعراب سے ظاہر کرنا ہیں۔ اعراب کی تفصیل یہ ہے۔

(1) زبر(َ) یا فتحہ (ب) زیر(ِ) یا کسرہ (ج) پیش یا ضمہ(ُ)۔ وہ حرف جس پر کوئی اعراب نہ ہو وہ حرف ساکن ہوتا ہے۔ ہجے اور اَملا میں اغلاط۔ اُردو میں بعض الفاظ ہم آواز ہیں ان کی درست پہچان نہ کرنے پر املا میں غلطی ہوجاتی ہے۔

**حروف متشابہ یہ ہیں**

ا۔ع ☆ ح۔ہ ☆ ت۔ط ☆ ث،س،ص ☆ ذ،ز،ض،ظ ☆ ق،ک ☆ ژ،ی ☆

ایسے الفاظ جو ان حروف کی وجہ سے صوتی مشابہت رکھتے ہوں ان کے معنی کے فرق اور محل وقوع کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے اس قسم کے چند الفاظ یہ ہیں۔ آلم، علَم، آثر، عَصر، طارق، تارك، ثواب، صواب، اَصل، عَسل، اَبد، عَبد، هَمزہ، حَمزہ، قَمر، کَمر، بَرس، برص، کَسرت، کَثرت وغیرہ۔ طرزِ کتابت میں اغلاط۔

بعض الفاظ میں طرزِ کتابت۔ الف۔ مثلاً دُھن، گھوڑا، اور کولھو کو (دُہن، کولہو، گہوڑا لکھنا غلط ہے۔ جن الفاظ میں ہائے ہوز''ہ'' ہو اسے چشمی نہ لکھا جائے۔ جیسے ہم، قہر، نہر، کوھم، قھر، نھر لکھنا غلط ہے۔ ب۔ سین، شین، کو دندانوں سے لکھنا بہتر ہے۔ جیسے کُرسی، رُستم، سکنہ وغیرہ البتہ جہاں سین شین اکٹھے ہوں وہاں ایک کوکش سے لکھا جاتا ہے۔ جیسے سُست اور کوشش وغیرہ۔ ج۔ سین شین کے صرف تین دندانے ہوتے ہیں۔ د۔ ہمزہ''ء'' کی تحریر کے لئے دندانہ ضروری ہے مثلاً کئی، مطمئن، دیئے وغیرہ۔

3۔ املا میں تیسری غلطی الفاظ کی ترکیبی صورت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے (ا) اسم اشارہ اور اسم ضمیر کے بعد'' ہی'' آئے تو ملا کر لکھنا چاہیئے۔ مثلاً "یہ+ہی = یہی، تم+ہی=تمہی،

اس+ ہی = اسی ،اُن+ ہی = انہی وغیرہ۔ مرکب الفاظ کولکھنا درست نہیں۔مثلاً بیوقوف کو بے وقوف لکھیں فیصد کو فی صد، سوالنمبر کو سوال نمبر، ہموطن کو ہم وطن سوالنامہ کو سوال نامہ لکھیں۔

**تلفُّظ کی اغلاط**

تلفُّظ کی اغلاط عموماً اعراب لگانے سے ہوتی ہیں۔یہ عیب کسی مستند بااعراب لغت سے درست کیا جا سکتا ہے۔

مذکر مُونث کی اغلاط۔عام گفتگو میں ہم لب ولہجہ کے اُتار چڑھاؤ کے علاوہ تذکیر و تانیث کا خیال بھی نہیں رکھتے۔

مجھے اُردو نہیں آتا۔ مجھے اُردو نہیں آتی۔

آج اخبار شائع نہیں ہوئی۔آج اخبار شائع نہیں ہوا۔

وہ عورت بہت لڑاکی ہے۔وہ عورت بہت لڑاکا ہے۔

مجھے قبض رہتی ہے۔ مجھے قبض رہتا ہے۔

ثمین یہ خبر سُن کر ہکی بکی رہ گئی۔ثمین یہ خبر سُن کر ہکا بکا رہ گئی۔

روزمّرہ زندگی میں گفتگو کے دوران ہم ایک ہی مفہوم اور معنی کے دو الفاظ ایک جملے میں استعمال کر دیتے ہیں۔یعنی ایک جملے میں ہم معنی الفاظ کا دہرا استعمال کر کے اس کو غلط کر لیتے ہیں۔مثلاً یہ ماہِ رمضان کا مہینہ ہے۔یہ ماہِ رمضان ہے

آج شب برات کی رات ہے۔آج شب برات ہے

اُردو روزمرّہ اوراس کی کچھ غلطیوں کی تصحیح۔روزمرّہ کیا ہے؟ مولانا شبلیؒ اس کی تعریف یوں کی ہے۔''جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل ہوتی ہیں۔ان کو روزمرّہ کہتے ہیں۔آسان الفاظ میں یہ کہہ لیجیئے کہ یہ اہل زبان کی بول چال کا نام ہے۔یہ اہل زبان کون ہیں؟ اسے بھی آسانی کی خاطر یوں کہہ لیتے ہیں کہ دلّی اور لکھنؤ کے رہنے والے لوگ جن کی مادری زبان اُردو ہے۔اور وہ پشتوں سے وہاں رہ رہے ہیں اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔یہ لوگ جو زبان یا الفاظ وتراکیب اپنی بول چال میں استعمال کریں۔انہیں روزمرہ کہا جائے گا۔بعض اوقات

یوں بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی لفظ فقرہ یا ترکیب اردو قواعد کے لحاظ سے تو بالکل درست ہو لیکن چونکہ اہل زبان اسے روزمرہ میں استعمال نہیں کرتے۔اس لئے وہ لفظ، فقرہ یا ترکیب غلط تصور ہوگی۔

میر تقی میرؔ نے بجا فرمایا:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا۔مستند ہے میرا فرمایا ہوا مثلاً ایک فقرہ ہے۔ہر چیز کی قیمت میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں ''آئے دن'' روزمرہ ہے۔اگر ہم آئے روز یا آئے یوم کہیں تو گرائمر کے لحاظ سے درست ہوگا مگر وہ روزمرہ نہیں ہوگا۔اور غلط ہوگا۔اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ روزمرہ کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار قواعد یا گرائمر نہیں بلکہ اہل زبان کی عام بول چال سند ہے۔اہل زبان گرائمر کے لحاظ سے غلط بھی بولیں تو وہ غلط العام ہوگا اور درست ہوگا۔

غلط العام کیا ہے اور غلط العوام کیا ہے؟ ان کی تعریف ''فرہنگِ آصفیہ'' میں سید احمد دہلوی نے یوں کی ہے۔''غلط العام وہ عام غلطی ہے جسے سب لوگ استعمال کریں مگر اصطلاح میں وہ بات جس کو بالاتفاق تمام زبان دانوں نے باعثِ فصاحت اپنے محاورے میں استعمال کر کے شعروسخن میں برتا ہو چنانچہ اس سبب سے غلط العام فصیح کو سب علماء وفصحا نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔مثلاً منصَب بجائے منصِب، کبھو بجائے کبھی، قالب کا قافیہ غالب کے ساتھ، یوُنس کی بجائے یوُنِس قافیہ مونس کے ساتھ کافَر بجائے کافِر کے اساتذہ کے کلام میں موجود ہے۔مثلاً میرؔ کا مصرعہ ؎

کبھو کبھو موزوں کروں ہوں میں

یا غالبؔ فرماتے ہیں:

دیکھیو غالبؔ سے گر اُلجھا جائے
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

اس میں قافیہ خاور، افسر وغیرہ ہے۔

غلط العوام۔وہ غلطی جو عوام کالانعام، یعنی جہلا اور بازاری اشخاص اپنی جہالت، بے علمی، اور ناواقفیت کے سبب کرتے ہیں اور ان کی یہ بات قابل سند نہیں خیال کی جاتی جیسے پھتر بجائے پتھر، سفیل بجائے فصیل، تابعدار بجائے تابع، تقرری بجائے تقرر وغیرہ۔

روزمرّہ اور محاورہ میں میں فرق۔

1۔روزمرّہ ایک لفظ پر مشتمل ہوسکتا ہے مثلاً قفل لیکن محاورہ دو یا دو سے زائد الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً آنسو پینا، فریب کھانا وغیرہ۔

2۔روزمرّہ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔مثلاً روٹی کے معنی اصل ہی ہیں لیکن آنسو پینا میں ضبط کرنا مجازی معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔یعنی محاورہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

3۔محاورہ قواعد کی حدود میں آتا ہے لیکن روزمرّہ قواعد نہیں اہل زبان کی بول چال پر مبنی ہوتا ہے۔

4۔ ہر محاورہ روزمرّہ ہوتا ہے ہر روزمرّہ محاورہ نہیں ہوتا۔

5۔محاورہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی لیکن روزمرّہ میں اہل زبان تبدیلی کر سکتے ہیں۔مثلاً محاورہ ہے دال میں کالا ہونا۔ہم اسے دال میں نیلا ہونا نہیں کہہ سکتے۔لیکن کبھو کو کبھی اور دیوے کو دے کر سکتے ہیں۔

6۔روزمرّہ عام طور پر اور محاورہ خاص مفاہیم کو خوبصورت جامہ پہنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی محاورے میں خصوصیت اور روزمرّہ میں عمومیت پائی جاتی ہے۔الغرض کوئی بھی زبان ہو بولنے، پڑھنے، لکھنے سے فروغ پاتی ہے پھر بھی۔

نہیں کھیل اے داغؔ! یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے



## ایک بات یاد رکھو!

اللہ اور ڈاکٹر کو کبھی ناراض مت کرو۔کیونکہ اللہ جب ناراض ہوتا ہے تو وہ آپ کو ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتا ہے اور جب ڈاکٹر ناراض ہوتا ہے تو وہ آپ کو اللہ کے پاس بھیج دیتا ہے۔

# اِبلاغ کے مختلف انداز اور ذرائع

اِبلاغ کے مختلف ذرائع ہیں:

**1۔زبان:**

ابلاغ کے لئے سب سے پہلے جو ممکنہ ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے۔وہ زبان ہے۔زبان کے ذریعہ سے حیوان اور انسان دونوں ابلاغ کرتے ہیں لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ جب ہم بات کرتے ہیں تو وہ زبان کے ذریعے چند مخصوص آوازیں نکال سکتے ہیں۔جبکہ اس کے مقابل انسان نہ صرف یہ کہ غیر محدود نئ آوازیں بنا سکتے ہیں بلکہ منظم زبانوں کے ذریعہ بات چیت کرتے ہیں۔

**2۔اشارات،علامات:**

اگر صرف زبان پر اکتفا کیا جائے تو گونگے، بہرے لوگ ابلاغ کرنے سے قاصر ہوجائیں گے۔اس کے علاوہ بعض باتیں جو عام لوگوں کو بتانے کی نہیں ہوتیں ان کو بھی مخصوص اشاروں سے کہا جاتا ہے۔اس طرح ابلاغ کا دوسرا ذریعہ اشارات وعلامات ہے۔

**3۔چہرے کے تاثرات:**

انسان کا چہرہ اس کے اندر کی شکست وریخت کا عکاس ہوتا ہے۔انسان اپنے چہرے سے بھی ابلاغ کرتا ہے۔یعنی چہرے پر وہ مختلف اوقات میں جو تاثرات لاتا ہے وہ بھی ابلاغ کا حصہ ہیں۔

**4۔تحریر کے ذریعے:**

تحریر ایک موثر ذریعہ ابلاغ ہے زبان،اشارات، یا تاثرات ابلاغ کا ذریعہ ہیں جو وقتی نوعیت کی حیثیت رکھنے والی چیز ہے۔اسی لیے تحریر میں غلطی کی گنجائش نہیں۔

**5۔اِبلاغ کی اہمیت وذرائع:**

اِبلاغ عربی لفظ ''بَلَغَ'' سے مشتق ہے۔اس کا مطلب پھیلانا، پہنچانا،اور بھیجنا ہے۔عربی

زبان کا لفظ تبلیغ اور ابلاغ ہم معنی ہیں۔اِبلاغ چونکہ ایک معاشرتی عمل ہے۔لہٰذا اس کی اہمیت بھی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی ہے۔ماہرینِ فن ابلاغ نے اس کی تعریفیں کچھ یوں کی ہیں:

1۔ایسا عمل جس کے ذریعے احساسات یا خیالات کسی ایک شخص سے دوسرے شخص تک منتقل کئے جاتے ہیں''اِبلاغ'' کہلاتا ہے۔

2۔ایسا عمل جس کے ذریعے افراد کے درمیان اطلاعات ومعلومات کا تبادلہ علامتوں، اشارات یا مشترکہ روّیوں کے سبب ہو اِبلاغ کہلاتا ہے۔

### 6۔اِبلاغ کی اہمیت:

انسان کی زندگی میں ایک بہت اہم چیز اِبلاغ ہے۔اِبلاغ کی مدد سے انسان کی وحشت اور تہذیب کے درمیان فاصلہ کم ہوا اِبلاغ کی اہمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں کیونکہ آج جو زندگی ہم آسائش اور آرام سے گزار رہے ہیں یہ سب اِبلاغ ہی کی بدولت ہے۔

### 7۔شاعر کا مقام:

اگر تاریخ عالم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کائنات روزِ اول سے ہی حق و باطل کی دلچسپ اور نہ ختم ہونے والی معرکہ آرائی کی مظہر ہے۔ہر دور میں ہمیں حق و باطل اور بقول زرتشت ظلمت ونور کی رزم آرائی سے واسطہ پڑا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انسان یہاں موجود ہے اسے کسی نہ کسی شکل میں خیر وشر کی اس باہمی آویزش میں شریک ہونا پڑے گا۔غالب ومغلوب، حاکم و محکوم، اور ظالم ومظلوم کی اس باہمی چپقلش سے عہد حاضر بھی خالی نہیں۔اگرچہ ظلم وتشدد اور استحصال کے طریقے مختلف رُوپ دھار چکے ہیں۔تاہم انسانیت کی تذلیل اور انسان کُشی کا یہ سلسلہ اب بھی کسی نہ کسی رنگ میں جاری وساری ہے۔ظلم و بدی کا مقابلہ کرنے والے مختلف محاذوں پر اب بھی اپنے انقلابی اور مدافعت آمیز پروگرام پر عمل پیرا ہیں ایسے ہی بہادر، بے باک اور عہد آفریں لوگ ناسازگار حالات اور حوصلہ شکن موانعات کا ڈٹ کر مقابلہ کرکے جریدہ عالم پر اپنا نقش ثبت کیا

کرتے ہیں۔ ہر دور میں ایسی سعید روحیں حق وصداقت کی راہ پر چل کر دوسرے انسانوں کو منزل نجات سے روشناس کرتی رہی ہیں۔ دیگر مصلحین کی مانند انسان دوست اور انقلابی شعراء، ادباء بھی معاشرتی زندگی کو نکھارنے کے لئے قابلِ قدر اضافہ کرتے رہے ہیں۔

شعر و ادب محض زندگی کا ترجمان ہی نہیں بلکہ وہ اس کا ناقد بھی ہے اس لحاظ سے شعراء اور ادباء اور انسانی ذمہ داریوں کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر ایسے جذبوں کو الفاظ کی سنہری جھالریں لگا کر ایک مرصع اور دلنشین پیرایہ تو عطا کر ہی دیتا ہے جو اس کے جذبات میں مخالف جنس کی جانب سے کسی ہلچل یا بیداری کا سبب بنتے ہیں۔ محبوب کے ہجر و وصال سے لبریز مضامین اردو شاعری کا صدفی صد حصہ بنے اور بنتے چلے آرہے ہیں یہ ایک محدود اور مختصر کینوس ہے جو شاعری کے جراثیم نمودار ہوتے ہی شاعر کے ہاں سے نمو پذیر ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس مخصوص سطح کی محض اپنی ذات سے منسوب شاعری سے ممتاز ہو کر افقی بلندی کے لئے ''میں'' کے حصار میں سے باہر نکل آنا ہنر مندی یا وجدان سے بڑھ کر ظرف کی عظمت کی دلیل ہے۔ انسانیت کے درد کو محسوس کرنے کے لئے اپنی ذاتی خوشی یا اندوہ کو الگ ہٹا کر رکھنا پڑتا ہے جذبات کا یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کے ہر قطرے میں شاعر کو دجلہ دکھائی دیتا ہے یہ اکائی میں کُل اور کُل میں اکائی ہو جانے والی کیفیت ہے۔

**8۔ شاعر کا کام:**

خیالات کو صداقت پر مبنی لفظ اسی صورت میں بنایا جا سکتا ہے۔ جبکہ وہ وارداتِ قلبی کی شکل اختیار کر جائیں۔ تاثیر محض اس جذبے کے اظہار میں پیدا ہو سکتی ہے جو دلی جذبات کا عکس لے کر آئینہ الفاظ پر ظاہر ہو۔ صرف الفاظ کو موزوں کر لینے سے شاعری جنم نہیں لے سکتی۔ شاعری تو ان تمام ارفع، پُر فضیلت، اچھوتے اور دل کو چھو لینے والے عام انداز و سطح سے بلند مقام کا نام ہے جو شاعر اپنی حساس اور دانا بصیرت سے ماحول و اطراف کی جنبشوں میں محسوس کرتا اور اپنی طبیعت کی مناسبت سے انہیں شعر کا پیراہن عطا کر دیتا ہے۔ محدود معانی کو لامحدود رنگ و رُوپ بخشنے اور ایک

بالکل نئی معنوی دنیا آباد کرنے کو ہی عمدہ شاعری کہا جاتا ہے۔ ایسے شاعر کے ہاں اسلوب کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ لفظ کو اس خام مال کی طرح استعمال کرسکتا ہے کہ جسے بھٹی میں تیار کرکے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ الفاظ وتراکیب ومعانی اس کے ہاں ظروف سازی کی حیثیت حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ صناعی اس کی مخفی کیفیات کو بیش بہا جہتیں اور پہلو فراہم کرتی چلی جاتی ہے وہ کس لفظ کا استعمال کس نوع اور کس ساخت سے کرے یہ اس کے کرشمہ ساز تصوراتی عرفان کا اختیار ہے اس کی با کمال صلاحیت اس لفظ کو لغت کے دائرے سے نکال کر نیا آہنگ، نیا مرتبہ، نیا مقام عطا کر جاتی ہے۔ دشتِ وقت میں ایک عمر سے صحرا نوردی کرنے والے مسافر کو موسموں کی تبدیلی کا بے حد انتظار بھی رہتا ہے اور اس امید پر روز وشب بھی بسر ہو جاتے ہیں لیکن وہ کانٹا جو اندیشوں اور واہموں کی چُبھن احساس میں پیہم بیدار رکھے ہوئے ہے اس کی تشویش اس لحاظ سے بھی سوا ہے کہ بیتے دنوں میں رُتوں کی تبدیل کسی طور بھی تغیر پذیری کا نیا رنگ پیش کرنے سے قاصر رہی ہے اس بنا پر اُمید پروری بھی خار بکف رہتی ہے۔



## پیسہ کمانے کی دُھن انسان کو اکیلا کر دیتی ہے

محققین کا خیال ہے کہ پیسہ کمانے کی دُھن انسان کو اکیلا کر دیتی ہے۔ ہر وقت دولت کے خیال میں رہنے والا شخص لوگوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کا سماجی میل جول بھی کم ہو جاتا ہے۔ اور ایسے لوگ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ محققین کا کہنا ہے کہ پیسہ انسان کی ضرورت ہے تاہم یہ انسان کی نفسیات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور پیسہ کمانے اور بچانے والے لوگ ہر شے کو اور ہر رشتے کو اسی کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ زیادہ میل جول نہیں رکھ پاتے۔ اور ان کے سماجی تعلقات بھی محدود ہوتے ہیں۔

# لغت کے معنی اور چند مشہور لغات

## لغت کے معنی

**1۔ بولی۔ زبان۔ 2۔ فرہنگ۔ ڈکشنری**

حروف تہجی کے ترتیب کے مطابق مرتبہ مجموعہ الفاظ جس میں ہر لفظ کے مقابل اس کے معنی اسی زبان یا کسی دوسری زبان میں درج ہوں۔ لغت کی جمع لغات، لغتوں، لغتیں۔ (فیروز الغات اُردو 12118) جیسا کہ لغت کی تعریف سے ظاہر ہے لغت ایسی کتاب کو کہتے ہیں۔ جس میں ترتیب تہجی کے مطابق مجموعہ الفاظ ہو اور اس کے ساتھ اس کے معنی بھی ہوں۔ اور جس کتاب میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہوں اس کتاب کو ہم اردو میں لغت، فارسی میں فرہنگ، عربی میں قاموس، سنسکرت میں کوش اور انگریزی میں ڈکشنری کہتے ہیں۔

## دنیا کی پہلی لغت

دنیا کی پہلی لغت یونانی زبان میں تھی۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سرزمین یونان کے دانشور ایتھینس نے ایسے 35 یونانیوں کے نام لئے ہیں۔ جنھوں نے یونانی زبان کی لغات لکھیں مگر اب وہ ناپید ہیں۔ ان لغات کے نہ ہونے کے سبب لغت نویس زینودوئس کی تالیف شدہ لغت گلوسا کو نیا کی پہلی لغت تسلیم کیا گیا ہے اس کے مصنف کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ دوسری صدی عیسوی کے زمانہ میں بطلیموس کے دورِ حکومت میں اسکندریہ کے کتب خانے کا مہتمم تھا۔

## اُردو کی پہلی لغت

اُردو کی پہلی لغت بحر الفضائل فی منافع الافاضل کو قرار دیا جاتا ہے۔ اسے 795ھ میں محمد بن قاسم محمد بن قوام کرخی نے تالیف کیا تھا۔ اس میں اردو زبان کے معانی فارسی زبان میں دیئے گئے ہیں۔ بعد ازاں متعدد لغات شائع ہوئیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔ اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں مرزا محمد بن فخر الدین نے تحفۃ الہند لکھی اس میں اردو زبان کے معانی فارسی زبان میں دیئے گئے ہیں غرائب اللغات مولفہ عبدالواسع ہانسوی اس میں اردو زبان کے معانی فارسی زبان میں

دیئے گئے ہیں۔نوادراللغات۔1756ءمولوی سراج الدین علی خان آرزوفرگوسن کی ہندوستانی لغت 1808ءجوزف ٹیلراورولیم ہنٹر ...ہندوستانی انگریزی لغت۔1876ءمولفہ ڈاکٹر فیلسن اردوکلاسیکی ہندی اورانگریزی ڈکشنری۔1885ءمولفہ جان ٹی بلیٹس ایم اے امیر الغات۔92۔1891ءمولفہ امیر مینائی۔

فیروزاللغات۔اردوجامع 1897ءمولفہ مولوی فیروزدین

فرہنگ آصفیہ 1908ءمولفہ سید احمد دہلوی۔

نوراللغات 1922ءمولوی نورالحسن نیر کاکوری۔

جامع اللغات 1933ءمولفہ عبدالمجید بی اے۔



حضرت بی بی آمنہؓ فرماتی ہیں:

جب آپ ﷺ میرے پیٹ میں آئے تو ایک بادل کا ٹکڑا آسمان پر وارد ہوا میں جہاں جاتی وہ بادل میرے اوپر چھاؤں کرتا، میں جب بکریاں چرانے جاتی تو بکریاں میرے پیچھے چلتی جب چلتی تو پتھر میرے پاؤں کے نیچے نرم روئی کی طرح ہوجاتے اور جب کنویں سے پانی نکالنے جاتی تب پانی اوپر چڑھ آتا اور آسانی سے پانی بھرتی، جب سوتی تو خوبصورت حوریں مجھے پنکھے سے ہوادیتی،اورروزانہ ایک نبی مجھے خواب میں مبارک باددیتے تھے کہ آپ کو مبارک ہو کہ آپ آخری نبی ﷺ کی والدہ ہیں۔

# تعلیم

ہر وہ نظامِ زندگی جو اس دنیا کا نظام اپنے مخصوص طرز پر چلانا چاہتا ہو اور اپنے طریقے پر زندگی کے مسائل حل کرنا چاہتا ہو وہ اس مقصد کے لئے افراد کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے اور اپنے اصولوں کے مطابق انسان سازی کا کام سب سے اہم ذریعہ اور طریقہ تعلیم و تربیت ہے۔ نظامِ تعلیم نظامِ زندگی کا جزو لاینفک ہے اور کسی نظام حیات کی کامیابی کا تمام تر انحصار زندگی کے مجموعی فلسفے سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کو تقویت بھی پہنچاتا ہے۔ اگر نظامِ تعلیم آزاد ہو یا فلسفہ حیات سے متصادم ہو تو وہ کامیاب بھی نہیں ہوگا۔ اور زندگی کی خدمت سے بھی معذور رہے گا۔ تعلیم کی حیثیت نظام حیات کے ایک خدمت گار کی سی ہے۔ تعلیم جو اقتدار نمایاں کرتی ہے۔ وہ زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرتی ہے۔ اس طرح زندگی کا نظام تعلیم کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ماضی یا حال کے کسی بھی نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی توجہ نظامِ تعلیم کی صحیح تشکیل پر مرکوز کرتا ہے، اور اس کو اپنے مجموعی مقاصد اور مزاج سے ہم آہنگ اور مربوط کرتا ہے۔ اسلام جس کو ہم مسلمان ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات مانتے ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں اس کی کامیابی کے لئے بھی نظامِ تعلیم و تربیت کی صحیح تشکیل ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے اسلام نے علم کی اہمیت پر بے حد زور دیا ہے۔ قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ میں اس باب میں واضح اشارات ملتے ہیں۔ حضور ﷺ نے خود اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے عالم اور جاہل کو برابر قرار نہ دے کر علم کے بلند مرتبے کو واضح کر دیا ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے اس میں علم، عالم، معلم اور متعلم کو اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں تعلیم کی نعمت عام ہوتی ہے۔ تعلیم پر کسی خاص گروہ، جماعت یا طبقے کا اجارہ نہیں ہوتا۔ اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کا حق ہی نہیں فرض ہوتا ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو مسلمان علم رکھتا ہو اس کا

فرض ہے کہ وہ علم دوسروں تک بھی پہنچائے ۔علم کوصرف اپنی جا گیرنہ بنالیں ۔علم کو چھپانا،حق کو چھپانے کے مترادف ہے ۔مقاصد تعلیم پر بڑی خامہ فرسائیاں ہوتی ہیں۔ ماہرین نے تعلیم کے مقاصد متعین کرنے میں بہت کاوشیں کی ہیں۔صفحات کے صفحات سیاہ کئے ہیں۔لیکن اگر ہم صاف ذہن سے غور کریں اور غیر ضروری بحثوں میں نہ اُلجھیں تو تعلیم کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ ہے انسان کوانسان بنانا۔انسان کواگر تعلیم انسان (یعنی اچھااور سچاانسان ) نہ بناسکےتو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہے۔انسان سازی میں جونظامِ تعلیم ناکام ہواور متعلم میں انسانیت پیدانہ کرسکےوہ ناقص اور لاحاصل ہے بلکہ ضرررساں ہے۔قرآن حکیم کے نقطہ نظر سے وہ انسان بہترین انسان ہے جو اللہ کا اچھابندہ ہوگویا قرآنی نقطہ نظر سے تعلیم کا مقصد عبادصالح اور نیک بندے تیار کرنا ہے۔قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان بہترین امت ہیں،اور ان کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ نیکیوں اور بھلائیوں کو پھیلائیں اور برائیوں کوروکیں۔



## انسانی معاشرے میں صدقہ کی آسان صورتیں

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ا۔تمہارے اپنے بھائی سے مسکرا کر پیش آنا بھی صدقہ ہے۔

۲۔نیکی کاحکم اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے۔

۳۔اجنبی سرزمین میں بھٹکے ہوئے شخص کوراستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔

۴۔کمزور بینائی والے شخص کی رہنمائی کرنا بھی صدقہ ہے۔

۵۔راستے سے پتھر،کانٹااور ہڈی (وغیرہ) ہٹانا بھی صدقہ ہے۔

٦۔اپنے برتن سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالنا بھی صدقہ ہے۔

(سنن الترمذی)

# حرف کی تقدیس

حرف کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ حرف کیا نہیں ہے تو غلط نہیں، حرف زندگی کی روح ہے۔ زندہ اور باضمیر زندگی کی روح، وہ آزاد رُوح جسے دنیا پابندِ جسم نہیں کرسکتی۔ آزاد رُوح جو ذہنِ انسانی کی غذا بھی ہے اور پوشاک بھی۔ وہ آزاد رُوح جو انسانی شعور میں جلوہ گر ہے۔ غاروں سے خلاؤں تک انسان کے تمام تر ارتقاء کا محور یہی حرف ہے۔ کیا حرف جنم نہ لیتا تو انسان شعور کی ان منازل پر قدم رکھتا جہاں آج ہے؟ کیا ان علمی کاوشوں کا حرف کے بغیر تصور ممکن ہے۔ جنہوں نے انسان کو ممالیہ سے انسان بنایا؟ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آج بھی ان کو ممالیہ ہی پاتے ہیں۔ جنہیں حرف کا نہ شعور و ادراک حاصل ہے، ورنہ ان کے دل اس کے احترام کا شائبہ بھی رکھتے ہیں۔ ؎

ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

شائد کوئی خیال کرے کہ مقام حرف کو مجروح کرنے والے لوگ اس گروہِ انسان میں سے ہیں۔ جس نے کبھی مکتب کا منہ تک نہیں دیکھا جسے کبھی وہ سہانی خوشبو سونگھنی نصیب نہ ہوئی ہو جو تازہ کتاب کو مہکاتی ہے۔ جس نے ہمیشہ مدرس کو ہاتھ اٹھا کر سلام ہی کیا ہے۔ کبھی اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ اگر چہ خیال کیا گیا تو ہرگز ہرگز درست نہیں۔ کہ یہ گروہِ انسانی تو حرف کی تقدیس ماضی میں بھی کرتا رہا ہے اور آج بھی کر رہا ہے۔ ؎

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

مقام افسوس یہ ہے کہ حرف کی تقدیس اُن کا نشانہ بنی ہے۔ جو مکتب کی روحِ رواں رہے ہیں جنہوں نے حرف سے ہی وہ عظمتیں حاصل کی ہیں جو شرفِ انسانی میں ممتاز و نمایاں ہیں۔ یعنی کشورِ علم و حکمت کے شہزادے اور جاگیرِ قلم و قرطاس کے گدی نشین جن کے ہاتھوں حروف کا اعتبار و احترام بڑھنا چاہیئے تھا۔ وہ اس کے زوال کا سبب بنتے جاتے ہیں۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

کثرت اشاعت کے اس دور میں حرف جتنا ارزاں اور بے وقعت ہو چلا ہے پہلے کبھی نہ تھا۔ ہر دل جو حرف کی تقدیس واحترام کا قائل ہے۔آج خون کے آنسو رو رہا ہے حرف تو وہی ہیں، معنی بدل گئے ہیں۔انصاف، آزادی، جمہوریت، مساوات ورواداری کے حروف زدِ عام ہیں مگر غور کرو تو جہاں انصاف کا حرف پیش کیا جارہا ہے، وہاں مافی الضمیر ''ناانصافی'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔یہی حال دوسری جگہوں پر ہے ہر حرف کو بے دریغ، بے سوچ، ڈھٹائی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں انسانیت سسک رہی ہے اور حقوق انسانی کا غلغلہ ایوانوں میں بلند ہو کر اس صدائے ناگوار کو مٹا رہا ہے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

کچھ کہ خود کو باقی انسانیت سے برتر واعلیٰ گردانتے ہیں۔ بڑے بڑے قلم اور بڑے خوشنما حروف لیئے قرطاس پر براجمان ہیں ان کی تحریروں میں انسانیت کے دُکھ نہیں اپنے اور دوسروں کی لذت کے سامان جھلک رہے ہیں۔حروف بِک رہے ہیں وہ راہنما جو اس دعویٰ پر قلم اٹھائے نکلے تھے کہ

ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بدل گیا

آج زمانے کی ہم نوائی میں راگ الاپ رہے ہیں۔ان کا دعویٰ والٹیئر جیسوں کی جانشینی ہے۔ مگر عمل مطلق سمتِ مخالف ہیں۔اخباروں میں، رسالوں میں، ہفت روزوں میں، ماہناموں میں، جریدوں اور ڈائجسٹوں میں حرف کی تقدیس ہر سو پامال ہے۔

کہاں گئے وہ...آہ کہاں گئے وہ شگفتہ طرز، وہ شیریں بیاں، کہاں گئے وہ حرف کو اس کے معانی سے ہم آہنگ رکھنے والے۔گو جو لکھا سچ لکھا بڑا نام بڑے کام سے کمایا۔کہاں ہے حالی، کہاں ہے۔ابوالکلام آزاد کہاں ہے، وارث شاہ اور کہاں ہے، ورڈز ورتھ؟ حرف کی تقدیس کے علمبردار آج کہاں ہیں؟

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

کیا اس دور میں کوئی ورڈز ورتھ نہیں، کیا کوئی میرؔ اشکبار نہیں، کیا کوئی رُڈیارڈ کپلنگ فطرت میں مگن نہیں، کیا کوئی اقبال بانگِ درا لئے نظر نہیں آتا، ایسا نہیں۔ سب ہیں مگر دورِنو کی گردشیں انہیں پا بہ زنجیر کرتی ہیں۔ حروف کے اجارہ دار انہیں آگے آنے نہیں دیتے علم وحکمت کی انہار جاری نہیں رہنے دیتے کہ ضمیر انسانی کو پابند کرتے ہیں جبر اور تادیب سے

ہے اہل دل کے لئے اب یہ نظم بست وکشاد

کہ سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد۔ زردتحریروں والے ''ڈائجسٹوں'' کے اس دور میں کون لکھے اور کیا لکھے۔ کوئی آج ورڈز ورتھ ہے تو کیسے کہ شگفتہ تحریروں کو ''بورتحریریں'' کے لیبل لگا کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ مقصد حیات ہی لذت کوشی ہوجائے تو کیا کیجئے۔

کوئی سمجھائے کہ ہم سمجھائیں کیا؟

پھر ایک اندازِ قلمکاری وہ سامنے آیا ہے جس کا مقصد صرف اور صرف دوسروں پر کیچڑ اچھالنا اور خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر سنگ باری کرنا ہے۔ ایک خاتون مضمون نگار ایسی بھی ہیں جنہیں اپنے عزیز واقارب کو نشانہ بنانے ہی میں فصاحت وبلاغت نظر آئی۔

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ان حقائق کا سرسری ادراک کرنے کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر چھوٹا بڑا جو قلم و قرطاس سے وابستہ ہے۔ حرف شناس ہے، کوشش کرے کہ حرف، قلم اور قرطاس کا تقدس قائم ہو۔ حرف تو اس لئے سکھائے گئے تھے۔'' کہ ہم ان کے ذریعے ایک دوسرے کے دل میں اُتر جائیں مگر ہم نے تو ان کے ذریعے دلوں کا قتل عام شروع کر دیا۔'' کیوں نہ انسانیت کے وہ راہنما جنہیں قدرتِ اظہار ملی ہے، جو حرف برتنا جانتے ہیں۔ حرف استعمال کرنے میں احتیاط کے خوگر ہوں۔ کیوں نہ ان کے حروف نفرتوں کی بجائے محبت بکھیریں۔ کیوں نہ ان سے نسلوں کو بگاڑنے کی

بجائے سنوارا جائے۔ کیوں نہ ان سے قوم کے مختلف طبقات اور گروہوں کو یک جان کیا جائے۔ کیوں نہ ان کے ذریعہ دلوں کو دور کرنے کی بجائے قریب کیا جائے۔آؤ اے قلمکارو! بڑو اور چھوٹو! حروف کی تقدیس قائم کریں اور ان باتوں کو عملی جامہ بھی پہنائیں۔ جو ہمارے پیش رو رہ چکے ہیں، اور جن پر ہم داد دیتے دیتے بے حال ہو جاتے ہیں۔شیکسپئر اور عمر خیام کو پھر جنم دیں۔آؤ ورڈزورتھ سامنے لائیں جو حسن فطرت کو سراہنے کا ذوق پیدا کر سکے آؤ پھر سے اپنی تحریروں کو عظیم انسانی اصولوں سے ہم آہنگ کریں اور پھر اپنی تحریروں سے دنیا اور زندگی کے خوبصورت پہلوؤں کو نمایاں کریں آؤ اپنے قول و فعل کا تضاد دور کریں آؤ کہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی۔

آغوشِ گلِ کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے



# استاداورتعلیم

درس وتدریس ایک انتہائی مقدس اوراہم شعبہ ہے۔اگر پڑھانے والے اس شعبہ سے مخلص ہیں۔محنتی ہیں اوراپنے مضمون پرعبور رکھتے ہیں۔تو وہ طلباءکوعمدہ رنگ میں تعلیم دے کرایک قوم کے مستقبل کومحفوظ کرسکتے ہیں۔قوموں کی تعمیر میں تعلیم کلیدی کردارادا کرتی ہے۔یہ دورتوعلم کا دور ہے۔جوقوم اس میدان میں وقت کے ساتھ ساتھ سفر کرے گی وہی قوم اقوام عالم میں اپنا مقام پیدا کرسکتی ہے۔جومعاشرہ یا ملک تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گیا وہ اندھیروں میں کھو جائے گا اور پسماندگی اس کا مقدر بن جائے گی۔

صاحب تدریس ہرروز خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ان کے لئےعلم وعرفان کا لامتناہی سلسلہ ہے۔سائنس کے میدان میں انسان عقل وسمجھ کے مطابق بہت آگے جا چکا ہے۔ہر روز حیرت انگیز ایجادات ہورہی ہیں۔اسی طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں دنیا بڑی تیزی سے ترقی کررہی ہے۔اس دھارے میں شامل ہونے کے لئے آج کے طلباءکو ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جوجدید تعلیم سے آراستہ ہوں۔جوجدید تدریسی طریقوں سے واقفیت رکھتے ہوں جو طلباء کی نفسیات کو گہرائی میں جا کر سمجھتے ہوں۔اعلیٰ تربیت یافتہ اساتذہ کی بدولت ہی مطلوبہ نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔اسکولوں کے اساتذہ نظام تعلیم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگرآج کے اساتذہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہونگے یا معاشی لحاظ سے پریشان ہوں گےتو ہمارا نظام تعلیم بہتر نہیں ہوسکتا۔اس لئے اس میدان میں خود پہلے ماہر بنیں۔اچھا نصاب،اچھا فرنیچر،اچھی کشادہ عمارت اور جدید کمپیوٹرائز نظام بھی اچھے تربیت یافتہ اساتذہ کے بغیر اپنا کردارادا نہیں کرسکتے۔جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے انہیں نظام تعلیم کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا چونکہ ذریعہ تعلیم زیادہ تر انگریزی میں ہے۔اس لئے اس میدان میں پہلے خود ماہر بنیں۔تاکہ معلم کے فرائض بخوبی احسن ادا کرسکیں۔ ہمارے ہاں پرائمری کے اساتذہ کے مسائل توجہ طلب ہیں۔تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے بھی پرائمری اساتذہ مسائل کا شکار ہیں۔بدقسمتی سے ہم اچھے استاد

پیدانہیں کر رہے ۔ایک استاد کے لئے اپنی کلاس کے ہر طالب علم کے بارے میں اس کے مزاج، تعلیمی قابلیت، ذہنی رجحان، اور صحت کے متعلق مکمل ایک جائزہ ہونا چاہیئے تا کہ وہ بہتر منصوبہ بندی کر کے تعلیم دیں۔

پرائمری کی سطح پر باقاعدہ امتحانات کے ساتھ ہر طالب علم کی ماہانہ کارکردگی کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے ۔اس طرح طالب علم اور زیادہ نکھر جاتے ہیں ۔صورت حال یہ ہے کہ ایک استاد نے کئی مضامین پڑھانے ہوتے ہیں ۔ایک استاد انگلش پڑھاتا ہے وہی اردو اور ریاضی بھی پڑھاتا ہے۔ اگر اس کی اچھی ٹریننگ نہیں ہوتی تو وہ اپنے فرائض منصبی کیسے احسن طریقے سے ادا کرسکتا ہے۔اس کے لئے باقاعدہ ورکشاپس لگا کر جدید تدریس کے طریقہ کار سے اساتذہ کو روشناس کرایا جائے۔ یوں اساتذہ پورے سال کا پروگرام بنا کر طلباء سے دوستانہ ماحول میں ایک خاص تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔اس سلسلے میں والدین کا کردار بھی بہت اہم ہے ۔وہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت میں دلچسپی لے کر اپنے بچوں کا کردار بہت اعلیٰ بنا سکتے ہیں۔ پرائمری کی سطح پر والدین کی کردار سازی بہت اہم ہے ۔جس سے بچوں کے ذہنی رجحانات بہتر سمتوں کے طرف ہو جاتے ہیں ۔اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔استاد اپنے علم، اپنی قابلیت، اور اپنی شخصیت کے لحاظ سے بچوں کے لئے آئیڈیل ہوتے ہیں۔اساتذہ کا آپس میں صحت مند مقابلہ کا رجحان پیدا کیا جائے ۔جس استاد، اسکول کا بہترین رزلٹ ہو اسے ایسی ترغیبات دی جا سکتی ہیں جو نظام تعلیم کی معاون ثابت ہوں۔ ایسا نصاب بنائیں کہ طلباء رٹہ لگانے کی صورت حال سے باہر نکلے ۔ایک سیمسٹر میں ایک نصاب ہو اور دوسرے میں اس سے قدرے مختلف اور ایڈوانس نصاب دیں۔جس کو طلباء اچھی طرح سمجھ کر پڑھیں، اور تیاری کریں۔ایسا نصاب ہو کہ طلباء لائبریری سے جا کر استفادہ کریں۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے طلباء یہاں سے ڈگری لے کر جاتے ہیں تو دوسرے ممالک میں انہیں ڈگری سے نچلے درجے کے امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔اسی طرح ہمارے اساتذہ کو امتحانی پرچے بنانے، انہیں چیک کرنے کی بھی تربیت دینی چاہیئے نہ کہ وہ اپنے شاگردوں سے چیک کروا کر رزلٹ تیار نہ کر دیں استاد کا مقام بہت بلند ہے۔اسے اس کے شان شایان مقام ملنا چاہیئے۔

# اُردو کی رومانی شاعری

اردو شاعری کے موجودہ دور کوعہد رومان کہا جا سکتا ہے دور جدید کی شاعری اپنے تمام اختلافات کے ساتھ ایک مشترک روح رکھتی ہے۔جو روحانیت کے سرچشمے سے سیراب ہو رہی ہے شاعری کیا ہے؟ یہ بھی زندگی کی مختلف کیفیتوں کی طرح ایک کیفیت ہے۔اور رومانیت ایک خاص انداز کی کیف زندگی ہے نفس کی مخصوص حالت کو رومانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔جس میں جذباتی کیفیات عقلی کیفیات سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔اور تخیل کے سمند ر ناز کو ایک اور تازیانہ لگ جاتا ہے۔تخیل وجذبات کا بھرجانا رومانیت کی روح رواں ہے،رومانیت کی ایک اوراہم خصوصیت انفرادیت ہے۔مگر انفرادیت،رومانیت کا سبب نہیں،نتیجہ ہے۔رومانی تخیل کائنات کو ایک نئے طور پر دیکھتی ہے۔اور رومانی جذبات عالم کو ایک جدید رنگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔اوراس کا لازمی نتیجہ انفرادیت ہے۔رومانی شاعری زندگی کی تعمیر نو ہے۔یہ روح کا ارمان بہشت آفریں ہے انسانی دل کی ازلی تشنگی کی بےقراریاں اس کی رگ جاں میں پھڑکتی نظر آتی ہیں۔رومانیت برنائی حیات کا خواب بیداری کرتا ہے۔اور روح کا اُفق وسیع تر ہوتے ہوتے لامحدود ہو جاتا ہے اور اس افق بے کراں کی آغوش میں آفتاب ہائے تازہ انوارفشاں ہوتے ہیں۔رومانی شاعر جب مناظر فطرت اور مظاہر حیات سے لطف اندوز ہوتا ہے تو وہ لطف اندوزی باطنی ہوتی ہے۔اس وقت حسن وصداقت ہم آغوش نظر آتے ہیں۔موجودہ رومانی شاعری نفسیاتی اثر کے ماتحت ظہور پذیر ہوئی ہے۔یہ تجدید ہے اردو شاعری کی رومانیت اولیں کی۔جس طرح انگریزی شاعری میں ایک شیکسپیئر کا رومانی دور تھا اور دوسرا،ورڈورتھ کا اور شیلے کا۔اسی طرح اردو شاعری کا پہلا رومانی دور کا ہیرو مرزا تھا اور دوسرا رومانی دورعہد حاضر ہے۔رومانیت کے عروج ہی کے زمانے میں یعنی غالب ومومن کے دور میں ''کلاسیت'' نے جڑ پکڑ لی تھی۔حالات کا اختلاف یا بزبان دیگر ماحول کا اختلاف دونوں رومانی ادوار میں مابہ الامتیاز ہے جو ذہنی،اقتصادی،سیاسی حالات آج موجود ہیں وہ اس وقت نہ تھے لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں ہیں۔کیونکہ دونوں پر جذبات وتخیل کی حکومت ہے۔قبل اس کے

کہ میں موجودہ رومانی شاعری کی تخلیق وتاسیس اور ارتقاء وعروج پر نظر ڈالوں۔نفسی حیثیت سے ادب میں انقلابات کی وجوہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ادب حیات کا ''نبض پیما'' ہے۔زندگی کو اگر آپ ایجاز بلیغ کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہوں تو ادب کو دیکھیے۔عروس حیات آئینہ ادب میں اپنی صورت دیکھتی ہے پہلے نفس میں انقلاب آتا ہے پھر اس کا اثر زندگی کی مختلف کیفیتوں میں واضح نظر آتا ہے پھر ادب میں بہت گہرا نظر آئیگا۔اب آیئے حقیقت انقلاب کا تجزیہ کیا جائے۔

انسان کی روح بھی اس کے جسم کی طرح یہ مختلف ''اجزا'' بھی لطیف،غیر مرئی اور غیر مادی ہوتے ہیں۔جب جسم میں کسی عنصر کی کمی ہوجاتی ہے۔تو اس کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔آپ اگر میٹھا کھاتے رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ نمک کی طرف آپ کو نا قابل برداشت رغبت ہوگی۔حیوانی دنیا میں بھی امر مذکور کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہرنوں کا ریوڑ اچانک امریکہ کے جنگلوں کے شاداب سبزہ زاروں کو چھوڑ کر سوکھی ہوئی جھیلوں کی طرف دیوانہ وار دوڑ جاتا ہے تاکہ وہاں جا کر نمک چشی کرے جب نمک کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے تو سارا گلہ چراگاہوں کی طرف واپس آجاتا ہے۔سیاسی،ومعاشی،مذہبی ومعاشی انقلابوں کی بنیاد بھی نفس ہی میں پڑتی ہے۔ انسانی روح کے اجزائے تعمیری کی کمی وبیشی نفسی انقلاب کا سبب اولین ہوتی ہے۔اگر انسانی نفس کو صرف عقلی غذائیں ملتی رہیں تو ایک وقت وہ جذبات سے سیراب ہوجاتا ہے تو نفس عقل کی بھوک محسوس کرتا ہے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

موجودہ رومانی رجحان مظہر کا ہے اسی نفسی انقلاب کا جو معاشرہ کی روح میں آیا اور یوں تو ظاہراً ردِعمل ہے۔لکھنؤ اسکول کی ''کلاسی'' Classical شاعری کیخلاف مگر باطناً خود کلاسی شاعری مظہر تھی اس دور کی نفسی حالت کی۔معاشرہ کا ''نفس اجتماعی'' Collective Soul ادب کے ذریعے ظہور کرتا ہے۔اب آیئے سرِ راہے،ذرا ''کلاسیت'' Classism اور اردو کی کلاسی شاعری کا جائزہ لیا جائے۔

لکھنؤ کی کلاسیکل شاعری۔دہلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ کا عروج ہوا اور آرزوئے جدت

میں لکھنواسکول کی بنیاد پڑی۔ یوں تو نصیر دہلوی نے بھی خالص کلاسی شاعری کے نمونے پیش کئے مگر اس صنف کو ناسخ اور اس کے پیروؤں نے تکمیل کے ساتھ برتا۔لکھنؤ نے دلی سے الگ ہو کر ایک الگ ہو کر ایک جدید تہذیب کی ابتدا کی مگر اس جدت میں زندگی نہیں تھی۔

ہندوستان کے اردو نواز طبقہ پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا ہر سُو پسپائی تھی۔اور ہر جانب موت۔ لکھنؤ کی نئی تہذیب حیات سے ہمکنار نہ تھی بلکہ وہ ایک سوانگ تھی زندگی کا۔صرف ادب وشعر ہی میں نہیں بلکہ تہذیب کے ہر شعبے میں۔لکھنؤ پر ایران کی کلاسیت کا اثر پڑا جس طرح پوپ اور ڈرائیڈن کے زمانے میں لاطینی کلاسیت کا انگریزی ادب وتمدن پر اثر پڑا تھا۔کلاسیت کی خصوصیات یہ ہیں کہ نفس شعر سے زیادہ قواعد وضوابط کی پابندی الفاظ کی تراش وخراش، آرائش و زیبائش اور صناع و بدائع پرزور دیا جاتا ہے ایسی شاعری کی مثال حنوط شدہ لاشوں کی سی ہے۔خارجی شوخی وطرحداری پر تو کافی وقت صرف کیا جاتا ہے مگر روح کا فقدان ہوتا ہے۔کلاسی شاعری میں انفرادیت کا فقدان تھا کیونکہ انفرادیت نتیجہ ہے زندگی کا، اور کلاسی شاعری ایک دم توڑتی ہوئی تہذیب کی زبان تھی۔ دبستان۔لکھنؤ نام ہے۔ بیچارگی کی تقلید کا۔ بیمار جذبات کا۔ مدفون تخیل کا! کلاسیت کی خوبی ہے کہ اس دبستان میں بے راہ روی خودسری وجنون پسندی نہیں، جذبات کی باگ ڈور کامل طور پر عقل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔کلاسیت ناکاروں کے ہاتھوں میں فرسودگی اور موت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔مگر کارواں شخصیتوں کے قبضے میں آکر تناسب فن کی بہترین مظہر ہوتی ہے۔اردو کی خوش بختی سے۔لکھنؤ میں ایک نابغہ ''Genius'' پیدا ہوا جس نے کلاسیت اور رومانیت کو ہم دست کر دیا نابغہ قواعد کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ قواعد کو پابند کر لیتا ہے۔وہ کسی دبستان کا پیرو نہیں بلکہ دبستان اس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ ماحول سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے مگر ماحول پر بھی اپنی خاتمیت کی مہر لگا جاتا ہے۔نابغہ اپنے زمانے کا فرزند تو ہوتا ہے۔مگر آنے والے زمانے کا باپ بھی۔انیس کلاسیت کے تقلیدی دور میں رہ کر بھی کلاسیت سے بلند تھا۔اس کی شاعری میں ہمیں کلاسیت اور رومانیت کی خوبیاں نظر آتی ہیں،اور ان کی برائیاں وہاں ناپید ہیں۔انیس کا آرٹ یونان کے مشاہیر ادب وشعر کے فن سے مشابہ ہے۔اس استثناء کے علاوہ دور کلاسیت کی

شاعری ایک فرسودہ، مضمحل، بیمار بے جان اور غیر فطری شاعری تھی ۔جس طرح ناامیدی کے قلب میں امید کی چنگاری پیدا ہوتی ہے ۔بالکل اسی طرح کلاسیت کی تاریکیوں میں افق بہار پر ایک تابندہ ستارہ صبح طلوع ہوا۔ ہر چند کہ شاد کلاسی سکول کی پیداوار تھے ۔مگران کی شاعری میر اور مومن کی یاددلاتی ہے ۔ یہ تھی رومانیت کی صبح صادق ۔اس کے بعد رومانیت کے شفق زاروں میں نظیر اکبر آبادی اور حالی نے لالہ کاریاں کیں ۔اردوشاعری سے نظیر کا وہی تعلق ہے جو Burns کا انگریزی شاعری سے ہے ۔دونوں نے رومان کی بانسریاں بجائیں مقامی لے کے ساتھ ۔مگران کے نغمے بلا کے دلفریب تھے ۔کسی پرستان سے آنے والے گیتوں کی طرح،اور حالی کی مثال ورڈزورتھ Wordsworth اور Coleridge سے دی جاسکتی ہے ۔

حالی کا مقدمہ شعروشاعری ''لیریکل بیلارڈز (Lyrical Ballards) کے دیباچہ (Preface) کی طرح ہے ۔دونوں دیباچوں نے اپنی اپنی شاعری میں انقلاب برپا کردیا ۔غرض نظیر، حالی، اور شادرومانی شاعر کے علم بردارانِ اولین ہیں ۔

## اُردو میں رُومانی شاعری کا دوسرا دور

اب میں رومانی شاعری کے پس منظر اور ماحول اوران تحریکات کی طرف رجوع کرتا ہوں ۔ جنہوں نے اس پر اثر ڈالا ۔غدر 1857ء کے بعد سارے ہندوستانی معاشرے میں ایک تشائم اثر تھا ایک اعلیٰ تمدن کی سر بفلک عمارت کے کھنڈروں کی اینٹیں بٹ رہی تھیں جس نے اپنے مٹنے کا سامان خود کیا تھا ۔اپنے ہاتھوں لوگوں نے اپنی قبریں کھودی تھیں ۔اب غیران کی لاشیں دفن کرر ہے تھے ۔ان بدبختوں کو تو اپنی تباہی کا احساس بھی نہیں رہا تھا ۔لیکن نوزائیدہ نسل جو اگر چہ آدم کے گناہ کی وارث تھی اپنے دل میں ایک بے اطمینانی محسوس کررہی تھی ۔ کیونکہ فردوس گم شدہ میں اس سے تو خطائیں سرزد نہیں ہوئی تھیں ۔وہ کیوں سزائیں بھگتے ۔ بیٹا اپنے باپ سے مختلف ہوتا ہے اور مشابہ بھی ۔جدید نسل کی روح نیم معصوم ضرور تھی لہٰذا یہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن نہ تھی ۔اسے جنت کی بازیافت کی آرزوستانے لگی تھی ۔لوگ چاہتے تھے کہ حالات بدلیں یہی حالت تھی کہ مغربی تہذیب کے اقدام نے معاشرہ کو اور حکومت کے چراغ چونکا دیا ۔مغربی تعلیم وتہذیب اور معاشرت کا اثر

ہوا۔حکومت کے چراغ کاشانہء اغیار میں جلتے نظر آئے عیسائی مشنریوں کی تگ ودو نے آرام سے سوئے عقائد تک کوجھنجوڑ کر تحت الشعور کے گوشہ عافیت سے جگایا۔ یہ بے اطمینانی کا دور تھا جو اپنا دامن ہمارے زمانے تک وسیع کئے ہوئے ہے اور یہی رومانیت کا بیج ہے۔رومانت نام ہے روزمرہ کی بے کیفی سے اجتناب کا۔عین اس وقت دو تحریکیں سامنے آئیں ایک علی گڑھ کی تحریک اوردوسری پنجاب کی۔علی گڑھ کی تحریک یہ تھی کہ فرسودگی کے خیال کو معاشرے سے منع کرنا چاہیئے اور جدید بنیادوں پر تہذیب کی عمارت اٹھانی چاہیئے۔اس تحریک سعید کا یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ سماج میں ایک روشن خیال طبقہ پیدا ہو گیا جو نئی تعلیم سے آراستہ تھا۔دوسری تحریک کا مرکز پنجاب تھا۔اس تحریک کی کوشش یہ تھی کہ لوگ پھر حجاز کی طرف رُخ کریں۔پھر وہی اگلے ولولے پیدا ہوں پھر وہی سادگی اور روح کی بیداری۔

اس تحریک کی بنیاد جذبات پر تھی،اور یہ عقل کے میدان میں بھی جذبات سے گل بوٹے اُگانا چاہتی تھی۔لازماً دوسری تحریک کا اثر پنجاب کی رومانی شاعری پر پڑا۔موجودہ بے کیفی سے انحراف اور ایک نئی دنیا کی تعمیر،یہ تھی بنیاد رومانی شاعری کی۔زندہ دلانِ پنجاب نے اس بے کیفی کا علاج ماضی میں تلاش کیا۔اور نئی تہذیب کا نمونہ تہذیب حجاز کے پُرشکوہ آثار میں ڈھونڈا اس گروہ کے سالارِ کارواں علامہ اقبال ہیں۔پہلی تحریک کا اثر صوبہ متحدہ میں ہوا۔اس گروہ کے علمبردار جوش ملیح آبادی ہیں۔ان کی رومانیت ایک نئی دنیا کی تعمیر چاہتی ہے۔یہ انقلاب کے رجز خواں ہیں۔اس جماعت پر یورپ کی جدت نے اپنا اثر ڈالا۔یہ مغرب پر مغرب کے ہی جدید ہتھیاروں سے ہی فتح پانی چاہتے ہیں۔اوراولالذکر عربی نیزوں پر بھروسہ رکھتا ہے ایک مستقل کو ماضی کے آئینہ میں دیکھتا ہے۔اور دوسرا مستقبل کو مستقبل کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔جس طرح بائرن اور کیٹس تہذیب یونان کے شیدائی تھے اسی طرح اقبال تہذیب حجاز کے گرویدہ ہیں،اور جوش انقلاب کا قرنا پھونکتے ہیں۔انقلاب فرانس نے انگریزی رومانی شاعری کو متاثر کیا تھا۔اور انقلاب روس نے اردو کی رومانی شاعری پر اثر ڈالا۔ہندوستان میں جنگ عظیم اول سے پہلے ہی تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی۔حریت کی رگوں میں خون دوڑنے لگا تھا کہ جنگ عظیم اول کی قیامت برپا ہوئی اور اس کے

اختتام پر روس کی زاریت تباہ ہوگئی اور کتنے شہنشاہوں کی کج کلاہیاں خاک میں مل گئیں۔ جنگ کے بعد ہندوستان میں ترک موالات کی تحریک کا عروج ہوا اور پھر پے در پے قانون عظمیٰ اور عدم ادائیگی محصولات کی مہمات شروع ہوئیں۔ دوسرے ممالک میں بھی انقلاب پر انقلاب شروع ہو رہے تھے۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ معاشرے میں ذہنی انقلاب بھی ہو رہا ہے۔ پرانے نظریے بدل رہے تھے۔ ماضی کے قوانین پر نکتہ چینیاں زوروں سے شروع ہوگئیں تھیں۔ فلسفہ اخلاق پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آ گئی تھی، اور ''نسائیات'' کے متعلق لوگ زیادہ فطری طور پر غور کرنے لگے تھے۔ داعیاتِ شباب اور جنسیات ہر چند کہ پرانے طرز کے لوگوں میں قطعی مردود تھے۔ مگر ایک طبقہ ایسا ضرور پیدا ہو گیا تھا جو فطرت کی پکار پر کان بند کر لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ ''مغچوں'' اور ''سبزہ آغاز'' برہمن زادوں کی جگہ اب ''سلمیٰ'' اور ''عذرا'' لینے لگی تھیں۔ اس دور میں ہماری موجودہ رومانی شاعری پرورش پاتی رہی ہے اور اب تک پرورش پا رہی ہے۔ ابھی ہمارے ماضی قریب اور حال میں چنداں تفاوت پیدا نہیں ہوا۔ ''حجازیت'' اور ''انقلابیت'' کے بڑے دو دھاروں کے علاوہ ''رومانیت'' کی اور صورتیں بھی ہیں جن میں ''وطنیت'' اور حسن پسندی کو امتیاز حاصل ہے۔ ''وطنیت'' نے چکبست کو ترجمان بنایا اور ''زلیخائے رومان'' نے اختر شیرانی کو اپنا ''یوسف'' بنانے کے لئے چن لیا۔ اگر چہ چکبست وارجن، کرشن و رام کے قصیدہ خواں ہیں تو اختر سلمیٰ کے حسن صبیح کی یاد میں نغمہ سنج ہیں۔ اقبال، جوش اور چکبست تینوں دور زریں Millenium کے خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال کے خواب کی تعبیر حجاز میں ہے جوش کی انقلاب میں اور چکبست کی ہند قدیم میں۔ یہ تینوں فرسودہ دنیا کو بدل کر ایک نیا عالم رنگ و بو تخلیق کرنا اور حالات کا مقابلہ کر کے اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری پیغام عمل ہے ان تینوں کی رومانیت میں عملیت ہے۔



# سخن فہمی

شعراء ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ میں سخن فہمی عالم بالامعلوم شدہ کا نعرہ بلند کرتے چلے آئے ہیں۔اس نعرہ میں تو جھنجھلاہٹ ہے لیکن شعراء کے ہاں ایسے اشعار بھی بکثرت ملیں گے جس میں حرماں اور تحسر کا رنگ جھلکتا ہے۔جن کی بنا اَبنائے زمان کی ناقدر شناسی سخن ہے۔اس شکوہ شکایت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے۔فارسی کا کم وبیش ہر بڑا شاعر اس بات کا شاکی نظر آتا ہے کہ لوگ نہ سخن فہم ہیں نہ سخن شناس۔قدردانی ہو تو کس طرح ہو؟۔اردو شعراء کا بھی یہی حال ہے۔میرؔ سادگی میں سہل ممتنع کے مقام تک پہنچتے ہیں۔اس کے باوصف وہ بھی یہی کہتے سنائی دیتے ہیں۔کہ سخن فہم نہیں ملتے۔غالبؔ اور بیدلؔ نے تو خیر اس موضوع پر بہت سے اشعار لکھے ہیں۔حالیؔ نے بھی کہہ دیا:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

علوم مجلسی پر جن لوگوں نے مشرقی وضع داری اور آداب پر کتب لکھی ہیں۔وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ سخن گوئی آسان ہے اور سخن فہمی مشکل۔یاد رکھیئے کہ غالب نے اپنے دیوان کی اشاعت سے پہلے سخن فہم دوستوں کی ایک مجلس بنائی تھی جس کے رکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی تھے۔انہی کے متعلق غالبؔ نے کہا ہے۔نہ نو دشت دیواں درغزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد۔غالب کے لئے ایسا کہنا بڑی بات ہے اور شاید اس بات کی دلیل قاطع ہے۔کہ سخن فہمی کا مقام سخن گوئی سے بلند تر ہے۔مجلس مشاعرہ ہو یا کوئی اور محفل،شاعر کی نظریں ہمیشہ سخن فہم کی تلاش میں رہتی ہیں۔سخن فہم کے داد دینے کا انداز اسلوب،رسمی داد دینے والوں سے علیحدہ ہوتا ہے،اور شاعر کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کی نظر حسن کلام کی باریکیوں اور اظہار کی نزاکتوں تک پہنچ رہی ہے۔سخن گوئی اس زمانہ میں پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔یوں بھی سخن گوئی کا عمل فنونِ لطیفہ میں سب فنون سے زیادہ پُراسرار،حیرت پرور اور پیچ دار ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ افکار،دل کی واردات،ذہنی تصورات،الفاظ کا جامہ پہننے

سے پہلے کئی بار شاعر کی گرفت میں آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔کبھی ردیف مانع اظہار ہوتی ہے کبھی قافیہ۔کبھی وزن کی پابندی، بہر حال تشکیل لفظی سے پہلے سخن گو کو عجیب عجیب منزلوں اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے وہ اس بات کا شعورِ کامل حاصل کرتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ جب یہ شعور حاصل ہو جاتا ہے تو ایک اُلجھن دور ہو جاتی ہے کہ سخن گو کو بقطع و یقین اپنی واردات ذہنی اور ان کی نوعیت کی دلالتوں کا علم ہو جاتا ہے لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔اب سخن گو کے سامنے، اردات کے اظہار کے لئے الفاظ کے انتخاب کا مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ بھی بہت ہی نازک اور پُراسرار مقام ہے۔ پہلے تو یہاں شاعر کے مبلغ علم کا امتحاں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جو الفاظ اظہار کے لئے موزوں ہوں وہ شاعر کے پاس ذخیرہ الفاظ موجود ہی نہ ہو۔ پھر یہ بھی ممکن ہے الفاظ تو ہوں مگر ان کے درست معنی شاعر کو معلوم نہ ہوں۔فرض کریں یہ دونوں تو ہوں مگر ترکیب استعمال کا پتہ نہ ہو۔اس منزل سے گزرا تو وارداتِ ذہنی نے الفاظ کا جامہ ضرور پہنا۔یعنی ذہن میں ابھی شعر وجود میں نہیں آیا۔ کیونکہ ابھی یہ منزل باقی ہے کہ الفاظ کی ترتیب اور اور نشست کی کیا صورت ہو۔

شعر اصلاً جس سماعت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے دل میں اترنے سے پہلے اسے در گوش پر دستک دینی پڑتی ہے۔ یہ مرحلہ بخوبی طے ہو جائے تو معنی تابناک کی عروس شرمگیں حجلہ الفاظ سے جھانکتے ہیں۔جھانکنے کا لفظ میں جان کر استعمال کیا ہے۔عروسِ معانی سے آنکھیں چار کرنا مشکل سے میسر آتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام مراحل طے کرنے میں کچھ پہلو تشنہ اظہار رہ جاتے ہیں۔اور شاعر گویا پھڑ کتا رہ جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اپنی پوری کوشش کے باوجود کہہ نہیں پایا۔جس وقت معانی الفاظ میں مقید ہو چکتے ہیں۔تب بھی الفاظ کی نشست اور معانی کی ترتیب بڑے شاعروں کے ہاں ایسی ہوتی ہے۔کہ سننے والا بھی وہ مطلب اخذ کرتا ہے۔جو مجموعہ الفاظ میں موجود نہیں ہوتا لیکن جس پر الفاظ کی ایک خاص چیز دلالت کرتی ہے۔مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں الفاظ کی ترتیب پر غور فرمایئے گا۔یقیں مارا گیا جرم محبت پر، زہے طالع!...سخن گوئی میں ایک مقام یہ بھی آتا کہ شاعر حقائق بیان کرنے کے لئے تشبیہات واستعارات کا دامن تھامتا ہے۔معمولی تشبیہات واستعارات

سے بحث نہیں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہنی واردات کو جو شعر کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہیں دوسرے فنون لطیفہ کی اصطلاحات کے ذریعے سامع تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہی نہیں سخن گوئی میں کم و بیش ہر بڑا شاعر کرتا ہے۔فرق یہ ہے کہ بعض تلمیحات پیش پا اُفتادہ ہوتی ہیں، اور بعض دقیق اور علوم وفنون کی اصطلاحات پر مبنی تلمیحات ہر طرح کی ہوتی ہیں۔

طب، ہیت، نجوم، تاریخ، فلسفہ، مذہب، فقہ، معانی شعر کے دام خیال سے کوئی چیز نہیں بچتی۔ فارسی میں خاقانی تلمیحات کی دقت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں۔اُردو میں اقبال کے ہاں جس کثرت سے تلمیحات ملتی ہیں۔شاید اور کسی کے ہاں اس کی مثال نہ ملے۔فلسفہ، حدیث، اور فقہ ان علوم کی طرف اقبال کا خاص میلان ہے۔سخن فہم کا کمال یہ ہے کہ اس کا مطلب دریافت کرے۔ جو مقصود شاعر ہے سخن فہمی ان تمام اشارات و رموز کو سمجھنے کا نام ہے جو شاعر نے شعر میں مخفی رکھے ہیں۔ یوں سخن فہمی، سخن گوئی سے زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔سخن فہمی کے لئے ذوق سلیم لازم ہے۔ ذوق سلیم کچھ مطالعہ کا، کچھ مشاہدے کا، کچھ محفل آرائی کا، کچھ تربیت کا، کچھ ذاتی اور اجتماعی ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس کی انفرادیت یوں قائم رہتی ہے کہ غزل گوئی میں اثرؔ لکھنوی میرؔ پر جان دیتے ہیں، اور نیازؔ فتحپوری مومنؔ پر لیکن نہ تو نیازؔ کو میرؔ کے شاعر ہونے پر انکار ہے اور نہ اثرؔ کو مومنؔ کے ناشاعر ہونے پر اصرار ہے۔ ہاں اگر کسی شاعر کے متعلق یہ جھگڑا کھڑا ہو جائے کہ یہ شاعر بھی ہے کہ نہیں اور جو لوگ مسلمہ طور پر ذوق سلیم رکھتے ہیں دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔تو افسوس سے ایک گروہ کو مردود ٹھہرانا پڑے گا۔ کہ شعر یا شاعر کی خوبی میں بھی اختلاف رائے نہیں ہو سکتا صرف پسندیدگی کے مدارج ہو سکتے ہیں۔شعر کی تعبیر میں اختلاف ہو سکتا ہے۔شاعر کے مالی رتبہ ہونے پر بحث ہو سکتی ہے یہ بات کبھی متنازعہ فیہ نہیں ہو سکتی کہ فلاں شعر اچھا ہے یا بُرا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سخن فہمی، سخن گوئی سے زیادہ مشکل فن ہے۔ میرے خیال میں آپ میرے ہم نوا ہوں گے کہ یہ بات غلط نہ تھی سخن فہموں کی تعداد ہمیشہ شعراء کی تعداد سے کم تر رہی ہے، اس لئے ان کی بڑی مانگ بھی رہی ہے۔اور شعراء کے نام لے لے کر اپنے دیوانوں میں ان کو سراہا گیا ہے۔

# اُردو ہے جس کا نام

اپنی زبان کس کو پیاری نہیں لگتی اس بارے میں طرف داری برحق لیکن سخن فہمی بھی ضروری ہے اُردو کی زُلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔اُردو کی حسن وخوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔اس کے لطف واثر اور شیرینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا کون نہیں جانتا کہ اُردو برصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اَخذ وقبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے۔اور جس کا دامن رنگ برنگے پھولوں سے پُر ہے اور جس کی جادواثری میں شکوہ ترکمانی ،ذہن ہندی اور نطق اعرابی تینوں کا ہاتھ ہے۔کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہندآریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔کون نہیں جانتا کہ جب نئی تاریخی حقیقتیں اُبھرتی ہیں۔تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں، اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے لسانی ،سماجی،اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے ساجھےاور اختلاط وارتباط سے وجود میں آئی۔

اس وقت اس کا کوئی نام نہ تھا۔جب کوئی بھی سچائی جنم لیتی ہے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہو جاتی ہیں۔دیوتاؤں کی دھرتی سے جب یہ نیا چشمہ پھوٹا اور اس میں عرب، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا تو اس کا کوئی نام نہ تھا۔ہندوستان کی ہر چیز ہندی تھی۔فارسی یائے نسبتی کے ساتھ۔اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔امیر خسرؒو نے اسے ہندی بھی کہا اور دہلوی بھی۔اسی زمانے میں جب راگ رنگ کی محافل میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجراتی بھی کہلائی اور پھر کسی نے اردو کہا تو کسی نے ہندی۔اور کسی نے کھڑی۔بنیاد وہی مگر راہیں الگ الگ ہو گئیں۔نام سے کیا ہوتا ہے لیکن یہاں نام ہی سے فاصلے بڑھےاور دوریاں بڑھیں۔اس امر کو تسلیم کرنے میں شاید کسی کو تامّل ہو کہ اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ایسی کمائی کہ جس سے کوئی انصاف پسند نظریں نہیں چرا سکتا۔تاریخ کے سیل میں جب تہذیبیں بہہ جاتی ہیں اور نسلیں پگھل جاتی ہیں۔جب چہرے کے نقوش، پہناوا، رہن سہن،طور طریقے نئی شادیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔جب گل وبلبل

کا رشتہ نئی رنگینیوں کی خبر دیتا ہے جب کوئل کوکتی اور آم کے پیڑوں پر بُور آتا ہے، جب دلوں کے دروازے وا ہوتے ہیں فصل کے فاصلے ڈُھل جاتے ہیں اور وصال کے در کھلتے ہیں، ایسے میں زبان قوموں اور نسلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں، اور محبت و یگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ تاریخ کے ایسے لمحات میں جب تہذیب کی ہوا میں نشے کی تاثیر اور لطافت مزید پیدا ہو جاتا ہے۔ تو محبت کے دو بول سنانے اور قلب و روح کو سرچار کرنے کے لئے کوئی اردو زبان پیدا ہوتی ہے۔ اردو کو محض اردو کہنا اسے صرف ایک زبان کہنا اس کی درجہ مندی کرنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں پوری ہندوستانی تہذیب اور ہزار سالہ تاریخ باہمی میل ملاپ اور برصغیر کے خوابوں، امنگوں، امیدوں، ولولوں کی توہین بھی ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا سلیقہ اور بولنے کا ایک طریقہ بھی ہے، اردو محض زبان نہیں ایک طرز زندگی، اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے، اور وہ شکل دی ہے جیسے آج ہم اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔ درباروں سے اردو کا رشتہ بڑا معنی خیز ہے۔ اردو نے درباروں سے نہیں بلکہ خود درباروں نے اردو سے رشتہ پیدا کیا اردو بازاروں، گلیوں، کوچوں، میلوں ٹھیلوں، جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء کی زبان ہے۔

انہی جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء نے اسے قریہ قریہ، شہر شہر پھیلایا اور سورج کی کرنوں کی طرح یہ جہاں جہاں پہنچی آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب کرتی چلے گئی۔ اس کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی، دسیع النظری اور محبت اور یگانگت کا وہ تصور رہا۔ جس سے قومیں عروج پاتی ہیں۔ اور تاریخ میں ان کے نقوش جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جس میں جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء، اولیاء، نے توحید کے ترانے گائے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ ہوں یا حضرت فریدالدین گنج شکرؒ یا حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہوں یا خواجہ بندنواز گیسودراز، رامانند ہو یا تُکا رام کبیر ہو یا گرو نانک سینکڑوں جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء نے اس زبان کے سر پر شفقت اور دعاؤں کا ہاتھ رکھا۔



# اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب کے مصنف

## جان جوشو کیٹلر

اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب کے مصنف جان جوشو کیٹلر ہیں۔سولہویں صدی عیسوی کے دوران جب پرتگال اور یورپ کی دوسری قوموں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر اپنے اڈے قائم کرنے شروع کئے تو ان کو فارسی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی سابقہ پڑنے لگا۔ چنانچہ اہل یورپ میں سے سب سے پہلے جن لوگوں نے ہندوستانی یا اردو زبان کی طرف توجہ دی اور اس کی لغت اور قوائد مرتب کئے۔وہ پرتگیزی پادری تھے۔مگر ان لغات اور قواعد کو چھاپے خانے کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ادھر یورپ میں فارسی رسم الخط کی کتب چھاپنے کا سلسلہ 1639ء سے شروع ہو چکا تھا۔لیکن اس کے باوجود اردو کی طباعت کا آغاز اس کے کوئی سو برس بعد یعنی جنوری 1743ء میں ہوا۔جس کا اولین نمونہ ہمیں جان جوشو کیٹلر کی کتاب جو دراصل ایک طرح کی لغت اور ہندوستانی زبان سیکھنے کی کتاب میں نظر آتا ہے۔اس کا اندازہ اس کتاب کے نام سے بھی ہوتا ہے۔جس کا ترجمہ ہے۔''ہندوستانی اور فارسی زبان سیکھنے کے لئے ہدایات اور سبق،فعلوں کے مختلف صیغوں کی گردانیں، ہندوستان کے ناپ تول کے پیمانوں سے متعلق الفاظ اوران کے ولندیزی متبادل اور مسلمانوں کے مختلف ناموں کے معنی''

اس کتاب میں چند ہندوستانی یا اردو الفاظ ٹائپ میں بیشتر الفاظ رومن رسم الخط میں ولندیزی زبان کے تلفظ کے مطابق دیئے گئے ہیں۔البتہ فارسی اور عربی الفاظ کے لئے نسخ ٹائپ استعمال کیا گیا ہے۔اس کے بعد ہندوستانی زبان کے قوائد بھی بیان کئے گئے ہیں۔اور مختلف عنوانات کے تحت مثالیں دے کر گرائمر کے اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔اس کتاب کا مصنف جان جوشو کیٹلر جرمنی (ELBING) نامی شہر میں 1659ء کو پیدا ہوا تھا۔وہ مختلف شہروں میں ملازمتیں کرتا ہوا 1682ء میں ایمسٹرڈم پہنچا۔جہاں سے اس نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔اسی

دوران وہ ہندوستان آ گیا۔اور ترقی کرتا کرتا1700ء میں آگرہ کی فیکٹری کا اور پھر 1710ء سورت کی فیکٹری کا ڈائریکٹر ہوگیا۔1711ء میں اسے حکومت ہالینڈ نے ہندوستان میں سفیر مقرر کر دیا اور وہ 8/فروری 1711ء سے 7فروری 1713ء تک شاہ عالم بہادر شاہ ظفر اور جہانداد کے درباروں سے وابستہ رہا۔1715ء میں اسے شاہِ ایران کے دربار میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔جان جوشو کیٹلر نے 12/مئی 1718ء کو بندر عباس میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔فارسی اور اردو قواعد کی یہ کتاب اس نے اپنے لکھنؤ کے قیام کے دوران 1698ء میں لکھی تھی اس کتاب کا جو نسخہ ہالینڈ کے شہر دی ہیگ کے رائل آرکائیوز میں موجود ہے۔یہ ایک قلمی نسخہ ہے اوراس کے اختتام پر لکھنؤ 1698ء کے الفاظ درج ہیں۔غالباً یہ اس کتاب کا واحد مخطوطہ جواب دستیاب ہے۔یہ کتاب جان جوشو کیٹلر کی وفات کے تقریباً دو برس بعد جنوری 1743ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب کی اشاعت کے چند ماہ بعد اپریل 1743ء جرمنی کے شہر ہالے سے بنجمن شلز کی کتاب ''ہندوستانی زبان میں عیسائی عقائد کا خلاصہ'' شائع ہوئی جو یورپ میں اردو رسم الخط میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے۔



## باتوں سے خوشبو آئے

☆زندگی اِک سراب ہے جس کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں اور موت حقیقت ہے۔ جسے ہم فراموش کئے ہوئے ہیں۔☆خوشی ذہنی سکون عطا کرتی ہے اور غم ایک نئی دنیا سے روشناس کرواتا ہے۔جسے ڈوب کراُبھرنا بھی کہا جاسکتا ہے۔☆جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو طاقت خود بخود آجاتی ہے۔☆بے انصافی کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوجانا ہی بہادری ہے☆جو محبتوں کی قدر نہیں کرتے وہ نفرتوں کا نشانہ بنتے ہیں۔☆انسان کا راز جب تک اُس کے سینے میں رہتا ہے وہ سلامت رہتا ہے۔☆اپنے اندر اتنی بھاری خواہش نہ ڈالو جو اپنے بوجھ سے تمہیں گرا دے۔☆اپنے آپ کو چٹان کی طرح مضبوط اور دل کو پھول کی مانند نرم رکھو۔☆وفا کے موتی پروتے رہو گے تو نفرت کے کانٹوں سے دور رہو گے۔

# زبان ایک عظیم نعمت

انسان کے پورے جسم کے بارے میں سوچا جائے تو عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں کہ ہر عضو صحیح طریقے سے، ہر وقت کام کرتا ہے، اور ذرہ برابر بھی اس میں کوتاہی نہیں کرتا، چاہے وہ آنکھ ہو یا کان، ناک ہو یا زبان۔ یہ کیوں اپنے کاموں میں کوتاہی نہیں کرتے، اس کی وجہ صاف ہے کہ اس کی تخلیق اللہ عزوجل نے کی ہے اور اللہ عزوجل کی تخلیق کردہ اشیاء میں کوئی اُونچ نیچ نہیں ہوتی، سارے وقت پر صحیح کام کرتے ہیں۔ زبان ہی کی مثال لیجئے، یہ ایک گوشت کا ٹکڑا ہے لیکن اس کے اندر ایسی حیرت انگیز اور فکر انگیز صلاحیتیں پائی جاتی ہیں کہ انسانی عقل آج تک اس بات پر حیران ہے، کہ زبان کے اوپر صرف ایک شے رکھنے کی دیر ہوتی ہے باقی وہ اپنا کام خود کرتی ہے، فوراً پتہ دیتی ہے کہ اس کے اوپر رکھے جانے والی شے کیسی ہے یعنی اس کا ذائقہ بتا دیتا ہے کہ کڑوا ہے، میٹھا ہے یا ترش۔ حالانکہ یہ ایک گوشت کا ٹکڑا ہے لیکن ذائقہ پہنچاننے کی صلاحیت بھر پور رکھتی ہے۔ صرف یہ ہی نہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی شے کے ذائقے کی نشاندہی کریگا بلکہ بیک وقت جتنی چیزیں بھی زبان پر ہونگی ان سب کا ذائقہ بھی الگ الگ ہوگا تب بھی الگ الگ ذائقے کی تمیز کریگی اور وہ بھی ایک ہی وقت میں۔ آخر اس میں ایسا کیا ہے کہ جو ان تمام اشیاء کی بیک وقت امتیاز کرتی ہے؟ اصل معاملہ تو اللہ عزوجل ہی کو معلوم ہے اور ظاہری طور پر جو چیز ہمارے سامنے ہے اور جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ زبان کے اوپری حصے پر ایک جالی دار تہہ چھڑی ہوتی ہے جس کے اندر چھوٹے چھوٹے لاتعداد سوراخ ہوتے ہیں، یہی سوراخ لعاب بناتے ہیں اور جب کوئی شے ان سوراخون پر آجاتی ہے تو لعاب فوراً اس پر چپک جاتا ہے اور زبان نشاندہی کردیتا ہے کہ یہ چیز میٹھی ہے یا کڑوی۔ اور وہ لعاب منہ کے اندر پھیل جاتا ہے جس سے پورا منہ میٹھا یا کڑوا ہو جاتا ہے۔

زبان محض چکھنے کا کام ہی نہیں کرتی بلکہ بولنے میں بھی اس کا کمال ہے بغیر زبان کے انسان صحیح

طرح سے بولنے کے قابل نہیں رہتا۔یعنی زبان ذائقہ، بول چال اور لعاب بنانے میں مدد دیتی ہے، یہی نہیں اللہ عزوجل نے لعاب کے اندر ایک قسم کا انٹی بائیوٹیک ایسڈ بھی رکھا ہے جو منہ کے اندر ہر قسم کے زخم میں کافی حد تک کارآمد ہوتا ہے۔ جب منہ کے اندر زخم ہوجاتا ہے تو بسا اوقات ہم اس کے لیے کوئی دوا وغیرہ استعمال نہیں کرتے مگر وہ زخم کچھ عرصے بعد خود بخود ٹھیک ہوجاتا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ لعاب کے اندر زخم ٹھیک کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے۔

اللہ عزوجل نے منہ کے اندر زبان کو دانتوں کے درمیان اس لحاظ سے رکھا ہے کہ باتوں کے دوران، سونے کے دوران اور کھانے کے دوران زبان دانتوں کے نیچے نہیں آتی۔ یہ بھی ایک فکر انگیز نعمت اس میں موجود ہے کہ گفتگو کے دوران زبان دانتوں کے مختلف جگہوں سے ٹھکراتی ہے اور پل بھر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے اور اس کے منتقل ہونے میں ایک راز ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کی اس منتقلی کی وجہ سے ہی ہم منہ سے مختلف قسم کے الفاظ نکالنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ الفاظ جس کا تعلق زبان سے ہوتا ہے جس کو عربی میں لسانی حروف کہتے ہیں۔ کیونکہ زبان ہلائے بغیر بات کرنا صحیح طریقے سے ممکن نہیں، بول چال کی خوبصورتی بھی زبان کے استعمال کرنے کی وجہ سے آتی ہے اور زبان کا مختلف جگہوں سے ٹکرانا یہ ہمارے ان الفاظ کے ادا کرنے کا باعث ہے جن کا تعلق زبان سے ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک سوال ذہن میں آرہا ہوگا کہ کھانے کے دوران تو زبان کبھی کبھار دانتوں کے درمیان آجاتی ہے، اور زخمی بھی ہوجاتی ہے۔تو آسان جواب یہ ہے کہ یہ ہماری بے احتیاطی کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر احتیاط سے کھانا کھایا جائے تو کبھی بھی زبان دانتوں کے درمیان نہیں آئیگی اور جب کوئی اپنی زبان دانتوں سے کاٹ لے تو اس کے بعد وہ خود کہتا ہے کہ بے احتیاطی کی وجہ سے زبان دانتوں کے نیچے آگئی۔ زبان کے اندر موجود صلاحیت جن چیزوں سے متاثر ہوتی ہے ان میں گرم کھانا، سخت ٹھنڈا پانی پینا، زبان پے برف رکھنا، زیادہ نمک یا مرچوں والا سالن مسلسل استعمال کرنا اس سے معدہ بھی خراب ہوگا اور آخر میں جو چیز زبان کے لئے حد درجہ خطرناک ہے اس میں چھالیہ اور گٹکہ قابل ذکر ہیں یہ چیزیں واقعی بہت جلد زبان پر اثر انداز ہوتی

ہےاور آخر کار منہ کے کینسر کا سبب بن جاتی ہے۔زبان کی صلاحیت بھی اللہ عزوجل کی ان نعمتوں میں سے ہے جن کانعم البدل پھر میسر نہیں ہوتا، لہٰذا اگر ایک بار ضائع ہوجائے تو واپسی ظاہراً ناممکن ہے۔ یہ قدرت کا عجیب نمونہ ہے۔لہٰذا اس کی مکمل حفاظت کرنی چاہیے۔اللہ عزوجل نے جتنی بھی نعمتیں دی ہیں ان سب کا خیال رکھنا فرض ہےاور اگر خدانخواستہ کچھ نقصان ہوجائے توفوراً کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے تاکہ اس کا بروقت علاج ممکن ہو سکے، تاکہ اس نعمت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ ❁❁

## قران مجید کے معارف

☆قرآن کریم پڑھنے سے قبل اعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا مسنون ہے۔☆قرآن کریم کی صبح صبح تلاوت کرنے سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔☆قرآن کریم کو صبح وشام پڑھنے میں برکت ہے۔☆قرآن کریم ترجمہ کے ساتھ پڑھنے سے قرآن مجید کے معارف کھلتے ہیں۔☆قرآن کریم ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے سے قرآن کریم کے مطالب حاصل ہوتے ہیں۔☆قرآن کریم ترنم سے پڑھنے سے سننے والے محظوظ ہوتے ہیں۔☆قرآن کریم دوسروں کو سکھانے سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔☆قرآن کریم کا صبح وشام پڑھنا خدا تعالیٰ کے فضلوں کو حاصل کرنا ہے۔☆قرآن کریم تمام کتب سماوی کا مجموعہ ہے۔☆قرآن کریم خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہے جس کا نزول اس کے سب سے پیارے نبی پاک ﷺ کے دل مطہر پر ہوا۔☆قرآن کریم مسلمانوں کی جان ہے۔☆قرآن کریم مومن کی غذا ہے۔☆قرآن کریم کا ایک ایک حرف اپنے اندر مطالب کا خزانہ رکھتا ہے۔☆قرآن کریم کو تمام کتب سے افضل جاننا ثواب ہے☆قرآن کریم جنت کی کنجی ہے☆قرآن کریم کو پوری انہماک سے پڑھنا اوراس کے مطالب پر غور کرنا فرض ہے☆قرآن کریم سننے سے خدا تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے☆جو قرآن کو عزت دیں گے وہ آسمان پر عزت پائیں گے۔

# یہ زندگی

جو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے۔کبھی بہت اچھی اور آسائشوں سے لبریز زندگی چھوڑنی مشکل ہے اور جب حالات اور واقعات ذرا سے ٹیڑھے ہو جائیں۔تو یہی زندگی جو عطیہ خداوندی ہے۔مصیبت اور تکلیف دہ ہوتی ہے کہ کیسے گزریں گے۔یہ دن اور یہ راتیں۔خدا تعالیٰ نے سب انسانوں کا دنیا میں آنا ایک طریق پر رکھا لیکن آدم کی اولاد کے ''مقدر کا لکھا'' میں کیوں فرق کر دیا۔کہیں تو زندگی ایک آرام و آسائش،خوشیوں،محبتوں،خواہشات کی تکمیل کا چلتا دور اور کہیں پر سانس ہر لمحہ امتحاں و آزمائش اور جذبات و احساسات کی قربانی یہ سب ہی تو زندگی ہے۔پیاسے کو پانی کی قدر اور بیمار سے صحت کی نعمت پوچھو تو بتا سکے گا؟ جس کو جو ملا وہ مطمئن نہیں کر سکتا اور جو مل نہیں سکتا یا دائرہ اختیار میں نہیں اس کے لئے واویلا اور حسرت اور شکوے شکایت۔یہ انسانی فطرت ہے۔جو خدا تعالیٰ سے ملی ہوئی نعمت بھی اور مصیبت بھی۔دل چاہتا ہے خدا سے پوچھوں بار بار پوچھوں؟

جب خواہشات حسرتیں بن جائیں جب اپنی پہنچ سے چیزیں آگے چلنا شروع کر دیں۔جب خوابوں کی تعبیریں نہ ملیں۔جب سوچ کے دھارے بکھرتے جائیں۔جب قدم سیدھے راستے پر بھی پھسلتے جائیں۔اور بار بار قدم ڈگمگائیں۔جب دنیا کی خوبصورتی میں کوئی کشش نہ رہے جب ہر سانس بھی بوجھ بنتا جائے تو وہ کیا زندگی بس دھکا ہے جو انسان کو زندگی دیتا ہے۔یا زندگی انسان کو اور دن گزرتے جاتے ہیں۔کبھی رو لئے کبھی مسکرا دیئے اور کبھی اپنی ہی حسرتوں پر قہقہے بھی برسا یئے۔یہ سب ہے مقدر اور مقدر کا لکھا انسان کے اختیار میں نہیں۔اس لئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ تقدیر پر جو اچھی یا بُری ہے۔تقدیر بنانے والا ایک ایسا وجود،ایسی ہستی عظیم الشان ہستی ہے جو نہ نظر آتی ہے اور نہ آنسو پونچھتی ہے بس دنیا کو اک نہ نظر آنے والا وجود ہے جو چلا جا رہا ہے نظام ہستی گردش میں ہے۔جب ہم وجود کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔اپنی حاجات کا دامن پھیلا دیتے ہیں۔اس یقین کامل کے ساتھ کہ کوئی ایسی عظیم الشان،اعلیٰ اور ارفع ہستی ہے جو ہماری دادرسی کرے گی تو اپنے

عبد بننے کا ثبوت دیتے ہیں۔وہ عظیم ہستی اگر چاہے تو کن کہہ کر ناممکن کو ممکن کر دیتا ہے، اور نہ چاہے تو بنے بنائے مقدر بھی بگڑ جاتے ہیں۔انسان خوش ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہمت اور محنت سے منزل تک پہنچ جائے گا۔مگر خدا نہ چاہے تو منزل سراب بن جاتی ہے اور انسان اپنے قدم گنتا رہتا ہے اور زخم سہلاتا ہے۔بس یہ تو اوپر والا جانے کہ کیا اچھا ہے؟ کیا برا ہے؟ اس لئے ہمارا کام تو اس در پر صدا دینا اور دیتے چلے جانا ہے۔اپنی جھولی پھیلائے رکھنا ہے۔اپنی حاجات بتاتے رہنا ہے اور اس ہستی سے امید لگائے رکھنا ہے وقت پر وہ سب ہو جو خدائے عظیم نے مقدر کر دیا۔اور جو دینا ہے مقدر کا دینا ہے۔اپنے حصہ کا لینا ہے۔صبر و صلوٰۃ کے ساتھ مستقل مزاجی اور یقین کامل کے ساتھ کہ ایک ہستی ہے جو سن رہی ہے جو قادر ہے دے سکتی ہے دے گی اگر نصیب میں ہے اس لئے کہ ہمارا کام مانگنا ہے اور مثبت طریقوں سے جدوجہد مسلسل کرتے رہنا ہے۔وہ داتا ہے دے یا نہ دے اس کی رضا پر ہمیں راضی رہنا ہے اور یہی سمجھوتا ہمیں زندگی گزارنے کا فن سکھاتا ہے۔



## وصیت کی رُو سے

امریکہ کے شہر کنٹکی کے شہر کی ایک بیوہ مسز یلی جب مریں تو اُن کی وصیت پڑھی گئی۔تو معلوم ہوا کہ اس نے دو کروڑ ڈالر کی رقم صرف اُن رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی وصیت کی ہے۔جنہوں نے نہ کبھی شراب پی ہو اور نہ کبھی نائٹ کلب میں گئے ہوں۔مرنے والی کے رشتہ داروں میں صرف ایک ہی فرد ایسا تھا جو ان شرائط پر پورا اُترتا تھا اور اُس کی عمر دو سال تھی۔کتنی دور سے۔۔ایک عدالت میں ٹریفک کا ایک مقدمہ پیش ہونے پر وکیل نے گواہ پر جرح کرتے ہوئے پوُچھا۔'' آپ کہتے ہیں کہ آپ اس وقت جائے وقوعہ سے ۳۵ فٹ دور تھے۔کیا آپ عدالت کو بتائیں گے کہ کہ آپ کتنے فاصلے سے صاف دیکھ سکتے ہیں؟ گواہ نے جواب دیا جب میں صبح اُٹھتا ہوں تو روزانہ سورج کو صاف دیکھ لیتا ہوں اور سنا ہے کہ'' سورج ہم سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے''

# شعر کی طاقت

شعر انسان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکارنہیں کر سکتا۔شعر سننے والا اشعار کے مفہوم اور معانی سے متاثر ہوتا ہے۔خواہ زیادہ یا کم۔یہ اس سامع کی ذہنی اور قلبی کیفیت کی حالت شعر کے معانی اور مفہوم سے ہم آہنگ ہوگی۔تو وہ بہت زیادہ متاثر ہوگا، ہوسکتا ہے یہ اشعار سامع کے ذہن وقلب کو بدل کر رکھ دیں۔اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیں۔تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں شعراء نے اپنی جادُو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح پائی، اور ایک شکست خوردہ فوج کی غیرت، بہادری اور جرات کو بیدا کر کے اس کو فتح سے ہمکنار کر دیا۔بعض اوقات شاعر سے عوام اسقدر اور مسحور متاثر ہوتے ہیں کہ شاعری کی حرکات وسکنات اور عادات کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔بعض اوقات وہ شاعر کے عیب بھی اختیار کر لیتے ہیں۔لارڈ بائرن کی نسبت مشہور ہے کہ لوگ اس کی تصاویر خریدتے تھے۔اس جیسے اشعار کہنے کی کوشش کرتے تھے۔اس کے اشعار یاد کرتے تھے۔اس کا سا انداز اختیار کرتے ہوئے وہ اشعار لوگوں کو سناتے تھے۔لوگ آئینہ سامنے رکھ کر مشق کیا کرتے تھے کہ اوپر کے ہونٹ پر ویسی ہی شکن ڈالیں جیسی کہ لارڈ بائرن کی بعض تصویروں میں پائی جاتی ہے۔ہمارے ہاں بھی لوگ علامہ اقبال، غالب ومیر کے انداز کو اختیار کرتے ہیں۔ان کی عادات کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب ان سے پوچھا جائے میاں یہ کیا؟ تو کہتے ہیں فلاں شاعر بھی ایسے کیا کرتے تھے۔اسی طرح ایک دوست ہیں وہ بڑی سیدھی سادی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے۔ایک دن ان سے ملاقات ہوئی تو قائداعظم کا تکیہ کلام استعمال کر رہے تھے۔ان سے کہا حضرت ابھی یہ تکیہ کلام رواں نہیں ہوا۔آپ بہت کوشش کر کے استعمال کرتے ہیں۔کہنے لگے کبھی تو رواں ہو ہی جائے گا۔ہماری قدیم عربی فارسی شاعری میں بہت سے ایسے مواقع بھی آئے جب شعراء نے قوموں کو فتح دلائی۔یہ صرف عربی فارسی شاعری پر منحصر نہیں ہے۔

1۔ لارڈ بائرن کی ایک مشہور نظم چائلڈ ہیر پلگر میج ہے جس میں فرانس، انگلستان اور روس کو

انگیخت کیا گیا ہے۔ کہ وہ یونان کو ترکوں کے قبضے سے آزاد کرائیں۔ آخر پر ایرانیوں کو یہ کہہ کر ابھارا گیا ہے کہ غیروں سے کچھ امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ بلکہ خود اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے ترکوں کو یونان سے نکال باہر کرنا چاہیئے۔ 1812ء میں یہ نظم شائع ہوئی جس کے سبب بائرن کی شاعری کی سارے یورپ میں دھوم مچ گئی۔ فرانس، اٹلی، انگلستان، روس اور آسٹریا کے عوام پر اس نظم نے وہ کام دکھایا جو آگ بارود پر دکھاتی ہے۔ یونان نے ترکوں سے بغاوت کر دی اور یورپ کی تمام بحری طاقت یونان کی مدد کو پہنچ گئی۔ 1827ء میں ان متحدہ افواج نے ترکوں کو زبردست شکست سے دوچار کر دیا اور ترکی ایران کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ تمام یورپ نے یونان کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ ڈنمارک کا ایک شہزادہ اوتھو بویالنا کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد ترکی کو بلقان ریاستوں پر قبضہ رکھنا دُوبھر ہو گیا اور وہ ایک ایک کر کے آزاد ہو گئیں۔

2۔ رودکی ایران کا مشہور شاعر تھا۔ جب امیر نصر بن احمد سامانی نے خراسان کو فتح کیا اور ہرات کی فرحت بخش آب و ہوا اسے پسند آئی تو اس نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ اور بخارا کو جو اصل دارالحکومت تھا فراموش کر دیا۔ اُمراء اور جنرل ہرات میں رہتے رہتے اُکتا گئے اور اہل ہرات بھی اس جبری مہمان نوازی سے تنگ آ چکے تھے۔ چنانچہ استاد ابوالحسن رودکی سے درخواست کی گئی کہ امیر کو ہرات سے کوچ پر آمادہ کیا جائے۔ تو رودکی نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ کہ بخارا میں ابتری پھیلی ہوئی ہے اور دشمن قبضے کے لئے دانت تیز کر رہے ہیں۔ اہل بخارا بھی بادشاہ سے نااُمید ہو چکے ہیں۔ جب بادشاہ شراب اور راگ میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے یہ قصیدہ پڑھا۔ ان اشعار نے بادشاہ کے دل پر اتنا اثر کیا کہ بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر مع لشکر کے بخارا کو روانہ ہو گیا اور دس میل پر جا کر پہلا پڑاؤ کیا۔

3۔ یونان میں ایتھنز اور مگارر یاستوں کے درمیان جزیرہ سلیمس کی وجہ سے مدت دراز تک برسرِ پیکار رہیں۔ ایتھنز والوں کو پیہم شکست سے دوچار ہونا پڑا، اور رفتہ رفتہ ان کا حوصلہ ایسا پست ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے لڑائی سے دست بردار ہو گئے۔ اور یہ مایوسی اس حد تک بڑھ گئی کہ فیصلہ کیا گیا کہ جو شخص اس لڑائی کا ذکر کرے گا یا دوبارہ لڑنے کی تحریک کرے گا۔ وہ قتل کیا جائے گا۔ اس وقت

ایتھنز کا مشہور مقنن سولن زندہ تھا۔ اس کو بڑی غیرت آئی اس نے اہل وطن کو پھر لڑائی پر آمادہ کرنا چاہا۔ وہ دانستہ مجنون بن گیا جب یہ بات مشہور ہوگئی کہ سولن دیوانہ ہوگیا تو وہ پرانے زرد کپڑے پہن کر گلے میں رسی ڈال کر گھر سے نکلا۔ سولن کا یہ حال دیکھ کر لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ اپنے درد انگیز اشعار میں اہل ایتھنز کو ابھارتا اور لوگوں میں اشتعال پیدا کرتا آہستہ آہستہ جزیرہ سلیمس کے لوگوں میں اسے دوبارہ واپس حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اور انہوں نے اپنا سب سامان فروخت کر کے ہتھیار خریدے اور بڑی تیزی اور بہادری سے پرسگار پر حملہ آور ہوئے کہ دشمن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔

4۔ 1830ء میں جب شاہ فرانس چارلس دہم نے قانون آزادی کے خلاف کاروائی کرنی شروع کی اور رعایا فرانس میں سخت اضطراب اور سراسیمگی پیدا ہوئی اس وقت فرانس میں بھی دو قصیدے لکھے گئے تھے۔ ایک منسوب بہ پیرس۔ دوسرا منسوب بہ مارسیلز جو شاہراہوں، گزرگاہوں، پارکوں، ہڑتالوں اور مظاہروں کے وقت گائے جاتے تھے۔ جن میں فرانس کے عوام کو بادشاہ سے بغاوت اور آزادی کی حمایت کرنے پر اُکسایا جاتا تھا۔ غرض یہ شاعری انسانی ذہن کو بہت جلد متاثر کرتی ہے اور شاعری ہمیشہ ایسی ہونی چاہیئے۔ جو بامقصد اور انسانی فلاح و بہبود میں ممد ہو بعض اوقات غلط قسم کی شاعری قوموں کو بے راہ بنا دیتی ہے۔ جس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔



## شہرِ دِل

ایک آرٹسٹ کو دل کے دروازے کی تصویر بنانے کو کہا گیا۔ اس نے بہت حسین گھر بنایا اور اس میں ایک خوبصورت سا دروازہ بنایا مگر اس کا ہینڈل نہیں تھا۔ کسی نے پوچھا۔ ہینڈل کیوں نہیں؟ تو اس آرٹسٹ نے بہت ہی خوبصورت بات کہی۔

''دل کا دروازہ اندر سے کھولا جاتا ہے۔ باہر سے نہیں اگر باہر سے کھولا جاتا تو کسی کے دل میں جگہ بنانا بہت آسان ہوتا۔''

# نقاد۔ایک روپ

شاعراورافسانہ نگارکسی کوخاطرمیں نہیں لاتے۔کوئی شاعرکسی دوسرے شاعرکواپنے سےتوبڑاتو بڑی بات ہےاپنے برابربھی تسلیم کرنے کوبھی تیارنہیں ہوتا۔اسی طرح کوئی افسانہ نگاراس مفروضہ کو گوارانہیں کرتا۔اسے سب سے اچھاتسلیم نہ کیا جائے۔کرشن چندر نے جب مذاق مذاق میں ہی افسانہ کی قلمرومیں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیاتوسعادت حسن منٹونے ایک لمحہ وتوقف کے بغیرہی اپنے شہنشاہ ہونے کی منادی کرادی تھی۔یگانہ نے شہنشاہ سے بھی بڑھ کرغالب تک کونہیں بخشا تھا لیکن شاعر یاافسانہ نگاراگرکسی کوخاطرمیں لاتا ہےتووہ نقاد ہے۔نقادایک ایسا قلندر ہے،جس کے سامنے بندربھی ناچتا ہے۔نقادتونقاد،نقاد کے بچے کوبھی اہمیت دینا،شاعر،افسانہ نگاریادوسرا قلمکار اپنے فرائض منصبی میں داخل سمجھتا ہے۔

نقاد کے بچے سے مرادوہ بچہ بھی ہوسکتا ہے جسے غصے میں نقاد کا بچہ کہا جا تا ہے۔مطلب یہ ہے کہ نقادکو باپ دادا سمجھنا کتنا ہی برا کیوں نہ لگے مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سگ لیلیٰ سے پیار کیا جائے،اورقلمکار کے لئے نام اورشہرت سے زیادہ محبوب لیلیٰ اورکون ہوسکتی ہے۔؟ ویسے بھی اگرنقاد کا بچہ یعنی فرزندارجمنداگرسامنے آجائے تواسے سلام کرلیا جائے تاکہ یہ سلام ایک نسل سے دوسری نسل تک یعنی لڑکے سے اس کے باپ تک منتقل ہوجائے۔کیونکہ ہربچہ باپ بھی ہوتا ہےاس لئے باپ کو باپ ماننے میں کیا قباحت ہے۔فلمسٹاراورلیڈر جو ہمیشہ اپنے چمچوں میں گھرے رہتے ہیں۔کسی سے آنکھ ملانے سے اس طرح بچنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے آنکھ ملی اورعزت گئی۔جیسے آنکھ کا ملانا نہ ہوااپنے آپ کوکسی کی نظروں سے گرالینا ہوا۔چنانچہ فلمسٹاراورلیڈر کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔لیکن فلمسٹاراورلیڈربھی جرنلسٹوں کودیکھ کراپنی ساری اکڑفوں بھول جاتے ہیں کیونکہ جرنلسٹ میں بھی ایک نقادسمایا ہوتا ہے۔اورجرنلسٹ کا رول بھی نقاد کے رول سے مختلف نہیں ہوتا۔ جرنلسٹ سے بھی نام ملتا ہےشہرت ہوتی ہےعیب ڈھانکے جاتے ہیں اوراس بات سے کون انکارکر سکتا ہے کہ لیلائےشہرت کےآگےحقیقی لیلیٰ ہیچ ہوتی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جرنلسٹ یانقاد سے جہاں نام اورشہرت ملتی ہے۔نام اورشہرت کوگہن بھی لگ

سکتا ہے۔ نیک نامی کی بجائے ذلت بھی مل سکتی ہے ۔بات نقاد کی چل رہی ہے۔درمیان میں جرنلسٹ کہاں سے آ گیا۔؟ جرنلسٹ کہیں سے بھی وارد ہوسکتا ہے۔یہاں وہ نقاد بن کر مسلط ہوا ہے لیکن اگر اگر بات اردو کے نقاد تک ہی محدود رکھی جائے۔تو بات زیادہ آگے نہیں بڑھے گی۔نقاد اور نقد میں بہت تھوڑا فرق ہے۔نقاد نقد سے سوا ہے۔اس کے درمیان میں اضافہ ہے۔اس لئے نقاد کا معاملہ نقد ہوا کرتا ہے۔یہی خوب سودا نقد ہے۔اس ہاتھ لے اُس ہاتھ دے۔چھوٹے سے چھوٹا بلکہ ادیبوں کی فہرست کا آخری ادیب بھی اگر نقاد سے جھک کر ملے سلام کرے۔اس کی پسند اور مجاز کے مطابق خاطر تواضع کا خیال رکھے اور اس کے نازنخرے سہے تو فہرست مذکور کا آخری یعنی ادیب کا ادنیٰ ترین نام ہونے کے باوجود ادب کا آخری مغل ہونے کی سند نقاد سے حاصل کرسکتا ہے۔سند ہی نہیں بلکہ توصیف نامہ بھی اپنی کتاب کے مقدمہ پیش لفظ یا دیباچہ کی شکل میں یا کسی اور عنوان سے نقاد سے لکھوا سکتا ہے۔

اگر کتاب شائع ہو چکی ہو تو تبصرہ لکھوا کر یا کسی تقریب میں مضمون پڑھنے کے لئے کسی نقاد کو آمادہ کر کے اس سے سند توصیف حاصل کرسکتا ہے۔اس کے برخلاف اگر نقاد کسی کو پاتال میں پہنچانا چاہے تو اسے جوش بھی ٹھنڈا اور جگر بھی بے جگر دکھائی دیتا ہے۔کرشن چندر کو اس کی نظر میں قلم پکڑنا ہی نہیں آتا۔غرض یہ کہ کوئی اس کی نظر میں نہیں سماتا۔حتیٰ کہ میرؔ اور غالبؔ بھی اس لئے نقاد سے بگاڑ مول لے کر کوئی ادیب اپنی عاقبت خراب کرنا نہ چاہے گا۔اچھا یہ بھی مان لیتے ہیں کہ نقاد نہ کچھ لکھے گا نہ کہیں کچھ کہے گا، نام تک زبان پر نہیں لائے گا لیکن اس کا خاموش رہنا بھی تو بہت بڑا کرم ہوتا ہے ۔یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ خاموش رہے نقاد کو خاموش رکھنے کے لئے بھی کیا کیا جتن نہیں کئے جاتے۔اس کے قلم کو روکنے کے لئے ہر طرح کی پیش بندی کی جاتی ہے۔اس لئے کس میں یہ تاب ،یہ مجال، یہ طاقت ہے کہ استادوں کے استاد یعنی نقاد سے پرخاش مول لے۔کیونکہ استادوں کے استاد کے سامنے استاد شہ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔وہ بے چارہ تو شہ کا مصاحب بن کر اتراتا پھرتا ہے، اور یہ استادوں کے استاد اپنے آگے پیچھے ''آزو بازو'' اوپر نیچے ہمیشہ ہر طرف مصاحبین ادب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

# انسان کی عمر

یونان کی کہانی ہے کہ جب زیوس دیوتا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی عمر بہت مختصر لکھی ! جب سردی کا موسم آیا تو انسان نے اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے اپنے لئے ایک مکان بنایا۔ ایک دن ایک گھوڑا سردی اور برفباری سے تنگ آ کر انسان کے پاس آیا اور پناہ مانگی۔ انسان نے شرط لگائی کہ وہ تب پناہ دے گا اگر وہ اپنی عمر کا ایک حصہ اسے دے۔ گھوڑے نے یہ شرط منظور کر لی۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک بیل موسم سے پریشان ہو کر انسان کے پاس آیا۔ انسان وہی شرط سنائی اور بیل نے منظور کر لی۔ آخر میں ایک ادھ موا کتا سردی سے کپکپاتا ہوا اور انسان کی شرط منظور کرتے ہوئے مکان میں پناہ گزیں ہوا۔ اس لین دین کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیوس دیوتا کی عطا کردہ مختصر عمر کے دوران انسان اچھا خوش اخلاق اور پاک صاف رہا مگر جب انسان نے گھوڑے کی عطا کردہ عمر کا استعمال کیا تو وہ مغرور اور خودسر ہو گیا، جسے قابو میں لانا مشکل تھا، جب وہ بیل کی عمر کو پہنچا تو وہ مدبر اور سنجیدہ ہو گیا اور عمر کی آخری منزل پر جب وہ کتے کی عطا کردہ عمر کو پہنچا تو وہ بددماغ اور چڑچڑا ہو گیا کاش وہ زیوس دیوتا کی عطا کردہ عمر پر ہی اکتفا کرتا۔



## ایک اور وصیت

مس الزبتھ نے مرنے کے وقت منظوم وصیت کی۔ جس کا مطلب تھا کہ ''جب میری زندگی کی ندی اُتر جائے تو میرے جسم کو نذر آتش کر دیا جائے۔ اور اس کی لاش کو دریائے چارکی موجوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن اگر دریا کا پانی برف میں تبدیل ہو چکا ہو۔ تو راکھ کو ایک کشتی میں رکھ کر دور ساحل سے ایک میل سمندر میں لے جایا جائے۔ تا کہ خدا کا وسیع سمندر مجھے ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں لے لے۔

# اچھی ماؤں کی ضرورت

حالیہ ایک مجلس مذاکرہ جس کا موضوع ''اکیسویں صدی میں عورت کا مقام'' تھا۔ اس کے اختتام پر کہا گیا کہ نئی صدی کو اچھی ماؤں کی ضرورت ہے۔ عورتوں میں اعتماد پیدا کیا جائے۔ عورت ایک حقیقت ہے۔ اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر تخلیق کی گئی ہے۔ ان بیانات کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آئے دن اخبارات کے رنگین صفحات اور ٹی وی کے اشتہارات، خواہ کسی قسم کا ہی اشتہار کیوں نہ ہو عورت ضرور دکھائی جاتی ہے۔ معاشرے کا گہری نظر سے مشاہدہ کریں۔ خواہ ایئر لائن ہو، کارپوریشن، بینکاری یا کھیت کا کام ہو، زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر سفر میں عورت اعتماد کے ساتھ کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں نیک سیرت اور سلیقہ شعار ماؤں کی ضرورت ہے۔ جنہوں نے محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، جیسے فرزندان اسلام کی تربیت کی۔ ایسی مائیں چاہئیں جنہوں نے قائداعظم، چودھری ظفر اللہ خان، ڈاکٹر عبدالسلام اور اقبال جیسے مدبران کی تربیت اور پرورش کی۔ حالانکہ یہ مائیں جدید تعلیم و آسائش و آرام سے بھی آراستہ نہ تھیں۔

یہ مائیں گھروں میں رہ کر بغیر اخبارات کی زینت بنے، اچھی اور قابل فخر مائیں تھیں۔ آج کی ماڈرن عورت اور وسیع تر مفادات کا نظریہ نصب العین بنانے والی عورت دوسری عورت کو حقوق دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ کبھی ان کے گھریلو ملازمین اور کام کرنے والی عورتوں سے پوچھیئے تو انکے اندرونی، محبت، صبر، حسن سلوک ان کے خوبصورت میک اپ کے برعکس دکھائی دیتے ہیں ان کی لگائی ہوئی خوشبو بدبو محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں تو وہی اَن پڑھ، سلیقہ شعار اور دین دار مائیں ہی قبول ہیں۔ جن کی گود سے پرورش پانے والوں نے ہمیشہ انسانیت کی بھلائی کے لئے اور بنی نوع انسان کی پاسداری کے لئے کبھی مصلحت کے تحت بھی سودا بازی نہیں کی۔ رہا یہ کہ عورت ایک حقیقت ہے۔ اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر تخلیق کی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی تعلیم بغور نہیں پڑھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو آبگینہ سے تشبیہ دی۔ مغرب نے جو عورت کو نام نہاد آزادی دی ہے۔ اس میں اس کی عصمت کو سرعام نیلام کر کے رکھ دیا ہے۔ اپنے

میک اپ کے نام پر وہ ایک دن کا چوتھائی وقت صرف اپنے جسم پر خرچ کرتی ہے۔مرد سے برابری کی سوچ نے اسے حد درجہ احساس کمتری کا شکار کر دیا ہے۔آزادی کے چکر میں دونوں اول تو اولاد سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں۔اگر ایک آدھ بچہ پیدا بھی ہو جائے تو حقوق اولاد اور فرائض سے غافل ہو چکے ہیں۔اور پھر جب اولا دان دونوں ماں باپ کا رہن سہن، دکھاوے کی محبت، بات بات پر مساویانہ حقوق کی بحث، اور قانونی چارہ جوئی وغیرہ کا مشاہدہ کرتی ہے تو ان سے جلد ہی کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔اس طرح یہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔



## بے بسی

بے بسی ایسا لفظ ہے جو اپنے اندر بے حد لاچاری سمیٹے ہوئے ہے۔انسان زندگی میں کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے کہ صلاحیتوں اور قابلیت کے ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتا۔یہ صبر کا دامن ہی ہے جو بے بسی کے آنسو صاف کر دیا کرتا ہے کیونکہ صبر کرنے سے خدا کا ساتھ نصیب ہوتا ہے۔جس کے ساتھ اللہ ہو اسے اور کیا چاہیئے۔امتحان کے بعد صبر پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے پر انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

## محبت کیا ہے؟

محبت کے چار حروف انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔محبت ایک بہت پیارا جذبہ ہے۔محبت کبھی زبردستی نہیں کروائی جا سکتی۔البتہ یہ خود ہم پر حاوی ہونے کی طاقت رکھتی ہے۔محبت کے بہت رُوپ ہیں بعض بہت سُندر بھی ہیں اور کچھ بھیانک بھی۔محبت کو سمجھنا انسان کے بس میں نہیں محبت اگر اللہ سے ہو تو دنیا و آخرت سنور جاتی ہے ہم بہت پُرسکون رہتے ہیں۔کچھ ایسا ہی حال والدین اور بہن بھائیوں کی محبت کی صورت میں انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔میاں بیوی اور بچوں کی محبت کا اپنا ہی ایک حسن ہوتا ہے۔یہ تمام محبتیں ہمارے لئے زندگی کا خوبصورت احساس بن جاتی ہیں۔ہمیں اپنے ان رشتوں کی بہت فکر رہتی ہے۔ہمیں ان کی خوشیوں کے جو کرنا ہو کرتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں باقی اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

# تا تامی

جاپان میں چاول کی بھوسی سے ایک خاص قسم کی چٹائیاں بنائی جاتی ہیں۔ جو گھروں کی زینت بنتی ہیں۔

جاپانی زبان میں انکو تا تامی کہتے ہیں، اور ملک میں اس کو ایک بہت بڑی گھریلو صنعت کی حیثیت حاصل ہے۔ اب چٹائیوں کو گھروں کے فرش کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے، اور ان کے رنگوں کا امتزاج گھر کی زینت بنتا ہے۔ چاول چھننے کے بعد اس کی بے کار شاخوں اور تنکوں کو اکھٹا کر لیا جاتا ہے۔ اور پھر ان تنکوں کو دبایا جاتا ہے حتیٰ کہ ان کی موٹائی پانچ چھ سنٹی میٹر ہو جاتی ہے اس کے بعد ان کو سخت کرنے کے لئے پٹسن کے دھاگوں سے بنا جاتا ہے۔ تا تامی چٹائی بنانے کے اس عمل کو جاپان میں تا تامی کہتے ہیں۔ ہر تا تامی عموماً 182 سینٹی میٹر لمبی اور 90 سینٹی میٹر چوڑی ہوتی ہے، اور جس کا وزن تقریباً 22 کلو ہوتا ہے۔ جاپانی گھروں کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ بھی تا تامی کے ذریعہ لگایا جاتا ہے۔ یعنی کسی گھر کی لمبائی چوڑائی معلوم کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں گھر میں ساڑھے چار تا تامی یا چھ تا تامی کمروں کے فرش پر بچھایا جاتا ہے۔ جاپان میں تا تامی کو بڑی تعداد میں کارخانوں میں مشینوں کے ذریعہ بنایا جاتا ہے مگر ان چٹائیوں کو لوگ انفرادی طور پر اب بھی ورکشاپوں میں بناتے ہیں۔ نئے سال کے شروع میں لوگ پرانی تا تامی چٹائیوں کا کاروبار خزاں کے اخیر سے موسم سرما کے آغاز تک زوروں پر رہتا ہے۔ تا تامی کو بطور فرنیچر کے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تا تامی چٹائی موسم سرما میں گرمائش اور موسم گرما میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ چاول کی بیکار بھوسی کی یہ چٹائی جاپان میں گھر گھر پائی جاتی ہے۔



# دیوارِ چین



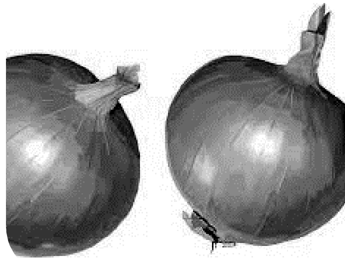
حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے 200 سال قبل چین کے بادشاہ ''شی ہوانگ ٹی'' نے اپنے ملک دشمنوں سے بچانے کے لئے شمالی سرحد پر ایک دیوار تعمیر کروائی جو کئی سو سال میں مکمل ہوئی۔اس کی تعمیر میں ہزاروں مزدوروں نے حصہ لیا،اور کئی ہزار مزدور اس کو بناتے وقت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے کیونکہ یہ پہاڑی علاقے میں بنائی گئی تھی۔کہا جاتا ہے کہ جو مزدور اس کی تعمیر کے وقت مر جاتا اس کی لاش کو اسی دیوار میں چُن دیا جاتا تھا۔بادشاہ نے یہ دیوار چینیوں کے سب سے بڑے دشمن تاتاریوں کے حملے کے ڈر سے بنوائی تھی۔کیونکہ وہ بہت وحشی اور ظالم تھے۔انہوں نے ایشیا میں تباہی مچا رکھی تھی۔اس دیوار کی لمبائی 2450 کلومیٹر اور اونچائی 20 سے 30 فٹ اور چوڑائی نیچے سے 25 فٹ اوپر سے 12 فٹ تک ہے۔ہر 20 گز کے فاصلے پر مضبوط چوکیاں بنائی گئی ہیں۔جن میں سے پہرے دار دشمنوں پر نظر رکھتے تھے۔یہ دیوار خلیج لیاؤ تنگ سے منگولیا اور تبت کے سرحدی علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے۔



## ظالم لوگ

نامور شاعر منیر نیازی ایک رکشے میں کہیں جا رہے تھے۔وہ اپنے خیالات میں گم تھے کہ اچانک رکشہ رُک گیا۔پوچھا کیا معاملہ ہے؟ ڈرائیور نے بتایا کہ جنازہ گزر رہا ہے۔منیر نیازی جو جملہ سازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے،بولے ''ظالمو! تم بھی کیسے لوگ ہو زندہ انسان کو تو کچل کر گزر جاتے ہو اور جنازے کے احترام میں رکشہ روک لیتے ہو۔''

# پیاز ایک مفید سبزی



مشہور فرانسیسی محقق گستاولی بان جو تاریخ عرب پر ایک سند رکھتا ہے لکھتا ہے کہ کھجور کے بعد عربوں کی بہترین اور پسندیدہ غذا پیاز اور لہسن جیسی سبزیاں تھیں۔ خلفاء عباسیہ کے دور میں پیاز کے گوناگوں خصائص دریافت کئے گئے۔ بوعلی سینا کی مشہور کتب میں پیاز کے بارے میں جو معلومات درج ہیں انہیں دیکھ کر یورپ اور امریکہ اور رُوس کے سائنسدان اقرار کرتے ہیں کہ جو صدیوں پہلے جو باتیں دریافت کی گئیں تھیں وہ آج بھی حرف آخر ہیں۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں پیاز کے مربے اور چٹنیاں ایجاد کی گئیں۔ جو خلفاء کو بہت پسند تھیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران جب یورپی عیسائیں نے ملک شام کے بعض علاقوں اور یروشلم کو فتح کیا اور یہاں رہ کر وہ پیاز کے استعمال اور افادیت سے واقف ہوئے اور ملک شام سے پیاز کی ایک عمدہ قسم اپنے ساتھ یورپ لے گئے۔ اس کا رنگ سرخ تھا، اور ذائقہ شیریں، اور اس کی سبز جڑوں میں سے نہایت مسحور کن خوشبو آتی تھی۔ جب اسے گوشت کے ساتھ پکایا جاتا تو دور دور تک خوشبو پھیل جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگ پیاز کی طرف متوجہ ہوئے اور پہلے جو نفرت تھی وہ جاتی رہی۔ 1596ء میں یورپ میں پہلی بار جڑی بوٹیوں اور پودوں پر جو کتاب لکھی گئی اس میں تمام تر مواد، معلومات عربی اور یونانی کتب سے اخذ کیا گیا۔ اس کا ایک خاص پیاز کے خصائص پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے۔

1۔ پاگل کتے کے کاٹنے کا شافی علاج بھی پیاز سے کیا جاتا ہے۔

2۔ گنج کا بہترین علاج پیاز کا عرق ہے۔ اسے سر پر مالش کرنے سے دوبارہ بال اُگ آتے ہیں۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا بانی شہنشاہ ظہیرالدین بابر اپنی خودنوشت تزک بابری میں اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ہم پر ایسا وقت بھی آیا جب کھانے کو کچھ نہ ملا آخر پیاز اور شہد کے ذریعے بھوک مٹائی اور ایسی جسمانی تقویت حاصل ہوئی جو اعلیٰ سے اعلیٰ مقوی ترین غذاؤں سے

بھی نہ ملی۔اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں قوم بنی اسرائیل پیاز ذوق شوق سے کھتی تھی۔شہنشاہ ہمایوں حقے کا شوقین تھا۔طبیب نے تمبا کو کے مضر اثرات کو ضائع کرنے کے لئے تمبا کو کو پیاز کے عرق میں ملانے کی ترکیب دی تھی۔شاہی دسترخوان پر پیاز کے مختلف سالن،اچار اور چٹنیاں موجود رہتی تھیں۔مغل اعظم اکبر کے دور میں پیاز کے استعمال میں بے انتہا جدّتیں پیدا کی گئیں شاہان اودھ کے دسترخواں پر باورچیوں نے پیاز اور لہسن کے استعمال کو ایک عجوبہ بنا دیا نواب سعادت علی خاں کا ایک باورچی محض پیاز بنانے کی اُجرت اس زمانے میں پانچ سو روپے ماحوار لیتا تھا وہ پیاز کو اس طرح گلاتا تھا کہ وہ پکی ہوئی دکھائی نہ دیتی اس طرح معلوم ہوتا جس طرح کچی پیاز کی گٹھیاں دسترخوان پر رکھ دی گئی ہیں جب کھاتے تو لا جواب معلوم ہوتا۔مہلک اور خراب زخموں کو اچھا کر دینے کی صلاحیت پیاز میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران روسی ڈاکٹروں نے ادویات کی کمی کے باعث محاذ جنگ پر زخمیوں کا علاج محض کچے پیاز سے کیا تھا۔زخم پر پیاز باندھ دی جاتی تھی اور ایک دو دن بعد زخم خشک ہو جاتا اس کے علاوہ گلے کے بڑھے ہوئے غدودوں، کالی کھانسی، دمہ،پھیپھڑے،نزلہ زکام،ذیابیطس،سر درد،معدے اور بواسیر کے امراض میں مختلف طریقوں سے پیاز کا استعمال کامل شفاء یابی کی ضمانت ہے۔زہریلے کیڑے کے کاٹنے کا فوری علاج پیاز کا پانی ہے سانپ،بچھو،اور بھڑ کاٹ کے توجسم کے اس حصے پر پیاز اور نوشادر کا پانی لگانے سے چند منٹوں میں سوزش جاتی رہتی ہے۔پس پیاز کو ایک معمولی سبزی خیال نہ کریں انسان اسے صدیوں سے استعمال کر رہا ہے۔اس کا استعمال انسانی صحت کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے اور بہت سی بیماریوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے۔



# زندگی کیا ہے..؟

ایک ایسا سوال جس پر شاید آپ نے بھی غور نہ کیا ہو، تو اب کر لیجیے۔

زندگی میں ایسے بھی لمحات بھی آتے ہیں جب انسان خود کو اتنا بے بس محسوس کرتے ہیں، کسی کی نصیحت تو کیا، اپنا آپ بھی برا لگتا ہے۔ ایسے لوگ زیادہ تر اپنی راہیں کھوٹی کر دیتے ہیں، اور انہیں احساس اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ٹھیک لگنے اور ٹھیک ہونے میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہم بسا اوقات بہت کچھ ایسا کر جاتے ہیں جو ہمیں ٹھیک لگتا ہے۔ جبکہ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ یہی تو زندگی ہے جو ہر سانس لینے والے کے پاس موجود تو ہے لیکن ہر کوئی اسکا استعمال نہیں جانتا۔ اگر اس کی بہت بھاری قیمت دے کر اپنی ضد اور خواہش سے حاصل کیا ہوتا۔ تو اس کی حفاظت بھی کرتے اور دنیاوی غلاظت سے اسے بچا کر اور پاک صاف بھی رکھتے لیکن صد افسوس! ہمیں دنیا میں سب سے پہلا تحفہ جو ملتا ہے وہ زندگی ہی تو ہوتی ہے۔ کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ ہمیں تبھی ہوتا ہے جب وہ چیز ہم سے چھن جاتی ہے۔ صوفی یا عالم کی زبان میں زندگی ''اللہ اللہ'' کرنے کا نام ہے۔ استاد کے نزدیک زندگی علم حاصل کرنے اور اسے آگے پھیلانے کا نام ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق زندگی بیماری اور شفاء کے درمیان لٹکا ہوا پنڈولم ہے۔ کسی معروف شخصیت کے نزدیک زندگی کام، کام اور صرف کام ہے۔ اور کچھ کے نزدیک زندگی جہد مسلسل کا دوسرا نام ہے۔ ایک ناکام انسان کے نزدیک زندگی ناکامیوں کا مجموعہ ہے۔ بعض سست اور کاہل لوگوں کا کہنا ہے کہ زندگی خود کو مصروف رکھنے اور بعد میں میٹھی نیند سونے کا نام ہے۔ خیر یہ تو تھے مختلف لوگوں کے مختلف خیالات زندگی کے متعلق۔ سوال یہ ہے کہ آپ کی نظر میں زندگی کا کوئی مفہوم ہے۔؟ اگر ہے تو کیا ہے؟ سوچئے، ضرور سوچیئے اور بھرپور سوچیئے۔



# شوق اپنا اپنا

1۔ بعض لوگ محض اپنے شوق کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں یہ شہرت ان کی موت کے ساتھ مر نہیں پاتی۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ حضرت نبی اکرم ﷺ کے برگزیدہ صحابی تھے۔ انہوں نے بہت سی بلیاں پال رکھی تھیں عربی میں بلی کو ہریرہ کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی نسبت سے ''ابو ہریرہ'' مشہور ہو گئے۔

2۔ مغلیہ خاندان کے نامور حکمران شاہجہان کو عمارتیں بنوانے کا بے حد شوق تھا۔ مگر ان کی شہرت ''تاج محل'' ہے۔ جو اس نے اپنی لاڈلی بیگم کی یاد میں بنوایا تھا۔ یہ تاج محل دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔

3۔ محمد علی جناحؒ قائداعظم اس لئے مشہور ہوئے کہ واقعی وہ ایک عظیم لیڈر تھے۔ انہوں نے وہ کام کئے کہ کوئی لیڈر اس جیسے کام نہ کر سکا۔ بہت سے لیڈر آئے مگر اس پائے کے نہ تھے۔ بلکہ ان کی طرح عالمی سوچ والے، انصاف پسند، اور خود دار انسان اور لیڈر نہ تھے۔ کاش کوئی ایک قائداعظم خدا تعالیٰ ہماری قوم کو اور دے دے۔ آمین۔

4۔ دنیائے اسلام میں آج تک کوئی عبدالسلام نہ پیدا ہو سکا۔ ایک متوسط گھرانے کا فرد نیوٹن کے مقام تک پہنچا۔ مگر قوم نے اس کی قدر نہ کی۔ یزیدی اذہان نے اپنی جہالت کے بل بوتے پر اسے قوم سے دور رکھا مگر وہ شخص آسمان کی بلندیوں تک شہرت پا گیا۔ ساری دنیا اسے ہیرو مانتی ہے۔

5۔ چوہدری ظفر اللہ خان جسے اقوام عالم نے عزت بخشی، شاہ فیصل والئی حرمین شریف نے ذاتی مہمان ٹھہرا کر حج کروایا۔ 25 اسلامی ممالک کو آزادی سے ہم کنار کرنے والا شخص اللہ کی مخلوق کے دل میں وہ اپنی جگہ بنا کر دونوں جہان میں کامیاب و کامران ہو گیا۔



# سوانح عُمری لکھنے کے تقاضے

ہم جس دنیا یا کائنات میں رہتے ہیں وہ مختلف سانحات اور واقعات کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جسے ایجازاً کیا تفصیلاً بھی بیان کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہی روز مرّہ کیا ہر ساعت کیا ہر منٹ اور سیکنڈ ایسے ایسے واقعات گزر جاتے ہیں جو اپنی دلچسپی دلآویزی اور ندرت کی وجہ سے اُس کائنات کے لئے جو کچھ بھی شعور وفہم وفراست رکھتی ہے صدہا نکات اور ہزاروں عبرتوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔شب و روز اگرچہ ہمارے مشاہدہ میں ایسے واقعات اور سانحات آتے رہتے ہیں۔لیکن ہم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو انہیں ضمیری مشاہدہ اور عبرت کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہوں یا اُن کے دلوں پر ان کا کوئی اثر پڑتا ہو۔ہم اکثر سرسری رنگ میں سانحات اور واقعات کا مشاہدہ یا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں وہ لاپروائی اور وہ غفلت جو ہماری زندگی کا رفتہ رفتہ لازمہ ہوتی جاتی ہے ہمیں بسا اوقات ان سانحات اور واقعات سے محض خالی اور کورا واپس لے جاتی ہے۔جو ہماری زندگی کے واسطے ایک قیمتی سبق ہوتے ہیں۔

بعض وقت ہم کہا کرتے ہیں کہ ایسی غفلت نہ ہوتی تو ہماری چہیتی دنیا کا کام ہی نہ چلتا شائد یہ کسی حد تک درست بھی ہو مگر یوں کہا جاوے تو زیادہ تر درست ہوگا کہ ان حالات میں ہماری زندگیوں کی داغ بیل کی روش کچھ اور ہی ہوتی۔انسان میں یہ طبعی اور فطرتی خاصہ ہے کہ وہ مختلف مشاہدات میں سے ایک حد تک انتخاب کرنے کا عادی ہے۔اور اکثر اوقات نظائر اور تماثیل سے اُس کا دل اور دماغ بہت کچھ حاصل کرتا ہے اسی خیال سے وہ چیدہ چیدہ مشاہدات کے جمع کرنے کا عادی ہے۔تاریخ اور تذکرات کی یہیں سے بنیاد پڑی ہے جب عام طور پر بعض واقعات کا بیان ہوتا ہے تو ایک تاریخ یا تذکرہ ہوتا ہے تحریر ہی اس کی حامل نہیں ہوتی حافظہ بھی بہت کچھ محفوظ رکھتا ہے سوانح عمریوں کی بنیاد بھی یہی ہے۔لوگ عموماً اس امر کے مشتاق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ہی ابنائے جنس کی زندگی کے حالات سے واقفیت پیدا کریں اور دیکھیں کہ ان کی زندگیوں اور دوسروں کی زندگیوں میں کیا کچھ فرق ہے۔اسی لئے اور اسی شوق میں ہر ایک اور ہر قوم میں صدہا سوانح عمریاں لکھی گئیں کچھ دوسروں نے لکھیں اور کچھ خود ہی لکھنے والے لکھ گئے۔

ہر سوانح عمری ایک خاص شخص کی زندگی اور رفتار زندگی کا ایک فوٹو ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس فوٹو کے کھینچنے یا کھنچانے میں کوئی نقص رہ گیا ہو اور اس وجہ سے اس پر نقطہ چینی ہوسکتی ہو لیکن باوجود اس کے بھی اگر کوئی سوانح عمری نیک نیتی اور احتیاط سے لکھی گئی ہے تو اس سے دوسرے ابنائے جنس اخذ اور ترک کے سلسلہ یا شکل میں بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بعض لوگ سوانح عمریوں کو پڑھنے سے اس لئے بھی دل چراتے ہیں، ان کے خیال میں سوانح عمری وہی پڑھنے کے قابل ہوتی ہے جو نکتہ چینی کی زد میں نہ آسکتی ہو۔ اُن کے خیالات کے موافق ہو۔ یہ خیالات درست نہیں اختلافِ خیالات اور متضاد مذاق ہونے کی وجہ سے کوئی بھی ایسی سوانح عمری نہیں مل سکتی جو سب قسم کے خیالات کا مجموعہ ہو اور جس کو سب لوگ ہی پسند کریں۔

سوانح عمری ایک خاص شخص کے چیدہ واقعات اور رفتار یا افتاد زندگی کا ذکر ہوتا ہے وہ بجائے خود اس شخص کی زندگی کا ایک ریویو ایک تنقید ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے مطبوعہ اور پرستیدہ خیالت کے ایسے شخص کی زندگی اور زندگی کے کارنامے کیا کچھ کیفیت اور قیمت رکھتے ہیں، پڑھنے سے پہلے ہی اپنے پرستیدہ خیالات کے ہجوم میں سے میخ نکالنا ہر تحقیق سے بعید ہے انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ پوری طمانیت سے حسنات کے اخذ کی کوشش کرے نکتہ چینی کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ اس سے انسانی ذات کیا ملکوتی ذات بھی نہیں بچ سکتی جو شخص کسی کی زندگی کا ریویو کرتا ہے وہ دراصل پیش کردہ معلومات کے مطابق ایسی زندگی کے مختلف واقعات، کیفیات اور سانحات سے ایک مجموعی نتیجہ نکالتا ہے یہ جُدا بات ہے کہ بعض لاگ اس سے اتفاق نہ کریں لیکن واقعات کے پیش کرنے میں بہت کم اختلاف کی نوبت آتی ہے اس میں کوئی بھی شک وشبہ نہیں کہ انسانوں کے مختلف واقعات ایک ہی خیالات اور تنقید کے تابع نہیں رہ سکتے لیکن ایں ہمہ یہ واقعات اور رفتار زندگی خود ہی ایک فیصلہ کُن فیصلہ ہوتا ہے۔

معشوقہ عیاں مے گزرد برتو ولیکن　　اغیار ہمے بیند ازاں بستہ نقاب است

زندگی یا زندگیاں جن جن خوفناک گردابوں میں سے گزرتیں اور جو طوفان ان کی راہ میں آتے ہیں اور جن جن آزمائشوں اور مشکلات میں ان کا امتحان ہوتا ہے وہ ایسی نہیں ہیں۔

# مزاح نگاری

## مزاح کیا ہے؟

بقول سٹیفن لی کاک ''مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار فنکارانہ طور پر کیا گیا ہو'' سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح نہیں بلکہ غیر سنجیدہ بات کو سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد یونس بٹ ''مزاح کی تعریف کئی نقادوں نے کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مکمل تعریف آج تک ہم نے نہیں پڑھی۔ سو ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ مزاح کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔''

## مزاح کا معیار اور مقدار

ہنسنا، مسکرانا، قہقہے لگانا یا پتھر بنے رہنا تو سامنے والے کا ذاتی کردار ہے لیکن ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرادینا مزاح نگار کا نہیں جوکر یا بھانڈ وغیرہ کا کام ہے۔ جبکہ صحیح قسم کا مزاح لکھنا سنجیدہ لکھنے سے کہیں مشکل تر کام ہے۔ کوئی اسے پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے کے برابر بتاتا ہے۔ مشتاق یوسفی اسے تنے ہوئے رسے پر کرتب دکھانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور عنایت اللہ کہتے ہیں کہ طنز و مزاح کے موتی نکالنے کے لئے معاشرہ کے کالے پانی میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے۔ جو انسانی فطرت سے زیادہ پُرفریب اور پُرخطر ہے۔ اور اس میں اتنا تعفن ہے کہ اہل علم و ادب ذرا دور ہی رہتے ہیں۔ گویا مزاح نگاری دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ مزاح کی حدود ابتذال اور فحاشی سے اسقدر ملتی ہیں کہ ذرا سی لغزش سے لکھنے والا پھکڑ پن کے تحت الثریٰ میں گر سکتا ہے۔ انور مسعود کہتے ہیں مزاح ایک تیز ڈھلوان ہے جس سے غیر شائستگی کی طرف بہت تیزی سے پھسلا جاسکتا ہے۔ اس لئے بڑے بڑے مزاح نگاروں میں بھی شاید ہی کوئی ایسا نام ہوگا جس پر اس قسم کا کوئی الزام نہ لگا ہو۔ اور اس طرح محتاط نگاری میں جو مزاح سامنے آتا ہے وہ بقول طاہر تونسوی ''دو طرح کا ہوتا ہے ایک سے ہنسی آتی ہے اور دوسرے پر'' اور ایم آر کیانی اپنے بارے میں کسی کا تبصرہ لکھتے ہیں ''پر مذاق بننے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔'' اس کشمکش میں مزاح کے معیار اور

مقدار کے بارے عربی کا یہ مقولہ کتنا درست ہے'' کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو نصیب ہے۔''

## مزاح نگاری مذاق نہیں

انور مسعود کا ایک نہایت ابتدائی شعر ہے۔

جو ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے
رونے کو چھپانا ہوتا ہے

مزاح بقول کسے رُکے ہوئے آنسوؤں کا نام ہے۔ہنسی کی آخری حد آنسو ہی ہوتے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں'' مزاح کو میں دفاعی میکنزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں اس شخص کا زرہ بکتر ہے۔ جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔'' اور بقول انور مسعود'' مزاح مکئی کی مانند ہے جب جلتی ہے تو مسکراتی ہے۔'' اور مشتاق یوسفی مزید لکھتے ہیں'' عملِ مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ...لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا ہیرا بن جاتا ہے۔'' اسد جعفری کہتے ہیں۔

بلا کا حسن ظرافت تھا جن کی باتوں میں
وہی تھے لوگ حقیقت میں چوٹ کھائے ہوئے

گویا معیاری مزاح نہ صرف بہت مشکل کام ہے بلکہ مزاح نگار کا ذہین ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ چند بڑے بڑے لکھاریوں نے بہت کم مزاح لکھا ہے۔ گویا اس بھاری بھرکم پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے مزاح نگاری کے کیا اصول ہیں؟ بقول ڈاکٹر محمد یونس بٹ'' مزاح نگاری کے تین اصول ہیں جنہیں یہ اصول نہ آتے ہوں اُسے مزاح نگار کہتے ہیں۔'' خیر یہ تو جملہ مزاحیہ تھا ورنہ حقیقت یہ ہے حسِ مزاح ذہانت کی پہچان ہے۔جس میں جتنی حسِ مزاح اور توازن ہوگا وہ اتنا ہی بڑا زیرک ہوگا۔ گوئٹے اور برگساں نے اسے دانائی کا پیمانہ قرار دیا ہے۔اور صوفی تبسم کہتے ہیں'' جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت،عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرز بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہوسکتا۔اور ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کہتے ہیں۔

''جو شخص دلچسپ گفتگو کا ہنر جانتا ہے ترشے تراشے جملے، ظرافت، طنز، واقعات، حکایات، دلکش نکات، ضرب الامثال، اشعار غرض دلچسپی پیدا کرنے والے تمام حربے اس کی نوکِ زبان پر ہوں وہ بہر طور ایک عمدہ مزاح نگار ثابت ہوسکتا ہے۔'' ان تمام چیزوں کو مزاحیہ زبان میں مزاحیہ صورت واقعہ، مزاحیہ کردار، ہمزاد، رعایت لفظی، تحریف، قول محال، گلابی زبان، اسلوب، تشبیہات، حسن تعلیل، صفت تجنیس، بیک وقت مشابہت وتضاد اور بذلہ سنجی (wit) وغیرہ کہتے ہیں، جن کا فرداً ذکر آگے آئے گا۔

## اُردو نثر کے اہم مزاح نگار

یہ فہرست طویل ہے۔ مزاح نگاروں کا ایک گروہ ایسا ہے، جس نے براہِ راست مزاح نہیں لکھا بلکہ اپنے اسلوب کی وجہ سے مزاح نگاروں میں شامل ہیں۔ مثلاً رشید احمد صدیقی علی گڑھ کی کہانیاں سناتے ہیں۔ جسٹس ایم آر کیانی عدالت یا سیاسیات کے قصے بیان کرتے ہیں۔ صدیق سالک اور کرنل محمد خان جیسے فوجی حضرات فوجی زندگی اور سیاسی طنزیات سے مزاح پیدا کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ پھر ایک بہت بڑی تعداد سفرناموں، اور اخباری کالموں کے ذریعہ مزاح نگاری کرتی نظر آتی ہے۔ جن میں اہم نام ابنِ انشاء، ابراہیم جلیس، اور عطاء الحق قاسمی ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ بھی مسعود مفتی قسم کے لوگوں نے اپنے طور پر مزاح نہیں لکھا۔ لیکن ان کی کچھ تحریریں مزاح نگاری میں شمار ہوتی ہیں۔ خالص مزاح لکھنے والوں میں فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، رتن ناتھ سرشار، امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، شفیع الرحمن، ہوش ترمذی، محمد خالد اختر، ڈاکٹر محمد یونس بٹ، اور مشتاق احمد یوسفی، بہت بڑے نام ہیں۔ ڈاکٹر محمد یونس بٹ بلا مبالغہ سب سے زیادہ اردو مزاح لکھنے والے کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریرات اور موضوعات کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں۔ الفاظ کی توڑ پھوڑ اور اردو انگریزی الفاظ کی مشابہت سے مزاح پیدا کرنا اس کا خاصہ ہے۔ جس میں بعض اوقات قاری پھنس کر رہ جاتا ہے۔ بسیار نویسی کی بدولت ان کی تحریروں میں تکرار اور سرقہ کے نمونے بھی بآسانی تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی تحریریں عریاں نویسی کے الزام سے بھی خالی نہیں۔ اُردو مزاح نگاری میں سب سے بڑا نام مشتاق احمد یوسفی کا لیا جاسکتا ہے۔ ان کی عظمت فن کے لئے سیّد

ضمیر جعفری کا یہ تبصرہ ہی کافی ہے۔''ان کی تحریر کے نمونے سے ادب کے طالب علموں کو یہ بات سمجھائی جاسکتی ہے کہ کونسی تحریر کون سا موڑ مڑنے پر ادبِ عالیہ میں داخل ہو جاتی ہے۔''انہوں نے مزاح نگاری کے تمام حربے تقریباً کامیابی سے استعمال کئے ہیں۔ وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے فنکار ہیں۔ بہر حال نقادوں نے ان کی مزاح نگاری پر بھی چند اعتراض کئے ہیں۔

## عمومی موضوعات

دیگر اصنافِ ادب کی مانند تقریباً ہر موضوع پر مزاح نگاری یا کم از کم اس کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ اس میں نظم و نثر کی بھی کوئی خاص تخصیص نہیں۔ البتہ چند موضوعات مزاح نگاروں کے چند پسندیدہ میدان محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں مشرقی اور مغربی اقتدار کا تصادم۔ نسوانیات اور اس کے متعلقات، سیاسیات، بشمول جمہوریت اور حکومت اور خوش خوراکی وغیرہ کافی نمایاں ہیں۔ ان میں مشرقی اور مغربی اقدار کا موضوع چونکہ اردو کے ابتدائی، ارتقائی دور سے تعلق رکھتا ہے اس لئے وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتا محسوس ہوتا ہے اس موضوع پر مزاح نگاری کرنے والوں میں اہم نام رتن ناتھ سرشار، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی اور اقبال کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ بلکہ پطرس بخاری اور شفیق الرحمن قسم کے مغربی طرز مزاح کو اپنانے والے بھی دراصل اسی موضوع سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اور یہی موضوع برّصغیر میں سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدل کر سیاسیات، بشمول جمہوریت اور حکومت ابھی تک جاری و ساری ہے۔ جس کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔

## سیاسیات

صدیق سالک کو شاید ہی کوئی مزاح نگاروں میں شامل کرتا ہو گا لیکن ان کی تحریروں میں جا بجا ایسے ٹکڑے ملتے ہیں۔ جنہیں نہ صرف کڑوا سچ کہا جاسکتا ہے بلکہ قاری زیر لب مسکرائے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ چند نمونے پیش خدمت ہیں۔''نادر شاہ ابدالی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے مشیروں کو بلا کر کہا کرتا تھا کہ ہم نے ایک ملک پر حملے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری وجوہات تلاش کرو۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔''سیاسی بصیرت میں اس راہنما کا جواب نہیں جس نے ملک کا نام

تجویز کیا تھا۔جس نے جان بوجھ کر اس کے اجزائے ترکیبی میں بنگال شامل نہ کیا....سات کروڑ افراد سے آغاز کیا جلد ہی تیرہ کروڑ ہو گئے ۔آبادی کے روز افزوں رُجحان کو روکنے کے جب تمام طریقے ناکام ہو گئے تو تنگ آ کر 1971ء میں اس کی آدھی آبادی یکمشت تفریق کر ڈالی۔برما کے قریب آدھا جغرافیہ،آدھی آبادی اور پوری قومی حمیت چھوڑ کر یہاں مقیم ہو گئے۔''بریگیڈیئر صدیق سالک ایک اور جگہ بڑے پتے کی بات لکھتے ہیں۔جنرل گریسی کے بعد پاک فوج کے تینوں مقامی کمانڈر انچیف پیغمبری ناموں کے حامل تھے۔ایوب،موسیٰ اور یحییٰ،اس کتاب میں ایک اور جگہ رقمطراز ہیں۔''غلط سیاسی ٹی بی کی طرح ہوتے ہیں۔جو شروع میں قابل علاج مگر نا قابل شناخت ہوتے ہیں لیکن بعد میں اُن کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔لیکن اس وقت وہ نا قابل علاج ہو چکے ہوتے ہیں۔مختار مسعود کا نام بھی کسی جہت سے مزاح نگاروں میں شامل نہیں۔لیکن اس موضوع پر اس کا ایک جملہ قابل توجہ ہے۔'' نظریہ ضرورت کی رعایت سے پاکستان واقعی ایک نظریاتی ریاست ہے''اور یونس بٹ نے اس موضوع پر ترقی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ملاحظہ کیجیے'' قیام پاکستان کے بعد ہم نے بہت ترقی کر لی ہے۔جس کے پاس ایک کوٹھی تھی اس نے دو بنالیں پہلے ہمارے پاس ایک پاکستان تھا پھر ہم نے دو بنالئے۔''۔قیام پاکستان کی نصف سینچری مکمل ہونے پر یونس بٹ کا ہی تبصرہ قابل توجہ ہے۔'' پاکستان پچاس برس کا ہو گیا ہے لیکن پچاس برس کا لگتا نہیں حالت اور حلیہ سے سو برس کا لگتا ہے۔''اور اس حالت اور حلیہ کے اسباب کو شاید ہی کسی تجزیہ نگار نے اتنی جامعیت سے دریا کو کوزے میں بند کیا ہو گا جیسے رئیس امروہوی نے اس قطعہ میں کیا ہے۔

چار طبقے ہیں جو مل سکتے ہیں پاکستان میں
آپ کو ہو خواہ ان طبقوں سے ہو کتنا ہی گریز
حاکمانِ بے لیاقت، عالمانِ بے عمل
رہبرانِ بے تدبر، واعظانِ فتنہ خیز

حاکموں کے بارہ میں ڈاکٹر اے ایچ خیال کا خیال ہے۔'' حاکم وہ خادم ہوتے ہیں جو اپنا معاوضہ خود طے کرتے ہیں''۔اور ڈاکٹر یونس بٹ کہتے ہیں'' ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہمارے جتنے

اچھے راہنما ہیں۔ سب مردہ ہیں اور جتنے بُرے حکمران ہیں وہ سابقہ ہیں۔موجودہ حکمران برانہیں ہوتا اسے ایسا کہوتو برا ہوتا ہے'' اب تو کوئی پوچھے کہ پاکستان کے کسی غیر متنازعہ بڑے آدمی کا نام بتائیں تو جواب ملے گا'' عالم چنا''۔ بڑے آدمیوں کی ایک اور خصوصیت بقول یونس بٹ ملاحظہ ہو۔'' بڑی عمارتیں کسی شہر کی شناخت ہوتی ہیں اور بڑے آدمی وہاں کے شہریوں کی۔ بڑی عمارتوں اور بڑے آدمیوں میں یہ فرق ہے کہ بڑی عمارتیں دور سے چھوٹی اور قریب سے بڑی نظر آتی ہیں۔ جبکہ آج کے بڑے آدمی دور سے بڑے قریب آؤ تو چھوٹے ہونے لگتے ہیں۔'' اور ضیاء الحق قاسمی کا کہنا ہے ؎

حج ادا کرنے گیا تھا قوم کا لیڈر کوئی
سنگباری کے لئے شیطان پر جانا پڑا
ایک کنکر پھینکنے پر صدا آئی اُسے
تم تو اپنے آدمی تھے تم کو آخر کیا ہوا

ویسے تو لیڈرانِ کرام کی ایک خوبی بقول یونس بٹ یہ بھی ہے۔'' موصوف نے اپنے ملک کی بھلائی کے لئے جو کچھ کیا ان میں سے ایک انتقال فرمانا بھی تھا''۔ لیکن صدیق سالک اقتدار سے چمٹے رہنے کو لیڈر کی سب سے بڑی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔'' اقتدار کو کوئی شکم مادر کی طرح محفوظ سمجھ کر باقی ایام وہاں گزارنا چاہتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ شکمِ مادر میں بھی قیام کی ایک حد ہوتی ہے۔ بچہ وقت پر باہر نہ نکلے تو دونوں کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔'' لیکن سیاستدان بقول یونس بٹ وہ ہوتا ہے'' جو آپ سے سو روپے لے کر آپ کو پچاس روپے واپس کردے۔ اور اعلان کردے کہ ہم دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو پچاس پچاس کا نقصان ہوا ہے۔'' عوام الناس کی تعریف انہی صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ'' وہ عوام جن کا ناس مار دیا جائے عوام الناس کہلاتے ہیں۔'' مزید فرماتے ہیں کہ سیاستدانوں کے بارے میں اتنے لطائف مشہور ہیں کہ انہیں ابولطیفہ کہنا چاہیئے۔ اور لکھتے ہیں'' ہمارا پسندیدہ ڈرامہ خبرنامہ ہوتا ہے کہ اس کی کاسٹ میں ملک کے تمام کامیاب اداکار شامل رہتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ سیاست بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں بلکہ معاشرتی

زندگی کے لئے آکسیجن کا کام کرتی ہے۔اور اقبال تو دین کو سیاست سے جدا کرنے کے مخالف ہیں اور ہمارے اکثر سیاستدان بھی یہی نعرہ لگاتے ہیں۔کہ وہ سیاست کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔اب یہ اور بات ہے کہ ان کی عبادت بھی سیاست ہو۔''بقول یونس بٹ ''کشتی اور سیاست میں یہی فرق ہے کہ کشتی میں لڑنے والا اپنے کپڑے خود اُتارتا ہے''جمہوریت جو اس سارے قصے کی جان ہے اس کے عجیب وغریب چرچے ہیں۔صدیق سالک لکھتے ہیں ''بعض لوگوں نے جمہوریت کے نام پر اقتدار حاصل کیا اور پھر آمر بن بیٹھے۔یا پھر آمرانہ طریقے سے اقتدار پر قبضہ کیا۔اور پھر جمہوریت کا نقاب اوڑھ لیا''۔''جمہوریت ایک خوبصورت پری ہے جو ہم سے روٹھ گئی۔الیکشن کی اوٹ میں جاتے ہیں تو وہاں ہمیں بھوت پریت ملتے ہیں۔پارلیمنٹ میں جاتے ہیں تو وہاں کرسیوں سے گتھم گتھا افراد سے واسطہ پڑتا ہے۔ایوانِ بالا میں جاتے ہیں تو وہاں کی ربڑ کی مہریں لئے حاکمِ وقت کے حکم کا انتظار کرتے اشخاص سے پالا پڑتا ہے''اور انور مسعود کی نظر میں ؎

وٹوں سے کہ نوٹوں سے کہ لوٹوں سے بنے ہیں
یہ راز ہیں ایسے کہ کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
اندر کی جو باتیں ہیں ٹٹولا نہیں کرتے

## غذا میں مزاح

شاید ہی کوئی مزاح نگار ہوگا جس نے کھانے پینے اور اس کے متعلقات سے مزاح تخلیق نہ کیا ہو۔قتیل شفائی جیسے سنجیدہ شاعر کی ایک تحریف ملاحظہ ہو۔ ؎

شاید مجھے نکال کر کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں

میں اور ابنِ انشاء ایک خط میں اے حمید کے بیٹے کو لکھ رہے ہیں۔''تمہارے ابا کے ساتھ ہمارا دعوتوں کا وٹہ سٹہ کا معاملہ ہے۔کبھی یہ ہمیں دعوت پر بلا لیتے ہیں اور کبھی ہم خود ان کی دعوت میں آجاتے ہیں''اور مشتاق یوسفی کا انکشاف ملاحظہ ہو...''کو کھانے کا ایسا ہوکا ہے کہ ایک منہ اسے

ناکافی معلوم ہوتا ہے۔خود کہتے ہیں صاحب! خدا نے ایک پارہ گوشت کو جانے کس لذت سے ہمکنار کردیا اگر سارا بدن اس لذت سے ہمکنار ہوجاتا تو انسان اس کی تاب نہ لاسکتا۔زمین کی چھاتی پھٹ جاتی۔''ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔''دال کو بدعت اور سبزی کھانے کو مویشیوں کی صریح حق تلفی سمجھتے تھے۔کڑاہی گوشت کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کڑاہی میں کھائیں بلکہ کڑاہی بھر کر کھائیں۔'' نظیراکبرآبادی کا چاند اور سورج کو روٹیوں سے تشبیہ دینا تو قدامت پسندی کے زمرے میں آسکتا ہے۔البتہ پلاؤ اور مرغ جدید کھانوں میں سرفہرست ہیں۔نذیر احمد شیخ کہتے ہیں۔

جہاں بھی پلاؤ بگھارا گیا ہے
اسی غم میں شیطان مارا گیا ہے
زمیں سے فلک تک بھپارا گیا ہے
کہ مومن پہ یہ کیا اُتارا گیا ہے

لذتِ کام ودہن کے بارے میں یونس بٹ کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔''ایک بار اُن کو کھاتا دیکھ کر کسی نے لکھ دیا کہ یوں کھاتے ہیں جیسے آخری بار کھار ہے ہوں۔تو ناراض ہوگئے۔سواُسے لکھنا پڑا کہ یوں کھاتے ہیں گویا پہلی بار کھارہے ہوں''۔مرغ کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ پورا دفتر درکار ہے۔مرغ چرغا کے بارے میں انور مسعود کی تنبیہ ملاحظہ ہو۔

یہ بوفے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو خود بڑھ کر اُٹھا لے ہاتھ میں مُرغ اسی کا ہے

مشتاق یوسفی کی خوش خوراکی کی ایک مثال دیکھیئے۔''ستّو اور فالودہ خالص لغوی معنوں میں نہ آپ کھاسکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں۔یہ ٹھوس غذا اور ٹھنڈے شربت کے درمیان ایک ناقابل بیان ایک سمجھوتہ ہے۔''زیادہ کھانے کا لازمی نتیجہ مٹاپے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔اس پر بھی کافی مزاح لکھا گیا ہے۔بقول یونس بٹ''30 سال سے ویٹ لفٹنگ کررہے ہیں۔ہر وقت ڈھائی من وزن اُٹھائے پھرتے ہیں۔''وہ تو جانِ من کو بھی جانِ دومن لکھتے ہیں۔اور مشتاق یوسفی وزن کرنے کے

ایک طریقہ کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں۔''وزن کم کرنے کے لئے ڈاکٹر نے گھڑسواری کا مشورہ دیا۔ایک ماہ کے بعد ڈاکٹر کے پاس گئے پوچھا کچھ وزن کم ہوا بولے جی ہاں گھوڑے کا''اور کھانے کے آخر میں سویٹ ڈش دی جاتی ہے اس کا احوال دلاور فگار کی زبانی سُنیے ۔

دعوتوں میں شاعری اب ہوگئی ہے رسمِ عام
یوں بھی شاعر سے لیا جاتا ہے اکثر کام
پہلے کھانا اس کو کھلواتے ہیں بھوکے کی طرح
پھر اسے کرتے ہیں استعمال میٹھے کی طرح

## دانشمندانہ مزاح

مزاح صرف وقتی ہنسی مذاق نہیں ہوتا بعض اوقات اس میں حکمت ودانائی کا سمندر موجزن ہوتا ہے۔کسی تشبیہ یا مشابہت میں ایسی ازلی وابدی حقیقت کا بیان ہوتا ہے۔وہ اقوالِ زریں سے بھی بلند تر محسوس ہوتا ہے۔یونس بٹ کہتے ہیں کہ''بیوقوف کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے۔اور عقلمند کا منہ اس کے دل میں۔''اسی طرح ضمیر جعفری فرماتے ہیں۔''بعض لوگ دماغ کے خانے میں بھی دل ہی رکھتے ہیں''۔اور بقول یونس بٹ''بغیر سوچے سمجھے بات کرنے کے بعد پریشانی ہوتی ہے۔حالانکہ سوچ سمجھ کر بات کرنے سے پہلے پریشانی ہوتی ہے''

مزید لکھتے ہیں''کسی کو احمق سمجھ کر اس سے بحث کرنے سے پہلے یقین کرلیں کہ وہ بھی تو یہی کچھ نہیں کررہا''۔ڈاکٹر سلیم ملک لکھتے ہیں''بچے غلطیاں کرنا سیکھ رہے ہیں اور ہم غلطیاں کرنا سیکھ چکے ہیں''۔اور انور احمد علوی کہتے ہیں۔''طلباء میں نقل اور اساتذہ میں نقل مکانی کا رُجحان بہت زیادہ ہے...نصاب پڑھاتے پڑھاتے عمر گزر جاتی ہے پھر بھی صاحبِ نصاب نہیں بن پاتے...بڑھاپا آجاتا ہے،عینک کا نمبر بڑھ جاتا ہے مگر تنخواہ نہیں بڑھتی۔''عمر اور بڑھاپے کے بارے میں چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔یونس بٹ لکھتے ہیں''بیماری تو عمر ہے بندے کو پیدا ہوتے ہی یہ مرض لگتی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔''مزید لکھتے ہیں انسانی زندگی کے تین ادوار ہیں ایک جب آپ کو قیلولہ کرنا پڑتا ہے مگر آپ کرنا نہیں چاہتے دوسرا آپ قیلولہ کرنا چاہتے ہیں مگر آپ کے پاس وقت نہیں ہوتا۔

تیسرا دور جب آپ قیلولہ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کے پاس وقت بھی ہوتا ہے مگر نیند نہیں آتی''

پھر ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ ''اس عمر میں بندہ خدا کو یاد کرتا ہے مگر چاہتا ہے کہ خدا اسے یاد نہ کرے۔'' شیطان کے تعلق میں مزاح نگاروں نے بہت مزاح تخلیق کیا ہے شفیق الرحمن کے مخصوص کردار کا نام ہی شیطان ہے۔ کئی مضامین کا عنوان ہی شیطان اور اس کے متعلقات پر مبنی ہے۔ یونس بٹ کی ایک کتاب کا نام ہی شیطانیاں ہے۔

پُرحکمت مزاح کے تحت ادب سے متعلق مزاح کا ذکر کر کے اس موضوع کو ختم کرتے ہیں۔ مشتاق یوسفی کہتے ہیں۔ ''محاورے تو زبان کے بڑھے ہوئے ناخن ہوتے ہیں'' اس بارے میں یونس بٹ کی چھیڑ خانیاں دیکھیئے۔ لکھتے ہیں۔ ''کہانی، افسانے یا حقیقت میں یہ فرق ہے کہ کہانی یا افسانہ بے تکا نہیں ہوتا''۔ رائٹر خوابوں کے محل بناتے ہیں قارئین ان میں رہتے ہیں اور پبلشر اُن کا کرایہ وصول کرتے ہیں۔'' اور مولانا شبلی کی تحریری خاصیت کے بارے میں مشتاق یوسفی لکھتے ہیں ''شبلی پہلا یونانی تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا انہوں نے اردو رسم الخط میں عربی لکھی۔ ان کی نثر کا مطالعہ کرنا ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا'' اور علامہ اقبال کی اردو شاعری پر پطرس بخاری کا جامع تبصرہ قابلِ غور ہے۔ ''علامہ اقبال نے اردو میں مردانہ شاعری کو رواج دیا'' یونس بٹ کے اس جملہ پر موضوع ختم کرتے ہیں ''سب شاعر بُرے ہی نہیں ہوتے کچھ بہت بُرے ہوتے ہیں۔''

## مزاح نگاری کے مختلف حربے

مزاح نگاری کے مختلف طریقے ہیں ان طریقوں کو حربے کہا جا سکتا ہے۔

ان حربوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اردو مزاح نگاری کے ابتدائی نمونوں میں شروع کے دو حربے ہی زیادہ تر استعمال ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ باقی حربے پہلے دو حربوں پر چھائے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ شاید اس طرح انگریزی ادب سے متاثر ہو کر ہوا۔ بہر حال ایک کامیاب مزاح نگار اسے گردانا جاتا ہے جو موقع محل کی مناسبت سے ہر حربہ کا استعمال کرنا جانتا ہو اور یہی چیز اس کا اسلوب کہلاتی ہے۔ ہر حربہ کا مختصر ذکر حسبِ ذیل ہے۔

**مزاحیہ صورتِ واقعہ**

اس میں کسی غلطی، غلط فہمی یا اتفاقِ وقت کا سہارا لے کر مزاحیہ صورتِ حال پیدا کی جاتی ہے لیکن عملی مذاق سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔اس حربے کے لئے پطرس بخاری اور اس کے بعد امتیاز علی تاج کا نام بہت مشہور ہے۔اس کی عمدہ مثال ان کا مضمون ''مرحوم کی یاد میں' ہے۔دورِ حاضر میں مشتاق یوسفی کا ایک جملہ غور فرمایئے۔''کراچی کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پر ہوا ہے باعلان یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ اس کے متعلق ہر چیز شریف ہے سوائے صاحبِ مزار کے'' اور عطاء الحق قاسمی ایک کالم میں لکھتے ہیں ''رومی اب چاہتا ہے کہ خالد احمد کی گفتگو نہ سنے تو گفتگو کے دوران آلہ سماعت کان سے نکال دیتا ہے بلکہ جب زیادہ زچ ہو جائے اور خالد احمد کہ شکل نہ دیکھنا چاہے تو تو عینک بھی اُتار کر پرے رکھ دیتا ہے کہ بچو پہلے تو آواز نہیں آ رہی تھی اب تصویر بھی نہیں آ رہی''۔اور شعری شکل میں دلاور فگار کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

کسی شاعر نے اک محفل میں نوے شعر فرمائے
ردیف ،قافیہ یہ تھا دعا کردے، دوا کردے
کہیں مقطع نہ پاکر سامع نے یہ دعا کردی
الہ العلمین! اس قید سے مجھ کو رہا کردے

اس موضوع کو عطاء الحق قاسمی کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔اللہ مجھے معاف کردے میں نے کافی جھوٹ بول لیا ہے لہٰذا آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ ابھی دوسروں کی باری ہے''۔

**مزاحیہ کردار نگاری**

اُردو مزاح نگاری میں انگریزی ادب سے متاثر ہو کر مزاحیہ کردار سازی کا کافی رواج رہا ہے۔ یہ ایک قسم کی تحریف بھی ہوتی ہے۔بعض نقاد اسے مزاح نگار کا ہمزاد بھی کہتے ہیں۔یعنی جو بات وہ خود نہیں کہہ سکتا یا کہنا نہیں چاہتا وہاں اپنے ہمزاد کو آگے کر دیتا ہے۔''داستان امیر حمزہ'' کا ''عمرو عیار''رتن ناتھ سرشار کا ''خوجی''امتیاز علی تاج کا ''چچا چھکن''،شفیق الرحمن کا ''شیطان''مشتاق احمد یوسفی کا ''مرزا عبدالودود بیگ''اشفاق احمد کا ''تلقین شاہ'' اور ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا ''ف'' اس کی

کامیاب مثالیں ہیں۔کامیاب مثالی کردار تخلیق کرنا کافی مشکل کام ہے۔لیکن اگر تخلیق ہو جائے تو مزاح نگار کا کام آسان ہو جاتا ہے۔واضح رہے کہ مزاحیہ کردار مسخرہ نہیں ہوتا۔وہ غیر شعوری طور پر ایسی حرکات سرانجام دیتا ہے۔جو ہنسی کو سرانجام دیتی ہیں۔اس میں خاص قسم کی ناموزونیت پائی جاتی ہے۔مزاح نگاروں کے مخصوص مزاحیہ کرداروں کے علاوہ چند مخصوص افراد سے اکثر و بیشتر مزاحیہ کردار نگاری کا کام لیا جاتا ہے۔جس میں فلسفی، پروفیسر اور زن مرید شوہر کافی مستعمل ہیں۔فلسفی کی حالت زار کی نقشہ آرائی میں یار لوگوں نے خوب مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ایسے ایسے لطیفے مشہور ہیں جن کی پلکیں بھی سفید ہو گئی ہیں۔یونس بٹ کہتے ہیں ''یادداشت ایسی کہ راستے میں کھڑے ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ محبوب سے مل کر آئے ہیں یا ملنے جا رہے ہیں۔'' اور مجازی یا مزاجی خدا یعنی شوہر کے بارے میں ضمیر جعفری فرما گئے ہیں۔

جانِ محفل تھا خدا بخشے ضمیر
اب تو اک عرصہ سے شوہر ہو گیا

## مبالغہ آرائی یا خیالی مزاح

یہ کافی مشکل کام ہے۔اور ذرا سی بے احتیاطی ایسے مزاح کو ادبی معیار سے گرا سکتی ہے۔مشتاق احمد یوسفی میں ایسے مزاح کی صلاحیت بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔شعری نمونے کے طور پر سرفراز شاہد کا یہ شعر دیکھیئے:

مٹن اور دال کی قیمت برابر ہوگئی جب سے
یقیں آیا کہ دونوں میں حرارے ایک جیسے ہیں

## قول محال سے مزاح

جو بات دیکھنے میں باطل معلوم ہو لیکن حقیقت میں حق ہو یعنی بعید العقل بات۔بظاہر ناممکن اور مشکل بات لیکن غور کرنے پر درست معلوم ہو۔اُردو مزاح نگاری میں اس کے بعض عمدہ نمونے موجود ہیں۔مشتاق احمد یوسفی لکھتے ہیں۔''جو بات عقل و منطق کے ذریعہ ذہن میں داخل نہیں ہوئی۔وہ عقل و منطق سے کیسے نکالی جا سکتی ہے۔تو ہم کے کارخانے میں دستور نرالا ہے۔یاں وہی ہے جو

اعتبار کیا۔''یونس بٹ کہتے ہیں۔'' پیدائش کے وقت انسان روتا ہے اور لوگ ہنستے ہیں لیکن مرتے وقت سب رو رہے ہوتے ہیں اور مرنے والے کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ہوتی ہے کیونکہ وہ زندگی کا ایک لمبا سفر ختم کر کے منزل مقصود پر پہنچ چکا ہوتا ہے''۔اور لکھتے ہیں ''معاف کر دینے سے سخت انتقام اور کیا ہوسکتا ہے۔ کہ آپ یکدم مدمقابل کو گھٹیا اور خود کو عالی ظرف ثابت کر دیتے ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں:

''فطرت کتنی مستقبل بین ہے جس نے اس وقت ناک کان بنائے جب ابھی عینک ایجاد نہیں ہوئی تھی''۔یونس بٹ کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو'' کوئی پوچھے جنت میں جانے کے لئے کیا کرنا پڑتا ہے؟ سب سے پہلے مرنا پڑتا ہے'' اور رئیس امروہی کے ان اشعار پر اس بات کو ختم کرتے ہیں۔

نہ کر افلاس و ناداری کی تعریف
نہ دے قولِ بزرگاں کے حوالے
اگر سرمایہ داری امتحاں ہے
خُدا اس امتحاں میں سب کو ڈالے

## بذلہ سنجی

یہ ہجو پھبتی ،فقرہ بازی اور برمحل حاضر جوابی کی ادبی شکل ہے۔جس کے لئے wit یعنی ذہانت و فراست بنیادی چیز ہے۔ورنہ یہ فوراً ادبی معیار سے گر کر بازاری اور نہایت قابل اعتراض چیز بن جاتی ہے۔پنجاب کے بعض علاقوں میں یہ بدنام زمانہ'' وقتی'' یا بختی'' کے نام سے رائج ہے۔اردو مزاح نگاری میں ڈاکٹر محمد یونس بٹ جیسے بسیار نویس تو ایک طرف رہے۔مشتاق احمد یوسفی جیسے معتبر نام بھی اعتراض سے مبرا نہیں۔بہرحال محتاط انتخاب پیش خدمت ہے۔ایک محقق نے عورتوں کی لمبی عمر ہونے کی ایک وجہ یہ بتائی کہ عورتوں کی کوئی بیوی نہیں ہوتی۔صرف شادیات ہی نہیں دیگر موضوعات پر بھی ان کے بہت سے جملے قابل غور ہیں۔مثلاً قلم کلاشنکوف سے زیادہ مفید ہے۔واقعی کلاشنکوف آپ شلوار میں ازار بند تو نہیں ڈال سکتے۔''

دیگر مصنفین میں رشید احمد صدیقی کا یہ جملہ دیکھیئے'' مجھے اشعار یاد نہیں رہتے جو یاد رہتے ہیں وہ

شعر نہیں رہ جاتے۔'' اب ذرا مشتاق احمد یوسفی کی گلکاریاں دیکھیئے۔ لکھتے ہیں۔'' حقہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے بلکہ اگر تمبا کو خراب ہو تو تفکرات پر کیا موقوف ہے کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔'' املاء بدل کر یا املاء کے ذریعے صنائع بدائع کا استعمال...مزاح کی سب سے عام اور عامیانہ پہلو دار صنف قرار دی گئی ہے۔ اس کا استعمال انتہائی چابکدستی اور ہنر چاہتا ہے۔ یہ اتنی سہل اور دلکش ہے کہ احتراز کے لئے بڑی قوت ارادی چاہیئے۔ انگریزی میں اس کے لئے PUN کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے لئے HOMOURS PLAY UPON WORDS کے الفاظ لکھے ہیں۔ یعنی الفاظ سے مزاح پیدا کرنا۔ گزشتہ بیس تیس سالوں میں اردو مزاح نگاری میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ شاید ڈاکٹر محمد یونس بٹ اس حربے کو سب سے زیادہ استعمال کرنے والے مزاح نگار ہیں۔ ان کی اکثر کتب میں یہ حربہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً غل دستہ، افراتفریح، جوک در جوک، نوک جوک، مزاح پُرسی، حوائیاں، بٹ تمیزیاں وغیرہ۔ دوسرے مزاح نگار بھی اس سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے مشتاق احمد یوسفی کی کتاب زرگزشت، عطاء الحق قاسمی کی کتاب حبسِ معمول اور جرم ظریفی وغیرہ۔ اس بارہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے'' رعایت لفظی سے مراد زبان و بیان کی بازی گری ہے۔ یعنی لفظ کو اس انداز سے استعمال کیا جائے کہ ناظر کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب کا احساس ہو اس کے لئے جدت شرط ہے۔ ورنہ تکرار سے مزاحیہ کیفیت انحطاط پذیر ہو جاتی ہے''۔ اب اس کے چند نمونے دیکھئے۔ عطاء الحق قاسمی ڈاکٹر سلیم اختر کی خاکہ نگاری میں لکھتے ہیں'' صبح سے شام تک وہ جتنی سائیکل چلاتے ہیں۔ اس کے مطابق اور سلیم اختر کو لازم و ملزوم نہیں بلکہ ظالم و مظلوم قرار دیا جا سکتا ہے۔'' مشتاق احمد یوسفی کی ایک پھلجھڑی ملاحظہ ہو۔ 25 فیصد اشعار وزن سے گرے ہوئے بقیہ تہذیب سے۔'' شعر کے وزن کی بات آئی تو تو یونس بٹ کا شگوفہ ملاحظہ ہو۔'' پہلے زمانوں کے شعراء کو دیکھ کر یہی کہہ سکتے تھے کہ وہ جتنا اپنے شعر کے وزن کا خیال رکھتے ہیں۔ اتنا اپنے وزن کا خیال رکھتے تو شاعر کی بجائے صحت مند نظر آتے۔'' ایک انکشاف کرنل محمد خان کرتے ہیں۔'' وہ لوگ جنہیں غصہ روانی سے اور مسکراہٹ قبض کے ساتھ آتی ہو دراصل بڑے روگی ہوتے ہیں۔ یہ روگ دراصل باسوں اور ساسوں کو لگتا ہے۔'' اور شمیم حیدر کی

تحقیق دیکھیئے۔''ساس اور داماد دونوں ایسے الفاظ ہیں کہ اُنہیں اُلٹا کریں تو ساس اور داماد ہی رہتے ہیں۔''آخیر میں ضمیر جعفری کی ایک شعری رعایتِ لفظی پیش خدمت ہے ؎

پوچھتے ہو ایشیا کا اور امریکہ کا فرق
جو ہمارے گھر میں ہے اُن کے عجائب گھر میں ہے

اور دلاور فگار کا شگوفہ ملاحظہ ہو ؎

ایک علامہ نے اظہارِ لیاقت یوں کیا
ملّتِ بیضا کے سامنے لکھ دیجیئے انڈے کی قوم

## تحریف

آخری حربہ تحریف ہے۔یعنی حروف کی ادل بدل کے ذریعہ مزاح پیدا کرنا۔جس سے مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔گو اس کے لئے انگلش لفظ پیروڈی بھی مستعمل ہے۔حالانکہ پیروڈی اور تحریف کے معنی میں قدرے فرق ہے۔اُردو میں نثری اور شعری دونوں قسم کی تحریف موجود ہے۔لیکن نثری کم اور شعری زیادہ ہے...عام طور پر کسی مقبولِ عام نظم یا نثر کی تحریف ہی پسند کی جاتی ہے۔اسطرح اقبال کے مختلف اشعار کی تحریفات کی گئی ہیں مثلاً بقول مجذوب چشتی ؎

دو بجے تھے رات کے ہر سمت تھا گہرا سکوت
اور میں فرما رہا تھا مشقِ سخن
جاگ اُٹھی بیگم اچانک اور یہ کہنے لگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اور انور مسعود کی یہ گلکاری ملاحظہ ہو ؎

بنتے تھے تیرے چار سو فی الحال چار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

اسی طرح غالب کی کئی مشہور غزلوں پر مختلف لوگوں نے طبع آزمائی کی۔مدن موہن راز لکھتے ہیں ؎

دن کو سوتا ہے اور کہتا ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اور کنہیا لال کپور کی تحریف دیکھیئے ۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

عاصی اختر کی سنیئے ۔

نقل کرتے ہو کس دھڑلے سے
شرم تم کو مگر نہیں آتی
گو پروٹین دال میں بھی ہیں
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
فیل تو میں بھی ہوا ہوں ابا کو
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مشتاق یوسفی کی یک فطری نثری شعری تحریف دیکھیئے ۔

''موٹاپے میں خرابی یہ ہے کہ تمام عمر کو گلے کا ہار ہو جاتا ہے۔تن کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں اور یونس بٹ کا کہنا ہے۔'' ایک سیب کھاؤ اور ڈاکٹر کو بھگاؤ اور ایک پیاز کھاؤ تو سب کو بھگاؤ۔'' کسی قسم کی تحریف کے بغیر غزلوں سے ایک ایک مصرع لے لے کر اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ وہ مزاح پیدا کرتا ہے پتہ نہیں یہ تحریف کی تعریف پر پورا اترتا ہے کہ نہیں۔ بہر حال کنہیا لال کپور کی ایک کوشش پیش خدمت ہے ۔

دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
گر نہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

## اختتام

مزاح نگاری کے مختلف حربوں کے تذکرے کے ساتھ یہ تحریف پر اختتام کو پہنچتی ہے۔معیاری

مزاحیہ تحریر میں موقع محل کی مناسبت کے کئی طریقے بیک وقت موجود نظر آتے ہیں۔ جو مصنف مختلف حربوں کے امتزاج سے اپنا خاص اسلوب بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہی کامیاب مزاح نگار ثابت تا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''اسلوب کے بغیر شاید انشائیہ نگار تو بنا جا سکتا ہے مگر کبھی بھی اچھا طنز نگار یا مزاح نگار نہیں بن سکتا۔'' مزاح وقتی شے ہے۔ قہقہہ، مسکراہٹ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے اسے زندہ رکھنے کے لئے طنز کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اسی لئے طنز و مزاح کا مرکب بہت مستعمل ہے۔ البتہ طنز قدرے منفی چیز ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کسی کا دل دکھائے بغیر مزاح پیدا کرنا دقیق اور عظیم کام ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دیگر اصنافِ ادب کے مقابلہ میں بہت کم معیاری مزاح دستیاب ہے۔ اُردو کے بعض نقاد طنز و مزاح کو تیسرے درجہ کا ادب قرار دیتے ہیں۔ یعنی اوّل شاعری، دوم کہانی، سوم مزاح۔ اس کی بڑی وجہ شاید اردو ادبی زبان کا تہذیبی رکھ رکھاؤ ہے۔ کیونکہ ابتدا ہی سے اردو مزاح میں سوقیانہ یعنی بازاری پن نمایاں رہا ہے۔ لیکن پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں اردو ادب کی پہلی دو شاخوں کا دورِ شباب ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جبکہ اُردو مزاح اپنی نئی جہتوں کے ساتھ ترقی پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ بہر حال اُردو مزاح میں ابھی تک کسی عظیم شاہکار کا انتظار ہے عدؔم کے اس شعر کے ساتھ ختم کرتے ہیں ؎

تخلیق کائنات کے دلچسپ کھیل پر
ہنستا تو ہوگا آپ یزداں کبھی کبھی



# اُردو کی حالت برطانیہ میں

خاکسار مورخہ 14 ستمبر 2014 کو SOAS کے سیمینار میں گیا۔جس کے ناظم محترم عبدالغفار عزم ہیں۔وہاں اُردو کی ترقی کے بارہ میں کافی تقاریر ہوئیں۔مگر ایک منتشر قوم کا منظر پیش تھا۔اس بارہ میں بندہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔بے شک بعض افراد نے انفرادی کوششیں کی ہیں میں اُن کا معترف بھی ہوں۔بعض اجتماعی کوششیں بھی ہوئیں مگر اُن کو ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔اور وہ منزل سے پہلے ہی راستہ کھو بیٹھیں۔برطانیہ یا یورپی ممالک میں اُردو بولنے، دیکھنے اور سننے والے لوگ تو مقیم ہیں۔مگر اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے۔اُن کے بچوں کو یہ زبان نہیں آتی،سوائے اُن حضرات کے جو ابھی نئے نئے آئے ہیں۔ہم اپنی اولادوں کو اُردو پڑھانے اور لکھانے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔اسی طرح دین کے معاملے میں بھی اپنی اولادوں کو کچھ سکھانے میں کلی طور پر ناکام ہوئے ہیں۔اس لئے کہ ہم نے ان کاموں کو ترجیح نہیں دی۔ہم سب ایک غلام قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ہمارا خیال ہوتا ہے کہ ہماری نسل ڈاکٹر، وکیل، انجینئر تو بنے مگر کوئی عالم دین نہ بن پائے۔چونکہ اُردو کی یہاں کوئی اہمیت نہیں۔اور نہ وہ کسی کورس کے لئے درکار ہے۔اس لئے ہم بھی اس کو ترجیح نہیں دیتے۔اب یہ زبان بڑے عمر کے لوگ پڑھتے یا لکھتے ہیں۔ہماری نوجوان نسل اس سے کلی طور پر نابلد ہے۔یہ سارا ہمارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔اب ہم مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔

پنجابی کے مقابلے میں ہم اُردو زبان کو عام کرنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ہماری تعداد بھی سب سے زیادہ ہے۔ہم آج تک اس زبان کو قومی دھارے میں نہیں لا سکے۔کیونکہ ہم سب نے اپنے اپنے گھروں میں اس کو مسترد کر دیا ہے۔کتنے خاندان ہیں جو بچوں کو اُردو قاعدہ لے کر بچپن میں پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔مائیں تو خود احساس کمتری کا شکار ہیں اور اُردو کو پسند نہیں کرتیں۔والد سارا دن باہر کام پر ہوتا ہے۔بچے کے پہلے دس سال ہی تو ہوتے ہیں جس میں اُسے کچھ پڑھایا جا سکتا ہے۔اُسی دور میں اُس کا وقت انگریزی علوم کی تدریس میں ترجیحی طور پر ضائع

کر دیا جاتا ہے۔اور والدین اپنی مصروفیات کو ترجیح دیتے ہیں۔حالانکہ بچہ اُردو بول بھی رہا ہوتا ہے اور سُن بھی رہا ہوتا ہے مگر لکھنے پڑھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ یہ سب ہماری یا والدین کی سستی اور کمزوری ہے۔ حالانکہ یورپ اور برطانیہ کے لوگ کم از کم پانچ زبانیں سیکھتے اور بولتے ہیں مگر ہم نہیں، ان سب کو سپینش، فرنچ انگلش، جرمن، پولش ضرور آتی ہے۔ ہمارے بچوں کو یہ زبانیں کسی حد تک آتی تو ہیں مگر لکھنے پڑھنے سے قاصر ہیں۔اس لئے کہ ہم نہ محب وطن ہیں اور نہ محب اُردو ہیں۔ ہماری سب کی ترجیحات متفرق اور مختلف ہیں۔جس طرح کہ ہم مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں ،مختلف ذاتوں اور اقوام میں بٹے ہوئے ہیں۔مختلف لسانی گروہوں میں منقسم ہیں۔ہ غلام اور منتشر قوم ہیں نہ ہی ہم ابھی تک پاکستان کو متحد اور مستحکم بنا سکے اور نہ ہی ہم نے اپنی ترجیحات کو بدلا۔ انفرادی طور پر ایک ایک بھیڑ بکری کی طرح اپنے پیٹ کو بھرنے کے چکر میں سرگرداں ہیں۔اس طرح کوئی قوم بھی کوئی مقصد حاصل نہیں کر سکتی۔اگر کوئی تنظیم بنتی ہے تو حسد وبغض کی بنا پر ہم ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ کر اُسے تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔یا ذاتی مفادات کی خواہش میں اس اجتماعی مقصد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ برطانیہ میں بہت سی تنظیمیں بنی اُن کا یہی حال ہوا کوئی مالی بے ضابطگی کا شکار ہوئی تو کوئی نفاق کا۔شکست خوردہ عناصر کی طرح ہم سرگرداں ہیں اس طرح منزل تو نہیں ملا کرتی۔سب شاعر لوگ مشاعرے منعقد کرواتے ہیں وہ ایک کوشش تو ضرور ہے مگر اس میں بھی ذاتی شہرت کو بڑھانے کی نیت ہوتی ہے۔اُردو کو پروموٹ کرنا ہے تو کوئی ٹھوس بنیادوں کام ہونا ضروری ہے۔کتنے ہیں جو کونسلرز، ایم پی ہیں لارڈز ہیں۔مگر کبھی کسی نے اُردو کے لئے اعلیٰ احکام سے بات کی ہو۔کبھی اسے ترجیح دی ہو۔ووٹ دیتے وقت اپنی پارٹی میں بات کی ہو ،اُردو کوئی چھوٹی زبان نہیں۔یو این او نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔چوتھی بڑی زبان ہے دنیا کی۔دوسو ممالک سے زیادہ میں بولی جاتی ہے۔ملک پاکستان میں ابھی تک اسے دفتری زبان تسلیم نہیں کیا گیا۔نیشنل اسمبلی بھی ساری کاروائی انگریزی میں لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ہمارے لیڈرز اسے بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ہم لوگ اُردو کا رونا تو بہت روتے ہیں۔سب ادیب وشاعر برطانیہ

میں اُردو کا رونا روتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔مگر اگر جائزہ لیا جائے۔ہر سال کتنے بچے اُردو کا امتحان دیتے ہیں۔ان سب ماتم کرنے والوں کو بھی اُردو نہیں آتی۔کیونکہ دولت نے ان کے گھروں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔میاں بیوی کی لڑائی ہی ختم نہیں ہوتی۔گھر میں امن نہ ہو تو اولاد کیسے امن سے پڑھ سکتی ہے۔اخلاق درست نہیں۔والدہ کہیں اور ہے اور والد کہیں اور نوکری بھی کرتے ہیں۔

جب تک ہم اسلام کو اپنے اوپر مکمل طور پر وارد نہیں کریں گے۔ہم یوں ہی آدھا تیتر آدھا بٹیر رہیں گے۔ہمیں اُردو کو عربی کی طرح بچوں کو ضرور پڑھانا چاہیئے۔اپنے اپنے علاقے میں اُردو سکھانے ،لکھانے ،بولنے کے سکول کھولنے کی ضرورت ہے۔ہمیں انفرادی طور پر ساری دنیا میں اُردو کے محافظ کا کردار ادا کرنا چاہیئے۔بڑے افسوس کی بات ہے کہ درد دل سے اس بارے میں نہ کوئی کوشش کرتا ہوا آتا ہے اور نہ توجہ ہے۔اُردو کی تاریخ پڑھیئے اور اُن مشاہیروں کو سلام کیجیئے جنہوں نے اُردو کو زندہ کیا۔اور یہ ایک تناور درخت بنا ہے۔ہم اس کی چھاؤں میں بیٹھے ہیں اور اُس کو پانی دینے سے قاصر ہیں۔اگر آج بھی ہم ذاتی طور پر اس زبان کے متعلق اپنی کوتاہیوں پر غور کریں تو ہم ہی اس کے قصوروار نکلیں گے۔اُردو سے غفلت کی بنا پر ہماری نسلیں ہمارے کلچر سے محروم ہیں۔انگریزی کلچر کا تو اُن کو پڑھایا جاتا ہے۔مگر میر و غالب ،اقبال،فراز،فیض سے وہ ناواقف ہیں۔یہ یقیناً ہم سب کا قصور ہے۔



# تعمیر وطن کے لئے اتحاد لازم ہے

کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب ساری عمر تلاش کرتے رہو اُلجھے وجود اور سلگتے افکار کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور یک دم بغیر کسی کوشش اور کسی آواز آ گہی کے ایسے دروازے پر آپ کھلتے چلے جاتے ہیں کہ آپ کے اندر ایک تلاطم بپا ہو جاتا ہے۔ جیسے آج صبح اٹھتے ہی مجھ پر یک دم انکشاف ہوا کہ اب زندگی میں زندہ رہنے کے واسطے کچھ نہیں رہا۔ زندگی میں وہ تمام چیزیں ناپید ہو چکی ہیں۔ جن کو زندگی کی رمق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میرے اس وجدان کو ''زندگی'' اور ''زندہ رہنے'' کا فرق سمجھنا ہوگا۔ سانسوں کے چلنے، دل کے دھڑکنے، خون رگوں میں دوڑنے، تمام اپنے اپنے افعال سرانجام دینے اوقات کے ساتھ بھاگنے، جذبوں کے ساتھ بسنے، ہنسنے، رونے، مسکرانے، سونے، پانے، کھانے، کھونے، مٹ مٹ کر بننے اور بن بن کر مٹنے کا نام زندگی ہے۔ ہر شخص کے نزدیک زندگی کا مفہوم مختلف ہے۔ لیکن کم سے کم لفظوں میں زندگی کو بیان کرنے کی کوشش میں زندگی شاید اسی کا نام ہے۔ اب آتے ہیں ''زندہ رہنے'' کی طرف۔ زندگی انسان کے پاس ایک امانت ہے، اور جس کے مقدر میں رب ذُوالجلال نے جتنے سانس لکھ دیئے ہیں، وہ اس سے زیادہ وقت اس فانی دنیا میں گزار نہیں سکتا لیکن ''زندہ رہنا کسی اور دنیا کی بات ہے۔ زندہ رہنے کے لئے سانسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے دل کے دھڑکنے کی آواز درکار نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک لمحہ کی بازگشت درکار ہوتی ہے۔ آنکھیں پتھرا بھی جائیں تو کسی کا انتظار، کسی کی دید کی طلب زندہ رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ریزہ ریزہ ہوئی ذات کی کرچیوں کو کوئی سمیٹ کر پھر زندگی کے راستے پر روانہ کر دیتا ہے۔ کسی کی ایک مسکراہٹ، مایوسیوں کے تمام اندھیروں کو ہٹا کے زندہ رہنے کا اذن عطا کرتی ہے۔ کوئی ایک وعدہ اپنی ذات سے اپنی اس وفا سے اپنے خدا سے آپ کو زندہ رہنے پر مجبور کرتا ہے، تو مجھ پر انکشاف ہوا۔ کہ ہم زندہ نہیں بلکہ زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے لفظ ہم دانستہ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ کچھ عمل، کچھ باتیں، کچھ حادثات و واقعات اجتماعی طور پر ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

ذرا غور کریں کتنا عرصہ گزرا ہم نے بحیثیت قوم زندہ رہنا ترک کر دیا ہے۔کس مذہب کا نام جپتے ہیں اور کیا ہمارے عمل ہیں۔حتیٰ کہ ہر برائی ہماری قوم میں انتہا تک پہنچ چکی ہے۔

پھر آمریت، وڈیرہ شاہی، جاگیرداری، دہشت گردی، ملائیت، لُولی لنگڑی سیاست، مذہبی، لسانی، گروہی سیاست، افراتفری، ہارس ٹریڈنگ، فلور کراسنگ، ہڑتال، تالہ بندی، لانگ مارچ، ٹرین مارچ نے ہماری ساکھ کومزید بدنام کر دیا ہے۔ ہر چیز ہر قسم کی ملاوٹ سے اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہے۔دین و دنیا کے ساتھ ساتھ ہر رشتہ، خون، نسل، ایمان، جنت، دوزخ، خدا، رسول، قبلہ و کعبہ اور قرآن تک اس ملاوٹ سے محفوظ نہیں رہے۔ ووٹ فروشی، وزارت فروشی، جسم فروشی، بردہ فروشی، ضمیر فروشی اور جنت فروشی، عزت فروشی، اولاد فروشی، دین فروشی، وطن فروشی نے میرے ملک کے جسم پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ہم نے جو طوق غلامی گلے میں ڈال رکھا ہے۔تو ہم زندہ کب ہیں۔وہ تیموری خون جو ہماری رگوں میں دوڑ کے ہمیں گرماتا تھا۔کب کا آٹے، دالوں، چینی کے بوجھ تلے ٹھنڈا ہو چکا۔تبھی تو دن دیہاڑے ہماری غیرتوں کے جنازے اٹھتے ہیں، اور ہم اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ بے عزتی، بے حیائی، فحاشی، بے راہ روی، نشے، مخلوط محفلیں، جہاں تفریح کے نام پر ایسے گھناؤنے کام کئے جاتے ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ہم زندہ کہاں ہیں؟ اگر زندہ ہوتے تو ان سینکڑوں بے گناہ ہم وطنوں کے غم میں تڑپ اٹھتے اور ہر طاقت سے ٹکرا جاتے جن کو پاکستانی شہری ہونے کی پاداش میں نیٹو اور ڈرون حملوں کی وحشیانہ بمباری سے شہید کر دیا گیا۔ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے ہیں۔جن کے بے گور وکفن لاشے ہم سے یہی سوال کرتے ہیں؟ کیا تم زندہ ہو؟ میں ان سے آنکھیں نہیں ملاتا اور منہ موڑ کے ان سے ہمیشہ کہتا ہوں کہ میں تو کب کا مر چکا۔اب تو بس زندگی گزار دیتا ہوں جو سانس لینے سے مشروط ہے۔زندہ لوگ اپنے رشتوں سے، اپنی مٹی سے، اپنی جڑوں سے، اپنے شاندار ماضی سے، اپنے اسلاف سے، اپنے دین سے، اپنی ذات سے اور سب سے بڑھ کر اپنے رب سے جڑے ہوتے ہیں۔ اب ذرا اپنے ضمیر کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔آپ کو نبض محسوس نہیں ہو گی۔کیونکہ آپ مر چکے ہیں۔

---

آپ کا ضمیر اپنی موت مر چکا ہے۔آج لوگ آپ کو مذہبی جنونی کہتے ہیں۔اگر آپ اپنے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی پر بھڑکتے ہیں۔آپ پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔آپ کو تنگ نظر کہہ کر آپ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔بہت بچپن میں ایک کہانی سنی تھی۔کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔جس کا ایک وزیر باتدبیر بھی تھا۔بادشاہ اور رعایا کی اچھی گزر رہی تھی کہ ایک دن وزیر باتدبیر نے بادشاہ سے کہا ''ظلِ الٰہی آپ کی رعایا بہت خوشحال ہوگئی ہے۔ہر گھر میں اناج اور بے فکری ہے،اور لوگ بہت خوش ہیں۔چوپالوں میں بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں،اور لوگ سیانے ہوتے جارہے ہیں۔بادشاہ بہت خوش ہوا۔یہ تو بہت اچھی بات ہے،تو وزیر باتدبیر نے جواب دیا۔

''بادشاہ سلامت! گستاخی معاف یہ لمحہ فکر یہ ہے،کہ اگر عوام اتنی خوشحال اور سیانی ہو جائے،تو وہ حکمرانوں کے ہر عمل اور ہر فیصلے پر نظر رکھنے لگتی ہے،اور پھر تنقید شروع کر دیتی ہے،اور حکمران ان کی منشاء و رضا کے پابند ہو جاتے ہیں''۔بادشاہ اس بات سے پریشان ہوگیا،اور گھبرا کر سوال کیا۔کہ ''پھر کیا،کیا جائے''۔وزیر نے جواب دیا کہ ''ان پر خوشحالی ٹیکس لگا دیں'' جس کے تحت آدھی کاشت سرکاری خزانے میں آئے گی۔ٹیکس لگا دیا گیا اور پھر لوگوں نے احتجاج کیا۔وزیر نے کہا ٹیکس بڑھا دو۔ٹیکس بڑھا دیا گیا۔لوگوں کے لئے جینا مشکل ہوگیا۔چوپال اجڑ گئے۔لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔کچھ لوگوں نے بغاوت کر دی۔وزیر باتدبیر نے مشورہ دیا کہ اعلان کر دیا جائے کہ ٹیکس کے ساتھ ساتھ ہر جوان کو دو دو کوڑے بھی لگائے جائیں۔بادشاہ نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس طریقے سے تو اس کی حکومت ختم ہو جائے گی۔اور لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہو جائیگی۔تو وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ ظل الٰہی!۔آپ میرے ساتھ محل کی فصیل پر چلیں۔بادشاہ وزیر کے ساتھ فصیل پر آیا۔تو دیکھا کہ فصیل پر ایک جم غفیر ہے۔لوگ قطاروں میں کھڑے ہیں۔بادشاہ بہت حیران ہوا بولا کہ یہ ہجوم کیسا؟۔وزیر نے جواب دیا کہ ''یہ عوام ہے،رعایا،دھکم پیل ہو رہی ہے کہ ہمیں پہلے دو دو کوڑے مار کر فارغ کر دیا جائے تاکہ اپنے کام لگ سکیں''اور اس کے

بعد اس بادشاہ نے اس ملک پر بہت عرصہ تک حکومت کی۔تو عزیز من! ہمارا حال بھی اب اس رعایا جیسا ہے۔ہم پر ٹیکس لگائیں۔ہمارے لئے زندگی عذاب بنادیں، زندگی کی ضروریات ہم سے دور کردیں، بنیادی ضروریات، پانی، گیس، بجلی، ہمارے لئے خواب کردیں۔ پھر ہمیں بدعنوانی، رشوت، ذخیرہ اندوزی، لاقانونیت کے جوتے ماریں۔ہم قطار بنا کر آئیں گے جوتے کھانے، کیونکہ ہم زندہ نہیں بلکہ زندگی گزار رہے ہیں۔ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جو زندگی گزارنا نہیں چاہتے بلکہ اپنی ذات کی پوری سچائیوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔لہٰذا وہ لڑ رہے ہیں، اپنے اپنے محاذ پر جیسے عبدالستار ایدھی جیسے لوگ جو زندگی گزارتے نہیں بلکہ زندہ رہنے کی ہمت رکھتے ہیں، اور میرے جیسے کچھ کمزور لوگ جو نہ تو زندگی گزارنے کے لئے تیار ہیں۔اور نہ ہی زندہ رہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔اور آئے دن ان کی خودکشی کی خبریں اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔

بقول شاعر ؎

تصویر درد نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خاموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اُڑائی خمریوں نے طوطیوں عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری
لپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

آپ فیصلہ کرلیجیئے کہ میرا وجدان غلط تھا۔ہم زندہ نہیں بلکہ اپنی صلیب اپنے کندھوں پر اٹھا کر

اپنے مرنے کا فیصلہ طے کر رہے ہیں۔موت سے موت تک کا سفر۔کب سانسوں کی قید سے آزادی ملے۔کب دل وحشی تھم جائے۔ زندگی کی صعوبتوں سے چھٹکارا حاصل کر کے شاید زندہ رہ سکیں۔تاریخ کے اوراق میں آنے والی نسلوں کے ذہنوں میں باقی رہ جانے والوں کے دلوں میں آزادوطن کی آزاد ہواؤں میں ''افکاروں'' میں حیات ابدی کے پوشیدہ افسانوں میں سوچئے! کہیں دیر نہ ہوجائے۔



# زندگی

ہماری زندگی پانی کے ایک بُلبلے کی مانند ہے۔خوشی، راحت، چین اور سکون کا حصول امیری اور غریبی پر نہیں بلکہ یہ سب انسان کے دل ودماغ پر منحصر ہوتا ہے۔ایک شخص کو فکر ہے کہ وہ نئے ماڈل کی کار نہیں خرید سکتا۔تو دوسرا شخص اس بات پر پھولا نہیں سماتا کہ اس کم پاؤں کا درد دور ہو گیا ہے۔اسی طرح جہاں ایک طرف انسان چکن روسٹ اور ہزار قسم کے اعلیٰ اعلیٰ کھانے کھا کر خوشی محسوس نہیں کرتا تو دوسری طرف ایک انسان روکھی سوکھی باسی روٹی پانی میں بھگو کر کھانے کے بعد خوشی سے اچھلتا کودتا ہے۔کسی گھر میں خوشیوں کے شادیانے بجتے ہیں تو ساتھ والے گھر میں اپنے پیارے کے بچھڑنے پر صف ماتم بچھی ہوتی ہو۔کوئی شخص موت کو قہقے لگا کر گلے لگاتا ہے تو کوئی پھولوں کی سیج پر بھی بے چین سوتا ہے۔اب یہ دیوانگی، پاگل پن، اور زندگی سے بیزاری نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم اس مختصر زندگی کو خوشیوں کا گلدستہ بنانے کی بجائے غم، دکھ، رنج والم کا گھروندہ بنا لیتے ہیں۔ہمیں چاہیئے کہ ہم زندگی کو تاریکی اور خوف کا غار نہ بنائیں۔ بلکہ خوشیوں اور خوشبوؤں کی پھلجھڑیاں بنائیں۔ کہ قوس وقزح کی مانند اپنے رنگ بکھیرتی جائیں کیونکہ زندگی ہر رنگ میں خوب صورت ہے۔ہم نہ خود روئیں اور نہ اوروں کو رلائیں بلکہ اس مختصر سی زندگی میں صرف اور صرف مسکراہٹیں بکھیریں کیونکہ زندگی کا اصل مزا روتے ہوؤں کو ہنسانے میں ہے۔آؤ ہم سب زندگی کے ہر لمحے سے پیار کریں۔

# زمین پر زندگی

آج کا انسان ان گنت ٹکڑوں میں بکھرا ہوا ہے۔اس کے اندر ہیجان کی کیفیت انتہا کو پہنچ چکی ہے،اوراس کی کیفیت کے پس پردہ توسیع پسندی، دولت کے حصول کی بے جا خواہش،قوت افتخار کی ہوس اور تحقیق کی آرزو کا منفی ردّعمل جیسے عوامل کارفرما ہیں،اوراس کے علاوہ انسان نفس کے جو دیوتا تخلیق کرتا ہے۔توڑتا ہے، بنا تا ہے،اور مسلسل یہی عمل دوہرار ہا ہے۔روز ایک نیا بت تخلیق کر کے پرانے بتوں سے وفاداریاں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ بظاہر اکیسویں صدی میں رہتا ہے لیکن رویوں کے اعتبار سے شکار کے عہد میں زندہ ہے۔صرف اپنی ذات کو کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔اور اسی کو زندہ رکھنے کی فکر میں ہے۔آج کا انسان ترقی کے عروج پر ہے،اوراسی علم کے ذریعہ اسلحہ بناتا ہے اوراس کا غلط استعمال کرتا ہے ۔کہتے ہیں کہ سائنس غیر جانبدار رویوں کو وسعت دیتی ہے ۔ انسانی زندگی میں آسودگیاں پیدا کرتی ہے ۔چاقو سائنس کی ایجاد ہے۔جو سبزی کاٹنے ،پنسل تراشنے اورکئی دوسرے کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔لیکن اس کو استعمال تو انسان نے ہی کرنا ہے اوراگراب انسان اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔تو اس کے لئے سائنس تو ذمہ دار نہیں ۔ یہ تو انسان کا قصور ہے۔انسان کی ذات سے منسلک اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان علم اورایجادات کا غلط استعمال کرتا ہے ایسا کیوں ہے؟

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں انسان کی اناٹومی کو سمجھنا ضروری ہے۔انسان دوکیفیات پر مشتمل ہے ۔جسم اور جان۔جسم کا تعلق مادہ سے ہے اور جان کا روح سے،اور مادہ طبیعات اور روح مابعدالطبیعات سے تعلق رکھتی ہے۔علم اورایجادات کا استعمال دراصل مقصد حیات سے منسلک ہے اورانہی دونوں چیزوں کے غلط استعمال کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان آج بھی اپنے مقصد حیات کو سمجھنے سے قاصر ہے ۔اگر مقصد حیات کو پالیتا تو بچوں کی مسکراہٹ، زمین کا سبزہ،شبنم کے قطروں، چرند پرند، پھولوں اور جگنوؤں کو بارود کے ذریعے آگ نہ لگاتا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا مقصد حیات کیا ہے۔ یہ بات تو حتمی ہے کہ انسان کا مقصد حیات طبیعات اور

مابعدالطبیعات کے درمیان کہیں موجود ہے ۔ یا یہ کہ مادہ اور موت کے درمیان کہیں موجود ہے ۔ بات تلاش سے منسلک ہے۔طبیعات یعنی سائنس کے غلط استعمال سے زمین اسلحہ سے بھر گئی ہے اور مابعدالطبیعات یعنی موت کے بعد کے تصورات کے مفروضوں کی تشکیل سے غیر یقینی کی کیفیات سے انسان کو اس کی منزل سے دور کر دیا ہے۔ بات منزل سے دوری کی نہیں بات زمین پر زندگی کے خاتمے کی ہے کہ طبیعات اور مابعدالطبیعات علوم کے غلط استعمال سے انسان موت کے دہانے پر آ کھڑا ہے۔ ایٹم کی ایجادات سے قبل صرف اتنا کہا جاتا تھا کہ انسان مر جائے گا، اور ایٹم کی ایجاد کے بعد بات یہاں تک آن پہنچی ہے کہ اب یہ کہا جاتا ہے کہ ہم سب مر جائیں گے، اور پھر جب انسان نہ رہا تو زمین کس کام کی ہے؟۔اب یہ بات حتمی ہے کہ زمین پر انسان کو بچانا ضروری ہو گیا ہے،اور انسان کے پاس اب غلطی کی گنجائش نہیں کہ ہم فطرت کے خلاف مسلسل کوئی عمل دوہراتے رہیں،کیا انسان کو اس بات کا احساس نہیں کہ درخت کو کاٹنا انسان کی اپنی موت ہے؟

کیا انسان اس بات سے آگاہ نہیں کہ ایک درخت چھ بچوں کے لئے آکسیجن پیدا کرتا ہے بات اب درخت تک ہی محدود نہیں انسان کرہ ارض پر اب ہر چیز کو تباہ کر رہا ہے اور اپنے مقصد حیات سے دور ہٹتا جا رہا ہے ۔آؤ مل کر فطرت سے دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور مقصد حیات کی تلاش کریں زمین، پھول، بچے، چرند و پرند اور جگنو سب کے سانجھے ہیں۔فطرت سے دوست کا رشتہ استوار کرنے کے لئے ایک ایسے انسان کی ضرورت ہے جو ماں کا جذبہ رکھتا ہو۔مولانا رومیؒ نے کمال حکمت سے انسان کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

دست ہر نا اہل بیمارت کند     سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

ترجمہ۔ ہر نااہل کا ہاتھ تجھے بیمار کر دے گا۔ ماں کے پاس آ تا کہ تیری خبر گیری کرے۔ ماں استعارہ ہے تحفظ کا۔ راہنمائی کا، ربوبیت کا، جو وہ اپنے تمام بچوں کے لئے برابر مہیا کرتی ہے۔ جو فطرت کی طرف سے انسان کے لئے ایک پیغام ہے کہ زمین پر موجود تمام انسانوں کو تحفظ، راہنمائی اور ربوبیت مہیا کی جائے اور یہی انسان کا مقصد حیات ہے۔ جو انسان سے ابھی اوجھل ہے۔ اے خدا تو اس اشرف المخلوقات کی راہنمائی فرما۔ آمین۔

# قومیں تباہ کیوں ہوتی ہیں

پانچ ہزار سال قبل مسیح کا ذکر ہے کہ قوم نوح دریا دجلہ اور فرات کی وادیوں میں آباد تھی۔ طاقت ، علم اور دولت کے لحاظ سے یہ قوم گئی گزری نہ تھی۔ مگر اس قوم میں یہ خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ امیر اور غریب میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اچھے اور بُرے کو امارت اور غربت سے پرکھا جاتا تھا۔ حسن سیرت اور کردار کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ قانون اُس کا تھا جسے دولت اور اقتدار حاصل تھا۔ دوسری خرابی اس قوم میں یہ تھی کہ آباءواجداد سے وراثت میں لئے ہوئے رسم ورواج اور معاشرتی طورطریقوں کو مذہب جتنا مقدس سمجھتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اس قوم کو راہ راست پر لانے کے لئے آئے۔ قوم اپنے سرداروں کے ہاتھوں ظلم اور بے انصافی کی اذیت میں پڑی تڑپ رہی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے پرچار کیا کہ ہر انسان قابل احترام ہے، اور برتری اسے حاصل ہے۔ جس کا کردار بلند ہے۔ اور جس کے پاس عقل و دانش اور انسانیت کا درد ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے اس پیغام کی وجہ سے سردارانِ قوم نے انہیں پاگل تک کہہ ڈالا، اور کہا کہ تیری آواز پر لبیک کہنے والے کون لوگ ہیں؟۔

ہمارے کھیتوں میں ہل چلانے والے ہماری جوتیاں مرمت کرنے والے، ہمارے کپڑے سینے اور دھونے والے اور اسی قسم کے گھٹیا اور کمین لوگ تمہیں جانے کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔ کیا تو ہمیں بھی اپنے پیروکار بناکر ان کے جیسے بنانا چاہتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ میں جو کچھ کررہا ہوں یہ تو اللہ کا پیغام ہے اور جب تم اللہ کے سامنے جاؤ گے تو تم اس پر اپنی امارت کی دھونس نہیں جما سکو گے۔ اس کی بجائے اپنے اعمال بد کی سزا پاؤ گے۔ اب جبکہ میں اللہ کی طرف سے تم تک پیغام اور احکام پہنچا چکا ہوں۔ تم سزا سے نہیں بچ سکو گے وہ جو دولت کے نشے میں سرشار تھے۔ بولے اے نوح ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ غلام آقا کی برابری میں، کسان اپنے مالک کی برابری کرے اور کمتر بہتر کے برابر بیٹھے۔ ہماری قوم کو ہمارے سر نہ چڑھاؤ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ سرداروں نے کہا کہ ہم تیری یہ باتیں تا دیر برداشت نہیں کریں

گے اور جو تیری حمایت میں آواز اٹھائے گا اسے بھوک سے تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ان سرداروں نے اپنی قوم کو حضرت نوح علیہ السلام کے پیچھے لگا دیا کہ یہ آباؤ اجداد کے مذہب کا منکر ہے، اور پوری قوم کو مذہب سے متنفر کر رہا ہے۔ مذہبی پیشواؤں اور حاکمان قوم نے مل کر حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کا جینا حرام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ کھیتوں اور مویشیوں کی ملکیت کے نشے میں لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں، اور ان کے رازق بنے ہوئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایک کشتی بنانے کے اشارے دیئے۔ اکابرین قوم نے جب جب حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بناتے دیکھا تو ان کی ہنسی اُڑانے لگے کہ دیکھو یہ پاگل (نعوذ باللہ) کیا کر رہا ہے۔ یہاں تو بارش نہیں ہوتی۔ سیلاب کا تصور کیسا؟ کشتی تیار ہوگئی تو اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ تو اور تیرے خاندان کے افراد اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ میں سب کو بچا لوں گا۔ پھر ایک طوفان بادوباراں آیا آسمان کے بند ٹوٹ گئے۔ اتنا پانی برسا کہ دجلہ اور فرات ایک ہو گئے۔ وادیاں پانی سے لبریز ہوگئیں۔ پہاڑیاں اور چٹانیں ڈوبیں۔ اللہ تعالیٰ کے منکرین کی بستیاں ڈوبیں۔

بستیوں کے باسی ڈوبے لیکن حضرت نوح علیہ السلام اپنے ساتھیوں سمیت کشتی میں محفوظ رہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے دیکھا کہ اس کا بیٹا بھی ڈوبنے لگا ہے تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ تو نے تو فرمایا تھا کہ میں تیرے خاندان کو بچاؤں گا لیکن اس میں میرا بیٹا شامل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ کہ اگر تیرا بیٹا گنہگار ہے تو تو اسے اپنے خاندان کا فرد نہ سمجھ۔ اور تُو دیکھ نہیں رہا کہ بچ نکلنے والوں میں تیری بیوی بھی شامل نہیں۔ وہ بھی میری منکر تھی اور وہ قوم ایسی تباہ ہوئی کہ پھر کبھی ابھر نہ سکی۔ قوم عاد، نوح کی قوم کے بعد تاریخ میں ابھری یہ زمانہ دو اڑھائی سال قبل مسیح کا تھا۔ اس قوم کی حکومت عرب، شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ قوم علم وحکمت اور دولت وثروت سے مالا مال تھی۔ لیکن حکومت کا حق صرف چند افراد کو حاصل تھا یہ لوگ کمزور اور ناتوانوں کو غلام بنائے رکھتے اور ان سے اتنا کام لیتے کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں۔ ارباب اقتدار جابر اور ظالم تھے ان میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ اپنی یادگاریں تعمیر کرواتے جو کہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بنائی جاتی تھیں۔ تاکہ مرنے کے بعد بھی قوم ان کی برتری سے مرعوب رہے۔ یہ قوم کا حق مار کر اپنے خزانے بھرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے

انہیں قوم المجرمین کہا ہے۔انہیں ہدایت کی روشنی دکھانے کے لئے حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے مگر عاد کے سرداروں نے جو اپنے آپ کو قوم کا دیوتا سمجھتے تھے۔حضرت ہودؑ سے وہی سلوک کیا جو قوم نوح نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کیا تھا۔جب حضرت ہودؑ نے قوم کو عذاب سے ڈرایا تو اس قوم نے ان کا مذاق اُڑایا۔قرآن میں اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔''اور جس تباہی کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا'' یہ قوم صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ان کی بنائی ہوئی یادگاروں سے مرعوب رہنے والا کوئی نہ رہا۔تباہی کی ایسی ہی کہانی قوم ثمود کی ہے۔جو وادی قریٰ میں آباد تھی۔یہ بھی تقریباً دو تین ہزار سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔اس قوم کو بھی چند دولت مند افراد نے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔یہ گروہ انسانیت کی تذلیل کو اپنا حق سمجھتا تھا۔اس کی کوشش یہی رہی تھی کہ قوم کی محنت کی کمائی کسی نہ کسی طریقے سے قانون کی زد میں لاکر اپنے خزانوں میں اکھٹی کر لی جائے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا کہ ان سرداروں سے کہو کہ جنہیں تم غلام سمجھتے ہو یہی لوگ اللہ کو عزیز ہیں۔مگر حضرت صالح علیہ السلام کو اکابرین قوم نے جنہوں نے دولت اور طاقت کے زور پر اپنے آپ کو قوم پر ٹھونس رکھا تھا وہی کچھ کہا جو ان سے پہلی اقوام کے خودسر سرداروں نے نوحؑ اور ہودؑ سے کہا تھا۔انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا مذاق اُڑایا اور برا بھلا کہا۔حضرت صالح علیہ السلام کو قوم کی نظروں سے گرانے کے لئے ان کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا کیا۔اوران پر جھوٹے الزامات لگائے۔اور وہ سمجھ نہ سکے کہ وہ حضرت صالح علیہ السلام کا نہیں اللہ تعالیٰ کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔اس کا نتیجہ وہی ہوا جو قوم عادؑ وثمودؑ اور نوحؑ کا ہوا تھا۔اُن کی بستیاں اُجڑ گئیں۔ان کے محل ویران ہو گئے ان کے مویشی ہلاک ہو گئے۔اور یہ لوگ ایک عبرتناک تاریخ چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے نابود ہو گئے۔قوم مدین کی داستاں بھی کچھ ایسی ہی ہے۔یہ قوم کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح شام کے قریب آباد تھی یہ تاجر قوم تھی۔تجارت میں دھوکہ ان کا شیوہ تھا ان میں ہر وہ خرابی اور بددیانتی موجود تھی جو آج کے تاجروں میں پائی جاتی ہے مال کم دیتے اور قیمت زیادہ لیتے تھے۔ملاوٹ کرتے اور وزن بڑھانے کے طریقے ایجاد کرتے تھے۔اس بددیانتی سے جو رقم اکھٹی کرتے اس کے بل بوتے پر قوم پر حکومت کرتے تھے۔قوم ان کی رعایا بھی اوران کے مال کی گاہک بھی تھی۔مال،اناج اور دولت ان کے

پاس تھی اور حاکم بھی اُن کے ہاتھ میں تھے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کوان لوگوں کو نیکی کی راہ پر ڈالنے کے لئے بھیجا۔آپ نے انہیں احکام الٰہی سنائے اوراس پر وہ حیران ہوکر بولے کہ شعیب تم تو ہم میں سے ہو یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو کہ ہم جو کماتے ہیں وہ سب غرباء میں تقسیم کر دیں؟۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کیااس طرح تو ساری قوم خوشحال ہوجائے گی اس کی عقل ٹھکانے آجائے گی۔اور پھر وہ کیا ہماری برابری کا دعویٰ نہیں کرے گی؟۔ہم بھلاقوم کواپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لینے کا حق کیسے دے سکتے ہیں؟۔حضرت شعیب علیہ السلام کو پاگل اور مجذوب قرار دے دیا گیا۔سرداران قوم نے ان سے قطع تعلق کر کے ان کا جینا حرام کر دیا۔حضرت شعیب علیہ السلام چونکہ ان ہی کی قوم کے ایک فرد تھے۔اس لئے سرداران نے کہا کہ اگر تم ہماری قبیل میں سے نہ ہوتے تو ہم تمہیں قتل کر ڈالتے یا سنگسار کر دیتے۔

آخر کار اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو عبرت کا نشان بنا دیا۔کچھ وقت تک ان کے کھنڈرات نظر آتے رہے پھر اللہ کی زمین نے انہیں بھی نگل لیا۔موجودہ زمانہ میں بھی اسی قسم کی قباحتیں پھیل گئی ہیں اور وباء کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔اوران کو اتنی مقبولیت مل چکی ہے کہ ملکوں اور قوموں نے ان برائیوں کو اپنی تہذیب وتمدن کا لازمی جزو بنالیا ہے۔وہ ہے جنسی بے راہ روی،لوگوں پر حیوانی اور سفلی جذبات کا غلبہ ہورہا ہے۔اجتماعی آبروریزی کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے۔ہر طرف ذہنی لذت اور جنسی تسکین کے مناظر نظر آتے ہیں۔تعلیم کی فراوانی نے انسان کو یہ جواز فراہم کر دیا ہے کہ نیم عریانی بے حیائی نہیں بلکہ یہ آرٹ ہے اور یہ کسی بڑے ذہین مصور کا شاہکار ہے۔کتب،رسائل،فلموں اورٹی وی پر عورت کواس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھنے اور پڑھنے والے کے حیوانی جذبات مشتعل ہوتے ہیں،اوران کی تسکین کے لئے انسان جنسی جبلت کی زنجیروں کو توڑ کر انحراف کے طریقے اختیار کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے عصمت اور حیاء کو بہت زیادہ قدرومنزلت اور اہمیت عطا کی ہے۔ یہ مرد کی آمریت اور خود ساختہ آمریت کا مظاہرہ ہے کہ اس نے عصمت وحیا کو عورت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔اور معاشرے میں یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ صنف عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔اور حیا کو اپنا زیور سمجھے۔مرد خود کتنا ہی بے حیا اور عصمت بریدہ ہوجائے،کوئی باز

پُرس نہیں۔عصمت مرد کی بھی ہوتی ہے۔درحقیقت حیا اگر عورت کا زیور ہے تو یہ مرد کی تلوار بھی ہے، اور ڈھال بھی۔مرد جو اپنی عصمت سے دست بردار ہوا اور حیا کو تار تار پھینکا تو وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اتنا ہی گنہگار ٹھہرا جتنی کہ ایک عورت۔قرآن کریم میں دونوں کی سزا ایک جیسی مقرر ہے۔اللہ تعالیٰ نے بدکاری اور بے حیائی اور گھناؤنے گناہ کی جو سزا قوموں کے لئے مقرر کی ہے اس کے آثار پہلے زمانوں میں بھی ملے ہیں۔اردن اور فلسطین کے درمیان بحیرہ مردار کے نام سے ایک سمندر ہے۔اس کے جنوبی حصے میں پانی کے نیچے ایک غرق شدہ شہر کے آثار دیکھے گئے ہیں۔ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ قوم لوطؑ کا ایک شہر ہے۔جس کا نام سدوم تھا۔اس سے تھوڑی ہی دور ایک اور شہر کا پتہ چلا ہے یہ بھی قوم لوط کی بہت بڑی بستی تھی۔اس کا نام گھوارہ بتایا گیا ہے۔اُس دور کی دستاویزات میں ان دونوں بڑے شہروں کا ذکر آتا ہے۔قوم لوط اسی علاقے میں بحیرہ مردار کے جنوب میں آباد تھی۔سمندر کے علاوہ زمین پر بھی اس قوم کی تباہی کے آثار ملتے ہیں۔اس قوم کے گناہوں کی تفصیل بہت ہی شرمناک ہے مختصر یہ کہ یہ قوم حیوانوں کی سطح سے بھی پست ہو چکی تھی،اور اس نے سفلی جذبات کی تسکین کو ہی جینے کا مقصد بنا لیا تھا۔جنسی بے راہ روی میں اس قوم نے اتنا نام پیدا کیا کہ آج اس شہر سدوم کے نام پر sodomy باقاعدہ اصطلاح بن گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو انسانیت کی تذلیل سے باز رکھنے کے لئے حضرت لوطؑ کو مبعوث کیا مگر ان کی بات سن کر لوگوں نے حیرت سے کہا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟۔ہمیں گنہگار کہتا ہے اور اپنے آپ کو مقدس اور ہم سے برتر سمجھتا ہے۔مختصر یہ کہ حضرت لوطؑ کی کسی نے نہ سنی۔جنسی لذت انسان کو پاگل پن کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔انسان پر کسی پند و نصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوتا وہ اسے بھی پاگل سمجھتا ہے، جو اسے اس پاگل پن سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔یہی سلوک حضرت لوطؑ سے اس کی قوم نے کیا۔اور حضرت لوطؑ پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے کا غلط الزام لگا کر قوم کے جذبات کو اُبھارا۔جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ کہ اس قوم کی تباہی ضرور ہوگی یہ تباہی اس قوم کے لئے سزا بھی تھی اور اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ ایسے گھناؤنے گناہ کے جراثیم اس قوم کے ساتھ ہی زمین میں دفن ہو جائیں۔قرآن کریم نے اس قوم کی تباہی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ان کی بلندیاں پستیوں میں بدل گئیں اُن کے شہر ایسے تباہ ہوئے کہ اُن کے اوپر پانی آ گیا اور گناہگار بستیوں کو دنیا کی نظروں

سے اوجھل کر دیا زمین پر ان بستیوں کے بکھرے بکھرے کھنڈرات ملتے ہیں۔ان میں سے ایک چٹان ستون کی طرح کھڑی ہے۔ جسے لوطؑ کا ستون کہتے ہیں۔روایت ہے کہ یہ لوطؑ کی بیوی تھی اور وہ ان کے مخالفین میں سے تھی۔اللہ تعالیٰ نے چراغ کے تلے اس اندھیرے کو یہ سزا دی کہ اسے پتھر بنا دیا۔اسے آج بھی لوگ لوطؑ کی بیوی یا لوطؑ کا ستون کہتے ہیں۔جنسی بے راہ روی کے واقعات میں دن رات اضافہ ہو رہا ہے۔آپ کو قومِ نوح،قومِ عاد،قومِ ثمود،قومِ مدین اور قوم لوطؑ کی ساری بدیاں اور سارے ہی گناہ نظر آئیں گے۔ چند ایک افراد دولت اور جاگیرداری کے زور پر قوم کو رعایا بنائے ہوئے ہیں۔قرآن ہاتھ میں لے کر اور اللہ و رسول کا نام لیکر قوم سے جھوٹے وعدے کرتے اور دھوکا دیتے ہیں۔قوم کو روٹی کا نعرہ دے کر بھوکا رکھتے ہیں،اور مذہب کا فسوں طاری کر کے کفر کے راست پر ڈالتے ہیں۔ چند ایک افراد اپنے خزانے بھرنے کے لئے قوم کو 65 برسوں سے لوٹ رہے ہیں،اور جب انہیں کوئی کہتا ہے کہ تمہارے اعمال قرآن کریم کے منافی ہیں۔ جو تم ہاتھ میں لے کر حکومت کرتے ہو۔تو وہ اُس شخص سے وہی سلوک کرتے ہیں جو انہوں نے نوح، ہود،شعیب اور لوطؑ سے کیا تھا۔خدا تعالیٰ غضب میں دھیما ہے،وہ قوموں کو سزا دینے سے قبل اتمام حجت کرتا ہے۔دنیا میں نذیر بھیجتا ہے جو انکو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔نذیر آ چکا۔اتمام حجت ہو چکی۔خدا تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی ڈھیل کا وقت آہستہ آہستہ گزر رہا ہے لیکن پکڑ لازمی ہو گی۔چنانچہ اس نے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا! کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم امن میں رہو گے،یا تم اپنی تدبیروں سے اپنے تیئں بچا سکتے ہو؟ ہرگز نہیں انسانی کاموں کا اُس دن خاتمہ ہو گا۔اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں،اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں۔ وہ واحد یگانہ ایک مدت تک خاموش رہا اُس کے آنکھوں کے سامنے مکروہ کام کئے گئے۔وہ چپ رہا۔مگر اب وہ ہیبت کے ساتھ اپنا چہرہ دکھلا دے گا۔جس کے کان سننے کے ہوں،سنے کہ وہ وقت دور نہیں۔اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ بخش دے۔ہمیں اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کی توفیق دے۔اور ہمیں ہر قسم کی تباہی سے اور عذاب سے اپنی پناہ میں رکھے۔آمین۔ ❁❁

# یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

مجھے نفرت ہے عدم مساوات، ظلم اور ناانصافی کی تند و تیز آندھیوں کے خلاف محبت، برابری، حق اور انصاف کے چراغ جلانے ہیں۔ ہر چند کہ گھُپ اندھیرے میں ایک جگنو کی روشنی کوئی حقیقت نہیں رکھتی، اور نہ سنگلاخ چٹانوں پر شبنم کے برسنے سے پھول اُگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی انسان کے بس میں جو کچھ ہے جو وہ کر سکتا ہے۔ نتائج کا انتظار کئے بغیر اگر وہ پوری جدو جہد اور تسلسل کے ساتھ کرتا چلا جائے تو پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے کا صرف محاورہ ہی نہیں آتا بلکہ سچ مچ جوئے شیر بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بظاہر گلہری اپنے جسم سے لپیٹ کر رات کے جو چند ذرے دریا کی بپھری ہوئی موجوں کے خلاف بچھاتی ہے اس سے طوفان کے سامنے نہ دیوار کھڑی ہوتی ہے اور نہ بند باندھا جا سکتا ہے۔ مگر اصل بات وہ ''احساس'' ہے جو ظالم موجوں کو روکنے کے لئے حق کی حمایت کی خاطر اسے میدان کارزار میں اپنی بساط کے مطابق کوشش اور سعی کرنے پر اُکساتا ہے۔ یہی احساس'' وہ روشنی ہے جس کی چمک خواہ کتنی ہی مدّھم اور کم کیوں نہ ہو بہر حال ایک دن وہ ظلمت کی شب کا دامن تار تار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب یہ احساس پختہ ہو کر ''یقین'' کے نور سے منور ہو جائے۔ تو پھر ظلم اور ناانصافی کے تاریک سائے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتے ہیں۔ محبت ایک سچائی ہے ایک نہ تھکنے اور نہ اکتانے والے مسلسل عمل کا نام ہے۔ یہ بات نہ صرف عام اور سطحی طور پر ہمارے معاشرے میں عروج مادی محبت کے بارے میں صادق آتی ہے۔ بلکہ کسی بھی اعلیٰ مقصد میں کامیابی اور کامرانی کے لئے بھی یہی لگن، جذبے کی سچائی، محبت اور مسلسل جدو جہد ہے۔ محبت اس دنیا میں سب سے زیادہ اور عام ملنے والا خام مال ہے۔ مگر افسوس دنیا کے اکثر ٹکسال حقیقی محبت کی بجائے خواہشات کے صرف کھوٹے سکے بناتے ہیں اور یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اور اس مجازی محبت کے نتیجہ میں محبت کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں کسی پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ چند

لمحے سکون کے ساتھ بیٹھ کر یہ سوچ سکے، تدبر کر سکے، غور کر سکے، کہنے کی حد تک تو کہا گیا کہ غمِ محبت اور راحتِ وصل کے علاوہ بھی بہت کچھ زمانے میں ہے۔ مگر عملی طور پر اس سلسلہ میں بہت کم توجہ دی گئی محبت کی سچائی کو اگر یقین کی ''روشنی'' حاصل ہو جائے تو یہ انسانی ذہن، وجدان اور شعور کو اس طرح منور کر دیتا ہے کہ یہ ''روشنی'' اس کے لئے نشانِ منزل اور مینارِ نور کا کام دیتی ہے۔ اکثر انسانی ضمیر روشنی کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ انسانی ضمیر بہت بڑا منصف ہے۔

بڑے بڑے پیچیدہ مسائل فوراً حل کر دیتا ہے۔ اور ان کا فیصلہ غلط بھی نہیں ہوتا۔ مگر انسانی ضمیر کا یہ پودا بہت نازک مزاج ہوتا ہے۔ ''احساس'' کا پانی اور عدل کی کھاد جہاں کم ہوئی یہ سوکھ کر مردہ ہو جاتا ہے، اور یہ حالت لاعلاج ہے۔ مردہ ضمیر کے لئے کوئی مصنوعی علاج یا آکسیجن کا کوئی مصنوعی تنفس کام نہیں دیتا۔ اس لئے اس کی حفاظت بہت ضروری ہے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ضمیر کا فیصلہ سننا بڑے دل گردے کا کام ہے لیکن جو اس امتحان میں کامیاب ہوا، کندن بن گیا۔ انسانی معاشرے کی بنیاد عدل اور انصاف پر رکھی گئی ہے۔ انصاف اور عدل کے بغیر مساوات کا تصور ناممکن ہے۔ قانون اور انصاف کے لئے دوہرا معیار قائم کرنا سب سے بڑی بے انصافی ہے۔ دوہرا معیار اصل میں انصاف کی نفی ہے۔ عدل کے بغیر کوئی معاشرہ زیادہ دیر تک پر امن نہیں رہ سکتا۔

قانون وہی ہے۔

قانون وہی ہے جو روح اور حقیقت کے لحاظ سے مساوات اور عدل قائم کرے۔ قانون پر صحیح روح کے ساتھ عمل کرنا اصل بات ہے۔ انسانی تمدن میں مذاہب کا کردار اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ مذہب اصول اور ضابطے مقرر کرتا ہے اور اس کی اصل روح کے ساتھ اس پر عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ مذہب قانون بنا کر حدود متعین کرتا ہے وہ انسانی ذہن اور خواہشات کو منتشر ہونے سے بچاتا ہے اور ایک مرکزی نقطے کے طابع رکھتا ہے۔ تاریخ مذاہب اس بات کی گواہ ہے کہ مذاہب نے محبت اور سچائی کو اپنے منشور کی اساس کے طور پر پیش کیا۔ مذہب نام ہے آفاقی قدروں کا، یہ نام ہے محبت کا، سچائی کا، بھائی چارے اور اخوت کا، باہمی احترام کا اور اگر کسی جگہ یہ اکائیاں موجود نہیں تو تسلیم کرنا

پڑے گا کہ بعد میں اس مذہب کی تشریح اور تعبیر کرنے والوں نے ٹھوکر کھائی اور وہ اصل روح سے دور چلے گئے۔ عدل اور انصاف کی حفاظت کے لئے احتساب بہت ضروری ہے۔ احتساب اور جوابدہی کا عمل انسان کو بے لگام ہونے سے بچاتا ہے۔ عدم احتساب جنگل کے قانون کو جنم دیتا ہے یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ معاشرے میں عدل اور امن رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جذبہ ایثار کو فروغ دیا جائے۔ قربانی کے جذبہ کو رواج دینے کی ضرورت ہے۔ مال کی قربانی، عزت کی قربانی، جان کی، وقت کی قربانی، جو قربانی کا فن نہیں جانتا، جو مرنے کے سلیقہ سے ناواقف ہے جو اس فن سے محروم ہے، زندگی اسے زندہ رہنے کے فن سے محروم کر دیا کرتی ہے۔ زندگی کا آبِ حیات موت کے پیالے سے قطرہ قطرہ کشید ہو کر ملتا ہے۔ جو اس زہر کو سقراطی وجدان سے پی گیا وہ ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔

دنیا کی کوئی طاقت اسکے وجود کو کالعدم نہیں کر سکتی۔ قانون اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو جس چیز نے زیادہ نقصان پہنچایا وہ ہے ''SHORT CUT'' یعنی قانون سے ہٹ کر، مروجہ طریقِ کار سے ہٹ کر۔ جلدی سے، فوراً ہی کسی چیز کا حصول، انسانی جبلت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ پابندیوں کو توڑنے کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے۔ قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں سے پہلے ٹکٹ لینے پر طبیعت مچلتی ہے۔ یہ خطرناک رُجحان ہے۔ یورپی اقوام اس لحاظ سے آگے ہیں کہ ان لوگوں میں برداشت ہے اپنی باری کا انتظار کرنے کی ہمت ہے، اور وقت ہے قانون سے عموماً ہمارے ہاں ایک قسم کی لاپرواہی برتی جاتی ہے، اور ہم خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ کہیں ایک فرد قانون توڑتا ہے یا قومی چیز کو نقصان پہنچا رہا ہوتا ہے، تو اس کے قریب کھڑے ہوئے درجن بھر افراد کھڑے تماشا بنے رہیں گے۔ اسے اخلاقی جرات کا فقدان کہا جا سکتا ہے۔ اگر ہمت کر کے ایک آدھ فرد غیر قانونی بات پر احتجاج کرے تو اس خرابی سے کسی حد تک نجات پائی جا سکتی ہے۔ مسلسل محنت، سچائی اور نیک نیتی سے عمل کیا جائے تو اس کے ثمرات بہت جلد ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ مسلسل محنت کرنا وہ سنہری کنجی ہے جس سے بڑی بڑی مشکل تجوریوں کے تالے کھُل جاتے

ہیں۔محبت سے بھرپور مسکراہٹ ایک ایسا پھول ہے جس کی خوشبو کبھی کم نہیں ہوتی۔یہ وہ ہتھیار ہے جس کی قسمت میں فتح ہی فتح ہے۔ناکامی اور نامرادی اس کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ پاتیں۔اس لئے محبت کو فاتح عالم کا نام دیا گیا ہے۔اگر آپ محبت کی خوشبو سے معطر ہو کر مسلسل کوشش اور یقینِ کامل کی فولادی وردی خود پہن کر کارِزار میں نکلیں گے تو مشکلات کا دیو سرنگوں ہو کر آپ کے قدموں میں رحم کی بھیک مانگتا نظر آئے گا۔کامیابیاں اور کامرانیاں آپ کے سر کا تاج بنیں گی۔اس کے ضروری ہے سب سے پہلے منزل کا واضح تعین کریں منزل کے حصول پر مکمل یقین ہونا ضروری ہے۔اور پھر جذبے کی سچائی کے ساتھ جو بھی انسان کے بس میں ہو وہ کرتا چلا جائے۔یقین بہت بڑی قوت ہے یقین کی دولت جسے مل گئی وہ غنی ہو گیا۔یقین سے دریاؤں کا رُخ موڑا جا سکتا ہے پہاڑ کاٹے جا سکتے ہیں۔یقین سے انہونی کو ہونی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یقین وہی کچھ دے گا جس قدر یقین اور جذبے کی سچائی کے ساتھ اسکا تصور کر کے اس پر عمل کیا جائے گا۔جس کو یقین جیسی دولت حاصل ہو گئی وہ مفلسی سے بچا لیا گیا۔



## کامیابی

کامیابی ان لوگوں کے قدم چومتی ہے جو کوشش اور جدو جہد میں لگے رہتے ہیں۔کامیاب زندگی کے لئے اپنے ماضی پر غور کیجیئے۔اور ماضی کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سیکھیں۔آئندہ کے لئے موثر حکمت عملی طے کریں۔اور اسے کامیابی سے لاگو کرنے کے لئے محنت اور جانفشانی سے کام کریں۔انگریزی کا محاورہ ہے۔ Plan your work and work your plan. کہ اپنے کام کی منصوبہ بندی کریں اور پھر اسے عملی جامہ پہنائیں۔

# خود کو پہچانیئے

''ہر مردے دہر کارے'' کا تخیل موجودہ دور کے دنیوی نظام میں اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ آج سے ہزاروں سال قبل افلاطونی جمہوری نظام میں اہم تصور کیا جاتا تھا۔ زندگی اور زندگی کی تمام تر رنگینیاں، ذہن اور اس کی جملہ صلاحیتیں اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتیں جب تک ہم زندگی کی پیچیدہ راہوں میں اپنا مقام یا نصب العین معلوم نہ کر لیں۔ آج بھی سر زمین پاکستان میں بے شمار نوجوان ایسے ہیں، جو عالمانہ رہبری کے فقدان کی بنا پر زندگی کے چوراہے پر کھڑے ہوئے اس شعر کی زندہ تفسیر بنے ہوئے ہیں۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں ترقی یافتہ مما لک میں نصب العین کا تعین قومی تعلیم کی اوّلیات تصور کیا جاتا ہے۔ اگر تعلیم کا کوئی مقصد ہے تو صرف یہ کہ حجاب در حجاب پردوں کو بے نقاب کرتے ہوئے آئینہ ایام میں ہمیں اپنی سچی تصویر دکھائے، تصورات کو مجردات کی شکل دے، جبلتوں کو حسن کے سانچے میں ڈھالے اور فرد کی فطری صلاحیتوں کے لئے ایک موزوں میدان ہموار کرے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو آلہ کار بناتے ہوئے اپنے میدان کا مرد ثابت ہو۔ آج جس شخص کو دیکھیئے اس کے ماتھے پر تین بل نظر آئیں گے۔ وہ قدم قدم پر کج خلقی کا مظاہرہ کرے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں 99 فیصد افراد Mental Anarchy میں گرفتار ہیں، اور زندگی میں اپنے موجودہ مقام سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں فردوس گم گشتہ کی تلاش ہے۔ اپنے ذہنی رجحانات اپنے ذوق اپنی گہرائیوں اور گیرائیوں کا جائزہ لیجیئے اور خود سے سوال کیجئے۔ میں کیا بننا چاہتا ہوں؟ اگر آپ کے پاس اس کا جواب ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ موزوں، متوازن، اور منتظم شخصیت کے مالک ہیں۔ ورنہ آپ ہر لمحہ اپنی زندگی کو برباد کر رہے ہیں۔ آپ وہ جسم ہیں جس میں روح نہیں، آپ وہ پھول ہیں جس میں خوشبو نہیں۔ وہ مسافر ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔ وہ گم کردہ راہ ہیں جو ہر وقت کہیں ذہنی خودکشی اور کہیں شکستہ ضمیری میں گرفتار ہو۔ بقول غالب نہ تو آپ

''بوئے گل'' ہیں، اور نہ ''نغمہ ساز'' آپ صرف اپنی شکست کی آواز ہیں۔سقراط کی پہلی اور آخری تعلیم ''خود کو پہچانئے'' کی تعلیم تھی۔

باب العلم حضرت علی کرم اللہ کا یہ قول آج بھی دنیائے علم کا ایک روشن مینار بنا ہوا ہے اس قول کی معنویت ان ماہرین تعلیم سے پوچھیئے جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے مسئلہ کو فرد کے ''عرفان نفس'' کی روشنی میں حل کرتے ہیں۔اگر آپ زندگی کی جوہری طاقت سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو پہلے واضح طور پر اس امر کا فیصلہ کر لیجیئے کہ آپ کیا بننا چاہتے ہیں۔جس طرح جہاز کے کپتان کے پاس بادپیما اور موسمیاتی معلومات اور قطب نما ہوتا ہے اس طرح ہر انسان کے پاس ایک قطب نما ہوتا ہے۔ جو اس کی منزل کی نشاندہی کرتا رہتا ہے۔اس کو عام الفاظ میں ''اپنا اپنا ذوق'' یا ''اپنا اپنا رجحان'' کہتے ہیں۔ ہمارا رجحان طبعی ہی اصل میں اصل میں طباع بناتا ہے۔ زندگی کے نگارخانہ میں جا کر دیکھیئے۔کہیں شاعر قوم کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے۔کہیں مصور قوم کی تصویر میں گُم ہے۔ کہیں لیڈر قوم کا درد بنا ہوا ہے۔کہیں استاد معمار اعظم ہے کہیں فنکار اپنے شہ پاروں میں گم ہے۔کہیں گلوکار اپنے نغمات میں محو۔ان سب نے اپنے آنسوؤں سے اپنی زندگی کی تاریک رات میں چراغاں کیا ہے۔اب سب نے اپنے خون جگر سے اپنی زندگی کی چمن بندی کی ہے۔ رومی، سعدی، خیام، فردوسی، بوعلی سینا، انوری، رازی سے لے کر غالب، حالی اور اقبال تک کی زندگیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ بلند ہستیاں دُھن کی اور کام کی پکی تھیں۔کیا یہ حقیقت نہیں کہ اقبال کو اقبال کی بچپن ہی سے تلاش تھی۔ جب ہی تو اس نے سکول میں دیر سے آنے پر کہا تھا کہ ''اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے''۔

زندگی کے بازار میں ہر چیز کی ایک قیمت مقرر ہے۔لیکن بہت سے لوگ زندگی کو ایک حسین تحفہ یا پھولوں کی سیج سمجھتے ہیں۔اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی ہر چوراہے پر انہیں بچوں کو کھلونے دے کر بہلا دیتی ہے۔ بر خلاف اس کے مردان ہنر مند جنہیں صرف ایک ہی لو اور لگن ہوتی ہے۔ وہ دن میں آفتاب کی کرنوں اور رات میں مہتاب اور تاروں کی ضوفشانیوں سے اپنی تصویر چمکاتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے بازار میں گرمی خون سے سودا کرتے ہیں۔ان کا مے خانہ

حیات ان کے گرم لہو سے معمور ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذوق کے نشہ میں سرشار ہوتے ہیں اور اپنی منزل کی تلاش میں مردانہ وار جادہ پیما ہوتے ہیں ۔ ہمارے محبوب قائد کو صرف ایک دُھن تھی ۔قوم کا صرف ایک مطالبہ تھا ایک نعرہ تھا'' پاکستان'' ہمارے مخالفین نے کہا جناح چاند تاروں کے لئے رو رہا ہے، جناح ناممکن کو ممکن بنانا چاہتا ہے، اور بے شک چاند تاروں سے حکومت کی تخلیق کی جو دنیا کی چاند تاروں والی حکومتوں میں سب سے بڑی حکومت ہے۔ ہمیں ہمیشہ اس ذہنی قانون کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وحدت، مقصد، وحدت فکر کو جنم دیتا ہے۔ وحدت فکر، وحدت عمل کو جنم دیتی ہے اور غم زندگی میں جوہری طاقت کا دوسرا نام ہے لیکن یہ میدان عمل یہ جوہری طاقت اس وقت تک ہیچ ہے جب تک ہم خود کو نہ سمجھیں اور اپنی صلاحیتوں کو یکسوئی کے ساتھ کسی خاص مقصد کے لئے جو ہمارے لئے عین عبادت ہے آلہ کار نہ بنائیں۔



## ایکسرے کا موجد

William Rontgen نے ایکسرے کی شعاؤں کو ۱۸۹۵ء میں اتفاقی طور پر دریافت کر لیا تھا۔لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ کہ یہ کیا شے ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس نے ان شعاؤں کو X (نامعلوم) کا نام دیا۔ بہر حال ان کارآمد شعاؤں کو دریافت کرنے اور کارآمد بنانے کا سہرا William Rontgen کے سر ہے۔ William Rontgen جرمنی کا رہنے والا تھا۔ ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوا۔ ہالینڈ اور زیورخ میں تعلیم حاصل کی ۔ ۱۸۷۵ء میں ایگریکلچر اکیڈمی میں فزکس اور حساب کے مضامین کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ اس نے بجلی اور مقناطیس کے متعلق بہت ہی مفید دریافتیں کیں۔ ۱۹۰۱ء میں اسے فزکس کا نوبیل انعام اور ۱۸۹۶ء میں اسے رائل سوسائٹی کا ''رمفرڈ تمغہ'' دیا گیا۔ میڈیکل سائنس کو عظیم ایجاد دینے والا یہ شخص فروری ۱۹۲۳ء وفات پا گیا۔

# نوشیرواں عادل کے اقوال زریں

1۔ جب تک کہ رات دن آتے جاتے ہیں حالات کی تبدیلیوں پر تعجب مت کر۔ کیونکہ ہر دن رات میں ایک نئی بات واقع ہوسکتی ہے۔

2۔ کیوں لوگ اس کام سے شرمندگی اُٹھاتے ہیں کہ جس کام کے کرنے کی وجہ سے دوسرے شرمندگی اُٹھا چکے ہیں۔

3۔ کیوں وہ شخص اپنے آپ کو زندہ شمار کرتا ہے جبکہ اس کی زندگی کا مقصد سوائے عیش وعشرت اور دنیاوی لذت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

4۔ کیوں تو اس شخص کو دشمن نہیں کہتا جو کہ اپنی طاقت وتوانائی کو لوگوں کو نقصان پہنچانے میں استعمال کرتا ہے یعنی خلقِ خدا کے دشمن کو تو کیوں تو اپنا دشمن نہیں سمجھتا۔

5۔ کیوں تو اس شخص کو اپنا دوست کہتا ہے جو کہ تیرے دوستوں کا دشمن ہے۔

6۔ کسی بے ہنر شخص سے دوستی مت کر کیونکہ بے ہنر شخص دوستی تو کیا دشمنی کرنے کے بھی لائق نہیں۔

7۔ اس نادان سے پرہیز کر جو کہ خود کو دانا شمار کرتا ہے۔

8۔ اپنی ذات سے دوسروں کو فیض عطا کرتا کہ خدا تعالیٰ تجھے غنی کر دے۔

9۔ تو حق کہہ اگر چہ کہ تلخ ہو۔

10۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تیرا راز دشمن نہ جانے تو اپنے دوست سے بھی مت کہہ۔

11۔ بڑے بزرگوں کو حقیر جان کر نقصان مت اُٹھا۔

12۔ جس انسان کے پاس کوئی ہنر نہ ہو اس کو زندہ مت شمار کر۔

13۔ اگر تو چاہتا ہے کہ کسی خزانے کے بغیر بھی تو دولتمند ہو جائے تو قناعت کر۔

14۔ لاف وگزاف مت خرید، تا کہ اسے بیچنا نہ پڑے یعنی اگر کوئی بڑائیاں مار رہا ہو تو اسے قبول مت کر کیونکہ اگر تو قبول کرے گا تو دوسروں کے سامنے کہے گا اور یہ تیرے حق میں باعث

شرمندگی ہوگا۔

15۔ موت اس سے بہتر ہے کہ ہم رتبہ لوگوں کا احسان اُٹھانا پڑے۔

16۔ بھوک سے مرجانا بہتر ہے اس سے بہتر ہے کہ کمتر لوگوں کی روٹی سے سیر ہوجائیں۔

17۔ ہر وہ خیال جو کہ تیرے ذہن میں آتا ہے اس پر اور نا قابل اعتماد لوگوں پر اعتماد مت کر اور قابل اعتماد لوگوں سے اپنے اعتماد کو مت کھینچ لے بلکہ ان پر اپنا اعتماد بحال رکھ۔

18۔ اپنے لوگوں پر اپنی ذات کی بہ نسبت کم محتاج نہ ہونا ایک بڑی مصیبت ہے۔جان لے یعنی اپنی ذات پر زیادہ انحصار کرنا بہ نسبت اپنے ساتھیوں کے بہتر ہے، کیونکہ پانی میں مرجانا بہتر ہے اس بات سے کہ کسی مینڈک کی پناہ حاصل کریں۔

19۔ ایک گنہگار اور اس دنیا کی جستجو میں رہنے والا دنیا دار شخص لیکن جس کے مزاج میں انکساری و عاجزی ہو اس شخص سے بہت بہتر ہے جو کہ عابد و زاہد ہو۔اور اپنی زندگی آخرت کی دنیا کی جستجو میں گزار رہا ہو لیکن تکبر رکھتا ہو۔

20۔ اس شخص سے زیادہ نادان کوئی نہیں جو کسی کم رُتبہ شخص کو کسی اعلیٰ مقام تک پہنچتا ہوا دیکھے لیکن پھر بھی اسی انداز میں حقیر جانے۔

21۔ اس سے بڑھ کر شرم کی اور کوئی بات نہیں ہے کہ آپ کسی چیز کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اسے نہیں جانتے اور اس طرح جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔

22۔ اس شخص سے زیادہ حواس باختہ کوئی نہیں جو حاصل شدہ چیز کو کسی نا حاصل چیز کے لئے گنوا دے۔

23۔ دنیا میں اس شخص سے کمتر اور کوئی نہیں کہ کسی کو اس سے ضرورت ہو اور وہ اس کی ضرورت پوری کرسکتا ہو لیکن وہ اس کے کام نہیں آتا۔

24۔ ہر وہ شخص جو کہ تجھے بلا وجہ برا کہتا ہے تو اس کو زیادہ معاف کر بہ نسبت اس شخص کے جو تجھ تک وہ بات پہنچاتا ہے۔

25۔ وہ شخص جس کو کہ کسی بڑی مصیبت کا سامنا ہو اس کی تکلیف اس سے بڑھ کر نہیں جس شخص کے کان بیکار ہوں۔

26۔ وہ شخص جس نے کہ بڑا نقصان اُٹھایا ہو اس سے بڑھ کر وہ زیادہ نقصان میں ہے جس کو آنکھوں کی بینائی میں نقصاں اُٹھانا پڑے۔ ہر وہ غلام جس کو خرید وفروخت کرتے ہیں وہ اس غلام سے زیادہ آزاد ہے جس کو کہ ایک ہی مالک کے تحت باندھ دیا گیا ہو۔

28۔ ہر چند کہ کوئی شخص کتنا بھی علم حاصل کرے اور عالم ہو جائے لیکن اگر اس علم کے ساتھ اس کے پاس عقل نہ ہو تو وہ علم اس پر وبال بن جاتا ہے۔

29۔ ہر وہ شخص جس کو کہ زندگی نے دانائی عطا نہیں کی کسی بھی عقلمند کو چاہیئے کہ ایسے شخص کو سکھانے کی تکلیف نہ اُٹھائے کیونکہ اس کی محنت رائیگاں جائے گی۔

30۔ نادان شخص کے لئے ہر چیز کی نگہداری کرنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنے خود کے معاملات کی نگہداری کر سکے یا اپنا برا بھلا دیکھ سکے۔



## دنیا کا خطرناک ترین راستہ

چین کے پہاڑی سلسلے ہوشان میں ایک راستہ موجود ہے جس سے گزرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔معمولی چوڑائی کا حامل یہ لکڑی کا بنا یہ راستہ ۷۰۰ فٹ کی بلندی سے گزرتا ہے۔جس پر چلنے کے لئے پہاڑ میں کیلوں سے ایک مضبوط رسی لگائی گئی ہے لکڑی کا یہ راستہ تقریباً ۷۰۰ سال قبل تیار کیا گیا تھا۔اور آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ ہر سال ہزاروں سیاح رسی کی مدد سے اس راستے پر چلتے ہیں۔اور دنیا کے خطرناک راستے پر چلنے کا لطف اُٹھاتے ہیں۔

*—*—*

## علمی و سیاسی مضامین

# عوام کے تین گروہ

یہ بات بڑی واضح ہے کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو نظریاتی بنیادوں پر اسلام کو اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے ہے جبکہ دوسرا گروہ اسلام کے اصولوں پر تو عمل پیرا ہے لیکن اس کی اخلاقی تعلیم سے کوسوں دور ہے۔ اسلام ان دونوں گروہوں سے بریت کا اعلان کرتا ہے۔ یہاں ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو اسلام کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اسکی تعلیم پر بھی عامل ہے۔ پھر اس کا ظاہر اس کے باطن کی مانند ہوتا ہے۔ اس راہنمائی کے مطابق جس کی طرف اسلام بلاتا ہے تاکہ شخصیت معتدل ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے سارے پہلوؤں کو اپنے اندر جذب کر سکے اور یہی حقیقی اسلام ہے جسکی رہنمائی میں کتاب وسنت ملتی ہے اسلام عقیدے اور بہتر رویے کا نام ہے چونکہ دین کے مقاصد سے حق کی پہچان ہے جو کہ کتاب وسنت سے ہو سکتی ہے پھر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس حق کے اوپر استقامت اختیار کرے یہ وہ حق ہے جس کے حصول کی دعا ہر مسلمان اپنے رب سے مانگتا ہے۔ اور نماز میں عرض کرتا ہے۔ ''ہمیں صراط مستقیم پر چلا'' پس جب وہ حق کی پہچان اعمال میں راسخ ہو جاتی ہے۔ تو اس کا اثر صاحبِ عمل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ صاحبِ عمل انسان اس سے خیرِ کثیر حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعے جنت کی ابدی نعماء کو حاصل کرتا ہے۔ اصل میں انسانوں میں تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ تو وہ ہے کہ جس کے دل میں عقیدہ گھر میں پڑی کسی بوسیدہ چیز کی طرح ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اسکے جذبات کی تحریک کا باعث نہیں بنتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دل میں کوئی چیز موجود ہی نہ ہو تو دل میں اس نظریے کے احیاء کی از سرِ نو ضرورت ہے۔ اس گروہ کے نزدیک دین بندے اور رب کے درمیان روحانی تعلق کا نام ہے اور یہی اصل مقصد ہے۔ اور اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا دل پاک اور صاف ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد اس پر کچھ فرض نہیں۔ اور نہ ہی اسے لعن طعن کی جا سکتی ہے

۔اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا خیال زعم باطل ہے۔اس طرح انسان اپنے رب کو کس طرح راضی کر سکتا ہے۔کیونکہ بندے اور رب کے درمیان تعلق ایک درخت کی طرح ہے اگر درخت پھل دار ہی نہ ہو تو اس کا کیا فائدہ؟انسان اپنے دل کو پاک صاف رکھتا ہے۔تاکہ یہ پاکیزگی اس کے عمل میں ظاہر ہو۔جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ ایمان دل میں ہوتا ہے۔اور اسکا اثر عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔

جہاں تک دوسرے گروہ کی بات ہے اس کا عقیدہ درخت کی مردہ شاخ کی مانند ہے اس نظریے کے حامل افراد فرائض کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن ان کے معاملات میں حلال وحرام کی کمائی، جھوٹ، بدخوئی، اور چغل خوری شامل ہوتی ہے۔اسی طرح ان کے دل میں حسد، کینہ، نفرت اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کے جذبات ہوتے ہیں۔یہ گروہ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔لوگوں کے سامنے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اللہ کے حقوق کی ذرا بھر پرواہ نہیں کرتا اس طرح اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو وہ توڑ دیتے ہیں۔اور اللہ سے اجرِ عظیم لینے کی بجائے لوگوں سے بہت کم اُجرت پر راضی ہو جاتے ہیں۔مذکورہ بالا دونوں گروہ اپنے نظریے کے سراب میں گم ہیں۔دین کے ایک پہلو پر عمل کرتے ہوئے دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔انہیں چاہیئے کہ حق پر عمل کے لئے اپنے آپ کو از سرِ نو تیار کریں۔ورنہ اسلام ان کے کسی عمل کی تائید نہیں کرے گا۔رہ گئی تیسرے گروہ کی بات تو وہ ایسے لوگ ہیں جنکے دل اللہ کے نور سے منور ہوتے ہیں اور ایمان انکے پورے جسم میں سرایت کر جاتا ہے اور اعمال کا نور ان کے اعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔پھر وہ عقلِ سلیم اور نفس مطمئنہ کی قوت سے غور وفکر کرتے ہیں غرباء اور محتاجوں پر مہربان رہتے ہیں۔انکا عمل اخلاص سے بھر پور ہوتا ہے۔کسی بھی انسان کو کوئی ایذا نہیں دیتے۔ایسے لوگ دوسروں کے لئے زندگی گزارتے ہیں۔یہ گروہ ایک طرف تو اللہ کی رضا تلاش کرتا ہے دوسری طرف لوگوں کی بھلائی سوچتا ہے ایسے ہی گروہ کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا ''مومن محبت کرتا ہے اس سے محبت کی جاتی ہے اور سب سے بہتر وہ انسان ہے جو دوسروں کے لئے نفع آور ہو'' دین کی حقیقی سمجھ کے لئے ضروری ہے کہ ہم حقیقی سمجھ رکھیں۔اور اس

بات پر یقین رکھیں۔عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات انسانی اور اخلاق طیبہ بھی دین کے اندر شامل ہیں۔جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ دین کے ستر شعبے ہیں۔ یہ ایک مسلمان کی زندگی میں توحید کے اقرار سے لیکر اخلاق تک شامل ہیں۔مثلاً راستہ سے پتھر ہٹا دینا بھی ایمان ہے۔پس مسلمان کو اسی انداز میں دوسروں کے لئے نمونہ بننا چاہیئے چونکہ معاملات کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ ہے تو اس میں انتہائی احتیاط کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔حلال وحرام کی تمیز،مشتبہ اشیاء سے دوری، اور اپنے آپ کو حقیقی اسلام کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔اسلام کا حسن اس میں ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہو۔اس کی بات دل کی ترجمان ہو، چونکہ مومن اس بات پہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ کی ذات ہر وقت اسے دیکھ رہی ہے تو وہ اپنے رب سے حیا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسی بات کہے جو اس کے دل میں نہ ہو کیونکہ حیا ہی ایمان ہے۔



# فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کے لئے امریکہ، برطانیہ اور اقوام متحدہ کی سازشوں کا تجزیہ

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ اور عالمی عدالت ک انصاف کے سابق صدر سر چودھری محمد ظفراللہ خاں اپنی خودنوشت سوانح حیات ''تحدیث نعمت'' میں فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کے لئے امریکہ، برطانیہ اور اقوام متحدہ کی ملی بھگت کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قواعد کے مطابق کمیٹی میں ہر تجویز کثرت آراء کے ساتھ منظور ہوجاتی ہے۔ چنانچہ کمیٹی میں تقسیم کا منصوبہ منظور ہوگیا لیکن اسمبلی کے اجلاس میں ہر اہم معاملہ کے متعلق تجویز کی منظوری کے لئے دو تہائی آراء کی تائید لازم ہوتی ہے۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ تقسیم کے حق میں دو تہائی کثرت پوری نہ ہو۔ اسمبلی میں بحث کافی لمبی ہوگئی۔ تقریروں کی افتاد سے ہمیں کچھ امید بندھنے لگی۔ کہ تقسیم کی تجویز منظور نہیں ہوگی۔ اندازہ تھا کہ نومبر کے آخری بدھ کے دن رائے شماری ہوجائے گی۔ بعض مما لک کے متعلق ابھی پختہ علم نہیں تھا، کہ وہ کس طرف رائے دیں گے۔ مثلاً نائیجیریا کی طرف سے ابھی اظہار رائے نہیں ہوا تھا۔

میں ''فلشنگ'' جانے سے قبل ''لائبیرین وفد'' کے سربراہ مسٹر ڈینس کو ملنے کے لئے ''والڈروف اسٹوریا'' ہوٹل گیا۔ وہ اسمبلی جانے کو تیار تھے۔ میں نے اُن کی رائے معلوم کرنی چاہی۔ انہوں نے کہا ''میری ذاتی ہمدردی تو عربوں کے ساتھ ہے، اور ابھی تک میری حکومت کی رائے بھی یہی ہے کہ تقسیم کے خلاف رائے دی جائے۔ لیکن امریکہ کا دباؤ ہم پر بڑھ رہا ہے۔ کوشش کرو کہ آج رائے شماری ہوجائے۔ اس صورت میں ہم رائے شماری کے خلاف رائے دیں گے لیکن اگر آج رائے شماری نہ ہوئی تو پھر معلوم نہیں کیا صورت ہو''۔ میری موجودگی میں انہوں نے اپنے سیکرٹری کو کہا میں اب اسمبلی کے اجلاس کے لئے جارہا ہوں۔ میرے نام کہیں سے بھی کوئی پیغام آئے مجھے مت بھیجنا

جو کچھ بھی ہوگا میں واپس آ کر دیکھ لوں گا۔ مجھے کہا آپ نے دیکھ لیا ہے آج کا انتظام تو میں نے کرلیا ہے۔ میں نے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور میں بھی اسمبلی کے اجلاس کے لئے ''فلشنگ'' چلا گیا۔ صبح کے اجلاس ختم ہونے تک یہ قیاس محکم ہوگیا کہ تقسیم کی سکیم منظور نہیں ہوگی سہ پہر کا اجلاس شروع ہونے سے عین پہلے السید فاضل جمالی وزیر خارجہ عراق بڑی پریشانی کی حالت میں میرے پاس آئے اور فرمایا میں نے سنا ہے کہ آج کا اجلاس بغیر رائے شماری کے ملتوی ہوجائے گا۔ چلو صدر اسمبلی سے چل کر معلوم کریں۔ اسمبلی کے صدر برازیل کے صدر مسٹر رانیا تھے۔ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے فرمایا کل thanks giving day ہے اور سیکرٹری جنرل ٹرگوئے لی کہتے ہیں، کہ اسمبل کا اسٹاف آج دیر تک کام کرنے پر رضامند نہ ہوگا۔ اس لئے آج سہ پہر کے اجلاس کے بعد اجلاس پرسوں تک ملتوی کرنا پڑے گا۔ ہم نے کہا رائے شماری آج کے اجلاس میں ہوجانی چاہیئے۔ صدر نے فرمایا۔ اس کے لئے وقت نہیں ہوگا۔ ابھی پانچ تقریریں باقی ہیں پھر ممکن ہے، کہ بعض مندومین رائے شماری سے پہلے اپنی رائے کی وضاحت کرنا چاہیں۔''

ہم نے کہا پانچ تقریریں کرنے والوں سے دو تو ہم ہیں جو آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ آپ ہمارے نام فہرست سے کاٹ دیں۔ تین رہ جائیں گے اور آراء کی وضاحت کے متعلق آپ کا اختیار ہے کہ آپ اسے رائے شماری ہوجانے کے بعد تک ملتوی کردیں لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ ہم اُن پر کوئی دباؤ نہ ڈال سکتے تھے۔ کیونکہ اگر تقسیم فلسطین کے حامی التواء پر مصر تھے تو صدر اگر التواء پر رضامند نہ بھی ہوئے تو کثرت رائے سے التواء ضرور ہوجاتا۔ عذر لنگ لیکن یہ عذر کہ سٹاف دیر تک کام کرنے پر رضامند نہ ہوگا ایک عذر لنگ تھا۔ اس کے بعد آج تک نہ صرف thanks giving day سے پہلی شام سٹاف نے حسب ضرورت دیر سے کام کرنے پر کوئی عذر نہیں کیا بلکہ thanks giving day پر بھی ہمیشہ اسمبلی کا اجلاس دو بجے تک ہوتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صدر اسمبلی اور سیکرٹری جنرل دونوں امریکی دباؤ کے ماتحت یا ذاتی رجحان سے صیہونیوں کی تائید میں تھے، اور اب تقریروں سے ظاہر ہوگیا کی تقسیم فلسطین کی تجویز کو دو تہائی کی تائید حاصل نہیں تو وہ

دونوں اس منصوبے میں شریک ہو گئے۔ کیا اجلاس جمعہ کی صبح تک ملتوی کیا جائے۔ تا کہ اس وقفہ میں صیہونی صدر ٹرومین کے دباؤ کے ذریعے تین چار ایسے ممالک کی تائید حاصل کر سکیں جواب تک تقسیم کے خلاف تھے۔ سہ پہر کے اجلاس میں، میں نے اپنی تقریر میں مغربی طاقتوں کو پُرزور انتباہ کرتے ہوئے کہا آپ نے عالمی جنگ اول کے دوران میں جو وعدے عربوں سے کئے تھے، ان کی خلاف ورزی نہ کریں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو بدعہدی کے مرتکب ہونگے اور آئندہ عربوں کا اعتماد کلی طور پر آپ سے اُٹھ جائے گا۔ تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا:

I BEG YOU I IMPLORE YOU ENTREAT YOU NOT TO DESTROY YOUR CREDIT IN ARBS COUNTRIES TOMORROW YOU MAY NEED THIER FRIENDSHIP BUT YOU WILL NEVER GET IT.

لیکن طاقت کا گھمنڈ اندھا اور بہرہ کر دیتا ہے۔ ہمارے احتجاج اور ہمارے انتباہ سب صدا بصحرا ثابت ہوئے۔ ٹرومین کا دباؤ۔ مسٹر ٹرومین 1944ء میں نائب صدر ہوئے تھے۔ صدر روزویلٹ چوتھی بار صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی چوتھی میعاد کی ابتداء ہی میں فوت ہوئے اور مسٹر ٹرومین نے ان کی جگہ صدارت سنبھال لی۔ 1948ء کے نومبر میں پھر انتخاب ہونے والا تھا اور اب کی بار مسٹر ٹرومین صدارت کے امیدوار تھے۔ صدارتی انتخاب سے ایک سال قبل ہی سارے امریکہ میں بحران کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اور امیدوار اور ان کے حمایتی اپنی کامیابی کے لئے ہر ہونی انہونی کر گزرتے ہیں۔ مسٹر ٹرومین کو یہ خوف بھی لاحق تھا کہ شاید انہیں اپنی پارٹی کی پُرجوش تائید حاصل نہ ہو اس لئے وہ ابھی سے سر توڑ کوشش میں تھے کہ ان کا پلڑا جس قدر بھاری بنایا جا سکے بنایا جائے۔ اس جدوجہد میں امریکہ کے یہودی عنصر کی تائید کی شدید ضرورت تھی۔

نیویارک میں یہودی عنصر نہایت زبردست ہے۔ اور مسٹر ٹرومین انہیں خوش رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دُھن میں انہوں نے اس واضح حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ روس اور اس کے ہم خیال ممالک بھی تقسیم فلسطین کی تائید میں ہیں اور اس موقف سے ان کی واحد غرض یہ ہے کہ تقسیم منظور ہو جائے تا کہ عرب ریاستوں کے ساتھ امریکہ کے تعلقات اُلجھ جائیں۔ میں وثوق کے ساتھ

کہہ سکتا ہوں کہ امریکی وفد کے مشیران قانونی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تقسیم کی تجویز کرنا اسمبلی کے اختیارات سے باہر ہے۔لیکن مسٹر ٹرومین نے یہ مشورہ بھی رد کر دیا۔اب اس آخری مرحلے پر مسٹر ٹرومین کی سرگرمیوں کا اندازہ واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔لائبیریا کا موقف لائبیرین وفد کے سربراہ مسٹر ڈینس کی زبانی بیان کیا جا چکا ہے۔ہائٹی کے مندوب نے اپنی تقریر میں بڑے جوش سے کہا تقسیم فلسطین کی تجویز نہایت غیر منصفانہ ہے۔ہم ہرگز اس پر رضامند نہیں ہو سکتے۔میری حکومت کی مجھے ہدایت ہے کہ ہم اس کے خلاف رائے دیں۔فلپائینز کی طرف سے جنرل رومیولو جیسے فصیح البیان اور خلیق السان مقرر نے ہر نقطہ نگاہ سے اس تجویز کے پرخچے اُڑائے۔اور پورے وثوق سے اعلان کیا کہ ہم ہرگز اس کی تائید نہیں کر سکتے۔جمعہ کے دن رائے شماری ہوئی اور نام پکار کر رائے لی گئی۔عین اس سے قبل ہائٹی کے مندوب مجھے آکر ملیاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور نہایت اندوہناک لہجے میں کہا ''مسٹر منسٹر پرسوں رات تک تو ہمارا وہی مؤقف تھا جو میں نے اپنی تقریر میں بیان کیا تھا۔اب مجھے یہ ہدایت موصول ہوئی ہے۔کہ تقسیم کے حق میں رائے دو''۔تقسیم کے حق میں رائے شماری میں جب ہائٹی کا نام پکارا گیا تو ایک بے دلی سے کہی گئی۔''ہاں'' سنی گئی۔جنرل رومیولو نیویارک سے واپس روانہ ہو چکے تھے۔

فلپائن کا نام پکارے جانے پر جواب ملا ''ہاں'' اسی طرح لائبیریا کا جواب ہاں میں ملا۔لاطینی امریکی کی ریاستوں میں صرف کیوبا ''نہ'' پر اڑا رہا۔تجویز کے حق میں دو تہائی آراء ہو گئیں۔تجویز منظور ہو گئی۔اقوام متحدہ کی بنیاد انصاف، مساوات اور حق خود اختیاری پر رکھی گئی تھی لیکن فلسطین کے معاملے میں ان تینوں کا خون کیا گیا۔میثاق اقوام متحدہ میں معاملات کی پابندی پر زور دیا گیا ہے لیکن فلسطین کے معاملے میں برطانیہ نے جو معاہدات شاہ حسین کے ساتھ کئے تھے۔ان کی صریح خلاف ورزی کی گئی۔یہ درست ہے کہ تقسیم فلسطین کے متعلق رائے شماری میں برطانیہ غیر جانب دار رہا، لیکن برطانیہ اعلان بالفور کے ذریعے ''اسرائیل'' کی بنیاد رکھ چکا تھا، اور فلسطین کے قضیئے کی ابتدا ''اعلان بالفور'' سے ہوئی۔فلسطین میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے، اور

دنیا کا امن برباد ہوگا اور نوع انسانی کے ایک بڑے طبقے پر جو تباہی اور مصائب وارد ہونگے ان کی تمام تر ذمہ داری برطانیہ اور مسٹر بالفور پر ان کے بعد امریکہ اور صدر ٹرومین پر ہوگی۔ فلسطین پر برطانیہ کی نگرانی ختم ہونے کے دوسرے دن صیہونیوں کی طرف سے اسرائیل کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ یہ اعلان ہوتے ہی صدر ٹرومین کی حکومت نے اسرائیل کو تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جب مجلس امن میں اسرائیل نے اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پیش کی تو اس پر رائے شماری کے وقت برطانیہ غیر جانبدار رہا۔ جب یہ درخواست اسمبلی میں پیش ہوئی تو میثاق اقوام متحدہ کی دفعہ 27 کے فقرہ 3 کی صریح عبارت کے خلاف باوجود ایک مستقل رکن مجلس امن کی تائید حاصل نہ ہونے کے مجلس امن کی سفارش بحق اسرائیل کو جائز قرار دے کر اسمبلی نے اسرائیل کی رکنیت قبول کر لی۔

(تحدیث نعمت صفحہ 622 تا 525)

## آفاتِ سماوی

**آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا::** نمبر ا۔ 1883ء انڈونیشیا کے شہر کارا کاٹبوا Kara Katobal میں آتش فشاں پھٹنے سے ہلاکتوں کی تعداد 36,000 تھی۔ جس کی طاقت 13,000 نیوکلئیر بم کے برابر تھی۔ جس کی آواز 300 میل تک سُنی گئی۔ نمبر ۲۔ 1980ء ماؤنٹ سینٹ ہیلنز امریکہ میں آتش فشاں کا لاوا 15 میل تک پھیل گیا اور پہاڑوں سے پتھروں کی بارش 15 میل تک ہوئی جس سے لوگ تو صرف 57 ہلاک ہوئے مگر اس کا نقصان بہت ہوا۔

**زلزلوں سے تباہی::** نمبر ا۔ 1556ء Shenzi شینزی چین میں زلزلہ آنے سے 8,30,000 افراد ہلاک ہوئے۔ یہ زلزلہ تاریخ کا بدترین زلزلہ کہلاتا ہے۔ جس نے 20 میٹر تک زمین میں سوراخ کر دیئے۔ اور سینکڑوں میل تک کی عمارتیں گر کر تباہ ہوگئیں۔ نمبر ۲۔ 1906ء sanfransisco میں زلزلہ آنے سے 3000 افراد ہلاک ہو گئے۔ جس سے آدھے سے زیادہ شہر تباہ ہو گیا اور عمارتوں میں آگ لگ گئی۔ نمبر ۳۔ 2010ء Port-au-Prince-Haiti میں زلزلہ سے 230,000 افراد ہلاک ہو گئے۔ زلزلہ صرف 30 سیکنڈ کا تھا مگر اس سے سارا شہر تباہی کا شکار ہو گیا۔

# ہمارے حکمران

عام آدمی کی رائے حکمرانوں، سیاستدانوں، سرکاری افسران اسٹیبلشمنٹ بشمول اپوزیشن ممبرانوں کے متعلق اتنی سخت ہے کہ وہ ان کو ناسمجھ، بے وقوف، لالچی، منافق، اور غدار ملک سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں مہنگائی سے لے کر، پٹرول میں منافع خوری تک، پانی بجلی گیس کی لوڈ شیڈنگ، عام آدمی انصاف سے محروم، کراچی میں قتل عام، امریکہ کی غلامی، پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والی کرپشن، جرائم کو پروان چڑھانے کی بھرپور حمایت، اس حوالے سے یہی کہنا کہ یہ سب چور ہیں اور اکٹھے مل کر ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ حکمرانوں اور اپوزیشن میں کوئی فرق نہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے مفادات کے چکر میں ہے۔ یہ زبان خلق ہے جس سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ عوام بھی تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے۔ اور نہ اسے یاد رکھتے ہیں وقتی طور پر غصہ نکالتے ہیں اور اگلے انتخاب میں پھر وہی رسہ گیر، جعلساز، چور اُچکے ان کے لیڈر ہوتے ہیں۔ جن کو وہ اسمبلیوں میں لا بٹھاتے ہیں۔ آج میں تاریخ سے چند حقائق عوام کے سامنے رکھنے جا رہا ہوں تا کہ بعض خصلتیں اور عادتیں ایسی ہوتی ہیں جو بدلتی نہیں۔ میرے سامنے P.H.D کا ایک تھیسس ہے جس کا عنوان ہے۔ Punjab and the War of Independence of 1857. یہ تھیسس ابھی حال ہی میں قائداعظم یونیورسٹی سے پاس ہوا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر تراب الحسن نے یہ تھیسس لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔

یہ تھیسس پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا تھیسس ہے جس میں 1857ء کی جنگ آزادی میں پنجاب کے کردار پر کام کیا گیا ہے۔ اس تھیسس کو Mishigun University USA,Columbia Hadleburg University, کے پروفیسروں نے Evaluate کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر کئے ہوئے کام میں بہتری کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس تھیسس میں بہت سے پہلوؤں کا ذکر نہیں مگر اس تھیسس میں عوام کو بتانا مقصود ہے کہ 1857ء میں انگریزوں نے اس خطے کے عوام پر جو وحشیانہ ظلم اور تشدد کیا اور مجاہدین کو کچلا اس کے پیچھے وہ جاگیر دار تھے جن میں سے آج بھی بہت سے حکمران

ہیں اور حکمرانی کو اپنا وراثتی حق سمجھتے ہیں۔ جو انہوں نے اس خدمت کے عوض انگریزوں سے جائیدادیں لی تھیں۔آج جوان کے پاس جا گیریں اورمراعات ہیں یہ سب ان کے اباءواجداد نے اپنے لوگوں کی مخبری کر کے اوران کے خلاف سازشیں کر کے حاصل کی تھیں۔ان میں مگر مچھ کے آنسو بہانے والے عوام کے محبوب چوہدری نثار علی خان، سابق وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی، حامد ناصر چٹھہ، خورشید قصوری، ملتان کے گیلانی، قریشی، خاکوانی، دولتانہ، شیخ، سروزئی، بدوزئی، ہراج، ڈاہا، سرگانہ، گردیزی، لنگڑیال، چٹھے، بھٹی، تارڑ، راجے، عباسی، سیال ،ٹوانے ،قزلباش ،قاضی، نوابزادے، اعوان، واہ کی حیات فیملی، فتح جنگ کی گھیبہ فیملی، ڈیرہ غازی خان کے مزاری، نواب آف کالاباغ کا خاندان شامل تھا۔

اس تھیسس سے حاصل کردہ ریکارڈ کے مطابق مخدوم سیدنور شاہ گیلانی کو انگریز سرکار نے ان کی خدمات کے عوض 300 روپے خلعت اور سند عطا کی تھی۔

Proceeding of the punjab political deptt no 47 20/6/1858

کے مطابق دربار حضرت بہاءالدین ذکریا کے سجادہ نشین اور تحریک انصاف کے راہنما شاہ محمود قریشی کے اباءاجداد نے مجاہدین آزادی کے خلاف انگریز کا ساتھ دیا انہیں ایک رسالہ کے لئے 20 آدمی اور گھوڑے فراہم کئے۔اس کے علاوہ 25 آدمی لے کر خود جنگ میں شامل ہوئے۔انگریزوں کی حفاظت پر معمور رہے۔ان خدمات کے عوض ان کو تین ہزار روپے کا تحفہ دیا گیا۔دربار کے لئے 1750 روپے کی ایک جا گیر اور ایک باغ دیا گیا۔

جس کی اس وقت سالانہ آمدنی 150 روپے سالانہ تھی۔چوہدری نثار کے جدامجد چوہدری شیر خان کو مخبری پر مجاہدین کو گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔انعام کے طور پر چوہدری شیر خان کو ریونیو کولیکٹر کا عہدہ دیا گیا، جب سب عوام سے اسلحہ واپس لیا گیا تو تو انہیں 15 بندوقیں رکھنے اجازت اور 500 روپے خلعت عطا ہوئی۔گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ گزٹ 36۔1935ء کے مطابق حامد ناصر چٹھہ کے بزرگوں میں سے خدابخش چٹھہ نے جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔وہ خود جنرل نکلسن کی فوج میں تھے۔قصور کے خیرالدین خان جو خورشید قصوری کے خاندان کے بزرگ تھے نے

انگریزوں کے لئے 100 آدمیوں کا دستہ تیار کیا اور خود اپنے بھتیجوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہوئے انگریزوں نے 2500 روپے سالانہ کی جاگیر عطا کی اور 1000 روپے پنشن دی۔ اس تھیسس میں بہت تفصیل ہے جو کہ خوفِ طوالت سے نہیں لکھ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مفادات کا نشہ پورا کرنے کے لئے آج بھی ایک سوچ اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں رکھ کر اپنے سمیت ملکی مفادات کا سودا کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ فرق یہ آ گیا ہے کہ اب یہ سوچ کسی ایک طبقے تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ اس نے مختلف طبقات میں ضم ہو کر ایک نئے طبقے نے جنم لیا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ عوام کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ جو لیڈر، جاگیردار، سیاستدان، وڈیرے، درباری دانشور، جج صاحبان، تاجران، نام نہاد پروفیسران اور نام نہاد صاحب عقل و دانش ایسے ہی طبقے کی پیداوار ہوں۔ جن کے دماغ میں اسلام کی بجائے اسلام آباد، آزادی کے بجائے غلامی، اور زن زر اور زمین پرستی سمائی ہوئی ہو وہ اس ملک کو کیا دے سکتے ہیں، جھوٹ جن کا شیوہ، کردار جن کا منفی ہو، ظاہر و باطن متضاد ہو، حج پر بھی جائیں تو مقصد دولت و زر ہو۔ انتخاب کروائیں تو دیدہ دانستہ دھاندلی پر بھی کسی ایک کا ضمیر ملامت نہ کرے، عوام کے ٹیکس کا بے دریغ ضیا، غریب عوام کو صحت و تعلیم و پانی جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم رکھ کر یزیدی کردار ادا کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ یہ لوگ نہ کسی رہبر کو مانتے ہیں اور کسی مولوی کو۔ نہ خدا خوف رکھتے ہیں نہ رسول کا ساری دنیا میں ہنود و یہود، عیسائی اور دہریہ اقوام بس رہی ہیں ان حکمرانوں سے بہتر سہولتیں اپنے عوام کو مہیا کر رہی ہیں جو ان کے علم میں بھی ہیں جن کو یہ منہ پھاڑ پھاڑ کر کافر کافر کہتے نہیں تھکتے۔ ایٹم بم کو کیا کرنا ہے جب عوام کے پیٹ میں روٹی نہیں پینے کو پانی نہیں، بیمار کو دوا نہیں ملتی، مظلوم کو انصاف نہیں ملتا، روزگار، پٹرول، گیس، پانی، بجلی سب کچھ ختم ہے پاکستان اور اسلام کے نعرے سے نہیں عملی اقدام سے کچھ ہوگا۔ اے خدا یا کوئی مرد مومن پیدا کر۔ جو اس قوم کی اصلاح کرے۔ جب قومیں اس قدر بے حس ہو جائیں تو خدا خود نوٹس لیا کرتا ہے اے خدا ان مکروہ حکمرانوں سے غریب عوام کو نجات دے۔ آمین۔



# آؤ اِنسانستان بنائیں

جب پاکستان بننے لگا تو علماء ہند نے اس کی بہت مخالفت کی، کسی بھی مذہبی جماعت نے مِن حیث الجماعت اس کی حمایت نہیں کی سب نے مہاتما گاندھی اور نہرو کی کانگرس کا ساتھ دیا۔سوائے ایک جماعت کے اس کی حمایت کی تھی۔امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری لیڈر مجلس احرار نے تو اس ملک کے آنے والے مستقبل کی پہلے ہی تفسیر کردی تھی جو کہ بالکل سچی ثابت ہوئی۔وہ اسے پلیدستان کے نام سے اور ناپاکستان کے الفاظ سے پکارا کرتے تھے اور آفرین ہے اس قوم کے جو اس کی تفسیر پر پوری اُتری۔اور مولانا مودودی بانی جماعت اسلامی تو اہل پاکستان کو ایک ہزار میں سے نوصد ننانوے کو کافر گردانتے تھے۔اور اس قوم کو ایک جانوروں کا بے ہنگم ہجوم کہتے تھے۔ان کی بات کی بھی اس قوم نے خوب لاج رکھی۔وہی بنے جو وہ کہتے تھے۔بڑے بڑے جغادریوں، دیوبندیوں، بریلویوں، مودودیوں، نے اس ملک کی بھرپور مخالفت کی۔مگر پھر بھی اس خاتم النبینؐ کے صدقے یہ معرض وجود میں آیا۔

اس کے علاوہ بہت سے بزرگان دین کے طنزیہ اقوال اس قوم کے متعلق تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں۔یہ صرف پاستان ہی رہ گیا۔یعنی کہ ماضی کا قصہ۔پنجابی میں بھائی کو پا اور ستان جگہ کو یا ستانے کو یا تنگ کرنے کو کہتے ہیں۔کچھ عرصے کے بعد پاستان کا ایک بھائی بھی اسے ستاتے ہوئے اس سے علیحدہ ہوگیا۔اور باقی جو بھائی تھے وہ اسے ستانے پر تل گئے جو کہ ابھی تک ستا رہے ہیں۔پھر جو لوگ اس کے وجود کے ہی منکر تھے۔مثلاً سرحدی گاندی باچا خان وغیرہ۔مجھے یاد ہے جب 1971ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد دوقومی نظریہ کی نفی کرتے ہوئے ایک سیاستدان نے بیان دیا تھا تو مولانا مفتی محمود نے بیان داغا تھا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ ہم اس گناہ (پاکستان بنانے کے گناہ) میں شریک نہ تھے''۔یہ تو ہمارے علماءسو کی حب الوطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس ملک کو اللہ نے بنایا ہے اور اسی نے اسے سلامت رکھنا ہے۔مگر نہ یہ پاک لوگوں کی جگہ ہے اور نہ یہ مسلمانستان ہے۔اس میں ہر قسم کے لوگ مقیم ہیں جو کہ انسانیت سے بھی دور کا تعلق نہیں رکھتے۔کوئی

ایسی برائی نہیں جو ان میں نہ پائی جاتی ہو۔سب انبیاء کے منکرین قوموں کی برائیاں ماشاءاللہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔قوم لوط،قوم ثمود،قوم شعیب،قوم یہود،قوم یوسف و یہود،اگر کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ طالبان نے اپنے پرُتشدد اسلام سے پوری کردی۔

اگر آپ کو کسی قسم کا بھی کسی جُرم کا گنہگار درکار ہو تو وہ بھی اسی ملک سے ملے گا۔ بے شک اس نے داڑھی بھی رکھی ہو،حج بھی کیا ہو،نمازی بھی ہو مگر وہ کسی نہ کسی گناہ کا چیمپئین ہوگا۔اگر اعلیٰ قسم کا شرابی،جوئے باز،زانی،ڈاکو،اغوا کنندہ،دولت اکٹھی کرنے والا،ٹیکس چور،جعلی ڈگری گرندہ،قبضہ گروپ،سیکس کے اڈے چلانے والا،ایٹمی راز ساری دنیا سے چوری کرنے والا،اپنی جیلیں رکھنے والا،ہیروئن اور چرس بیچنے والا،بجلی چور،جنگل چور،انسانی سمگلر،ساری دنیا میں جعلی شادیاں کرنے والا،مدرسوں میں معصوم طلباء کو دہشت گرد بنانے والا،اور سب کو کافر کہنے والا،مردوں کی ہڈیاں فروخت کرنے والا،مردہ جانور کا گوشت فروخت کرنے والا آپ کو اسی ملک پاکستان میں آسانی سے مل جائے گا۔

اب مجھے خیال آیا ہے کہ یہ قوم اگر کچھ بھی نہیں بن سکتی تو کم از کم انسان تو بن سکتی ہے۔لہٰذا ہمیں ایک انسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔براہِ مہربانی میرا ساتھ دیجیئے۔میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ خواب دیکھوں نہ تو یہ خواب خرگوش ہے اور نہ ہی خواب ہو جانے والا خیال۔بس ایک انسانستان بنانے کا خواب ہے۔افغان،افغانستان میں،ایک ہجوم پاکستان میں رہتا ہے تو انگریز انگلستان میں لیکن انسانوں کے لئے کوئی ستان نہیں،اس لئے آج تک کوئی جگہ انسانستان کہلانے کے لائق نہیں ہوئی۔علم منطق میں انسان وہ ہے جو جانور نہیں ہے اور جو جانور ہے وہ انسان نہیں،لیکن جو جانور نہیں ہے ضروری نہیں کہ وہ انسان ہو۔اس لئے ہر حقیقت سچ نہیں ہوتی اس لئے سچ کو ماننا ضروری نہیں کیونکہ وہ حقیقت نہیں ہے۔حقیقت کو سچ مانا جا سکتا ہے مگر حقیقت کو مان لینے سے وہ سچ نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ عجیب سی تکرار ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں برا ہوں لیکن اگر میں برا نہیں ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اچھا بھی ہوں اس اگر مگر میں بندہ الجھ جائے تو کچھ دیر میں ہی اپنے بال نوچتا نظر آئے گا،لیکن

کسی نقطے تک نہ پہنچ پائے گا ،لوگ کہیں گے کہ فلاسفر ہو گیا۔انسانستان بنانے کا جنون بھی کچھ فلاسفروں جیسا ہی ہے۔لیکن انسان کی کوئی تعریف کرنے سے پہلے کیسے پتہ چلے کہ وہ انسان ہے کھانا کھاتے دیکھوتو سارے ہی جاندار دکھائی دیتے ہیں،سونا دیکھوتو سارے ہی جاندار سوتے ہیں۔حواس خمسہ کے سارے ہی کام سارے ہی جاندار کرتے ہیں۔اپنے اپنے خواص کے مطابق۔پھر کونسی ایسی چیز ہے کہ ظاہر کرے کہ یہ انسان ہے محض جاندار نہیں ایسا انسان کہاں سے ڈھونڈا جائے جس کے لئے اس کا ''ستان'' بنایا جائے۔اس فلسفیانہ آئیڈل ازم سے نکل کر دیکھتے ہیں کہ ہم جس زمین میں اپنی جڑیں گاڑے بیٹھے ہیں کیا وہ انسانوں کی زمین ہے کہ ''ستان'' انسانوں کا ستان ہے تو ایسا خاص نظر نہیں آ رہا ہر جبلت میں حیوانیت نظر آ رہی ہے۔فطری طور پر چھینا جھپٹی کا دور دورہ ہے عادات واطوار میں جنگل کا رہن سہن ہے زہریلے اور خونخوار جانوروں میں بھی کئی قسم کے ڈسپلن موجود ہوتے ہیں۔

وہ اپنے ہم جنس کا خیال رکھتے ہیں۔اسے دشمن اور خطرے سے آگاہ کرتے ہیں ہم جنس باہم پرواز۔کبوتر با کبوتر باز بہ باز۔لیکن یہ کہاوت اس زمین پر بسنے والے یا خاص طور پر پاکستان میں بسنے والے نام نہاد اشرف المخلوقات پر پوری نہیں اترتی کیونکہ وہاں نہ تو کوئی باہم پرواز ہے نہ ہی ہم جنس خیال باہم چھینا جھپٹی ضرور ہے۔بات ہو رہی تھی انسان کی تعریف کی۔یہ ایک مشکل سا سوال ہے۔کیونکہ ہم مسلمان کی تعریف کر سکتے ہیں مگر ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں۔جمہوریت کی تعریف کر سکتے ہیں مگر اس پر عمل ضروری نہیں۔سوشلزم کا ذکر کر سکتے ہیں مگر اس پر سوچنا ضروری نہیں عدل کا علم اٹھا سکتے ہیں لیکن عدل کرنا ضروری نہیں تہذیب کا ذکر کر سکتے ہیں لیکن مہذب ہونا قطعاً ضروری نہیں تو پھر ہم انسان کی کیا تعریف کریں گے اس لئے ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اس کے برعکس ہوتا ہے جو ہم کہتے ،کرتے یا سنتے ہیں۔ہم دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو اس بات کا احساس مٹا دیتے ہیں کہ کتنے اوروں نے بھی اس دسترخوان سے کھانا ہے۔عالیشان گھر بنانے لگتے ہیں تو یہ محسوس نہیں کرتے کہ میرے جیسے کتنوں کا جو آسمان تلے پڑے ہیں کیا حال ہو گا بیماری سے سسکتے بغیر دوا کے پڑے کتنے لاکھوں جنگلوں میں پڑے زخمی جانوروں کی طرح آہستہ آہستہ موت کے

جال میں پھنستے جارہے ہیں کتنے دوسروں کی محبت سے محروم گھائل دل کے ساتھ محض سانس کی ڈوری سے کھنچتے جارہے ہیں۔ یہ دوسروں کا درد ہی تو ہے جو اس مٹی کے پتلے کو انسان کہتا ہے ورنہ رینگنے والی مخلوق یا چوپائے اور ہمارے جیسے جانوروں میں کیا فرق ہے ہم نے اس فرق کو مٹا کر جو اپنے مقام کا تعین کیا ہے اس کے مطابق ہم نے اپنے لئے ''ستان'' بنالئے ہیں جی چاہتا ہے کہ اس کرہ ارض پر انسانوں کا بھی کوئی ''ستان'' ہو۔ ستان تو بن ہی جاتا ہے اس کے لئے انسان ڈھونڈنے پڑیں گے کہاں ملیں گے البتہ بنانے پڑیں گے انسان بنانے کے لئے شاید کوئی ٹیکنالوجی دریافت کرنی پڑے گی۔ فی الحال اس کا کوئی سافٹ ویئر نہیں یہ انسان بنانے کا کام ہے جو بندے نے خود ہی کرنا ہے۔ جو نہ تو کسی بٹن دبانے سے ہوگا نہ ہی اس کے لئے کوئی منتر پڑھنے کی ضرورت ہے۔

کسی دَم درود سے بھی کام نہیں چلے گا کسی پوپ کی دعا چاہیئے نہ کسی گُرو کی پرارتھنا یہ اصل کرنے کا کام ہے یہ عمل ہے اور سوچ کی تبدیلی کا ریاض۔ وہ سب کچھ جو بندے نے اپنے اندر بیدار نہیں کیا اسے جھنجھوڑنے کا نام ہے یہ کام کون کرے گا اس کے لئے کسی زرداری یا کیمرون کی ضرورت نہیں ان میں کوئی بھی انسانوں کا ستان بنانا نہیں جانتا۔ یہ سب کوئی اپنا اپنا سلسلہ چلا رہے ہیں۔ یہ کسی دوسرے کا کام نہیں یہ کام ہمارے اپنے کرنے کا ہے۔ انسان کاملؐ کی پیروی کرتے ہوئے یعنی میں نے اپنے آپ کو انسان بنانا ہے وہ وصف انسانی جو حُسن رکھے ہیں انہیں اپنانا ہے میرے اندر جو انسان چھپا بیٹھا ہے اس کا فیصلہ مجھے آپ ہی کرنا ہے لیکن پھر انسان کا منظر اور ماحول کیا ہوگا۔ انسانستان میں صرف انسان ہونگے وہاں کوئی مولوی نہیں ہوگا، عورتیں اور مرد بھی ہونگے جو آزاد بھی ہونگے کسی محرومی کا شکار بھی نہیں ہونگے نہ انہیں محبت اور پیار کے بغیر کچھ آتا ہوگا، رنگ، نسل، مذہب، فرقہ، علاقہ، زبان، صوبہ، ذات، قبیلہ غرض یہ کہ سب تعصّبات سے مبرا۔ نہ ہی کوئی امیر نہ غریب ہوگا۔ سب کی ضرورت پوری ہورہی ہوگی سب ایک دوسرے کے لئے مرمٹنے کا درد رکھتے ہوں گے۔ پیدا ہونے والے کو خوش آمدید کہیں اور مرنے والے کو الوداع۔ یہی انسانستان کی انسانیت ہو۔



# اس دور کا مسلمان

خاکسار سیدھا سادہ مسلمان ہے کسی فرقہ کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ کسی کے خلاف بغض وعناد رکھتا ہوں جو شخص بھی اس مضمون کو پڑھے صرف جائزہ لے، کہ سچائی کیا ہے اور ہم کس حد تک حب الوطن ہیں۔عرصہ بارہ سال سے ہمارے لوگ غیر ملکی ایجنڈے پر عامل ہیں۔ نامعلوم قوتوں سے روپیہ لے کر اپنے ملک میں دہشت گردی میں مبتلا ہیں۔اب تو پاکستانی طالبان کا نام بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔

اس ملک کی تربیت کرنے والی جماعتوں نے آخر اپنا رنگ ساری قوم کو چڑھا ہی دیا۔عرصہ 65 سال میں آخر ہر ایک مومن کے خون میں اپنی نیتوں کے مطابق اپنا اور اسلام آباد کا تشخص خوب کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ مادر پدر آزاد اور بے لگام معاشرے کی بنیاد ان فرقہ پرست مذہبی اجارہ داروں نے روز اوّل سے پاکستان میں رکھ دی تھی۔ ہر ایک فرقہ نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر اپنی شکم پُری کے کارخانے بنائے۔اور اس دوزخ کو بھرنے کے لئے اقتداری محلوں سے نام نہاد محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ضیاء الحق کے دور میں تو ہیروئن اور کلاشنکوف نے ان کے سٹیٹس تبدیل کر دیئے۔جب انکل سام اور سعودی آقا کے فتویٰ کی آڑ میں جہادِ افغانستان کا ڈھونگ رچایا گیا تو مُلاں کا سٹیٹس ہی تبدیل ہو گیا۔

فرقہ پرستی کو خوب ہوا ملی۔روپے کے زور پر وہابی ازم کی پرورش کما حقہ ہوئی،شیعہ افراد کو مساجد اور مدرسوں میں قتل کیا گیا احمدی افراد کو غیر مسلم قرار دے کر ان پر اسلام کے نام لینے پر پابندی لگائی گئی سارے شکلِ موموناں کی آڑ میں کرتوتِ کافراں کا سماں باندھنے لگے۔سیاسی اداکاروں نے ہر قسم کی بد کرداری کو فروغ دینے میں اپنا بھیانک کردار ادا کیا انصاف کا گلا گھونٹا گیا اور اس طرح ہر قسم کے بدقماش سرکردہ افراد نے اس معاشرے کی تربیت اس رنگ میں کی کہ آج آپ کو پاکستانی معاشرے میں کوئی دیانتدار نہیں ملتا۔علماء تو اپنی غربت اور بد کرداری کے پیش نظر گاؤں کے نمبردار کو(جھوٹا اور ظالم ہونے کے باوجود) جھوٹا یا ظالم نہیں کہہ سکتے۔صرف یہ بتا کر اپنی

روزی پوری کرتے رہے کہ حضورﷺ نے یہ فرمایا ہے۔لیڈر حضرات نے اپنی سیاسی دکان چمکانے کی خاطر،سستی شہرت پانے کی خاطر،عوام کواسلامی راستہ دکھایا ہی نہیں۔نیک اور متقی لوگوں کی کمی بھی ہے اور نیک لوگوں کی توان کی اولادنہیں سنتی۔ایک طرف سیرۃ النبیﷺ کا جلسہ ہو اور دوسری طرف کوئی سٹیج ڈرامہ گاؤں یا شہر میں آجائے تو آپ اس کی حاضری سے اس قوم کے نیک ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔اب 65 سالوں کی منفی کوششوں سے یہ کینسر قوم کے سارے جسم میں سرایت کر چکا ہے۔اب اس کا کوئی علاج نہیں چہ جائیکہ کوئی نئی قوم کو جنم دیا جائے یا کوئی قوم امپورٹ کی جائے۔یا نصف صدی انتظار کیا جائے اگر کوئی فرقہ میری اس بات سے اتفاق نہیں کرتا تو وہ اپنی 65 سالہ کارکردگی دکھائے کہ وہ دیانتدار لوگ یا مومن لوگ کتنے فیصد پیدا کرسکی۔کیا ان کے تربیت یافتہ لوگ معاشرے میں نمایاں ہیں سچے اور دیانتدار ہیں حقوق العباد کا ان کو کوئی پتہ ہے۔مگر جب ہم سارے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو دو چار فیصد سے زیادہ لوگ معیاری نہیں ملتے۔مگر ان سب کو کسی ایک جماعت یا فرقے سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔مگر ان لوگوں کو جب کوئی بڑی ذمہ داری دی جاتی ہے تو یہ لوگ بڑے اور بُرے لوگوں کے خودساختہ معیار اپنا کر اپنے کردار کی نفی بھی کر دیتے ہیں۔

آج کا مسلمان تعلیم انگلینڈ میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ملازمت امریکہ میں،رہائش کنیڈا میں چاہتا ہے بات انگریزی میں کرنا،کھانا چائینیز رائس،پیزا اٹالین،رشین سلاد،مصنوعات جاپانی استعمال کرنا چاہتا ہے۔چھٹیاں یورپ میں گزارنا چاہتا ہے فلمیں ہالی وُڈ کی دیکھنا چاہتا ہے۔گانے بالی وُڈ کے سننا چاہتا ہے لیکن زندگی کے اختتام پر مکہ میں مرنا اور دفن ہونا مدینہ میں پسند کرتا ہے اور موت کے بعد جنت میں جانا پسند کرتا ہے۔جہاد کا متمنی ہے مگر نماز سے گریزاں ہے مذہبی لیڈروں سے محبت کرتا ہے مگر ووٹ لبرل لیڈر کو دیتا ہے۔شراب کو سوسائٹی کا فیشن سمجھتا ہے۔گرل فرینڈ بھی اس کی کمزوری ہے۔سود لیتا ہے اور سور کھاتا ہے۔اور زکوٰۃ بھی شیر مادر کی طرح ہڑپ کر جاتا ہے۔متعہ کے بہانے کئی بیویاں کرتا ہے۔حج اور عمرہ دکھاوے کے لئے کرتا ہے اور حج سکینڈل میں

داڑھی رکھ کرخوب روپے بناتا ہے۔ برطانیہ میں gay merriage کا قانون پاس ہوتو برطانوی ممبر پارلیمنٹ ہوتے ہوئے اس کی حمایت کرتا ہے۔امریکہ اس کا باپ ہے برطانیہ اس کی ماں۔دنیا میں سب سے بڑا عیاش اور جواباز سعودی عرب کا مسلمان ہے۔قذافی کی طرح کئی ٹن کے زیورات کا مالک ہے۔ یاسر عرفات کی طرح کئی خفیہ ایجنسیوں کا ایجنٹ ہے۔ زرداری کی طرح زمین، زن اورزر پرست ہے۔مسٹرڈیزل کی طرح ہرحکومت کا دوست ہے۔ ہرمولوی کی طرح صرف خود کو مسلمان سمجھتا ہے اور باقی سب کو کافر۔انگریز کو پکا کافر خیال کرتا ہے مگر بےعمل خود اس سے بھی بڑھ کر ہے۔رزق حرام اس کی خوراک ہے۔ناجائز طریقے سے کمائی اس کا شعار ہے۔غرض یہ کہ شیطان کا سارا محکمانہ کام اس نے سنبھال رکھا ہے۔

آج کا مسلمان بہت سیدھا سادہ ہے سب کچھ دیکھتا، سنتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے مگر کچھ کرنے کی حیثیت میں نہیں رہا۔ذہنی اور جسمانی طور پر معذور ہو چکا ہے۔حتیٰ کہ اپنے بنیادی حقوق کے لئے لڑنے سے بھی محروم ہو چکا ہے۔امریکن جاسوس ریمنڈ ڈیوس کی خبر پڑھ کر پرانے زخم ہرے ہو گئے۔یتیم ریاست کی بےبسی پر رحم آتا ہے۔جس شخص کو اپنے ملک میں دو ٹکے کی عزت نہیں اس نے بھی پاکستان کو آگے لگا رکھا تھا۔یتیم ریاست کی آبرو کو پیروں تلے روندتا ہوا پاک فوج اور حکومت کے کندھوں پر سوار تھا۔ پاکستان میں دو افراد کا مبینہ قاتل امریکن جاسوس ریمنڈ ڈیوس کو اس کو اپنے ملک کی عدالت نے ایک امریکی پر تشدد کے الزام میں دو سال کی قید سنادی ہے۔امریکن جاسوس ریمنڈ ڈیوس نے پاکستان سے واپسی پر 2011ء میں امریکہ کے ایک شاپنگ مال میں ایک امریکی کو معمولی تنازعہ کی بنا پر تشدد کا نشانہ بنایا جس پر اسے گرفتا کرلیا گیا تھا عدالت نے امریکن جاسوس ریمنڈ ڈیوس دو سال کی سزا اور غصہ پر قابو پانے کی خصوصی کلاسز کا حکم سنایا ہے۔امریکن جاسوس ریمنڈ ڈیوس کو امریکہ میں کوئی نہیں جانتا مگر اس جاسوس کو پورا پاکستان جانتا ہے پاکستان میں تعینات اس جاسوس نے لاہور کی ایک معروف شاہراہ پر دو موٹر سواروں کو فائرنگ کر کے بے دردی سے قتل کر دیا اور تیسرے نوجوان کو اپنے گاڑی تلے روند ڈالا۔مبینہ قتل کے بعد بڑی ڈھٹائی سے فرار

ہوا میڈیا نے معاملہ اٹھایا تو اسے گرفتار کرنا پڑا اور پھر جو ہوا وہ پاکستان کی تاریخ کا شرمناک باب بن گیا۔ امریکہ کے ایک معمولی اہلکار ریمنڈ ڈیوس کی امریکہ میں گرفتاری اور سزا کی خبر پاکستانی اخبارات سے ملی جبکہ امریکہ میں اس شخص کی حیثیت ایک عام شہری سے زیادہ نہیں جب یہ شخص پاکستان میں تھا تو اس شخص کی رہائی کے لئے امریکہ کے صدر نے استثنیٰ کا حکم صادر فرمایا تھا۔ ریمنڈ ڈیوس پاکستان میں ''امریکی چودھراہٹ'' کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ کا ایک کمی بھی پاکستان میں چودھری ہوتا ہے اور پاکستان کے سچی مچی کے چودھری امریکہ میں کمی کمین ہوتے ہیں۔ امریکن جاسوس ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے لئے نام نہاد اسلامی شق کا سہارا لیا گیا۔ اسلام میں دی گئی خون بہا کی شرعی سہولت کو تسلیم کر کے امریکہ کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا کاغذی ثبوت دیا۔ پاکستان کے حکمرانوں کا اسلام بھی مفاد پرستی تک محدود ہے۔ ایک امریکی نے کہا تھا کہ پاکستانی ڈالروں کی خاطر اپنی ماں کا سودا بھی کر سکتے ہیں پاکستان میں اب وہ کچھ ہوتا ہے جسے قیامت کی علامات کہا جاتا تھا اس ظالم دور میں والدین پیسوں کی خاطر اپنے بچوں کو بیچ سکتے ہیں۔ تو بچوں کا خون بہا کیوں نہیں لے سکتے۔؟ امریکہ کا پاک فوج پر دباؤ تھا حکومت پاکستان کے تعاون سے ریمنڈ ڈیوس کو رہا کرا لیا گیا۔

اس کے عوض پاکستان کو خون بہا بھی ادا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے عوض مزید خون کی ندیاں بہا دی گئیں۔ ریمنڈ ڈیوس کا طیارہ فضا میں پرواز کرتے ہی امریکہ نے شمالی وزیرستان پر حملہ کر دیا۔ ریمنڈ ڈیوس جیسا کمی کمین بھی پاکستان میں چودھری ہوتا ہے۔ جبکہ پاکستان حکومت اپنے لوگوں سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتی ہے۔ جاپان میں دو امریکی فوجیوں کو ایک جاپانی عورت کے ساتھ زیادتی کے جرم میں دس سال کی سزا سنا دی گئی پاکستان میں ایک امریکی اہلکار بے گناہوں کو مبینہ قتل بھی کر دے تو اسے پروٹوکول کے ساتھ رہا کر دیا جاتا ہے پاکستان کے ایک نجی چینل کے ایک اینکر صاحب فرما رہے تھے کہ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کس بنیاد پر کہا جاتا ہے جبکہ نہ وہ اسلام رہا اور نہ پہلے جیسے مسلمان رہے غلاموں کو خریدنے اور آزاد کرنے کا اسلام اب نہیں رہا وغیرہ۔ انہیں کوئی بتائے کہ جو خود غلام ہو وہ غلام خود کیونکر خرید سکتا ہے؟ جو مسلمان غلام خریدا کرتے تھے وہ آزاد

مسلمان تھے دورِ حاضر کا مسلمان خواہ وہ بادشاہ بن جائے نفسیاتی غلام ہے یتیم ریاست پاکستان میں ہر دوسرا شخص کسی نہ کسی صورت میں غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ پاکستان آج جس شرمناک اور المناک صورت حال سے دوچار ہے اس کی وجہ ہماری غلامانہ ذہنیت ہے پاکستان کا مسلمان سب کچھ سن، سمجھ، اور دیکھ رہا ہے۔ پاکستان کا مسلمان بہت سادہ اور معصوم ہے۔

قوم کے سامنے ایک دیانتدارانہ نظام رکھا جائے اچھائی اور برائی پر قوانین اور سزائیں مقرر کی جائیں۔ اور ہر آدمی عمل اپنے آپ خود سے عمل شروع ہو۔ قوانین اسلام پر نہ بنیں کیونکہ کون سے اسلام پر قوانین بنیں گے یہ فیصلہ ہی نہیں ہو سکے گا کہ کونسے اسلام کے قوانین پر عمل کیا جائے کیونکہ ہمارے ملک میں اسلام کا تشخص ہر بیس میل کے فاصلے پر مختلف ہو جاتا ہے اور ہر فرقے کا اسلام مختلف ہے۔ صرف جنرل قوانین بنائے جائیں۔



## بیوی یا آمریت

شوہر: کیا آج تم میرے ساتھ واک پر چلو گی؟

بیوی: تم کہنا کیا چاہتے ہو کہ میں موٹی ہو گئی ہوں؟۔

شوہر: ٹھیک ہے۔ نہیں تو مت چلو۔

بیوی: تم کہنا کیا چاہتے ہو کہ میں لیزی ہوں۔

شوہر: اُف غصہ کیوں کرتی ہو۔

شوہر: میں نے ایسا تو نہیں کہا۔

بیوی: اچھا تو میں جھوٹی ہوں؟

شوہر: اوکے بابا میں اکیلے ہی چلا جاتا ہوں۔

بیوی۔ تم اکیلے کیوں جانا چاہتے ہو؟

# ہائے ہماری نئی نسل وقوم

ہمارا اپنا تعلیمی نصاب غیر اسلامی اور غیر محب وطن طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ہم سب وطن کی محبت کے داعی ہیں اور حُب رسولؐ کے بھی ۔مگر عمل ہمارا بالکل متضاد ہے ۔ہمارا کوئی لیڈر مثالی لیڈر نہیں ،قائداعظم کے بعد ہم کوئی حقیقی لیڈر پیدا نہ کر سکے۔ بلکہ علماء سو نے اپنا کردار قوم کی منفی تربیت میں صرف کیا۔ضیاء الحق (نام نہاد امیر المومنین ) نے سعودی اور امریکی امداد کے توسط سے نام نہاد مجاہدین پیدا کیئے اور ہزاروں مدرسوں کو کھول کر وہابی ازم کو بڑھایا۔اور سنی وشیعہ ازم کو دبانے کی کوشش کی۔ ہماری زیادہ تر نوجوان نسل کے ذہن پر فلمی میڈیا نے قبضہ کرلیا ہے۔مغربی کلچر ہماری آئندہ جوان ہونے والی نسل کو اپنے نرغے میں لے رہا ہے۔ ہمارے قول وفعل میں اس قدر تضاد ہے کہ الامان والحفیظ۔ ہماری زیادہ تر نوجوان نسل کو اتنا قائداعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں علم نہیں جتنا وہ گاندی اور نہرو کو جانتے ہیں۔

مگر اسلام کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں جانتے۔انہیں دوسرا کلمہ نہیں آتا یہ اسلامی طریقہ سے نماز نہیں پڑھتے ،جنازوں میں شریک نہیں ہوتے ، وضو اور طہارت کے اصولوں سے نابلد ہیں۔کھڑے ہوکر پیشاب کرتے ہیں۔گھوم پھر کر کھاتے ہیں اور اخلاقی پابندیوں کو ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ کتنے افسوس اور دُکھ کی بات ہے کہ آج ہم اپنی نئی نسل کو کس طرف لے جارہے ہیں اس نسل کو ہم نے کس دلدل میں دھکیل دیا ہے جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ یہ سب کیسے ہوا ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں۔ ہاں ہم سب۔ جب ہم نے اپنے بچوں سے سپارے اور قائدے چھین کر انہیں آزاد انسان بنانے کی خاطر انکے ہاتھوں میں آکسفورڈ اور پینگوئن کی کتب پکڑا دیں،انہیں ڈی وی ڈی،سی ڈی پلیئر اور وی سی آر اور کمپیوٹر کے سامنے بٹھا دیا یہ جانتے ہوئے کہ جس کلچر میں زیادہ شہوت ،لذت اور زیادہ تھرل ہوتا ہے۔ وہ بوسیدہ، کمزور پینڈو ثقافت کو نگل جاتا ہے۔آج ہم وہ نسل پیدا کر چکے ہیں جو جارج فلپ اور الزبتھ کی نسل ہے۔ ہم نے اپنے کردار کو اپنے بزرگوں کی طرح نہیں استوار کیا،مغربی سوسائٹی کی تقلید میں ہم قرآن اور اسلام کو

بھول گئے۔ بچوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اب بچے جب ہاتھ سے نکل رہے ہیں تو ہم اس کا رونا روتے ہیں۔ ہماری ساری پاکستانی قوم نے اسلام کو نہیں اپنایا بلکہ اسلام آباد کو اپنایا ہے یعنی کہ مادیت پرستی کو۔ عمل سے ہم نے اسلام کو بچوں کے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ انگریزی زبان کو اپنایا اور اسی زبان میں اس کے ہیروز اور تاریخ کو پڑھا۔ اور پھر بچوں نے اسی تاریخ کے ہیروز سے متاثر ہو کر وہی کردار اختیار کرنے کے چکر میں ہیں۔ علماء سو کے پاس جب طالب علم جاتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ میرا مولوی سوائے اپنے اور کسی فرقہ کو مسلمان ہی نہیں مانتا۔ 73 قسم کے اسلام دیکھ کر وہ مذہب سے ہی بددل ہو جاتا ہے۔ جب وہ مولوی کا علم و عمل دیکھتا ہے تو اسے اسلام جیسے پیارے مذہب سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ جب وہ سیاست دان کو دیکھتا ہے تو پریشان ہوتا ہے۔ جب کسی بھی طبقے کے انسان کو دوہرے کردار میں دیکھتا ہے تو وہی بچہ کنفیوز ہو جاتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں ہر برائی نے گھر کر لیا ہے۔ جھوٹ ہماری خوراک، منافقت ہمارا اوڑھنا بچھونا، رشوت حلال، زنا و شراب کی انتہا، بلکہ زنا بالجبر کی انتہاء۔ جو انتہائی جھوٹا مکار اور بدکردار ہو وہ ہمارا لیڈر ہوتا ہے۔ جو قوم کی دولت لوٹے وہ ہمارا لیڈر ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہم اپنے محلے کے شریف آدمی یا مولوی یا عالم سے نہیں ڈرتے جتنے ہم کلاشنکوف بردار بدمعاش کی عزت کرتے ہیں۔ سچی گواہی دینے کی عادت نہیں۔ جھوٹا قرآن اُٹھا کر گواہی دینا ہمارا وطیرہ بن گیا ہے۔ ہمارے وکلاء دو فی صد کے علاوہ سب جھوٹ کی ترغیب دیتے ہیں اور عدلیہ کو راشی بنانے میں مڈل مین کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس بار ہمارے اساتذہ کرام نے دھاندلی میں بہت ہی برا کردار ادا کیا ہے۔ عدالتوں میں ایسے جھوٹے اور پیشہ ور گواہ مل جاتے ہیں ہماری قوم میں سچ بولنے کی جرأت رندانہ نہیں کیونکہ سچ کے بعد سولی چڑھنا پڑتا ہے مگر آج کے دور میں منصور کون بنے۔ قانون کی حکمرانی نہیں۔ ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ ہر چیز کا منہ مانگے ریٹ لیا جاتا ہے۔ ہر چیز کا جب تاجر چاہے بلیک کر کے اس کا ریٹ بڑھا دیتا ہے۔ نوجوانوں نے بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنے آپ کو طالبان کے ہاتھوں روپوں کی خاطر کھلونا بنا لیا ہے۔ ہر جوان لازمی طور پر انجانے میں Misuse ہوتا ہے۔ کوئی اپنوں کے ہاتھوں کوئی غیروں کے ہاتھوں، بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ ہمسایہ

ہمسایوں کا مخبراور دشمن ہے۔ ہر کوئی اپنے پیٹ کے بھرنے کی فکر میں ہے۔ قیامت کا نظارہ ہے۔ کسی کی بہن محفوظ نہیں کسی کی بیٹی محفوظ نہیں ۔ ہر کوئی عدم تحفظ کا شکار ہے۔ بد کرداری نے ہمارے سب معاشرے کو سانپ کی طرح نگل لیا ہے۔ نشہ اور ہیروئین نے جوان نسل کو ہڑپ کر لیا ہے۔ یہ سب نااُمیدیاں ایک عذاب کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ سیاست دان اپنے اپنے مفادات کے پیش نظر ضمیر فروشی سے پارٹیاں بدل رہے ہیں۔ علماء کرام رشوت لے لے کر ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ فروشی کا دھندہ کر رہے ہیں ۔ تاجر اپنے منافع کی خاطر اشیاء کو مہنگی اور بلیک فروخت کر رہے ہیں۔ بیوروکریٹس اپنے اپنے کمیشن کی خاطر بڑے بڑے آرڈر دے کر ملک کی نام نہاد تعمیر جدید میں دن رات مصروف عمل ہیں۔ طلباء سرِ عام نقل مار رہے ہیں۔ لیڈر جعلی ڈگری کو عزت دینے کے چکر میں ہے۔ علماء سو نے اپنی فتویٰ بازی کی دکانیں چمکا رکھی ہیں، میڈیا جس کو چاہتا ہے رشوت لے کر ننگا کر دیتا ہے۔ ہم PIA کو نگل گئے ہیں، سٹیل ملز کو ہڑپ کر گئے۔ ریلوے کو برباد کر دیا، جنگلات کو اس کے گارڈ زکھا گئے۔ پٹواری بادشاہ ہے جو ہر زمیندار کو کھا رہا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سب ڈی سی او تک کرپٹ نظام چل رہا ہے۔ جب تک کسی بھی محکمے کا افسر بددیانت نہ ہو اس کا عملہ بھی بددیانت نہیں رہ سکتا۔ ہم میں اسلامی قوانین اور روایات کا فقدان ہے۔ نئی روایات نے جنم لے لیا ہے۔ جو اخلاقی طور پر مردہ ہیں۔ وحشیوں کی طرح نظام ہو گیا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ سرِ عام اغوا ہو رہے ہیں اور رقوم کا مطالبہ پورا کر کے مغوی واپس لئے جا رہے ہیں ۔ کوئی قانون کی حکمرانی نہیں۔ ساری قوم ایک ریوڑ کی مانند ہے کوئی اس کا راعی نہیں۔ ہمارے لیڈرز حضرات بدنامِ زمانہ ہیں اور اپنی اپنی قیمت وصول کر کے غیر ملکی طاقتوں کے مقاصد پورے کر رہے ہیں۔ عدلیہ اگر آزاد ہوتی تو الیکشن منصفانہ ہوتے مگر وہ بھی آزاد نہیں۔ جب عدل نہیں ہوگا تو کسی بھی سلطنت کا وجود کبھی بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اے خدا تو اس قوم پر رحم کر۔

ناراض ہے خدا یا کسی کی بددعا
خلقِ خدا کو خدا یاد ہی نہیں رہا



# آدھا تیتر آدھا بٹیر

بارہ سو سال سے اسلام ہندوستان میں داخل ہوا۔ اس نے خوب عروج حاصل کیا۔ اولیاء کرام نے بہت درس دیئے۔ اکثریت کو سبق واحدانیت سے آشنا کیا۔ بہت سے متقی رہبر و راہنما بھی پیدا ہوئے۔ جن لوگوں نے اسلام کو مقدم کیا۔ آج بھی ہم الگ خطہ ارض پاکستان لے کر بھی نہ مسلمان بن پائے۔ ہم عورت کو پاؤں کی جوتی خیال کرتے ہیں جبکہ اسلام اسے اس کے حقوق دیتا ہے۔ ہم رزق کو ہر چیز پر ترجیح دینے لگ گئے ہیں جبکہ اسلام واللہ الرازقین کا درس دیتا ہے۔ دوسری قوموں کی طرح ہم بھی درجہ بندی میں بٹ گئے ہیں جبکہ اسلام سب کو مساوی قرار دیتا ہے۔ بت پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی، شاہ پرستی، خوشامد، منافقت، بزدلی ہے جبکہ اسلام خدائے واحد کا سبق دیتا ہے۔ ہم خالد بن ولید، طارق بن زیاد، کی بجائے یزید و شمر کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہم غیر اللہ کے آگے جھک کر خدائے واحد پر یقین سے غافل ہو چکے ہیں۔

ہم سچ بولنے سے عاری ہو چکے ہیں۔ ہماری اولادیں غیر اسلامی ڈگر پر رواں دواں ہیں۔ مولوی ہمارا اپنے کردار سے ہمارے مذہب کی نفی کر رہا ہے اس لئے اسے کبھی بھی زیادہ ووٹ نہیں پڑا۔ ہمارے لیڈر اپنا امیج کھو بیٹھے ہیں ہیں۔ ہم باہمی اعتماد کھو چکے ہیں۔ ہم اپنی حلال آمدنی کے علاوہ اُوپر کی آمدنی سے گھر چلاتے ہیں۔ ہم ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، رشوت ستانی، دھوکہ دہی، اقرباء پروری، دہشت گردی، لوٹ مار، فرقہ پرستی، میں ساری دنیا میں بدترین مثال بن چکے ہیں۔ ہم نعرہ تو اسلام کا مارتے ہیں مگر مدّنظر اسلام آباد رہتا ہے۔ نہ ہم سے کوئی ہمسایہ محفوظ ہے اور نہ کوئی عزیز و اقارب۔ اور نہ جانور نہ انسان۔ کتوں کی طرح ہر ہڈی پر دست و گریباں ہیں۔ اپنے نفس کے دائرے سے نکل کر باہر جھانکتے تک نہیں۔ ہمارا ہر محکمہ ایمان و دیانت سے خالی اور مردِ بیمار کا منظر پیش کر رہا ہے۔ حُب الوطنی ہمارے ضمیر کو بھاتی نہیں، قومی ترقی ہمارا نصب العین نہیں۔ اخوت کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ہم عرصہ دراز سے غلام ہیں ہمارے اَباء و اَجداد بھی غلام تھے اور ہم بھی۔ امریکہ یا یورپ سے کوئی حکم آئے تو ہماری ٹانگیں کانپنے لگ جاتی ہیں، خدا کے خوف سے نہیں

کعبہ تو ہمیں عزیز ہے مگر عجیب بات ہے کہ والیٔ کعبہ بھی اس سے بڑھ کر عزیز ہے۔

بے شک وہ ہماری قومی پالیسیوں کو تباہ کرتا رہے۔ مگر وہ کڑوی گولیاں امدادی ریال کی شیرینی میں لپیٹ کر دیتا ہے۔ اور ہم رہے لالچی جانور۔ دوسرا مذہب ہماری کمزوری ہے۔ جس طرح مذہب نے ترکی کو مردِ بیمار بنا دیا تھا۔ یہی ہماری حالت ہو چکی ہے۔ امریکہ اور یورپ کہہ رہے ہیں کہ 2015ء میں پاکستان کو فیل سٹیٹ قرار دے کر اس کے ایٹمی اثاثوں پر کنٹرول کر لیا جائے گا۔ اسرائیل اور پڑوسی ملک اس منصوبہ بندی میں برابر کے شریک ہیں جنھوں نے ابھی تک پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ پہلے بنگلہ دیش بنایا اب بلوچستان توڑنے کے چکر میں ہیں۔ بلوچستان کی معدنیات پہلے شاہِ ایران کو ٹھکتی تھیں اب یورپ و امریکہ کو۔ ہمارے حکمران اب وہی کچھ کر رہے ہیں کہ جو کچھ اہلِ بغداد کر رہے تھے۔ جب چنگیز خان و ہلاکو نے حملے کئے تھے اور اس پر قبضہ کیا تھا۔ ایک لیڈر بلاول ہاؤس میں اور دوسرا رائے ونڈ میں اور باقی اپنے اپنے محلوں میں ٹن سو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کی ذات کو کچھ ہو تو پھر ان کو احساس ہو۔ ملک کا کیا حال ہے۔ کوئی مردِ مومن نہیں، کوئی مردِ مجاہد نہیں، کوئی محمد بن قاسم نہیں، کوئی غیور نہیں جو اس ملک کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لے۔ ویسے تو بڑے بڑے جبہ پوش، کج کلاہ، فتوہ فروش اپنی اپنی گدیوں پر براجمان ہیں۔

تائیدی بیان اور اپنے اپنے سیاستدانوں کی ڈوبتی ساکھ کو سہارا دینے کے لئے الیکشن میں نظر آئے تھے مگر اب ملک کی کشتی جب ڈوبنے کو ہے آل پارٹی کانفرنس کرنی چاہیئے، ڈرونز حملوں کا مخالف ہیرو عمران خاں یا کوئی اور خان کچھ تو کرے۔ ہر محکمہ زبوں حالی کا شکار ہے۔ لُوٹ مچی ہوئی ہے۔ جنگلات کو اس کے کارکن کھائے جا رہے ہیں۔ پٹواری زمین اور زمیندار کو کھائے جا رہا ہے۔ عدلیہ اور انتظامیہ کو اس کے ریڈرز اور اردلی اور مڈل مین کھائے جا رہے ہیں۔ عشر زکوٰۃ نام نہاد مقامی نمبردار چیئرمین ہڑپ کر رہے ہیں۔ سقہ شاہی کا زمانہ ہے۔ ملک کے لئے longterm بجلی کے منصوبے عرصہ دراز سے بند ہیں۔

ہماری معیشت پر IMF کا راج ہے۔ ہسپتال ویران پڑے ہیں۔ صحت عامہ اور امور عامہ کی

کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔معاشرہ شتر بے مہار کی طرح رواں دواں ہے جس کی نہ کوئی منزل ہے اور نہ کوئی مقصد۔ ہر کوئی اپنے فرقہ سے تعلق رکھتا ہے مگر خدا سے کوئی تعلق نہیں۔مسلمان یوں تو آپس میں بھائی بھائی ہیں مگر عملاً ایک دوسرے کی جان و مال کے دشمن۔ایک دوسرے سے نہ کسی کی عزت محفوظ، نہ مال، نہ جان۔ پولیس کا محکمہ تو عبرت کا نشان بن چکا ہے۔بڑی بڑی توندوں والے ان کے بھرنے کے چکر میں نہ غرباء، بیوہ، بیٹی کو دیکھتے ہیں بس اپنے باس کے حکم کو بجالانے میں مصروف عمل ہیں۔جھوٹی گواہی کا دور دورہ ہے۔جھوٹے قرآن اُٹھانے والوں کی چاندی ہے۔ زرعی ٹیکس برائے نام ہے۔جبکہ آباد زرعی زمینوں کا ٹھیکہ مختلف علاقوں میں پانچ ہزار سے چالیس ہزار فی ایکڑ زمیندار لے رہا ہے۔کاش پانچ صد روپے فی ایکڑ ٹیکس لگا کر بڑے زمینداروں سے ٹیکس وصول کیا جائے۔مگر یہ کام کرے گا کون۔زمیندار جو مال مویشی سالانہ پالتا ہے اس پر بھی کوئی ٹیکس نہیں۔آبیانے کا ریٹ بھی بہت کم ہے۔اسے بھی بڑھایا جائے۔مال مستقل اور لوکل ریٹ کا ریٹ بھی بہت کم ہے۔اس مہنگائی کے زمانے میں یہ سب ریٹ بڑھانے چاہیئے۔ہم سب کو اس گلشن کو سنوارنے کے لئے اسے خون سے سینچنے کی ضرورت ہے۔ ❁❁❁

## زمین کے پھسلنے (Landslides) سے تباہی

زمین، پہاڑوں یا کیچڑ کے یک دم پھسلنے اور زمین کے یکدم ٹوٹنے سے جو تباہی آتی ہے وہ لینڈ سلائڈ کہلاتی ہے۔جس سے بڑی تباہی آجاتی ہے۔دراصل لینڈ سلائڈ آتش فشاں کے پھٹنے یا زمین پر یا زمین کے اندر زلزلہ آنے سے سبب بن سکتی ہے۔دوسری بڑی وجہ سیلاب یا طوفان آنے سے لینڈ سلائڈ آسکتی ہے۔ایک اور بڑی وجہ لوگوں کا بے وجہ درختوں کے کاٹنے سے بھی لینڈ سلائڈ آسکتی ہے۔نمبر ا۔1920ء Kansaou چین میں لینڈ سلائڈ سے 180000 افراد ہلاک ہوئے۔جس سے سینکڑوں گاؤں ملیا میٹ ہو گئے۔نمبر ۲۔1963ء Vagont اٹلی میں لینڈ سلائڈ سے 2000,افراد ہلاک ہو گئے۔نمبر ۳۔1970ء Yungay Peru میں لینڈ سلائڈ سے 20000 افراد ہلاک ہو گئے۔(National Disasters By Mr.Tim Collins)

# ہائے میرے پیارے وطن کا بےلگام معاشرہ

آج کل میرے پیارے وطن میں دل دہلا دینے والے واقعات ہر روز کا معمول بن چکے ہیں۔روزانہ ٹی وی پر بم بلاسٹ، بڑے پیمانے پر گولہ و بارود کا استعمال ،آگ اور خون کا کھیل جاری ہے۔کس کے خلاف؟ اپنی دھرتی ماں کے خلاف۔جس نے ہمیں پناہ دی ہے اور اپنی آغوش میں لیا ہوا ہے۔ہم اس ملک میں رہتے ہیں لیکن ہمارا ملک اس کی بربادی کے لئے ہے۔ایک جانور کو پالا جاتا ہے۔ یا ویسے ہی اس کو کھانے کے لئے دے دیا جاتا ہے تو وہ اسی دَر کا ہو جاتا ہے۔ہم تو انسان ہیں اور اشرف المخلوقات ہیں۔ یہاں زیادہ آباد مسلم ہیں جو مسلم تو ہیں مگر ان کا عمل ان کے اپنے دین کے برعکس ہے۔

مرنے مارنے پر ہر دم تیار لیکن اُسوہ رسول ﷺ پر کوئی عمل نہیں۔دینی تعلیم پسِ پشت ڈالی ہوئی ہے لیکن افسوس ہے کہ وطن سے کسی کو کوئی پیار نہیں۔کراچی میں عباس ٹاؤن، بلدیہ ٹاؤن، پشاور صوبہ سرحد، بلوچستان اور اب پنجاب بھی زیرِ عتاب آ گیا ہے۔ٹی وی پروگرام دیکھیں تو ایسے لگتا ہے کہ کوئی وطن کے لئے نہیں سوچتا۔دعویدار تو سبھی ہیں لیکن عمل سے پیدل ہیں ان کا کام ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرنا ہے۔اس کا مستقل حل ڈھونڈنا نہیں۔الزامات کی بھرمار ہے ایسے لگتا ہے کہ فیکٹریاں کھلی ہیں الزامات اور کفر کے فتوے لگانے کی۔ایک دوسرے سے بڑھ کر محب وطن کے دعوے لیکن سمجھ نہیں آتی کہ سکیورٹی کے ادارے کیا کر رہے ہیں؟ مظاہرین کے آگے بے بس ہیں اور مظاہرین با اختیار۔ایک تو پہلے ہی جانی و مالی نقصان ہو چکا ہوتا ہے اس کے بدلے میں قومی املاک کی تباہی شروع ہوتی ہے۔یہ سوچیں کہ نقصان کس کا ہو رہا ہے؟ زیادتی کرنے والوں کو بے لگام کیوں چھوڑا ہوا ہے۔جب بھی آتے ہیں نقصان پہنچا کر بھاگ جاتے ہیں۔میری سیاست دانوں سے گزارش ہے کہ مصلحت اندیشی کی سیاست کو چھوڑیں۔برائی کو ختم کریں۔یہ نہ سوچیں کہ ملزمان کو سزا دینے سے ہمارا ووٹ بنک متاثر ہوتا ہے یہ سوچیں کہ ملک رہے گا تو سیاست وحکومت

ہوگی۔اگر ملک کوتباہ کیا جائے گا تو کیا بچے گا۔ان ظالموں کو کھلا چھوڑیں گے تو کل حکمرانوں کے گھر بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔پڑھا لکھا طبقہ ملک کو چھوڑ کر باہر کا رُخ کر رہا ہے۔کیا پاکستان کو جاہلوں کی سرزمین بنانا ہے۔نہ ڈاکٹر محفوظ نہ استاد۔نہ سیکیورٹی اداروں کے ملازمین نہ دوکانوں میں بیٹھے تاجر، نہ راستہ چلتے راہی محفوظ، نہ کوئی بچہ نہ کوئی عورت، کہیں پر قتل و غارت گری کہیں اغوا۔کہیں نام نہاد مُلاں اسلام کا تشخص بگاڑنے پر تُلے ہوئے ہیں۔کہیں انتظامی افسر بن کر ملک کو لوٹنے والے،کہیں جعلی ڈاکٹر،کہیں جعلی ادویات،جعلی کھانے پینے کی اشیاء،کہیں مردہ جانوروں کا گوشت بِک رہا ہے۔کہیں کھلے عام شراب خانے اور جوا خانے اور کہیں برائی کے اڈے،مساج سنٹر اور کلینک کی شکل میں غلط کارلوگ،جنہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔اب نانگا پربت پر سیاحوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔یہ کیا ہورہا ہے۔کیا ہم منافق ہو چکے ہیں اپنے ہی ملک کے خلاف ہم کسی غیر ملکی ایجنڈے پر کام کررہے ہیں۔اقبالؒ

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یہ اگر علاقائی اور محلہ لیول پر کمیٹیاں ہوں وہ نظر میں اپنے علاقے کو رکھیں کہیں بھی غلط کام نہ ہو چھوٹے بڑے امیر وغریب کی تفریق کے بغیر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر کام ہو تو چھوٹے چھوٹے یونٹوں سے بڑے یونٹ تک کوئی غلط کام نہیں ہوسکتا۔جب معاشرے میں انصاف ختم ہوجاتا ہے، اپنوں کی پردہ پوشی اور غیروں پر عتاب ہو تو اس طرح معاشرے میں امن قائم نہیں رہ سکتا،میرا ان سب سے یہ سوال ہے کہ آپ وہ فصل بو رہے ہیں۔جو آپ کی نسلوں کو تباہ کردے گی۔جہالت کا ہی دور واپس آئے گا جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کا تھا۔جب نہ کوئی عورت، ماں، نہ بہن نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا محفوظ تھا۔ہمارے پاک نبی ﷺ کی تعلیم کے مطابق تو آبادیوں، جانوروں، باغوں، پبلک پراپرٹی کا جنگ کے دنوں میں بھی نقصان نہیں ہونا چاہیئے۔یہاں تو جنگ کیا عام امن کے دنوں میں بھی کوئی محفوظ نہیں۔اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔عوام اپنے اپنے ہی لوگوں

کے ہاتھوں سے گھائل ہیں۔کوئی آنسو پونچھنے والانہیں۔کوئی مرہم رکھنے والانہیں۔اور یہی کہہ دیا جاتا ہے نامعلوم افراد نے کام کیا اوران کے خلاف ایف آئی آر درج کر لی گئی ہے۔پولیس جانتی ہے مگر بے بس ہے۔اپنی روزی کے لئے خاموش ہے۔اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔اور بااثر لوگوں کے سامنے بے بس ہے۔میں آپ سب سے التجا کرتا ہوں کہ ملک کا سوچیں مظلوم کی دادرسی کریں دہشت گردی سمیت سب برائیوں کا قلع قمع کریں۔قوانین بنائیں ان پرعمل درآمد کروائیں ساری قوم کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دیں ہرانسان اور ہرشعبے کا آدمی اس میں اپنا حصہ ڈالے خدا کے حضور جُھک کر اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔اس ملک کو بچائیں جس کے دُشمن زیادہ ہیں اور دوست کم۔ساری دنیا کی نظریں آپ کے ایٹمی اثاثوں پرلگی ہوئی ہیں اورآپ کے ملک کوفیل سٹیٹ قرار دینے کے درپے ہیں اورآپ ہیں اپنی انانیت کے چکر میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔اے اللہ اس قوم پراپنا فضل کر۔آمین۔



## کافی پینا جگر کی بیماریوں کے خاتمے کا ایک موثر طریقہ ہے

ایک نئی تحقیق کے مطابق عام روٹین میں کافی پینے سے جگر کی بیماریوں کو روکنا ممکن ہے۔ امریکہ کے میوکلینک میں کی جانے والی نئی تحقیق کے نتائج کے مطابق کافی پینے سے جگر کی بیماری سے بچاؤ ممکن ہے۔اس بیماری کی وجہ سے جگر نا کارہ ہوسکتا ہے۔اوراس بیماری سے انسان جگر کے کینسر میں بھی مبتلا ہوسکتا ہے۔ڈاکٹر کریگ لیمر گیسٹر واینٹرولوجی معدہ اور چھوٹی آنت کی بیماریوں کے ماہر ہیں جنہوں نے اس ریعرچ پر کام کیا۔

(روزنامہ جنگ ۲۴ مئی ۲۰۱۳)

*-*-*

# چودھویں صدی کے مُلاؤں کی اَقسام

حضرت رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے۔لوگوں پر ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ جب اسلام کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن محض رسم بن جائے گا اُن لوگوں کی مساجد بظاہر آباد مگر ہدایت سے خالی ہوں گی۔اُن کے علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہونگے۔اُنہی میں سے فتنے اُٹھیں گے اور واپس اُنہی میں لوٹ جائیں گے۔آج رنگارنگ کے مُلاّؤں کو دیکھ کر جو اسلام کے نام پر قسما قسم کے تماشے کر رہے ہیں دل گواہی دیتا ہے کہ اے پیارے حضور ﷺ آپ نے جو نقشہ کھینچا تھا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ واقعی یہ علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہیں۔(درج ذیل تحریر میں حقیقی اسلام کی تعلیم دینے والے علماء مراد نہیں) حضرات! دنیا بھر میں مختلف انواع واقسام کے مولوی پائے جاتے ہیں آج ہم پاک سرزمین شاد باد میں آباد لوگوں کی گردنوں پر سوار مولویوں کی چند اقسام سے آپ کو روشناس کروائیں گے۔مُلاّں رنگ باز۔میڈیا کی گھر گھر رسائی کے سبب اس قسم نے بڑی شہرت پائی ہے اس کا دوسرا نام ڈرامے باز اور تیسرا شعبدہ باز مولوی ہے۔یوٹیوب اور دوسرے سوشل میڈیا میں ان کی لغویات، واہیات حرکات وسکنات و پُھرتیات اور ڈرامے دیکھ کر لاکھوں افراد محظوظ ہوتے ہیں۔ان میں مولوی ٹوکا، مولوی کرنٹ اور مولوی بھنگڑا قابل ذکر ہیں۔چونکہ یہ اقسام عوام میں خاصی شہرت پارہی ہیں۔اس لئے ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ اس قسم کی اقسام بھی مارکیٹ میں دستیاب ہوں۔مثلاً مولوی بندوق، مولوی گنڈاسہ، مولوی ایٹم بم، مولوی چُھرا، مولوی راکٹ وغیرہ وغیرہ۔ان کی سب سے گھٹیا قسم وہ ہے جو اپنے مریدوں سے خود کو سجدے کرواتی ہے۔مُلاّں فساد فی سبیل اللہ۔یہ قسم آج کل بڑی ''اِن'' ہے۔چند روپوں کی خاطر یہ فتویٰ دینے والی بلائیں توہینِ رسالت اور توہینِ قرآن کے متعلق فتوے جاری کرتی ہیں۔اور بے گناہوں کو زندہ جلوا کر یا کبھی پتھر مار مار کر سفا کی کا مظاہرہ کرواتی ہیں۔جائیدادوں اور املاک پر قبضہ، حسد، ذاتی رنجشیں، جھگڑے اور دیگر مسائل سے نپٹنے کے لئے بہت سے لوگ ان سے فائدہ اُٹھا چکے ہیں۔دیگی مولوی۔یہ فسادی مولوی کی ہی ایک قسم ہے۔لوگوں کو مار دھاڑ پر اُکسانے والی یہ مخلوق وقت پڑنے پر داڑھیاں منڈوا کر دیگوں میں گُھس کر جان بچاتی ہے۔جنرل

اعظم خاں نے 1953ء میں لاہور میں ہونے والے فسادات کے دوران بڑی تعداد میں ان کو دیگوں سے برآمد کیا تھا۔ یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی پلاننگ بھی بدل رہی ہے۔ لال مسجد میں جہاد کی تعلیم دینے والے مولوی صاحب نے دیگ میں چُھپنے کی بجائے برقعہ پہن کر فرار ہونے کی کوشش کی ان صاحب نے متعدد بار گورنمنٹ کو خودکُش حملوں کی دھمکیاں دیں اور کہا کہ شہادت اُن کی آخری خواہش ہے مگر جب وقت آیا تو میدانِ جنگ میں بچوں اور فقط ایک سو بچوں کو چھوڑ کر خواتین کے ساتھ برقعہ پہن کر فرار ہوتے ہوئے دبوچ لئے گئے۔ حلوہ مولوی۔ یہ میٹھی قسم کے مولوی ہیں انہیں حلوہ کھلا کر جنت تک کا پروانا لیا جا سکتا ہے افسوس کہ یہ بے ضرر قسم کے مولوی مفقود ہوتے جا رہے ہیں زمانے کی ضروریات کے مدنظر ان کی جگہ نئ ٹائپ کے مولوی اُبھر کے آئے ہیں۔ جیسے مولانا ڈیزل، مولانا حج کرپشن وغیرہ۔ ان مولویوں کی پہچان ان کی موٹی گردن اور پھیلی ہوئی توند ہے۔ مولوی پینترا۔ یہ مولوی بھیس، بیان، چہرے، وفاداریاں اور پینترے بدلنے میں لاثانی ہیں۔ ان کے بانی پاکستان بننے کے سخت مخالف تھے۔ قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کی حکومت کو کافرانہ حکومت کہتے تھے۔ اور اعلان یہ کرتے کہ پاکستان تو دور کی بات ہے اس کی ہم پ بھی نہیں بننے دیں گے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد 180 ڈگری کا یو ٹرن لے کر پاکستان کے سب سے زیادہ ہمدرد بن کر اُبھرے ان میں سے ایک کا بیان بہت مقبول ہوا کہ ''ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہ تھے''۔ یہ عظیم مفتی 1974ء کی اسمبلی کے روحِ رواں تھے۔

چنانچہ انہوں نے مولانا ڈیزل، جو اپنے والد محترم کا نام آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی اکثریت امریکہ کے خلاف رہی مگر تعجب ہے کہ اس گناہ میں شریک ہمارے آباہ واجداد سے انتقام اس رنگ میں لیا کہ کہ آج بھی ہماری گردن پر سوار ہیں۔ ان کی اولاد میں سے ایک مولانا کی اولاد امریکہ میں ہی تعلیم حاصل کرتی ہے اور وہیں پر مستقل رہائش رکھتی ہے۔ ان کو علاج کے لئے بھی امریکہ ہی کے ہسپتالوں میں جانا پڑتا ہے اور افسوس کہ ان کی موت بھی امریکہ میں ہی ہوتی ہے۔ مولوی قصاب۔ یہ کسی تعارف کے محتاج نہیں گردنیں کاٹنا اُن کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ بچوں کو جنت کے جھانسے دے کر اُنہیں خودکُش جیکٹس پہناتے ہیں مولویوں میں سب سے خطرناک اور درندہ صفت ہیں۔ ان کو طالبان کے نام سے جانا جاتا ہے، ان کا نِک نیم مولوی بمبار بھی ہے ہزاروں بے گناہ بچوں کو، مردوں کو، عورتوں اور

بوڑھوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکے ہیں۔ان پر زیادہ لکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔مولوی چونکہ چنانچہ لیکن یہ مولوی میڈیا پر آ کر طالبان کی مذمت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ''چونکہ، چنانچہ، لیکن، پس، لہٰذا ثابت ہوا جو کروا رہا ہے امریکہ کروا رہا ہے'' کے بھاشن سناتے ہیں۔

قصاب مولویوں کی کامیابی انہی کی مرہون منت ہے۔انہوں نے عوام کو ایسا اُلجھا رکھا ہے کہ آج تک اُنہیں سمجھ نہیں آئی کہ ان کا اصل دُشمن کون ہے۔معاشرے کی اصلاح کے نام پر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والے یہ خدائی فوجدار اپنی ہر ناکامی پر، برائی یا گناہ کا سہرہ یہودیوں، امریکنوں، ہندوؤں اور دوسرے اہل مغرب کے سر باندھتے ہیں۔انہی اقسام میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بچوں کے ساتھ بدفعلی کر کے ان کا گلا گھونٹ کر قتل کرتے ہیں پھر اُن کا جنازہ بھی خود پڑھاتے ہیں۔اور جب پولیس پکڑ لے تو شرمندہ ہو کر کہتے ہیں کہ مجھ سے ایسا شیطان نے کروایا۔مولوی وارنٹ۔ایسے مولوی کو اگر کسی سوال کا جواب نہ آئے تو سوال پوچھنے والوں کے لئے کفر کا وارنٹ جاری کرتے ہیں۔نہایت ڈھٹائی سے معصوموں کے لئے جہنم اور موت کے وارنٹ جاری کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔مُلاں آن لائن۔ان کی شکلیں دیکھ کر قے آتی ہے۔

ٹی وی پر آ کر ایسی جاہلانہ حرکات کرتے ہیں کہ الامان الحفیظ۔یہ ٹی وی پر آ کر کبھی وظیفے بتاتے ہیں۔تو کبھی استخارہ کرتے ہیں۔کبھی مخالف مسلک رکھنے والوں کے قتل عام کرنے کا فتویٰ جاری کرتے ہیں مساجد اور خدا کے نام پر لوگوں سے پیسے بٹورتے ہیں۔پہلے یہ اپنے مدرسوں کے بچوں سے بسوں میں بھیک منگواتے تھے۔یا پھر مساجد کے لاؤڈ سپیکرز کے ذریعے چندہ مانگا کرتے تھے اب ٹی وی پر بنفسِ نفیس، کئی کئی مرلوں کے تھوبڑے لے کر پچاس پچاس پونڈز مانگتے نظر آتے ہیں۔جنوں والا مولوی۔یہ جن نکالنے اور جان نکالنے کے ماہر ہوتے ہیں۔کئی عشروں سے لوگوں کو بیوقوف بنایا ہوا ہے۔سینکڑوں کی تعداد میں رنگے ہاتھوں پکڑے بھی جاتے ہیں۔مگر جاہل عوام انہیں جعلی پیر کہہ دیتی ہے۔مُلّاں کلین شیو۔یہ جدید قسم ہے چہرے پر داڑھی اور بعض دفعہ مونچھ بھی نہیں ہوتی۔سنا ہے کہ اُن کے پیٹ میں داڑھی ہوتی ہے۔ضیاء الحق کو اس نسل کا بانی مانا جاتا ہے۔جن کی باقیات میں سے کلاشنکوف و ہیروئن کلچر، منافقت، شدت پسندی، کٹھ ملائیت اور نواز شریف یادگار رہیں۔(ماخوذ)



# جرمن میں احمدی اسٹیٹس

یہ خبر قارئین کے علم میں آچکی ہوگی کہ عالمی ختم نبوت نے اس بات کو بُرا منایا ہے کہ جرمنی کی حکومت نے احمدیوں کو بطور مسلم اُمت تسلیم کر کے سرکاری طور پر سٹیٹس دے دیا ہے۔علماء کرام کو ہر اس بات سے چڑ ہوتی ہے جو کہ مثبت ہو۔اور دوسرے ممالک کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔بھلا ہم ٹھہرے غلام۔خدا کے نہیں عیسائی اور یہودیوں کے۔ہم کھاتے بھی اُنہی کا ہیں اور بُرا بھلا بھی اُنہی کو کہتے ہیں۔ہم نے مُلاں کے توسط سے بھٹو اور ضیاالحق کی مدد سے احمدیوں کے سارے حقوق چھیننے کی بھرپور کوشش کی۔اُن کو کلیدی آسامیوں سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی، ہر محکمہ سے ان کو نکالنے میں کامیاب رہے۔اُن کے کارناموں کو ہم نے بُرے کاموں میں تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش کی،اُن پر روزی کے دروازے، ملازمتوں کے دروازے، عبادت کے دروازے بند کرنے کی شرعی خدمت انجام دینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔اُن کی خوردنی پراڈکٹس پر بے شمار فتاویٰ دے کر ان کو معاشی طور پر فیل کرنے کی کوشش کی مگر خود یہود و ہنود کی سب پراڈکٹس کو بلا جھجک استعمال کیا۔اور سب علماء کرام اپنی اولادوں کو غیر مسلم ممالک میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔اور وہاں سب کچھ حلال و حرام کھاتے ہیں۔

مئی 2010ء کو جب لاہور میں احمدیوں کی مساجد میں خون کی ہولی کھیلی گئی اور ان کے ایک صد کے قریب نہتے لوگ مارے گئے تو ہم نے افسوس تک کرنے کی جرأت نہیں کی۔اور کوئی ان کو امداد بھی دی، کیا وہ اس ملک کے شہری نہیں۔کیا سر ظفر اللہ خان کی، ڈاکٹر عبدالسلام کی، جنرل اختر ملک، ایم ایم احمد، جنرل افتخار جنجوعہ، جنرل عبدالعلی ملک، ایئر مارشل ظفر چوہدری اور بیسیوں احمدی خدامِ پاکستان کی خدمات یکسر اس قوم نے نہیں بھلا دیں۔ہم نے اُن کو غیر مسلم بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر خود مسلمان بننے کی کوئی کوشش نہ کی۔احمدی ہمارے دستور کے مطابق مسلمان نہیں دوسری غیر مسلم دنیا اُن کو کیوں مسلم کا سٹیٹس دے۔یہ سُن کر تکلیف تو ہوئی مگر کیا کر سکتے ہیں۔

ہمارے ملک کے سب حکمران تو پہلے ہی انگریز کے غلام ہیں ۔احمدی جو کچھ بھی ہیں مگر اپنی تنظیمی ،یکجہتی ،اتفاق واتحاد میں اپنی مثال آپ ہیں ۔دوصد سے زیادہ مما لک میں وہ اپنا نیٹ ورک پھیلا چکے ہیں جبکہ دوصد مما لک میں ہمارے ملک کے سفارت خانے بھی نہیں ہیں ۔برّاعظم افریقہ کے باون مما لک میں تعلیم وصحت پر اُن کا قبضہ ہے ۔فلاحی کاموں میں وہ سب سے آگے ہیں ۔کئی مما لک کی پارلیمنٹس میں وہ ممبرز اور وزراء ہیں ۔اُن کے اعداد وشمار کے مطابق وہ ستر 70 دنیا کی بولی جانے والی بڑی زبانوں میں قرآن کے تراجم کر چکے ہیں عنقریب 100 زبانوں میں قرآن کا ترجمہ مکمل کرنے والے ہیں ۔بجلی اور پانی مہیا کرنے میں اور سولرز انرجی بہم پہنچانے میں افریقہ کے مما لک میں وہ عوام الناس کی ہمدردیاں حاصل کر چکے ہیں ۔یورپ میں بھی وہ اسی نہج پر مسلسل دن رات کام کررہے ہیں ۔اُن کا واحد انٹرنیشنل ٹی وی M.T.A جو کہ کئی چینل پر مشتمل ہے ۔عالم اسلام میں اپنے مذہب کی تبلیغ میں شب وروز مگن ہے ۔دنیا میں ان کی تعداد کروڑوں میں بتائی جارہی ہے جبکہ پاکستان میں ان کی تعداد کو کم ازکم بتایا جارہا ہے الیکشن میں ان کی ایک لاکھ ووٹ بتائی گئی مگر ووٹ ڈالنے کا حق بھی نہیں دیا گیا اور اسی لئے احمدیوں نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا ۔ہم لوگ جو پاکستان کے نام پر اکٹھے ہوئے تھے ۔ہم نے اور ہمارے قابلِ احترام علماء کرام نے ہمیں منظم نہیں ہونے دیا ۔پہلے تو یہ نظریہ پاکستان ہی کے مخالف تھے ۔پھر جب مجبوراً انہیں پاکستان آنا پڑا تو انہوں نے ہمیں پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ،ہمیں لسانی گروہوں میں اور فرقوں میں بانٹ دیا ،ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنادیا گیا ۔ہمارے ہاتھ میں بندوق اور بارود پکڑا دیا ۔

69 سالوں سے ہم پاک وطن میں ناپاک سازشوں میں مبتلا ہیں ۔نہ اخوت ہے ،نہ مروت ہے ،نہ امن ہے نہ سلامتی ہے نہ بجلی ہے نہ پانی ہے نہ پیار ہے نہ محبت ۔نہ روٹی ہے نہ کپڑا نہ مکان اور نہ انصاف ۔ہر طرف ظلم ہی ظلم ہے ۔ہم نے نہ غیر اقوام سے اور نہ احمدیوں کو دیکھ کر کوئی عقل لی اور جہالت کی تاریکی میں غرق ہو گئے ۔ہم نے 69 سالوں میں دنیا کی نظر میں کیا سٹیٹس لیا ۔ہم ٹھہرے دہشت گرد ،چور ،انتہا پسند ،لالچی ،دولت پسند ،انگریز کے درباری ،ایمان فروش ،ضمیر فروش ،ہیروئن

فروش۔ساری دنیا ہمیں فیل سٹیٹ قرار دینے کو ہے۔ہمارا صدر اور ساری پارلیمنٹ انتہائی کرپٹ لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔ہم ایک دوسرے کو بے ایمان اور جعلی ڈگری ہولڈرز، کمیشن خور اور جعلسازی میں نمبر وَن کا سرٹیفکیٹ دے چکے ہیں بلکہ یہ حقیقت ہے۔عدلیہ نے بے شمار اشرافیہ کا کچا چٹھہ بیان کر دیا ہے۔اب نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ساری قوم میں کوئی ایسا صادق اور امین نہیں جس کو قوم نیک اور معقول لیڈر تسلیم کر کے اس پر اعتماد کر سکے ۔ہم اور ہمارے علماء کرام اور اکابرین ملک کو ترقی کی بجائے پستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ہمیں اپنی قوم کی فکر ہونی چاہیئے ۔ہمیں کسی ملک میں مداخلت کی بجائے اپنے ملک کی ترقی کے متعلق سوچنا چاہیئے ۔جو بھی ترقی کرتا ہے اس سے سبق سیکھنا چاہیئے ۔دنیا ہمارا مذاق اُڑا رہی ہے اور ہم اپنے ملک کے وسائل کو اپنی ذاتی انا کی خاطر اُڑا رہے ہیں۔اے اللہ اس قوم کو عقل دے اور اس قوم پر اپنا خاص رحم کر۔آمین۔



## معمولی ایجادات کی تاریخ

چھوٹی چیزوں کی بڑی اہمیت کا اندازہ ہمیں کم ہی ہوتا ہے بعض ایجادات بہت معمولی ہیں لیکن انہوں نے ہماری روزمرہ زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

چوٹ کی پٹی:: چوٹ لگ جائے تو اس پر چپکانے کی چھوٹی سی پٹی ۱۹۲۰ میں ایک امریکی ارل ڈکسن نے ایجاد کی جو ہر گھر کی ضرورت بن گئی۔

ربڑ بینڈ:: انگلینڈ کی مشہور ایجاد ربڑ بینڈ ہے ۔اسٹیفن پیرس نے اسے ۱۸۴۵ء میں پیٹنٹ کروایا۔یہ دنیا بھر میں فوراً مقبول ہوگیا۔سالانہ ۳۴۲ ملین ربڑ بینڈ استعمال کئے جاتے ہیں۔

پیپر کلپ:: یہ ۱۸۶۷ء میں ایک امریکی باشندے سیموئل بی نے ایجاد کیا تھا آج بھی یہی ڈیزائن استعمال ہوتا ہے۔

کپڑے لٹکانے کی چٹکی:: یہ ۱۸۵۳ء میں ڈیوڈ ایم سمتھ نے ایجاد کی تھی۔موجودہ ڈیزائن اوریجنل ہے۔اس میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکی۔

# مسلمان۔ماضی،حال اور مستقبل

صدیوں سے زندہ اور حکمران چلی آنے والی قوم۔وہ قوم جس نے ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کی۔وہ قوم جس نے شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلایا۔وہ قوم جس نے اپنے مغلوب اور محکوم کو ہر طرح کی آزادی دی۔وہ قوم جس کا مدّعا ابتدا سے لے کر انتہا تک صلح وآشتی کی روح پھونکنا تھا۔اپنے اسلاف کی مثال کو لیجیئے۔انہوں نے چیتھڑے پہن کر قیصر وکسریٰ کی خلعتِ فاخرہ کو نوچ ڈالا۔خود تنکوں پر رات کاٹی اور بڑے بڑے کجکلاہوں کے تاج وتخت روند ڈالے اور دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پرچمِ اسلام لہرا دیا۔اور سپین میں وہ عظیم الشان سلطنت قائم کی جس کا آٹھ سوسالہ دور نے یورپ کو جینا سکھایا۔ان کے پاس کیا تھا۔ایک لازوال تعلیم !اور بے نظیر حسنِ عمل۔

آج اس قوم کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔وہ قوم آج ذلت اور بدبختی کے گہرے اور تاریک گڑھے میں گری ہوئی ہے وہی قوم پستی کی ایک ایسی وادی تک پہنچ چکی ہے جہاں نظر دوڑانے سے تو کیا شمع لے کر ڈھونڈنے سے بھی روشنی نہیں مل سکتی۔وہ قوم جو اپنی جوانمردی اور بہادری سے مشرق میں سائیبیر یا تو مغرب میں فرانس کے سپوتوں سے ٹکرا رہی تھی آج وہی قوم دھتکاری جارہی ہے۔وہ قوم جس کے متعلق عیسائی مفکر نے کہا تھا ''اگر یہ قوم چند سال اسی طرح رہی تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بعد دنیا میں حکومت کرنے والا کوئی نہ ہوگا''...افسوس وہ آندھی اپنی یکسانیت میں نہ رہی اور جلد ہی اپنی تیزی کھو بیٹھی۔مسلمان اپنی اسی حالت میں نہ رہے اور جلد ہی بدل گئے انہوں نے اپنی شمشیر کو باہر نکالا ہی تھا کہ وہ ان سے چھِن گئی مسلمان عیش وعشرت میں محو ہو گئے انہوں نے غداریاں شروع کیں مسلم جو غیر کی جان کا محافظ کہلاتا تھا اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کو ذبح کر دیا۔مسلم جو ہزاروں کے ساتھ اکیلا میدان جنگ میں لڑا کرتا تھا آج ان چند آدمیوں سے اپنی عزت کا سودا کر رہا ہے وہی مسلمان جس نے کئی کئی دن اور راتیں میدانِ جنگ میں گزارتا تھا اب اپنے محلات میں رنگ رلیاں منا رہا ہے۔دسویں صدی ہجری میں مسلمانوں سے تقریباً سب علاقے چھِن چکے تھے۔سوائے چند اُن علاقوں کے جو مسلمانوں کے تھے جن پر حکومت تو مسلم کی تھی مگر وہ

عیسائیوں کے تابع تھے۔ جب عیسائیوں نے مسلمانوں کو اُندلس سے نکالا تو ان پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جن کو یہ قلم ضبطِ تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے خاندانوں کو نیست و نابود کر دیا گیا عورتوں کی عصمت دری کی گئی انہیں ننگا کر کے بے خانہ و بے اماں کیا گیا۔ غرضیکہ وہ تمام مظالم جن کی طاقت انسانی ہاتھوں میں تھی وہ عیسائیوں نے کر دکھائے۔

پھر فرانسیسیوں نے مراکش، ٹینس، اور الجیریا پر اپنے ہاتھ پاؤں مضبوط کر کے ان کو آزادی سے محروم رکھا۔ اس طرح عیسائیوں نے ترکوں سے تمام وہ علاقے چھین لئے جو ایشیائے کوچک کہلاتے تھے۔ اور انہیں محدود کر دیا۔ عرب کے جنوب میں عدن یعنی شہ رگ پر قبضہ کر لیا اسی طرح ہندوستان جس پر ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے نہایت شان و شوکت سے حکومت کی تھی وہ بھی محکوم ہو گئی۔ محمد بن قاسم کی عظیم الشان فتوحات نے ہمیشہ کے لئے ہندوستان کو مطیع بنالیا۔ اور اولیاء کرام نے اپنے عمل اور کردار سے اس قوم کی بے مثال تربیت کی کہ یہ قوم ایک مثالی قوم بن گئی تھی۔

مسلمانوں کی قوم اب نام کے اعتبار سے مسلمان ہے مگر اپنے ظاہری باطنی اخلاق، اپنے کردار، اپنے افعال، اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے مسلمان نہیں۔ اس کے وہ اخلاق و کردار نہیں جو پہلے تھے۔ اس زمانے میں مسلمان خوش اخلاق، اعلیٰ کردار اچھے افعال اور پاکیزہ مقاصد کے مالک تھے۔ یہ وہی قوم ہے جس کے افراد غیر کے لئے یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی میدانِ جنگ میں بغیر اسلحہ کے ان کے مقابل پر آئے لیکن آج کا مسلمان نہتے، بے کس، اور مظلوم بھائی کو ہی دھوکا دے کر مارے گا۔ وہ مسلمان جو اپنے ہی نہیں بلکہ غیر کی بھی غمخواری کرتا تھا آج وہ اپنے بھائی کی تکلیف پر اس کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اور طعنے دیتا ہے۔ جب مسلمان کی یہ حالت ہو کہ وہ نہتوں پر حملہ کرے اور بے بس کمزور سے اس کا اسباب چھینے اور امانت میں خیانت کرے اور بلی پر کتے کی طرح جھپٹے اور شیر کے سامنے بلی بن جائے وہ کیسے ترقی کر سکتا ہے؟ وہ کیسے امید کر سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں دوبارہ عنانِ حکومت آئے گی۔

ہمارے اَباواجداد اس لئے تاج و تخت کے وارث بنائے گئے کیونکہ وہ نیک تھے، وہ اپنے

بھائیوں کے خیر خواہ تھے۔حقوق العباد بجالاتے تھے،عادل ومنصف تھے۔فرض شناس،شفیق اور رحم دل تھے۔دوسری اقوام نے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے محکوم بنالیا ہے۔مسلمانوں میں اعمال واخلاق کی پستی نے مستقل ڈیرہ ڈال لیا ہے،تفرقہ پرستی،باہمی بغض وعناد،جہالت اور تاریک خیالی نے انکو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔عمل وکردار کھوکھلا ہے۔قرآن اور اسلام پر کوئی عمل نہیں۔ہر کوئی تنہا لیڈر اور مفتی بن رہا ہے۔باہم جب بھی مسلم اکھٹے ہوں ان کا ایک امام نہیں ہوتا حتیٰ کہ امامِ کعبہ کے پیچھے بھی بعض لوگ نماز نہیں پڑھتے۔انہوں نے قرآن پر عمل ترک کر دیا ہے۔خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے باغی ہیں۔ہر برائی نے ان کے اندر گھر کر لیا ہے۔جب تک قرونِ اولیٰ کے اصحاب کی طرح،حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جان نثاروں کی طرح،انصار ومہاجرین کی طرح، پیار واخوت کا درس نہیں لیتے،عزم وہمت کے پہاڑ نہیں بن جاتے،اتحاد وتنظیم واطاعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنا لیتے،معراجِ انسانیت پا نہیں لیتے اور اپنی زندگیاں حُبِ رسول کے لئے وقف نہیں کر دیتے تب تک بابِ قبولیت کے در،وا نہیں ہوتے۔جب تک دوبارہ عنانِ جہاں بانی آپ کا مقدر نہیں بن سکتی۔

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں



## کھوپڑی میں پنسل کی موجودگی سے لاعلم شخص

ایک شخص بچپن میں لگنے والی چوٹ سے ۱۵ سال لاعلم رہا بتایا گیا ہے کہ جرمنی میں ایک ۲۴ سالہ افغانی باشندے کو اکثر سر درد کی شکایت رہتی تھی۔ڈاکٹرز نے جب معائنہ کیا تو اس میں ۴ انچ لمبی پنسل موجود تھی۔جو بچپن میں اس کے دماغ میں گُھس گئی تھی۔اور وہ اب تک اس سے لاعلم تھا۔ ڈاکٹرز نے کامیاب اپریشن کے بعد وہ پنسل اس کی کھوپڑی سے نکال لی ہے۔جس کے بعد مذکورہ شخص جلدی سے صحت یاب ہورہا ہے۔اور اس کے سر کی درد بھی ختم ہوگئی ہے۔

# غیرت و ناموس

قیامِ پاکستان کے بعد کے پہلے پندرہ سال چھوڑ کر پچھلے بارہ تیرہ سالوں میں ہماری طرح یقیناً آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ معاشرہ میں نہ صرف قتل ایسے خوفناک جرائم کی وارداتیں زیادہ ہوگئی ہیں بلکہ ان وارداتوں میں 90 فیصدی بناء ''غیرت ناموس'' ہوتی یا بیان کی جاتی ہے...فلاں شخص نے اپنی بہن کو زہر دیا گولی یا چھرا، گھونپ کر مار دیا۔ اسے شک تھا کہ اس کے فلاں پڑوسی کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔...فلاں شخص نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو موقع پا کر ذبح کر دیا، وہ بار بار ٹوکنے اور روکنے کے باوجود اپنے فلاں آشنا سے قطع تعلق پر آمادہ نہ ہوئی تھی...فلاں باپ نے اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر اپنی بیٹی کا ٹوکے، کے ساتھ سر قلم کر دیا وہ محلہ کے فلاں نوجوان کے ساتھ آوارہ تھی...یا...فلاں خاوند نے اپنی بیوی کو سوتے میں قتل کر دیا وہ فلاں ہمسائے کے ساتھ خراب تھی یا اسے شک تھا کہ اُس کے ہمسائے کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ اب تو ان خبروں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زیادہ قتل ہوتے ہی غیرت ناموس کی بناء پر ہوتے ہیں۔ یا کئے ہی بظاہر غیرت ناموس کے لئے کئے جاتے ہیں...بے شک ماہرین اخلاقیات وغیرہ نے عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے اشتعال کو جائز اور قابلِ معافی قرار دیا ہے۔لیکم یہ خبریں قارئین کو دو ہی نتیجوں پر پہنچا سکتی ہیں۔

اوّل:: پاکستان میں جنسی بے راہ روی اور اُوباش پن بہت زیادہ ہوگیا ہے اور معاشرے کے مختلف طبقات میں عزت و آبرو کا وہ احساس نہیں رہا جو آج سے پہلے تھا۔

دوم:: یہ کہ پاکستانیوں میں احساس غیرت ناموس بہت بڑھ گیا ہے۔ مجھے معاف کیا جائے اس صاف گوئی کے لئے ان دونوں نتائج پر گہرے غور و خوص کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پہلی بات صحیح اور دُرست ہے۔اور دوسری اصل وجہ نہیں بلکہ اس گھناؤنے جرم کی پاداش سے بچنے کے لئے ایک آسان اور سہل دفاعی حیلہ کا حکم رکھتی ہے۔ جو ہمارے نزدیک بے غیرتی ہی کی ایک قسم ہے ۔اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی قتل ''واقعی اشتعال'' میں ہوتا ہی نہیں لیکن ایک بات جو سمجھ میں نہیں

آتی وہ یہ ہے کہ جو باغیرت شخص ایک وقت یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اُس کی بہن، بیٹی، بیوی یا بہو کسی غیر مرد کے ساتھ ہنس کر بات بھی کرے۔ اُس کی غیرت یہ کیونکر گوارا کر لیتی ہے کہ وہ پولیس اور عدالت کے رُوبرو بڑی تفصیل کے ساتھ اُسی معاشقے کی سچی جھوٹی جزئیات بیان کرے۔ گواہان استغاثہ اس کے سامنے اس کی اُسی بہن، بیٹی، بیوی یا بہو کا بار بار نام لے کر اس کے معاشقے کی تفصیلات دہرائیں، متذکرہ معاشقے کی دستاویزی شہادتوں، یعنی خطوط، اور تصاویر پر برسر عدالت جرح ہو۔ وکلاء حضرات بڑی گہرائی میں جا کر اُسی معاشقے کی سچی جھوٹی جزئیات اُس کے سامنے کریدیں اور جس بات کو چھپانے، دبانے یا ختم کرنے کے لئے ملزم نے اپنی عزیزہ کو جان سے مار دینا گوارا کیا تھا۔ وہی بات عدالتی ریکارڈ میں آ کر ایک پبلک دستاویز بن جائے اور... میڈیا اور اخبارات کے عدالتی، رپورٹر اسے ذہنوں میں سنسناہٹ پیدا کرنے والے عنوانات کے ساتھ روزانہ کھنگالیں اور ساری دنیا کو سنائیں۔ آخر یہ کس قسم کی غیرت ہے جس کا پاسدار اپنی ہی کسی عزیزہ یا رشتہ دار کی جان لینے میں تو کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا لیکن اُس کا احساس غیرت و ناموس خاندان خوفِ تعزیر سے فوراً ہی لب کھول دیتا ہے اور جس گناہ کے بارہ میں چند گھنٹے یا چند دن پہلے وہ یہ چاہتا تھا کہ اسے کوئی نہ دیکھے، کوئی نہ سنے، واردات کے چند گھنٹے اور چند ہی دن بعد وہ خود بڑی تفصیل سے وہی قصہ راوی دنیا سنانے لگ جاتا ہے۔ مگر شومئ غیرت معاشرہ کے ثناء خواہان و پاسدارانِ تقدیسِ مشرق نہ معاشرہ میں بڑھتے ہوئے اُوباش پن اور جنسی بے راہروی ہی کی کچھ فکر ہے اور نہ اُن کا دھیان کبھی اس نئی قسم کی بے غیرتی ہی کی طرف گیا ہے جو ''اشتعال'' کے نام سے ہر ایسے جُرم کے دفاع میں پیش کر دی جاتی ہے۔

الامان والحذر۔ جس کنبے میں ایسا خونیں حادثہ ہو جاتا ہے اُس کی ناموس و غیرت کے تانے بانے تین، تین، چار چار سال تک عدالتوں میں اُدھڑتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی بیٹیوں کے لئے رشتے ملنے اور بیٹوں تک کے رشتے ہونے ناممکن ہو جاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود کوئی بھی اس آسان اور ایور ریڈی قسم کی ''مکروہ صفائی'' سے گریز و اجتناب پر تیار نہیں۔ ہمیں بعض

دانشوروں کی اس توجیہہ سے سو فی صد اتفاق ہے کہ نئی قسم کا اشتعال یا احساسِ غیرت ہماری سستی تفریح کے لئے بننے والی فلموں کی ایجاد ہے۔ ڈھائی گھنٹے کی ایک فلم میں ایک لڑکی کسی کنبے میں پیدا ہوکر، جوان ہوکر معاشقہ لڑاتی ہے پھر اس کا بھائی، باپ یا کوئی اور رشتہ دار اسے اشتعال کی بنا پر قتل کر دیتا ہے اور چند منٹوں میں اس کے جرم کی تعزیر بھی سنا دی جاتی ہے ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ایک انسان کی زندگی ایک فلم ہی کی مانند ہوتی ہے لیکن اے اَبنائے وطن! آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ نہ انسانی زندگی اڑھائی گھنٹے کی ہوتی ہے اور نہ ہماری سستی پوچ اور جنسیاتی تفریح کے لئے بننے والی فلمیں کیا حقیقی انسانی زندگی کا چربہ ہوتی ہیں؟۔ تقدیس و مستقبل ملّت کی اس سے بڑی شومئ قسمت اور کیا ہوگی کہ اگر چہ ہم قومی زندگی کے شعبہ ہائے تفریح کے نگہداروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان وقتی تفریحات کو حقیقی انسانی زندگی کے قریب تر لائیں۔ ہم نے اپنی زندگیوں کو اپنی قومی ناموس اور اپنے احساس غیر ناموس ہی کو وقتی، عارضی طور پر ڈرامائی اور فلمی بنا ڈالا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ 

## ٹین کے ڈبے

یہ کین کھانا محفوظ رکھنے کے لئے بہترین ہیں۔ ۱۸۱۰ء میں نکولس اپیرٹ نے یہ ایئر ٹائٹ ڈبے بنائے اصل میں نپولین کو جنگ کے دوران پتہ چلا کہ خوراک محفوظ نہیں رہتی اور فوجی غذائیت کی کمی کی وجہ سے کمزور پڑ گئے ہیں اس نے یہ اعلان کیا کہ جو یہ مسئلہ حل کرے گا اسے 12 ہزار فرانک انعام دیا جائے گا بس مشکل یہ تھی کہ اس وقت تک کین کھولنے والا آلہ ایجاد نہیں ہوا تھا سپاہیوں کو اسے کھولنے کے لئے تلوار استعمال کرنا پڑتی تھی۔

آپ نے Bubble Wrap دیکھا ہوگا۔ یہ نازک اشیاء کی پیکنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے اس میں ببل جیل کشن ہوتے ہیں اسے 1950ء کی دہائی میں ایجاد کیا گیا۔ اس کے موجد الفریڈ یلڈنگ اور مارک شوائز تھے لیکن ابتدا میں یہ ناکام ایجاد تھی پھر آئی بی ایم نے اسے کمپیوٹرز کی محفوظ ڈلیوری کے لئے استعمال کیا تو یہ ایجاد کامیاب ہوگئی۔

# 14راگست-یومِ محاسبہ

نئی نسل کو نہ سہی اہلِ وطن کا وہ حصہ جس کی آنکھوں نے دُنیا کے نقشے پر اس مملکتِ عزیز (پاکستان) کی حدود کواُبھرتے دیکھا ہے۔اُسےتو بہرحال کچھ نہ کچھ یاد ہوگا۔اپنے رَب سے اس ارضِ پاک کی نعمت مانگتے وقت ہم نے کیا کیا عہد کئے تھے۔کیسے کیسے نیک، نیک،تعمیری اور بلند عزائم کا اظہار کیا تھااور یقیناً صورت وشکل بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سےہمیں اس نعمتِ عظمیٰ کا وارث بنادیئے جانے کے بعد ہم نے اپنے وعدوں کو کس کس طرح پورا کیااور نبھایااسی طرح نہ کہ لادینیت،اشترا کیت اور الحادوزندقہ کی لعنتیں مختلف النوع خوش نماو خوش آئندہ جُوتے پہن کر ہمارے فکرواحساس کی صفوں میں درآئیں۔ہم نے نعرہ لگایا تھا کہ اس خطہ ارض میں ہم اپنے نظریات اوراپنی نئی نسل کی تعمیروتربیت خالصتاً اسلامی نظریات وتعلیم کی روشنی میں کریں گے۔لیکن عملاً ہم نے اپنے 1947ء سے پہلے والے اسلام کو بھی خیر باد کہہ دیا۔اوراپنے آپ کو ہوس زَرومال کے سپرد کرکے اپنی آئندہ نسل کی تربیت وتعمیر سراسر ناجائز،ناروا بلکہ حرام طریقوں سے حاصل کردہ یافتوں سے افرنگیت اور بےراہ وبےغیرت مغربی تہذیب کی لائنوں پر شروع کردی۔

ہم نے بلند آواز میں اپنے عزائم کا اعلان کیا تھا کہ ہم اس خطہ ارض موسوم بہ پاکستان کے داخلی وخارجی دشمنوں سے ہمیشہ چوکنےّ اور چوکس رہیں گے قیامِ پاکستان کے دشمنوں کو کبھی منہ نہ لگائیں گے۔ففتھ کالموں سے ہشیار رہیں گے اور اسلام کے دُشمن،منزہ،اتحاد اور انسانیت دوست تعلیم پر عمل کرتے ہوئے ہم جلد ہی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گے کہ دُشمن ہمارے اندر داخل ہوکر ریشہ دوانی کرنا تو رہاایک طرف وہ ہماری طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گالیکن اس بے نیازی،عدم تدبر اور عدم تدبر (حفظ وطن ایسے اہم فریضے سے) بےخبری کے باعث ہم نے اپنی دیکھنے والی آنکھوں سے یہاں محبت وطن سے کہیں زیادہ دشمنانِ وطن کو پھلتے پھولتے دیکھا۔اورٹس سے مس نہ ہوئے۔ففتھ کالموں اور دشمنانِ وطن کے پٹھوؤں کو کیفرکردار تک پہنچانے

کی بجائے سر براہانِ حکومت کی سطوتوں کو للکارتے اور سالمیتِ وطن پر تبرلاتے دیکھا مگر ہمارے کانوں تک جوں تک نہ رینگی ۔حتیٰ کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بدخواہانِ وطن کینچلی بدل کر محبانِ وطن بلکہ رہنمایانِ وطن بن گئے ۔اور ہم نے اُن کی اندھادھند تقلید کو وظیفہ حیات بنالیا۔

ہم نے اپنے اس یقین محکم کا ڈھول پیٹا تھا کہ ہم یہاں اسلامی رواداری اور اسلامی نظام اقتصاد کی اساس پر ایک لاثانی و لا فانی معاشرے کی تعمیر کریں گے۔جس کے سائے میں انسانیت، شرافت،صداقت، دیانتی آزادی کلیلیں کیا کریں گی لیکن ہوس جاہ واقتدار نے ہمیں بھٹکایا کہ ہم اقتدار کی کرسیاں حاصل کرنے کے لئے حیلوں بہانوں سے اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کی گردنوں پر چھریاں پھیرنے لگے۔حتیٰ کہ ہمیں اس غیر اسلامی ہنگامہ روی میں مصروف پا کر دشمن نے ہمارے اندر ایسے کالم نویس پیدا کر دیئے جو اُس مسلمانوں کی حمایت کر رہے ہیں جن کی مسلح مداخلت کے باعث چالیس ہزار پاکستانی موت کی وادی میں چلے گئے۔اور اربوں کا اقتصادی نقصان ہو چکا ہے ہزاروں کی تعداد میں لا علاج امراض میں مبتلا ہو گئے۔اپنے نہتے اور بے بس ہموطنوں کو تہ تیغ بے دریغ کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اسی قسم کی دسیوں وعدے، وعدے اور اعلان ہم نے اپنے رب،اس نئے ملک کے عوام اور اپنی آئندہ نسل سے کئے تھے۔

آیئے ذرا آج ان حقائق کی روشنی میں اپنے پچھلے سالوں کے کردار کا محاسبہ کر دیکھیں کہ ہم نے اس عرصہ میں اپنے ان نظریات ،عزائم ،اور مواعید کا کس کس طرح رنگ نکھارا یا حلیہ بگاڑا ہے !۔بیشک ''محاسبہ'' ایک بڑا ہی چبھتا ہوا لفظ اور کرب انگیز عمل ہے اور سہلا الحصول دولت کے حصول کی لگن میں اپنے فکر و احساس کے جسم سے اقدار اخلاق و مروت کے تمام لبادے اُتار کر باؤلی ہوئی پھرنے والی قوموں پر بڑا ہی بھاری ہوتا ہے لیکن یہ بھی واضح رہے کہ جو قوم آپ اپنے محاسبے سے کنی کترانا شروع کر دے اُس سے رفتہ رفتہ غیروں اور بدخواہوں کے احتساب کی صلاحیتیں بھی چھن جایا کرتی ہیں۔



# ترقی کا سوچیئے خدارا

ہمارا پاک وطن جب کہ مسلمانوں کا وطن ہےاور مسلمانوں کی اکثریت نے بنایا ہے۔مگر یہ اسلامی قوانین کے لئے نہیں بنایا گیا۔اس لئے ہمیں یہ فکر نہیں کرنی چاہیئے کہ یہاں اسلامی قوانین ہوں۔اسلام پر عمل ہو۔ایک فلاحی ریاست کے قوانین ایک فرد کی فلاح کے ارد گرد گھومتے نظر آئیں۔مگر ہمارا ملک جب سے بنا ہے اس کا قبلہ ہی سیدھا ہونے کو نہیں آرہا۔بدوؤں کی طرح ہر کسی کا اپنا خیمہ ہے اپنا قانون۔اپنا فقہ ہے اپنا فتویٰ۔اپنا نظریہ اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد۔ہر چیز پر اختلاف ہے۔عید پر، چاند پر، زکوٰۃ پر، نماز پر، دربار پر، ختم پر۔ہم ان مسائل سے دور ہٹ کر کیوں نہیں سوچتے۔ہم غلام قومیں ہیں۔ہمارے دماغ آزاد نہیں ہیں۔ہم احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ہم بات حضرت عمر فاروقؓ کی کرتے ہیں اور رویہ یزیدی ہے۔اس لئے ترقی نہیں ہورہی۔ہم بات اسلام کی کرتے ہیں مگر مقصد اسلام آباد ہوتا ہے۔بھٹو صاحب آئے جمہوریت کے نام پر مگر آمر بن بیٹھے اور پھر آمریت کی ہی نذر ہوئے۔

ضیاءالحق آیا اسلام کے نام پر ملک کی فلاح کے لئے کہ ایسے مولوی کے ہتھے چڑھے کہ اب تک وہی مولوی قابو میں نہیں آرہا۔پھر فوج میں بھی وہی دماغ چل رہا ہے۔وہ کون سے فرشتے ہیں۔ اصل میں کوئی مردِ مومن یا مجاہد درکار ہے جو کہ کوئی درمیانہ راستہ تلاش کرے۔اس ملک کو اس دلدل سے نکالے۔کبھی کوئی خمینی مانگ رہا ہے، کبھی کوئی ہلاکو خان مانگ رہا ہے۔جو بھی آتا ہے اپنی جیبیں بھرتا اور چلا جاتا ہے۔خدارا چائنہ سے سبق سیکھئے۔وہ کہاں پہنچ گیا ہے۔اور ہم کہاں تاریک راہوں پہ چل پڑے ہیں۔پھر پڑوسی ملک سے سیکھیئے کیا وہ تمہاری طرح کا ملک نہیں ہے۔اس میں دیانتداری کا معیار تم سے اچھا ہے۔جب تم مسلمان نہیں۔کوئی طور تمہارا اسلامی نہیں۔تو اسلام کیوں طلب کر رہے ہو۔تم بھٹکی ہوئی، لالچی، اور راندہ درگاہ قوم بن گئی ہو۔نہ آپ کی قوم میں سچائی ہے، نہ دیانت ہے، نہ ایمان ہے، نہ انسانیت ہے، نہ ہمدردی ہے، نہ غیرت ہے، نہ وعدے کا پاس ہے، نہ

کاروباری اصولوں کی پاس داری ہے۔ چوری چکاری، رشوت خوری، کرپشن، دوسرے کا مال کھانا، لوٹنا، بے غیرتی کی حدتک بڑھ گیا ہے۔ دنیا میں تمہارا دوست کوئی نہیں۔ آقاؤں کی بھرمار ہے۔ جس کے سامنے کشکول لے جاتے ہو وہی آپ کو بلیک میل کرتا ہے۔ جو بھی سیکرٹری اور چیف سیکرٹری بنتا ہے اس کے سارے اثاثے اولاد ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔

کچھ ہوش کے ناخن لو۔ کچھ غیرت کرو، ایسے قوانین بناؤ کہ ملک ترقی کر سکے۔ ایک مولوی کے ہاتھ میں آپ نے اسلحہ پکڑا دیا ہے۔ اب لے لو مزا۔ آپ کی اپنی بے وقوفیاں آپ کے گلے پڑ گئیں ہیں۔ ملک میں بہت دولت ہے ایمان نہیں۔ سب کچھ ہے مگر ایمان نہیں۔ لوگ ہیں مگر ایک بھی انسان نہیں۔ کیونکہ ریاست سے کسی کو کوئی وفا کا سبق ہی نہیں دیا گیا۔ جو بھی آیا لوٹنے کو آیا۔ تم تو صومالیہ، اور افغانستان سے بھی اپنا معیار پست کر رہے ہو۔ ساری دینا میں اپنے دونمبر کردار سے پہچانے جاتے ہو۔ خدارا اگر مسلمان نہیں تو انسان ہی بن جاؤ اور اپنے ملک کو زندہ کرو۔ اپنی ذات سے نکل کر قومی سطح پر سوچو۔ انڈیا کی ترقی سے تمہیں غیرت آنی چاہیئے۔ اقبال کا شاہین بنیئے۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ بنئے۔ آپ تو یزیدی راستے اپناتے ہوئے ساری قوم کا بیڑہ غرق کرنے کی طرف گامزن ہیں۔ خدارا ذرا سوچیئے۔ ❁❁

**کوٹ لٹکانے کا ہینگر**

۱۹۰۴ء میں ایک امریکی البرٹ جے پارک ہاؤس نے ایجاد کیا۔

**انڈے رکھنے کی ٹرے**

۱۹۱۱ء ایک امریکی جوزف کوائل نے ایجاد کی۔

**شپنگ کنٹینرز**

۱۹۵۶ء میں بنائے گئے مالکم میک لین نے یہ ایجاد کیا۔

**ٹی بیگ**

نیو یارک کے باشندے ٹامس سلیوان نے ۱۹۰۴ء میں بنایا اور اس کی مارکیٹنگ کی۔

# جن بوتل سے باہر آ گیا ہے

اب بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔سادہ لوگوں کوتو یاد ہی نہیں رہتا۔مگر تاریخ سے واقف لوگ ان سے واقف ہیں۔اس سے قبل عطاء اللہ شاہ بخاری نے پاکستان کو پلیدستان کہا تھا پھر پاکستان میں آ کر فرمایا کہ ہم نے پاکستان کو بطور بازاری عورت تسلیم کرلیا ہے۔اس سے قبل مولانا مودودی صاحب کے خاص کارکن اور معتمد مولانا مظہرعلی اظہر نے قائداعظم کو کافراعظم کہا تھا۔بعدازاں مولانا مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ انبوہِ کثیر پاکستانی مسلمانان ایک ہزار میں سے 999 کافر ہیں۔اور یہ ان کا فتویٰ بھی موجود ہے کہ وکلاء کی کمائی حرام ہوتی ہے۔مزید جنگوں میں جو 1948ء میں شہید ہورہے تھے ان کے لئے بھی مودودی صاحب نے حرام موت کے الفاظ استعمال کئے تھے۔اور پھر مودودی صاحب کا ہی فتویٰ ہے کہ بعض مواقع پر جھوٹ بولنا واجب ہوجاتا ہے اور یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے۔پھر جناب مفتی محمود صاحب والد محترم مولانا فضل الرحمن صاحب نے 1971ء میں فرمایا تھا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہ تھے۔''اسی طرح اسامہ بن لادن اور طالبان کو شہید کہنے والوں کے منہ میں کون لگام دے گا۔

یہ پاکستان مخالف گروہ اب تو ایوانِ اقتدار میں گھس آیا ہے۔ان لوگوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر ملک کو اغوا کرلیا ہے۔مذہب کی آڑ میں، جہادِ افغانستان کی آڑ میں اپنے مدرسے بنائے۔سعودی عرب کے ریال پر اپنی گردنیں موٹی کیں اب ان میں سریا آ گیا ہے۔اور نظریہ پاکستان کو تہ تیغ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔بنگلہ دیش نے تو اسی جماعت اسلامی کے ممبران کو حال ہی میں پھانسی تک چڑھادیا ہے۔مگر ہماری ساری بیوروکریسی ہے ہی جماعت اسلامی کی مرہونِ منت۔یہاں کیا ہوسکتا ہے۔ان لوگوں نے پاکستان کے نظریے کو پاش پاش کرکے اپنے پیٹ کی پوجا کی ہے۔آج ہر پارٹی اس سے خائف ہے۔ہمارا ہر شہر جماعت اسلامی کے نرغے میں ہے۔اسی لئے تو گھر کا بھیدی لنکا ڈھارہا ہے۔ہماری فوج، ہمارا GHQ ہمارے ادارے، طالبان کے نشانے پر ہیں۔اصل ان کی پروردہ یہی مذہبی جماعتیں ہیں۔جن سے اندرونی طور پر رانا ثناء

اللہ اور شہباز شریف کی ملی بھگت ہے۔ یہ لوگ اور یہ جماعت شروع ہی سے پاکستان کو تسلیم نہیں کرتی اور نہ اب تک تسلیم کیا ہے۔ اس کے لشکری ونگ ہیں اور منظم طور پر پاک وطن کو توڑنے کے درپے ہے۔ خفیہ ایجنسیوں کی اطلاعات کے باوجود اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال رہا۔ یہ جماعت غیر ممالک کے مفادات کی نگران ہے۔ مگر عوام میں غیر مقبول۔ حکومت پاکستان کو ایسی منہ پھٹ اور باغی جماعتوں کے افراد پر فوراً غداری کا مقدمہ چلانا چاہیئے۔ چاہیئے کہ باقیوں کے لئے عبرت ہو۔ عام فوجی کا تو فوراً کوٹ مارشل ہو جاتا ہے مگر اتنے بڑے لیڈر کو کوئی نہیں پوچھتا جبکہ اس جماعت کے پاس کوئی سٹریٹ پاور بھی نہیں ہے۔ ہمارے سب لیڈر یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کو اپنے اندر سے خطرہ ہے باہر سے نہیں مگر دشمن کی نشاندہی نہیں کرتے۔ اب تو وہ غدار جن بوتل سے باہر خود ہی آ گیا ہے۔ صرف سوچنے اور بروقت فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔



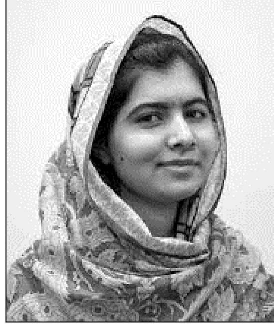
## کمال کا ضبط و برداشت

احباب ذرا غور کریں آج کے دور میں راہ چلتے کسی پر گندے پانی کے کچھ چھینٹے پڑ جائیں تو وہ سو سو گالیاں دے گا کوسے گا۔ مگر میرے آقا نبیوں کے سردار تمام جہانوں سے افضل نبی کریم ﷺ پر ایک بڑھیا روزانہ کوڑا پھینکا کرتی تھی تو آپ ﷺ نے کبھی اس کو اُف تک نہ کہی۔ حیرت انگیز صبر کا نمونہ تھا کچھ دن اس نے کوڑا نہ پھینکا تو فکر ہوئی کہ بڑھیا کو کچھ ہوا تو نہیں۔ جب گھر گئے وہ بیمار پڑی تھی آپ ﷺ نے اس کے گھر کی صفائی کی اور کچھ شکوہ بھی نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کی بات جتائی کہ بڑھیا تم تو یہ کام کرتی تھی میں نے اچھا سلوک کیا۔ بلکہ کوڑے والی بات کا ذکر تک نہ کیا۔ قربان جاؤں میں آقا کی اداؤں پر فدا ہوں میں دل و جان سے اے اللہ مجھے عاشق حقیقی بنا اپنے پیارے آقا کا اور دیدار نصیب کر آمین۔

اللهم صل على محمد و على آل محمد وبارك وسلم انك حميد مجيد۔

# ڈاکٹر عبدالسلام کا ملالہ کے نام خط





پیاری ملالہ! مبارک ہو کہ خدا نے تمہیں عزت دی ۔میرے اس وطن کو سلام جس نے ہمیں سکون بخشا۔قائد اعظم کو سلام اور اس پاک وطن کی تعمیر کنندوں کو سلام ، اصل مسلم لیگ کے ابتدائی کارکنوں کو سلام، خان لیاقت علی خاں، سرظفر اللہ خان، چوہدری محمد علی، سہروردی اور نشتر صاحبان کو سلام جنھوں نے ہمیں یہ پاک خطہ زمین ہمیں عنایت کیا۔اس پیارے وطن کے دریاؤں، ندی نالوں اور کہساروں کو سلام ۔ جسے دیکھ کر ہماری روح خوش ہوتی ہے۔ میں اس قوم کے حُب الوطنوں کو سلام پیش کرتا ہوں جنھوں نے تمہارے ساتھ تعاون کیا اور تمہیں اس منزل تک پہنچایا۔مگر اس قوم سے تمہیں خیر کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے ۔ کیونکہ یہ قوم ابھی تک غلامانہ اذہان سے پُر ہے۔اس کی جہالت عام ہے۔ یہ بھی طالبان کی سدھائی ہوئی ،نیم مُلاں کی پڑھائی ہوئی ،کوتاہ اندیش اور بے علم ہے۔اسے منفی رویے پسند ہیں۔

ملاوٹ، رشوت، کذب بیانی، بے عدل و انصاف کی دلدادہ ، خدا سے دُور،جعلی خداؤں کی دلدادہ،اَقرباء پروری کی بدترین مثال،اَنا پرستی کی بدترین شکل،قبور ومزاروں کو سجدہ کرنے والی،کاہل و جاہل ملاں سے خدا کے گھر کا نام پوچھنے والی ،مساجد ومندر اور عبادت گاہوں کو بم سے اُڑانے والی ،شراب وزنا کی عاشق ،فرنگی کی غلام،توہم پرست ، بت پرست ،خوشامد پسند ، یہ قوم گم گشتہ راہ اور کشکول بردار ہے۔ میں نے بھی آپ کی طرح ہمیشہ اُمید کا دامن تھامے رکھا تھا۔تب کہیں جا کے خدا تعالیٰ نے عزّت دی تھی۔ وہ مجھے پاکستان کا واحد نوبل انعام یافتہ کہتے تھے مجھے اصرار تھا کہ مجھے 'پہلا' کہا جائے۔ میں سنتوخ داس نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا۔ جو آپ کی وادی سوات جتنا خوبصورت تو نہیں

لیکن پھر بھی یہ ایک اچھی جگہ تھی ۔ میں جھنگ میں پلا بڑھا جو کہ اب خطرناک تنظیموں کی وجہ سے جانا جاتا ہے ۔ میرے والد محکمہ تعلیم کے ایک افسر تھے ۔آپ کی طرح مجھے پڑھائی میں بہت دلچسپی تھی ۔ مجھے انگلش اور اُردو اَدب سے بہت لگاؤ تھا۔لیکن حساب میں میری کارکردگی بہت اچھی تھی ۔ بہت کم عمری میں میں نے میٹرک میں اتنے نمبر لئے تھے جو کہ مجھ سے پہلے (اتنے نمبر پورے پنجاب میں) کوئی طالب علم نہ لے سکا تھا۔لیکن میری تعلیم آپ کی طرح مشکلات سے پُر نہ تھی ۔ مجھے نہ طالبان کے بموں سے سکولوں کو اُڑانے کا سامنا کرنا پڑا ۔نہ ہی تعلیم پر کسی پابندی کا لیکن آپ کی راہ میں جو بھی روڑے اٹکائے گئے ۔آپ نے کامیابی سے انہیں اپنی راہ سے ہٹایا۔حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اپنی ہر سانس کے ساتھ ان لوگوں کو شکست دیئے جارہی ہیں ۔ملالہ یوسف زئی ایک اُمید کی ایک چھوٹی سی مگر روشن کرن ہے۔آپ کو نوبلز پرائز ملنے کے بعد سب سے زیادہ غصے میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ پر حملہ کر کے آپ کی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہا تھا۔اس غصّے میں آپ کے کئی ہم وطن حاسد و جاہل بھی شریک ہیں ۔ان سب مشکلات سے گزرنے کے لئے بہت ہمت درکار ہوتی ہے ۔اور میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس ہمت کی کمی نہیں ۔اس ملک میں زیادہ کچھ تبدیل نہیں ہوا ہے ۔آپ کا مذاق اُڑایا گیا،آپ کو اجنبی اور غیر کہا گیا،اور مزید کہا جائے گا۔( کیونکہ ہماری قوم کی نکیل جاہل ملاں کے ہاتھ میں ہے جسے تین دن تک عید کا چاند ہی نظر آتا رہتا ہے ) حالانکہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہ تھا۔ میں اس بارے میں جانتا ہوں کہ بحیثیت قوم ہم خوشیاں حاصل نہیں کرنا چاہتے ۔ہم چاہتے ہیں کہ ہم پر رحم کیا جائے ۔ یہ لوگ تب تک خوش تھے جب تک تم ایک متاثرہ مقامی لڑکی تھی لیکن پھر آپ نے متاثرہ کے لیبل کو جھٹک کر خود کو پوری دنیا میں لڑکیوں کے لئے ایک اُمید کی کرن کے طور پر منوالیا۔ملالہ ہمیں ہیروز پسند نہیں ہیں ۔ہمیں صرف متاثرہ اور پسے ہوئے لوگ پسند ہیں ۔جنہیں ہم دکھاوے کے طور پر دنیا میں پیش کرسکیں ۔

ہم صرف برّصغیر کے مسلمانوں کی سچی اور جھوٹی کہانیاں بنا کر بیرونی طاقتوں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں تا کہ دنیا یہ تسلیم کرے کہ علامہ اقبال نے جو جنت کا تصور پیش کیا تھا اُسے اِس دنیا نے نقصان پہنچایا ہے جبکہ اسی ملک کے مکّفرین نے اس ملک کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے لیکن جو اندرونی عناصر اس قوم

کو لے ڈوبے ہیں اُن کے کردار پر کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ نام نہاد مسلمان، تاجر، جاگیردار، بیوروکریٹس، اَقرباء پرور، مذہبی انتہا پسند قسم کے طالبان، جعلی فتویٰ باز، سعودیہ اور دیگر ممالک سے جہادی تنظیموں کے نام پر مال کھانے والے، یہود کے ایجنٹ، کشکول بردار، زردار ولوہار، جعلی ڈگری بردار اَزل سے پاکستان کے دُشمن ہیں۔ ہم اپنے اندر نفرت انگیز روّیوں کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ میں اس کا مزہ لے چکا ہوں۔ مجھے اس بات کا اندازہ تب ہوا تھا جب مجھے نوبل انعام ملا تھا۔ خالص مغربی لباس میں ملبوس لوگوں میں جب میں پنجابی پگڑی اور شلوار میں ملبوس انعام حاصل کر رہا تھا۔ تو مجھے اپنے ملک کی نمائندگی پر فخر تھا لیکن میرے ملک کے کچھ افراد کو اس سے بھی کوئی خاص خوشی نہیں پہنچی تھی۔ اور پھر مجھے بُرا بنا کر پیش کیا گیا، یہودیوں کا ایجنٹ کہا گیا اور بعد میں مجھے میرے مذہبی عقائد کی بنا پر مجھے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ کئی نام نہاد اسلامی تنظیموں (یہودی ایجنٹوں) کے احمقانہ مطالبے پر کئی یونیورسٹیوں میں فساد اور تشدد کے پیش نظر میرے لیکچرز دینے پر پابندی لگا دی گئی۔ میرے کام کو اس احمق و غدار و شکست خوردہ برسر اقتدار اشخاص نے ذرّہ بھر بھی اہمیت نہ دی۔ میں نے مجبوراً فیصلہ کیا کہ کسی اجنبی ملک میں اجنبی بن کر رہنا، کام کرنا بہتر ہے اس سے کہ اپنے ہی ملک میں اجنبی بن کر رہا جائے لیکن میرے اس فیصلے سے مجھ پر غداری کا الزام لگایا گیا۔ مگر پھر بھی میں نے اپنے ملک کے طلباء کا ہر دم خیال رکھا۔ ٹریسٹے اٹلی میں سینکڑوں پاکستانیوں کو پڑھنے کی سہولیات دیں۔ مگر پھر بھی مجھ پر میرے ہی ملک کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ مگر ڈاکوؤں اور لُٹیروں کو اس ملک کے خزانوں کا مالک بنا دیا گیا۔ اور پھر اس قوم و ملک کو انہوں نے خوب لوٹا۔ جس سے بلاول ہاؤسز، سرے محل اور رائے ونڈ محلات تعمیر ہوئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس ملک کے راہبر، راہزن ثابت ہوئے۔ ملک کو دولخت کیا گیا، البدر اور الشمّس کے ظالم لیڈر اپنے کالے کرتوتوں کی بنا پر بنگلہ دیش میں اب پھانسیوں کے پھندوں پر لٹکائے جا رہے ہیں یہ مکافاتِ عمل ہے۔

ملالہ اَب آپ نئی غدارِ وطن ہیں اب آپ پر ذمہ داری ہے کہ آپ اس ملک میں امن، فخر اور خوشیاں لائیں۔ جو یہ سب نہیں چاہتے۔ لیکن ایک نافرمان بچہ چاہے جو کچھ مرضی کرے ایک ماں اُسے

کبھی نہیں چھوڑتی۔اسی طرح یہ لوگ آپ کو بھی قبول نہیں کریں گے۔میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ لوگ ایک دن سمجھ جائیں گے۔ہمیں چاہیئے کہ ہم ان کے لئے جدوجہد کریں اور اس کے ساتھ دعا بھی کریں۔اور اُن مہاجرین شہداء کے لئے جنھوں نے یہ آزادی اپنا خون سینچ کر لی تھی۔اُن ماؤں بہنوں کے نسل کے لئے جنکی عصمتیں اس ملک کی تعمیر کے دوران لوٹی گئیں،جن کے گھر گھروندے،مال واسباب،حتیٰ کہ اُنکے بچے نیزوں سے اُچھالے گئے،اُن کے لئے ہمیں اور آپ کو اور حُب الوطن قوم کے نوجوانوں کو دن رات بے لوث کام کرنا چاہیئے۔خدا میرے ملک کو کوئی پھر ایک قائداعظم دے۔اور وہ اس پیارے ملک کو اُس عظمت کے مینار پر بٹھائے کہ دنیا کے لئے ایک بہترین مثال ثابت ہو۔آمین۔



## ہے کوئی ایسا؟

جو اپنی ذات و صفات میں اپنی مثال آپ ہو جو فتح کے بعد دشمن کے لئے معافی کا اعلان کرے۔جو طاقت رکھنے کے باوجود بدلہ نہ لے۔جسے لہولہان کیا جائے اور وہ بدلے میں دعا دے۔جو عمر بھر برائی کا بدلہ بھلائی سے دے۔

جسے اس کے جانی دشمن بھی صادق و امین کہیں جو بادشاہ ہو کر بھی تین تین دن تک جس کے گھر چولہا نہ جلے۔جو مالک ہو کر بھی غلام کو سواری پہ بٹھائے اور خود پیدل چلے۔جو پاک اور معصوم ہو پھر بھی رات رات بھر رب کی حمد و ثناء کرے۔بے حساب دُرود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہ جو اپنی مثال آپ ہیں۔ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ لوگ اپنے رب کو بھول جائیں گے،لباس بہت قیمتی پہن کر بازار میں اکڑ اکڑ کر چلیں گے اور اس بات سے بے خبر ہوں گے کہ اسی بازار میں ان کا کفن بھی موجود ہے۔

(حضرت علیؓ) کتنے نادان ہیں ہم کہ جانتے ہیں کہ ملک کے دینی مدرسوں میں دہشتگردی کے انڈے دیئے جاتے ہیں جو سانپ بن کر اس ملک کے امن وامان کو بے دردی سے نگل رہے ہیں مگر پھر بھی دینی مدرسوں کے خلاف صرف اس لئے کچھ کرنے سے قاصر ہیں کہ:

مولویوں کی شرارت سے ڈرتے ہیں۔یاد رکھو کہ اسلام کے سب بڑے ٹھیکیدار سعودیہ اور ایران اپنے ملک کے مدرسوں کو بے لگام نہیں چھوڑتے تو آخر ہمارے ملک میں یہ شتر بے مہار کیوں؟

# ان سفید ہاتھیوں کو فروخت کرو





یہ جو بڑے بڑے سفید ہاتھی گورنمنٹ نے پال رکھے ہیں۔ان کو توڑ کر کارپوریشنز میں تبدیل کیا جائے یا ان کو پرائیویٹ کیا جائے۔پی آئی اے، ریلوے، اسٹیل ملز، یوٹیلیٹی سٹورز، واپڈا وغیرہ جبکہ یہ ادارے خسارے میں ہر سال اربوں روپے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ان کی آمدہ رقم سے اس کے کارکنوں کو گولڈن شیک ہینڈ دے دیا جائے۔ ہمارے ملک میں کوئی حکومتی ادارہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔پرائیویٹ بزنسز ہر لحاظ سے کامیاب ہیں۔پرائیویٹ ٹرانسپورٹ ، بنکاری نظام ، شوگر ملز اور دیگر اداروں کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ان سفید ہاتھیوں نے مخصوص خاندانوں اور افراد کو سہارا دے رکھا ہے۔سیاسی طور پر ان اداروں میں بھرتیاں کر کے اربوں روپے کا نقصان دیدہ دانستہ طور پر کیا جاتا ہے۔حکومت کو چاہیئے کہ فوری طور پر اس طرف توجہ دے۔اور ان سفید ہاتھیوں سے ملک کو بچائے۔ہماری قوم میں حکومت کے اداروں کو بچانے کی کوئی روایت نہیں بلکہ ان کو کھانے کی عادت پڑ چکی ہے۔جب اس ادارے کے کارکن ہی اس کی خیر نہیں چاہتے تو حکومت کو انہیں فروخت کر دینا چاہیئے۔ورنہ یہ سفید ہاتھی ہمیں لے ڈوبیں گے۔

ایسے سب ادارے سالانہ خسارے میں جاتے ہیں ان کے بڑے بڑے افسران سب بڑی مچھلیاں ہیں۔ان کے ٹی اے ڈی اے کے بلز، سرکاری رہائشیں ، کاروں کی بہتات ، اور دیگر مراعات کی اگر گنتی کی جائے تو کروڑوں روپے سے بڑھ جاتی ہیں۔اور پھر حکومت ان خساروں کو پورا کرنے کے لئے مزید ٹیکس لگاتی ہے۔یا قرضہ لیا جاتا ہے۔اگر کوئی کاروبار کسی انسان کو مسلسل

خسارہ دے تو انسان اس سے جان چھڑا لیتا ہے۔مگر یہ حکومتیں مسلسل ان اداروں کو گلے سے لگائے ہوئے ہے اصل اس کی کیا وجہ ہے۔وجہ سیاسی ہے۔حکومتی لیڈروں کے مفادات وابستہ ہیں۔ان اداروں میں بلاوجہ بھرتیاں کر کے اور پرانے نکالے ہوئے کارکنوں کو پی پی نے بحال کر کے مزید خسارے کو بڑھایا ہے۔اور اربوں روپے سالانہ خسارہ دیا ہے۔آخر یہ کون سی مصلحت ہے۔ان سفید ہاتھیوں سے خدارا جان چھڑائیں۔آج تک ان اداروں میں کس قدر فراڈ اور کرپشن کے ڈرامے ہوئے ہیں۔کسی کے سر میں جوں تک نہیں رینگی۔کیسی غفلت اور کیسا ڈھیٹ پن ہے۔اگر کسی کا ذاتی نقصان ہو تو رات کو نیند نہیں آتی اور صبح ہوتے ہی اس سے جان چھڑانے کوشش کرتا ہے اور یہاں سب اُدھار کھا کر سوئے ہوئے ہیں۔اور ہر آنے والی حکومت ان خساروں کو ٹیکس لگا کر پورا کر رہی ہے۔اور ان اداروں کو سینے سے لگا رکھا ہے۔خدارا اسطرف بھی دھیان دیں ورنہ ان اداروں کے کارکن ہی ان اداروں کو کھوکھلا کر دیں گے۔اور آپ ان کا خسارا ہی پورا کرتے رہیں گے۔



## اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو

''میرا ہاتھ تھامو اور کہو کہ آؤ نماز پڑھتے ہیں، مجھے سمجھاؤ کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، مجھے قرآن مجید پکڑاؤ اور کہو کہ آؤ مل کر ہم اسے پڑھتے ہیں، مجھے نیند سے اٹھاؤ اور کہو کہ اپنی نماز مت قضا کرو، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں میری مدد کرو اور جنت کے بارے میں مجھ سے باتیں کرو، مجھے نصیحت کرو کہ میں آخرت کی تیاری کیسے کروں اور سب سے اہم یہ کہ......میرا نام اپنی دعا میں لیتے رہو چاہے دعا کے آخر میں ہی کیوں نہ ہو''۔مجھے جنت کی راہ پہ اپنے ساتھ لے کر چلو....!

*-*-*

# قوم کی حالت

ہم حاسد قوم ہیں۔ہم ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتے اور دوسرے کی عزت ہمیں ہضم نہیں ہوتی۔ ہماری نظر میں ہر کامیاب شخص بے ایمان، کرپٹ، اور یہودی ایجنٹ ہے۔ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جو دنیا میں برائیوں کی ایک بدترین مثال بن گیا ہے۔ ہر منفی عمل کو اپنا کر پھر بھی مسلمان ہیں اور سرکارِ دوعالمؐ کے نام کو بدنام کررہے ہیں۔ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں لوگ عبدالستار ایدھی کو بھی بے ایمان سمجھتے ہیں۔جس نے اپنی ساری زندگی انسانی فلاح پر خرچ کردی۔ہم نے ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی نہ بخشا، اور اُسے چند اَن پڑھ مُلاؤں کے کہنے پر یہودی ایجنٹ قرار دے دیا۔ ہماری نظر میں ڈاکٹر عبدالسلام اور ملالہ دونوں پکے یہودی ایجنٹ ہیں۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پھر ہم نے ڈاکٹر عبدالقدیر کو بھی اطاعت افرنگ میں ٹی وی پر مجرم بنا کر پیش کردیا۔قائداعظم کے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ اس کی بہن فاطمہ جناح کو الیکشن میں دھاندلی کرکے ہرادیا۔اس سے قبل بھی ہم نے تمام اسلامی اور قومی لیڈروں سے اُن پر کفر کے فتاویٰ لگا کر، اُن کے خلاف نفرتیں پھیلا کر ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔مثلاً قائداعظم ، علامہ اقبال، سرسید احمد خان وغیرہ وغیرہ، پھر ہم نے اپنے مشرقی پاکستان کے باسیوں سے وہ مواخات کے سلوک کا نمونہ دکھایا کہ الامان والحفیظ۔دوسری طرف طالبان کو شہید اور پاک فوج کو حرام موت کہنے والے، اور بچیوں پر کتے چھوڑنے والے، ونی کرنے ، اُن کی شادیاں قرآن سے کرنے والے، اُن کے منہ پر تیزاب پھینکنے والے، اُن کی اجتماعی آبروریزی کرنے والے، انصاف کے نام پر اُن کی شادیاں 80 سالہ بوڑھوں سے کرانے والے، سچے مومن ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالك۔ ملالہ یوسف زئی اور ڈاکٹر عبدالسلام، اسلام کے خلاف مغربی سازش ہیں ۔مگر دودھ میں کیمیکل ملانے والے، مرچوں میں لکڑی کا برادہ مکس کرنے والے، جعلی ادویہ بنانے والے، غلط اپریشن کرکے گردے چوری کرنے والے، بے بس لوگوں کو سڑک پر کچلنے والے، زہریلی شراب کے ذریعے پچاس پچاس لوگوں کو قتل

کرنے والے،مسجدوں، درسگاہوں، مدرسوں یتیم خانوں ،قبرستانوں کے فنڈز کھانے والے،عشر زکوٰۃ کھانے والے سفید پوش،رشوت لینے،ملکی خزانہ لوٹنے والے،حاجیوں کا زادِ راہ چرانے والے،خودکش حملے کے ذریعے نمازیوں کو مارنے والے،شناختی کارڈ دیکھ کر اور نام پڑھ کر گولی مارنے والے، بھتہ لینے،ٹارگٹ کلرز، اور زمینوں پر ناجائز قبضہ کرنے والے، گجرانوالے میں احمدیوں کو زندہ جلانے والے، جوزف کالونی ،شانتی نگر کے سانحات کے روحِ رواں،کوٹ رادھا کشن میں مسیحی جوڑے کو زندہ جلانے والے،قوم کا روپیہ چرا کر سرے محل اور رائے ونڈ محل بنانے والے، یہ بے علم جاہل ہر دوسرے مومن کو کافر قرار دینے والے، طالبان کے وارث،قوم کو پارہ پارہ کرنے والے،ازل سے پاکستان کی تعمیر کے دشمن فرقہ مولویاں،عین مسلمان اور پاکستانی ہیں۔ان بدکردار لوگوں نے ہمارے ملک کی شکل بگاڑ دی ہے۔کوئی نہیں بولتا،کوئی نہیں اس کو سنوارنے کا عہد لے کر اٹھتا۔کوئی نہیں جو غلط کو غلط کہے۔قرونِ اولیٰ کی جہالت ساری قوم میں اُمڈ آئی ہے۔اگر کسی سے پوچھا جائے تو ان سے کوئی اور بڑا عقلمند ہی نہیں۔(یہی جہالت کی نشانی ہوتی ہے )

مگر قوم کا درد کسی میں نہیں ۔نہ عدل ہے،نہ انصاف ہے،نہ صدق ہے جیسا کہ اب بھی ہم انگریز کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔نہ کوئی کسی کی مان رہا ہے اور نہ کسی کو منا رہا ہے۔وطن کو لوٹنے کی طرف سب کا دھیان ہے۔کبھی سعودیہ کی طرف سے حکم آتا ہے تو کبھی افرنگ کی طرف سے، ہم برخوردار کی طرح بسر وچشم تابع فرمان کھڑے ہیں ۔بیرون ملک کی بھی سب خاک چھان رہے ہیں۔سب نظاموں کا علم ہے مگر اپنے ملک میں کوئی اچھا نظام لانے کی ہماری نیت ہی نہیں ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر، تماش بین کی طرح خاموش ہیں۔اپنے ذاتی مفادات کو ہم ترجیح دیتے ہیں اور قومی مفادات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔غیر ممالک میں ہم اچھے شہری بھی ہیں اچھے کارکن بھی۔ایک کروڑ سے زائد لوگ پاکستانی بیرون ممالک میں اپنی روزی کے لئے سرگرم ہیں مگر کوئی بھی اپنے ملک کو ترجیح نہیں دے رہا۔ برسوں سے میرا ملک لٹ رہا ہے، پٹ رہا ہے، بدنام ہو رہا ہے۔کسی کو وطن کی غیرت نہیں آتی ۔ ہماری قوم بھیڑ کی مانند سر نیچے کئے ہوئے اپنے اپنے پیٹ

بھرنے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ہم وحشی اور دہشت گرد بن چکے ہیں، ہمارے اعمال یہودیوں سے بھی بدتر ہو چکے ہیں ہم جس اُمت سے، جس دین سے، منسوب ہیں اس کی کوئی اچھائی ہم میں نہیں۔ ہم آپس میں بھائی بھائی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ کتے کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں۔مگر پھر بھی ہم مسلمان ہیں۔ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے کہ ہماری پاکستانی قوم میں اس قدر قحط الرجالی کسی عذاب کا پیش خیمہ تو نہیں۔ کہیں خدا تعالیٰ ہماری حرکات سے ہم سے ناراض تو نہیں۔ غیر اسلامی قوتیں ترقی میں ہم سے بہت آگے ہیں اور ہم روز بروز تنزل کی طرف رواں ہیں۔ ہمارے کاموں سے برکت اٹھ گئی ہے۔ ہماری عبادتوں میں اثر نہیں، آخر کیا وجہ ہے۔ ہمارے اکابرین، اہلِ انصاف، اہل وعقل و دانش عرصہ دراز سے سقوط بغداد اور سقوطِ ڈھاکہ کی طرح محوِ نیند ہیں۔ ہمارے سب ادارے لٹ گئے۔ پی آئی اے، اسٹیل ملز، ریلوے، واپڈا، اور سب بڑے ادارے ہمارے بڑے بڑے مگرمچھ کھا کر ڈکار مار گئے۔ اور ہم عوام انگشت بدنداں ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ مجھے کیا؟ وہ تو بولتا نہیں۔اے میرے خدا اس قوم کو ایک اور قائد اعظم سے نواز۔ کیونکہ یہ قوم ابھی تک غلام ذہن کے ساتھ پستی کی اَتھاہ گہرائیوں میں گری پڑی ہی نام نہاد مذہبی عقائد کی زنجیروں میں بندھی جنت کی خواہاں ہے۔اے اللہ ہماری مدد کر آمین۔



## گولڈن الفاظ

1۔شرم کی کشش حُسن سے زیادہ ہوتی ہے۔2۔رونا دل کو روشن کرتا ہے۔۳۔ماں، باپ کی خدمت دونوں جہاں میں آزمانا ہے۔۴۔اولاد کے لئے جو چیز گھر لاؤ پہلے لڑکی کو دو پھر لڑکے کو۔۵۔دنیا میں سب خطرناک غصہ جوانی کا ہے۔٦۔کسی کا دل نہ دکھاؤ کیونکہ تم دل رکھتے ہو۔ ۷۔گفتگو چاندنی ہے اور خاموشی سونا۔8۔کسی سے ملتے وقت مسکرا دینا صدقہ ہے۔۹۔گناہ سے بچنا سب سے بڑی نیکی ہے۔۱۰۔ہمیشہ سچ بولو تا کہ قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

# کوٹ رادھا کشن کا واقعہ

اب وقت آ گیا ہے کہ حقیقت سامنے لائی جائے۔ چند اور مٹھی بھر لوگوں نے میرے مادر وطن کو اغوا کر لیا ہے۔ ہم اب تک ان واقعات کو بدنامیوں کے خوف سے چھپاتے رہے۔ اب چاہیئے سب مل کر اس خوفناک، ہیبتناک واقعہ کی مذمت کی جائے۔ جو کوٹ رادھا کشن میں ہوا ہے۔ کوٹ رادھا کشن کے گاؤں چک 59 میں شہزاد کا والد جادو ٹونے کا کام کرتا تھا۔ ایک ہفتہ قبل وہ فوت ہو گیا تو شہزاد کی بیوی شمع نے اپنے سسر کا ایک تھیلا اُٹھا کر شوہر کو دکھایا اور بتایا کہ اس میں جادو ٹونے کی کچھ کتب ہیں کیوں نہ اس تھیلے کو جلا دیں۔ چنانچہ اُن دونوں نے اس تھیلے کو نذر آتش کر دیا۔ اگلے دن ایک پھیری والے کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے دیکھا کہ جلے ہوئے اوراق میں کچھ قرآنی آیات ہیں۔ اس پر شور مچ گیا کہ شہزاد مسیح اور اس کی بیوی نے قرآن پاک کی توہین کی ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتے تھے۔ اور بھٹہ مالک کے دیئے گئے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے محلے کے ارباب اختیار کو لاکھ صفائیاں دیں کہ ہم تو اَن پڑھ ہیں ہم نے تو اس تھیلے کو جلایا تھا جس میں جادو ٹونے کا سامان تھا۔

مگر اس دوران مساجد سے اعلان ہونے لگے اور بپھرے ہوئے لوگوں کی تعداد جمع ہو گئی۔ بپھرے ہوئے افراد نے مکان کو نقب لگا کر ان دونوں کو باہر نکالا اور مار مار کر اَدھ مویا کر دیا۔ ابھی کچھ زندگی کی رمق باقی تھی کہ کسی ایمان والے نے آواز لگائی ''انہوں نے ہمارے قرآن کو جلایا ہے اس کی سزا یہی ہے کہ انہیں بھی اسی طرح آگ میں جلا دو''۔ چنانچہ جذبہ ایمانی سے سرشار افراد نے ان دونوں کو گھسیٹتے ہوئے بھٹے کی چمنی میں پھینک دیا۔ اور جیتے جاگتے انسان چند لمحوں میں راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ شمع کے پیٹ میں چند ماہ کا ایک بچہ بھی ماں کے ساتھ جل گیا۔ ہمارے ہاں اس قسم کے واقعات ہر روز کا معمول بنتے جا رہے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے اسی قسم کا ایک واقعہ گجرانوالہ میں بھی پیش آیا تھا جہاں تین احمدی جانوں کو جلا دیا گیا تھا۔ چند برس ہوئے یزمان میں ایک مسلک کے افراد نے ایک مسجد کے موذّن پر اس قسم کا الزام لگایا تھا۔ آناً فاناً لوگ جمع ہوئے۔

بلاتصدیق لوگوں نے اس حافظ قرآن کو بے رحمی سے پیٹنا شروع کر دیا ایک مقامی سکول کے ٹیچر نے چھڑانے کی کوشش کی۔تو دونوں کو مار مار کر شہید کر دیا۔

جس قرآن مجید کی حرمت پر ہم مر مٹتے ہیں اور اس قدر مشتعل ہو جاتے ہیں۔مگر اُسے پڑھنے کی جسارت نہیں کرتے۔ہم بد بخت ہیں جو اس آفاقی کتاب کو چومتے ہیں ،مشک وعنبر سے دھوئے ہوئے ،اطلس وکمخواب کے قیمتی غلاف میں لپیٹ کر رکھتے ہیں،تعویز بنا کر گلے میں پہنتے ہیں اور ان کو دھو دھو کر بھی پیتے ہیں۔اس آسمانی صحیفے کی اس طرح قدر کرتے ہیں کہ اس کی طرف پشت کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں لیکن ہم اس چشمہ ہدایت سے اپنی روحانی پیاس نہیں بجھاتے۔اور یہ جاننے کے لئے قطعاً یہ کوشش نہیں کرتے کہ اس میں ہمارے اللہ تعالیٰ نے کیا پیغام دیا ہے۔؟ کوٹ رادھا کشن کے عوام کو جن لوگوں نے انسانیت کی تذلیل کی ہے انہیں قرآن پڑھنے کی توفیق مل جاتی تو انہیں معلوم ہوتا کہ پروردگار نے ایک انسان کے قتل کو ساری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔

قرآن میں سزا اور جزا کا نظام بھی واضح ہے کہ اگر کوئی مجرم انکاری ہو تو گواہان کی گواہی کے بعد جج اُسے سزا دیتا ہے لیکن ہم ایسے صالحین ہیں کہ نہ روزے رکھنے کی توفیق ،نہ نماز کی فرصت اور نہ اپنے رب کے احکامات سے آشنائی ہے اور نہ حضرت محمد ﷺ کے فرمودات سے آگاہی۔اس دور میں جب ساری دنیا میں شعور بیدار ہو چکا ہے۔سروے کر کے دیکھ لیں میرے مادرِ وطن میں 25 فیصد پاکستانی ناظرہ قرآن نہیں جانتے۔کئی دیہات میں نماز باجماعت پڑھانے کے لئے امام جماعت دوسرے پہاڑی علاقوں سے لا کر رکھے جاتے ہیں۔کوئی پیش امام میسر نہیں ہوتا ،نومولود بچے کے کان میں اذان دینی ہو تو کسی مولوی کو ڈھونڈا جاتا ہے۔دم درود کے لئے کسی قرآن خوان بزرگ کی تلاش کی جاتی ہے لیکن باقی جن 75 فیصد لوگوں نے ناظرہ بھی پڑھ لیا ہے وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس چشمہ ہدایت میں کیا لکھا ہے۔اسی جہالت کا نتیجہ ہے ہم سوچے سمجھے طیش میں آجاتے ہیں اور ایسی گھناؤنی حرکات کر جاتے ہیں جو مسلمان تو درکنار کسی انسان کے شانِ شایان نہیں۔دیارِ وطن میں ایک آگ ہم نے حب الوطنی کے نام پر لگائی تھی جس میں اپنے ہی ہم وطنوں کو

غدار قرار دے کر ایسی بھٹی میں جلایا جاتا رہا۔اور دوسری آگ یہ مذہبی منافرت کی ہے۔جس کو ماضی میں ایک ہتھیار بنا کر کئی فرقوں کو جلایا گیا،احمدیوں کو،شیعوں کو،ہزارہ فرقے والوں کو۔

یہ مذہبی منافرت کی وہ ظالم آگ ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنے مخالف کو کافر کہہ کر بھسم کر سکتا ہے اگر یہ آگ آج بجھانے کی کوشش نہ کی گئی تو امکان ہے مستقبل قریب میں سارا ملک اس آگ میں جل سکتا ہے۔ یہ خونخوار، مُلانوں کا لبادے اوڑھے، یہ دین الٰہی کے ٹھیکیدار، نت نئی توجیحات گھڑنے والے، جنت بردار، ڈبہ پیر، لٹیرے، شراب میں دُھت ہوکر فتاویٰ دینے والے، سعودیہ کے نمک خوار، امریکہ کے وفادار، ڈیڑھ اینٹ کی مساجد تعمیر کرنے والے، ہر بڑے سیاسی یا مذہبی لیڈر کو کافر قرار دینے والے، طالبان کو شہید اور پاک فوج کے شہداء کو حرام موت کہنے والے، پاکستان کے ازلی دشمن، اپنے اُن آباءاَجداد کے مشن کو پورا کرنے والے مکفّرین اس ملک کو پارہ پارہ کر کے ہی دم لیں گے۔ان مندرجہ بالا طبقہ مکفرین نے اس ملک کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ان کی سرکوبی نہ کی گئی تو ساری قوم عنقریب پچھتائے گی۔سقوط بغداد، اورسقوطِ ڈھاکہ کا منظر پیش آنے والا ہے۔



## مومن کا عمل

کافروں کے مرنے والوں پر خوشی منانے والو! سونامی طوفان آنے پر خوشی منانے والو! دیکھ لو تمہارے پشاور کے بچے مرنے پر کافر بھی رو رہے ہیں۔...کتنے ہی کافر آنسو بہا کر روئے...سب نے مذمت کی (سوائے لال مسجد کے مولوی عبدالعزیز کے)...یہی انسانیت ہے...کبھی تم اپنا احتساب بھی کر لو مومنو...کافروں کے مرنے پر تمہارا ردّعمل کیا ہوتا ہے...؟؟؟ان علمائے سُو نے اس قوم کو نفرت کے سوا کچھ نہیں سکھایا...اے رحمۃ اللعٰلمین ﷺ کو ماننے کے دعویدارو! ذرا سوچو۔

# شک ہمارا نصب العین

شک کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ انسان پہنچے یا نہ پہنچے مگر اس کا شک سمندر کی آخری سطح سے لے کر فضا کی آخری اُونچائی تک پہنچ سکتا ہے۔ بس انسان کے من میں شک پڑنے کی بات ہے۔ وہ اس شک میں ساری انتہاؤں کو پار کرنے کی لگن میں لگ جاتا ہے۔ اب اسی طرح میں پچھلے چند سال سے شک میں پڑا ہوا ہوں کہ جیسے ہمارے ملک کے اکثر کالم نگار لکھ رہے ہیں۔ ایسے عامیانہ سے کالم تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ لازمی تو نہیں اس کے لئے صحافی بننا پڑے۔ بس اسی شک میں، مَیں نے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ اب جو قارئین مضمون پڑھتے ہیں، ان میں کافی لوگ میرے شک کو یقین میں بدلنے کی کوشش میں رہتے ہیں کہ تم لکھ سکتے ہو۔ اب اُن کرم فرماؤں کی طرف سے مجھ پر اگر نہ لکھوں تو طرفداری کا الزام لگتا ہے، لکھوں تو ملزم قرار پاتا ہوں۔ میں نے سوچا چلو ملزم ہی بنے رہتے ہیں۔ اس میں کبھی نہ کبھی تو شک کا فائدہ حاصل کر کے بری الذمہ ہو جاؤں گا۔ ملزم کے شک میں بری ہونے کے خاصے چانس ہوتے ہیں جو الزام کے لگنے میں نہیں ہوتے۔ اندھوں کی اندھیر نگری میں ایک اضافہ اور سہی۔ کمال یہ ہے کہ جہاں پر پڑھنے پڑھانے کے اندھیرے چھائے رہتے ہیں، وہاں پر لکھاری خاصی تعداد میں بنتے جا رہے ہیں۔ اسی کمال کی وجہ سے ہر بات شک پر ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا کے ہر کلچر کی حدیں ہوتی ہیں۔ یہ حدیں ملکی حدود کے اندر ہی رہتی ہیں۔ ملک چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو یا بہت بڑا، ہر ملک کا کلچر اس کی حدود میں رہتا ہے۔ مثلاً امریکہ کتنا بڑا ملک ہے، مگر اس سارے ملک کا کلچر ایک ہے، اسی طرح چین بھی ایک ہی کلچر رکھتا ہے۔ جرمنی یورپ کا بڑا ملک ہے، جونہی اس کا بارڈر ختم ہوتا ہے، ایک نیا کلچر نئے ملک کے ساتھ ملتا ہے۔ لکسمبرگ دنیا کا ایک انتہائی مختصر ملک ہے۔ اس ملک کا رقبہ تقریباً پچاس کلومیٹر ہے۔ آبادی صرف ساڑے پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ مگر اس کا اپنا کلچر ہے، اس پر جرمنی کی چھاپ ہے، نہ ہی فرانس کی۔ زبانیں دونوں بولی جاتی ہیں۔ تمہید کا مقصد یہ ہے، کلچر ہر ملک کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اگر نیا ملک وجود میں آتا تو اس کا کلچر بھی نیا ہی ہوگا، اس ملک کے رہنے والے جو بنیادیں بنائیں گے، اُسی پر کلچر بھی پنپے گا۔ لہٰذا ہمارے ملک کے کلچر کی عمارت کا سب سے بڑا استون جس نے عمارت کا (80) اسی فیصد سے زیادہ

ایریا گھیر رکھا ہے، وہ ستون ہے شک کا۔ شک میں بندوں کو مار دیا جاتا ہے۔ شک کا فائدہ دے کر مجرموں کو بری کر دیا جاتا ہے، باوجود ثبوت کے۔ نوے فیصد عدالتوں میں مقدموں کی وجہ شک ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے ملک کا سارا نظام ہی شک پر قائم ہے۔ اگر کسی پر یہ شک پڑ جائے کہ فلاں شخص نے اسلام اور رسالت کی توہین کی ہے تو پھر اُس کا بچنا ناممکن بنا دیا جاتا ہے، صفائی کا موقع فراہم کرنا بہت دور کی بات ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں شک کا مقام یقین سے آگے ہے۔ ہم لوگ اپنے من میں سب سے پہلے شک ہی کا سکہ جماتے ہیں۔ اس غلط فہمی میں بڑی بڑی قومیں طاقت کے شک اور غرور میں تباہ ہو گئیں ہیں۔ جن قوموں نے بڑی تیز رفتاری سے شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کو قابو میں کرنے کے لئے قانون کی حدود بنا لی ہیں، ہر بات کا مطلب نکالنے اور مذہبی رنگ دینے کی بیخ کنی کر دی ہے۔ وہ چند قومیں جنت بسانے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ جن قوموں نے شک کو اپنا دین بنالیا ہے۔ بات بات پر ہر چیز میں مذہبی ملاوٹ کرتی ہیں۔ وہ قومیں اسی شک میں ماری گئی ہیں اور ماری جا رہی ہیں کہ اللہ اُن کی مدد کرے گا۔ اللہ نے تو زمین پر بندے کو حاکمیت دی ہے۔ ہمارے ملک والوں نے اُس حاکمیت کے حقوق اللہ کو واپس کر دیئے ہیں۔ اپنی تباہی اللہ کا نام لے کر کرتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے اس زمین پر انسان کو کھلم کھلا مینڈیٹ دے کر بھیجا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے منشور میں صاف اور واضح کہا ہوا ہے۔ میں تمہارا حساب صرف یوم حساب کو ہی کروں گا۔ اس دنیا میں جو تباہی آئے گی وہ انسانی نالائقیوں کے سبب آئے گی۔ مگر میں بار بار وارننگ دیتا رہوں گا۔ اب ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ شاکی مردوں اور عورتوں کی فصلیں در فصلیں تیار کھڑی ہیں۔ اپنے ہر کام میں شاکی ہیں۔ اب تو خمیر بھی شک آلودہ ہو گیا ہے۔ ہماری سوسائٹی شک کی گریوٹی میں پھنس چکی ہے اور بلیک ہول کی طرف گامزن ہے۔ ہمارے تمام لیڈران سیاسی اور مذہبی بے رحم سازشی ذہن رکھتے ہیں، ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سب کی پالیسیاں اصل میں ایک جیسی ہیں وہ سب اپنے مخالفتوں کو غدار یا کافر دلوانے میں ذرا بھی نہیں چونکتے۔ اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی ان کی کڑکی کے نشانے پر آئے سہی۔ یہاں تک کہ قتل کے فتوے دلوانے کا عام رواج پڑ چکا ہے۔ اس پر عمل نہایت آسانی سے کیا جاتا ہے۔ حکومت والے اتنے بے بس اور لاچار ہیں کہ قتل کے مجرموں کو پھانسی

نہیں دے سکتے۔ کیونکہ قاتلوں کے سرغنوں سے ڈرتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ ایک دن شک کا فائدہ اُن کو ضرور ملے گا۔ ہمارے ہاں شک کا نظام بہت وسیع ہے۔

حامد میر کے کام کا دارومدار شک کی بنیاد پر تھا۔ وہ چٹخارے دار شک کا استعمال خوب کرتا تھا۔ لوگوں کو بلڈ پریشر اوپر نیچے شک کے ذریعہ کیا کرتا تھا۔ اسی لئے اس صاحب کا پروگرام بھی مقبول تھا۔ لوگوں کی خوراک چاہیئے تھی اور وہ بہم پہنچاتا تھا۔ اسی طرح پاکستان کا سب سے بڑا اخبار بھی شکوک کو استعمال کر کے پورے ملک پر چھا گیا۔ اس نے شک کی نیوز کا خوب پرچار کیا۔ اب وہ خود شک کے گھیرے میں آ چکا ہے۔ بے انتہا کی خود اعتمادی، خود غرضی اور خودسری کی آمیزش نے اس ادارے کو ایسے گڑھے میں دھکیل دیا ہے کہ اب اس کا وہاں سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ اس پر پابندی لگے یا نہ لگے۔ لوگوں کی نگاہوں میں یہ ادارہ قابل اعتماد نہیں رہا۔ لوگ اب اس کو ہمیشہ کے لئے شک کی نگاہ سے دیکھا کریں گے۔ ایک صحافتی ادارے کے لئے اس سے بُری خبر اور کیا ہو سکتی ہے کہ عوام میں اس کا اعتماد ختم ہو جائے حالانکہ اس کے پاس بہت مالی وسائل اور طاقت ہے۔ یہ اپنے ملک میں اکٹوپس کی طرح کام کرتا ہے۔ اب یہ اونٹ جیسا ادارہ شک کے پہاڑ کے نیچے آ چکا ہے (اگر ادارے کا مالک عقلمند ہو تو اس کو اپنے کچھ حصے خود ہی بند کر دینے چاہیئے۔ اپنی سزا خود تجویز کرنے میں کافی بچت ہو سکتی ہے) باقی رہا زخمی میر صاحب کا پہلے وہ لوگوں کے (مشرف وغیرہ) دیس نکالا پروگرام کیا کرتے تھے۔ اب وہ خود شک کے دائرے سے نکل کر یقین کرنے پر مجبور ہے، کہ یہ ملک اس پر تنگ ہو چکا ہے۔ مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ اگر اس ملک میں رہنا ہے تو پھر سرکاری ادارے کو راضی کرنا ہو گا۔ مگر پھر مسئلہ یہ ہے کہ اس کا صحافتی ادارہ شک میں پڑ جائے گا۔ مجھے انجام کچھ شیکسپئر کے (اوتھیلو) ڈرامے جیسا لگتا ہے۔ جس میں لڑکی کا باپ اس کے خاوند کے کان میں جاتے جاتے آہستہ سے یہ بات ڈال دیتا ہے۔ کہ یہ اگر باپ کی نہیں ہوئی تو تمہاری کیسے ہو سکتی ہے۔ بس پھر کیا ہوتا ہے، خاوند شک کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخر کار اپنی وفا شعار بیوی کو مار دیتا ہے، حالانکہ وہ محبت بھی اُسی سے کرتا تھا۔ شک بہت بُری بلا ہے۔ آج سے ڈیڑھ سو برس قبل ہمارے بزرگوں کے دماغوں میں یہ شک ڈال دیا گیا تھا کہ یہ دونوں قومیں اکٹھے نہیں رہ سکتیں۔ جب حاکم تھے تب ہزار سال سے زیادہ اکٹھے رہے۔ جونہی مسلمان ڈاؤن فال پر آئے تو ان کے دماغوں میں

شک کے بیج بو دیئے گئے۔

1947ء تک یہ پھل پک کر تیار ہو گیا۔ خطے کے مالکوں نے اپنی مرضی کا کاٹ کر، پاکستان نام کا پھل آدھے مسلمانوں کی گود میں گرا دیا۔ ان بیچارے سادہ لوح مسلمانوں نے سوچا چلو جو ملا ہے۔ اسے غنیمت جانیئے۔ یہ آخری موقع ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ آخری موقع ہوتا۔ کیونکہ انسان کے پاس آخری موقع کا اختیار ہے ہی نہیں ورنہ یہ دنیا کب کی اختتام پذیر ہو چکی ہوتی۔ ہم اب اس خطہ میں اُسی عمل کا نتیجہ پا رہے ہیں۔ جو 65 برس قبل اپنے آدھے بہن بھائیوں کو بے یارو مددگار اُدھر چھوڑ آئے تھے۔ اُن کی کہانیاں ہم نے کبھی سننے کی کوشش ہی نہیں کی وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتے اور رائے رکھتے ہیں۔ ہمیں اُن کے سچ سے ڈر لگتا ہے۔ اُدھورے ملک ایسے تو مکمل نہیں ہو سکتے جیسے ہم کرنا چاہ رہے ہیں۔ (دوسری جنگ عظیم میں ساری دنیا ایک طرف ہو گئی اور جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مگر جرمن قوم نے آخری موقع سمجھا نہ ہی بننے دیا۔ ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود مشرقی جرمنی کے عوام کو نہ چھوڑا۔ اُن کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔ مشرقی جرمنی کے لوگوں میں بداعتمادی کی ہلکی سی لہر بھی پیدا نہیں ہونے دی۔ 45 سال بعد اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں کو ساتھ ملا لیا پھر سے ایک ملک بنا دیا، باوجود دنیا کی سپر طاقتوں کی مخالفت کے) اور ہم تھے کہ اپنے بہن بھائیوں کا خیال کئے اور سوچے بغیر کہ پیچھے رہ جانے والے تو اور زیادہ اقلیت میں ہو جائیں گے۔ وہ تو اُدھر نسل در نسل غدار اور جاسوس کہلوائے جائیں گے۔ مگر نہیں بس اسی لالچ میں نئے ملک میں سب مسلمان ہوں گے سب پاک ہوں گی۔ غیر مسلم دیکھنے کو نہیں ملے گے، نہ ہی کوئی برتن پلید ہوگا، نہ ہی جگہ بار بار صاف کرنی پڑے گی۔ (جیسے اب ہم پاک سرزمین پر اقلیتوں کے ساتھ کر رہے ہیں) یہ ادھورا ملک ہر طرح کی مذہبی آزادی کے فارمولے کے تحت بنایا گیا تھا۔ مگر کیا ہوا، یہ سارا تجربہ ہی تباہ کن ثابت ہوا۔ جہاں پر ایک مسلمان دوسرے کا دشمن بن گیا۔ ہر فرقہ دوسرے کو کاٹنے مارنے کی راہ پر چل نکلا۔ ایک دوسرے کو کافر کافر کہنے کا بازار گرم کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کسی کو علم نہیں۔ بس سب اپنے آپ کو سچا ثابت کرتے ہیں اور بے گناہ بھی۔ الزام یہ لگاتے ہیں باہر کی سازشیں ہیں اور ہم معصوم ہیں۔ اپنے اندر شکوک کے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں کوئی قانون

نہیں کہ لوگوں کو شک کے گرداب سے باہر نکال سکے۔ اب تو ساری دنیا نے ہمارے اوپر پابندیاں لگانے کی ٹھان لی ہے۔ اب اگر کسی ملک سے باہر جاتا پڑے گا تو پولیو کے ٹیکے لگوانے اور سرٹیفکیٹ دکھلانے ہوں گے۔ عنقریب بیس کروڑ عوام کو پولیو کے وائرس کا شکار قرار دے دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ ملک کے وزیراعظم کو بھی پولیو کے ٹیکے لگوانا پڑیں گے۔ اگر یہی حالات رہے تو مجھے ڈر ہے باہر کی دنیا والے ہم سے ہاتھ بھی دستانے چڑھا کر ملائیں گے، منہ پر ماسک پہن کر بات کریں گے۔ ہم لوگوں کو شک تھا، پولیو کے قطروں کے بہانے ہمیں نامرد بنانے کی یہودی سازشیں ہیں۔ ہماری قوم کو ایک شک عظیم میں مبتلا تھی، ایٹمی طاقت بن کر ہم دنیا پر چھا جائیں گے۔ ہمارے سارے مسئلے یہ ایٹم بم حل کر دے گا۔ دنیا ہم سے ڈر کر رہے گی۔ خاص طور پر دشمن ہم سے خوف کھائے گا۔ ظاہری اور باطنی اندھیرے اس ایٹم کے ذریعے دور ہو جائیں گے۔ مگر کیا ہوا کیا دنیا واقعی ہم سے ڈر گئی ہے؟ کیا ہمارے اندھیرے اُجالوں میں تبدیل ہوئے ہیں؟؟ دنیا والے ہمارے ایٹم بم سے ڈرے اور نہ ہی ہماری شدت پسندی سے خوف کھایا۔ بلکہ اس کی وجہ سے اُلٹا ہمیں بھوکا اور مقروض در مقروض ہاں دنیا ہم سے اگر ڈرنے لگی ہے تو وہ اچھوت کی وبائی بیماریاں ہیں۔ جس کی پہلی قسط پولیو کے وائرس کی شکل میں ہوگی۔ نہ جانے اور کتنی ایسی بیماریاں ہمارے لئے پائپ لائن میں لگی ہوئی ہیں۔ ہمارے اندر نہ ختم ہوانے والی ہر قسم کی جنگیں بھڑک چکی ہیں۔ ہم نے خود ہی ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں کے گہرے اور گھنے جنگل کھڑے کر دیئے ہیں۔ جہاں پر ہر قسم کی بیماریوں کے علاوہ اور کچھ نہیں مل سکے گا۔ خدانخواستہ اب میرا شک یقین میں بدل رہا ہے کہ دنیا والے ہمیں ہمارے نام نہاد اسلامی قلعہ میں محصور کر دیں گے۔

یہ انجام نہیں ابھی شروعات ہیں۔ یہ ہمیں معلوم ہونا چاہیئے قلعے بنانے والے ہمیشہ اپنے قلعوں میں محصور رہتے آئے ہیں۔ آخر کار پھر اندر سے ہی لوگ قلعے کو کمزور کرنے لگتے ہیں۔ جو بعد میں ریت کے ڈھیر کی طرح بکھر جاتا ہے۔ تاریخ ایسے انجاموں سے بھری پڑی ہے۔ پھر کھنڈرات کے دریچوں میں ایسی آوازیں بازگشت کرتی ہیں۔ اس دشت میں اِک شہر تھا وہ کیا ہوا آوارگی!!



# آپ کے ضمیر سے ایک اہم سوال

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں ایک لٹیرا خود وزیرِ اعظم اور اُس کا بھائی چیف منسٹر، اُس کی بیٹی سواارب روپے کی اسکیم کی مالک، بھتیجا ڈپٹی چیف منسٹر، سمدھی وزیر خزانہ، بیوی کا بھانجا بجلی کا وزیر، سادہ لوگ پھر بھی اسے جمہوریت کہتے ہوں۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں پورے ملک کے بجٹ کا 70 فیصد ایک صوبے کے ایک شہر پر لگایا جاتا ہو، خواتین کی خصوصی نشستوں میں سے 60 فیصد ایک ہی شہر کی خواتین کو دے دی جائیں، بیس سال ایک صوبے پر حکومت کرتے ہو جائے اور پھر بھی اسی صوبے میں ایک ہی بارش سے نظامِ زندگی معطل ہو کر رہ جائے، اور پھر بھی اُسے ترقی کہا جائے۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جس کے حکمران جیسے ہی حکومت میں آتے ہیں، اُس ملک کے اَثاثے کم اور حکمران ٹولے کے اَثاثے بڑھنے لگ جائیں۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے جس میں بیرونی دوروں پر چھبیس اَرب روپے خرچ کر دیئے جائیں۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے جس کا حکمران جب باہر دورے پر جاتا ہے تو اپنے قریبی عزیزوں کو ضرور لے جاتا ہے۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں عوام کے ٹیکس کی رقم سے دس اَرب روپے کے ایڈز دیئے جاتے ہیں، پھر بھی وہاں کے حکمران کہتے ہیں کہ ہم نے کبھی کرپشن نہیں کی۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں اگر صدر کا ہیلی کاپٹر لینڈ کرنا ہو تو کسان کے گندم کے کھیت جلا دیئے جاتے ہیں۔ ☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں وزیر اعظم ہاؤس کے ایک دن کا خرچ چونتیس لاکھ روپے ہو، ☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں سیکیورٹی کے نام پر 25 لاکھ کے کتے خرید لیئے جائیں اور پھر اُسے سادگی کہا جائے۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے جہاں عوام دیکھ رہے ہوں کہ ایک باپ نے اپنی جگہ لینے کو اپنی

بیٹی، ایک باپ نے اپنا بیٹا، تیار کر رکھا ہو کہ ہمارے بعد یہ ہماری پارٹیوں کے سربراہ ہونگے اور پھر بھی عوام نسل در نسل اس غلامی کو بخوشی تیار ہوں۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں جتنا بڑا لٹیرا، فحاش، بدمعاش یا ایم پی اے یا ایم این اے ہو، یا جعلی ڈگری بردار، ڈنڈا بردار ہو، عدلیہ اور پولیس پر اثر انداز ہونے والا کوئی گلو بٹ ہو، بجلی چور ہو اُسے عظیم الشان عزت سے نوازا جاتا ہو۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں لاہور کی جوزف کالونی کے کھنڈرات مسلمانوں کی وحشیانہ بربریت کی داستان سنا رہے ہوں۔ غرباء کی ساری عمر کی کل پونجی جلا کر راکھ کر دی گئی ہو اور مجرم ابھی تک گرفتار نہ ہوئے ہوں۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں ایک منصوبے کے ساتھ عام انسانوں کو گمراہ کر کے، عوام کے جلوس کی آڑ میں توہین رسالت کی آڑ میں، ذاتی عناد کی خاطر گجرانوالے میں احمدیوں کو، کوٹ رادھا کشن میں دو مسیحی میاں بیوی کو، زندہ جلا دیا گیا ہو، شانتی نگر، پشاور چرچ اور گوجرہ کے مسیحوں سے انتقام لیا گیا ہو، اور کوئی مجرم گرفتار نہ کیا گیا ہو۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں علماءِ سُو کا بول بالا ہو، چرچز، معابد، مساجد پر بم مارنا کارِ ثواب سمجھا جاتا ہو۔ شیعہ اور ہزارہ کمیونٹی کے افراد کو بسوں سے اُتار کر شناختی کارڈ دیکھ کر تہ تیغ کر دیا جاتا ہو اور ملزمان دندناتے حکومت کا منہ چڑاتے پھرتے ہوں۔ جج اُن کے خلاف فیصلے کرنے سے کتراتے ہوں اور ایسے قاتلوں کے گلے میں پھانسی کے پھندے کی بجائے پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہوں۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں علمائے سُو بڑے دھڑلے سے اُسامہ بن لادن کو شہید اور پاک فوج کے نوجوانوں کی شہادت کو لیکن موت قرار دیں، مساجد کی تعمیر ہو یا مدرسوں کی، یا حج سکینڈل میں کرپشن کرنے کا قصہ ہو۔ اور حکومے بے ضمیری سے خاموش اپنی جیبیں بھرنے میں شب و روز مصروف ہو، عدلیہ اور انتظامیہ غرباء پر ظلم اور اُمراء کے خوف سے اُن کی مرضی کے فیصلے سنائے۔ وزیر اعظم، اور وزرائے اعلیٰ اپنا مکّا اٹھا کر کے تقریریاں کریں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جہاں عوام کی ایک نہ سُنی جائے۔ قادری اور عمران خان تین ماہ سے بھلے سچ ہی پیٹ رہے ہوں۔ ڈھٹائی اور بے ضمیری سے لوگوں کے حقوق نہ دیئے جائیں۔ ماڈل ٹاؤن کے قاتلوں کو گرفتار تک نہ کیا جائیے بلکہ اسمبلی ہال پر حملے کے بہانے مزید لاشیں گرا کر اس کی بھی کوئی تحقیق نہ کی جائے۔

☆ بتائیں وہ کون سا ملک ہے؟ جس میں اکثر وزراء کو نماز تک پڑھنی نہ آتی ہو بلکہ وزیر داخلہ کو تلاوت کرنے کو کہا جائے تو قُل ھو اللہ تک بھول جائے، اس کے علاوہ جمشید دستی کے بقول سب وزراء کے کمروں کے باہر ولایتی شراب کی بوتلیں روزانہ خالی پڑی ملتی ہوں۔ اور اکثر وزراء جعلی ڈگری بردار ہوں، اور اکثر پر زنا بالجبر، کرپشن، اقربا پروری، اور انسانی حقوق کی پامالی کے الزامات ہوں اور نیب کے پرچے ہوئے ہوئے ہوں، اور وی آئی کلچر کے دلدادہ یہ عوام کے مینڈنٹ سے آئے ہوئے لوگ عوام پر ظلم روا رکھے ہوئے ہیں، جنہوں نے سازش سے، بے ایمانی، سے، الیکشن کمیشن کی جانبداری سے عوام کا مینڈنٹ چوری کیا ہو، عوام کو صحت و تعلیم کی بجائے اپنے کمیشن کی خاطر جنگلہ بس دی ہو، جو مساجد میں احمدیوں کو خود مروائیں، طالبان کے سرپرست خود ہوں، خونی کے قائل، ملاوٹ کے دلدادہ، جعلی اَدویہ بنانے کے قائل، اخلاق باختہ، بے ایمان، راشی ومرتشی، چور، ڈاکو، لٹیرے، بجلی چور، ہر قسم کے جرائم میں یہ ملوّث نام نہاد مسلمان، لاقانونیت کے متوالے، ایمان فروش، حتیٰ کہ ضمیر فروش یہ حکمران تختہ دار پر لٹکانے کے قابل ہیں۔ یہ کسی ایک جماعت کے خلاف بات نہیں کر رہا بلکہ یہ پڑھ کر سوچ کسی ایک جماعت کی طرف جاتی ہے، تو سمجھ جائیں کہ یہ باتیں سچ ہیں، کیونکہ میں نے کسی جماعت کا نام نہیں لیا، پھر بھی یہ نشانیاں آپ کی سوچ کو وہاں تک لے جائیں گی جہاں تک آپ کو جانا چاہیئے۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں''۔ ایسے اعلیٰ اخلاق واعمال کی اقوام اگر مسلمان کہلانے کی حقدار ہیں تو خدائے قہار و جبار کے اُن عذابوں کے منتظر رہیئے جو وہ ایسے اعمال والی اقوام کو ازل سے دیتا چلا آیا ہے اور یہ اُس کی سنت ہے۔



# ذرا سوچئے!!

اس سے بڑی اور کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ اپنے معاشرے کا قتل ہم خود ہی کر رہے ہیں۔کبھی وہ وقت تھا جب رشوت کا نام سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ دنیا کی سب بڑی برائی رشوت ستانی سمجھی جاتی تھی۔ جو کوئی رشوت لیتا تھا لوگ کھلے عام اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ اس شخص سے کام کرانا پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے رشوت خور کا ہمارے ہاں رتبہ تبدیل ہوتا گیا، آہستہ آہستہ لوگوں کو اس میں خوبیاں نظر آنے لگیں۔ اس شاطر راشی نے آس پاس کے لوگوں میں نیاز بانٹنا شروع کر دی۔ اسی طرح وہ محلے میں مقبول اور عزت دار ہوتا گیا۔ پھر اس نے مساجد میں روزے کھلوانے بھی شروع کر دیئے۔ اسی طرح غیر ضروری فلاحی کاموں سے مقبولیت حاصل کرتا گیا۔ حتیٰ کہ سادہ لوح انسانوں کی نسلوں کا وہ رول ماڈل اور ہیرو بن گیا۔ یہ تھی وہ ابتدا، جہاں پر ایسے نوسر باز ہمارے شہروں اور گاؤں کی گلی کوچوں کے رول ماڈل بنتے گئے۔ کیونکہ قانون میں ایسے بہروپیوں پر کوئی پابندی نہیں، نہ ہی اب لگائی جاسکتی ہے۔ اسی لئے وہی لوگ حاجی بھی کہلاتے ہیں۔ میاں صاحب بھی، سائیں بھی، چوہدری بھی، مولانا بھی، غرضیکہ انہوں نے دنیا کا ہر عزت والا نام اپنے نام کا حصہ بنالیا ہوا ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی آغوش میں لیا ہوا ہے۔ اب پورا نیٹ ورک بن چکا ہے۔ محلے کے نمبردار سے لے کر وزیراعظم تک ان لوگوں کی رسائی ہوتی ہے۔ غریب جاہل عوام ان کے نرغے میں ایسے جکڑ چکے ہیں جیسے چوہا کڑکی میں پھنس جاتا ہے اور اس کا انجام بالآخر موت ہی ہوتی ہے۔ جو بچ نکلتے ہیں وہ باقی زندگی جسم کے کسی نہ کسی حصہ سے معذور ہی رہتے ہیں۔ اب تو یہاں یہ عالم ہے، رشوت کوئی برائی تصور ہی نہیں ہوتی۔ یہ ایک شریفانہ کام کے زمرے میں آتی ہے۔ رشوت نہ لینے اور نہ دینے والا کملا اور سودائی کہلاتا ہے۔ ساری عمر عدالتوں کی سڑکوں پر خاک چھانتا پھرتا ہے۔ اس کی عاقبت تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کلچر کا انکاری ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بیس کروڑ عوام میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اسی لئے ہماری حکومت بھی میجارٹی کا خیال رکھتے ہوئے ایسے کاموں کو پرموٹ کرتی ہے جہاں پر رشوت کے نظام کو

مضبوطی ملے۔اسی طرز پر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ہم اب ایک نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔سن اسی (80) کی دہائی سے ہم نے قتل کرنے کی راہ اپنائی تھی، مذہب کے نام پر ٹریننگ کیمپ کھولے ان کے تجربات کے لئے قتل گاہ افغانستان کو بنایا گیا۔پھر وہاں سے ایسے ایسے خطرناک جنگجو پیدا کر دیئے کہ ان سے پیچھا چھڑوانا ناممکن ہو گیا ہے۔وہ جنگجو اب اپنے ملک کو ہی کاٹنے میں لگے ہیں۔یہ بات سن کر حیران ہوں گے کہ میرے آبائی شہر میں پہلا قتل 1973ء میں ہوا تھا۔اُس مقتول کی لاش کو دیکھنے کے لئے ایسے لگتا تھا جیسے پورا شہر اُمڈ آیا ہے۔میں اس جم غفیر کو دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔مقتول ایک عام غریب انسان تھا۔اس شہر کے لوگوں کو اس قتل پر بڑا جھٹکا لگا تھا، میں نے وہاں لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ اس شہر میں قتل کی یہ پہلی واردات ہے جو ایک خالصتاً گھریلو لڑائی میں قتل ہوا تھا۔میں اب اگر اپنے آبائی شہر میں قتال کا حساب کرنے بیٹھوں تو مجھے ڈر ہے کہ وہاں کے مقتولوں کی تعداد کہیں سینکڑوں کو کراس نہ کر جائے۔اتنا اندازہ ضرور ہے وہاں کے شہر خاموشاں لاشوں سے بھرے پڑے ہیں۔یہی حال ہر شہر کا ہو چکا ہے۔ستر کی دہائی میں خاکسار کراچی میں رہا تھا۔اس وقت وہاں کے لوگوں میں قاتلوں کے خوف کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔جس جگہ پر حامد میر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔وہاں سے ایک کلومیٹر کی دوری پر ہمارا گھر تھا۔یہ علاقہ امن کا ایک گہوارہ ہوا کرتا تھا۔

دن رات ہمارا وہاں سے گزر ہوتا تھا۔تقریباً ہر روز ناتھا خان پُل اور ڈرگ روڈ (شاہراہ فیصل) پر رات کو چہل قدمی کرتے تھے۔انسانی درندگی اور موت کے رقص کا کبھی گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔حامد میر پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر بہت افسوس اور دکھ ہوا۔مجھے ایسا لگا جیسے اس علاقے کی نہیں بلکہ میری ذاتی بدنامی ہوئی ہو۔میرے دل میں ایک شدید خواہش اور تڑپ اُٹھی کہ کاش میں ڈرگ روڈ (ناتھا خان پل) پر جاؤں۔نہ جانے مجھے کراچی شہر سے اتنی اُلفت اور لگاؤ کیوں ہے؟؟ شاید جنم بھومی کے ہونے کا کوئی طلسماتی چکر ہو؟ اس دفعہ دل کی یہ خواہش وہاں کے قاتلوں سے ملنے کی تھی۔اُن سے صرف اتنا کہوں اور پوچھوں کہ آپ کے آباؤ اجداد تو ایسے نہ تھے۔وہ تو ایک چڑیا کو بھی مارنے کے روادار نہ تھے۔اُن کے پاؤں سے تو چیونٹیاں بھی محفوظ رہتیں تھیں۔یہ آخر آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔آپ لوگوں کی مت کیوں ماری گئی ہے۔سازشی لوگوں کے بہکاوے میں آ کر

آپ لوگ کیوں اپنے ہم وطنوں کا خون بہا رہے ہو۔اس ملک میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ آپ میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ڈرگ روڈ، ڈرگ کالونی، سٹار گیٹ بلکہ سارا کراچی ہی حسین اور بااخلاق لوگوں کا مسکن تھا۔آخر اُن لوگوں سے کیا خطا ہوگئی، اُن کا کیا قصور تھا کہ ان کی اگلی نسلوں نے خون کی ہولی کھیلنا شروع کر دی ہے۔ نہ جانے کراچی پر لگے خون کے دھبے کب دُھلیں گے یا اور زیادہ گہرے ہوتے جائیں گے۔ ویسے تو حامد میر کا میں کبھی مداح نہیں رہا۔اس کا ٹی وی شو اور کالم مجھے کبھی نہیں اپیل کرتے۔اس کی اپروچ اور سوچ ہمیشہ سطحی رہتی ہے۔سستی شہرت سے ہی اس نے خوب شہرت پائی ہے۔ وہ ایک چھوٹی سوچ کا مالک ہے مذہبی تعصب سے اٹا شخص ہے۔

میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ حامد میر نے اپنی بے وقوفیوں سے اپنے لئے خود مشکلات پیدا کی ہیں۔ انجانے میں وہ اپنی زندگی مختصر کرنے کی راہ پر گامزن تھا۔ اگر کسی حکومتی ادارے سے اس کو جان کا خطرہ تھا تو پھر اس کو اتنا شور مچانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا فائدہ اس ادارے کے ملکی اور غیر ملکی دشمن اٹھا سکتے ہیں۔ جان کسی کی جائے فائدہ انجان لوگ اٹھا جائیں یہ تو کوئی عقلمندی نہ ہوئی (پنجابی محاورہ کچھ یوں ہے۔ مونڈھا کسی ہوردا ہووے، تے بندوق میری ہووے، فیر چلان دا مزا ای کچھ ہور ہونداا ے) ترجمہ کچھ یوں ہے کہ: کندھا کسی اور کا ہو اور بندوق میری ہو، پھر اس کے چلانے کا مزہ ہی کچھ اور آتا ہے۔ حامد میر کی اس سے بڑی اور کیا حماقت ہوسکتی تھی۔ خون بھی بہا دیا، جان بھی بچ گئی، شہرت کو بدنامی میں بدل دیا گیا۔

حامد میر کی اپنی کمپنی جہاں پر وہ ملازم تھے، ایک مافیہ طرز کی سوچ رکھتی ہے۔ وہ تو صحافت کے نام پر ایک کاروبار ہے۔ ایک انسان جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا تیار کھڑا ہے۔ فرض کریں خدانخواستہ آج حامد میر اگر نہ ہوتا تو اس کی جگہ عامر میر لے لیتا اپنے پیش رو سے بڑھ کر کرتب دکھاتا۔ وہ بھی اور کمپنی بھی اس کے نام کو تا عمر کیش کرتی۔ کمپنی کو کیا فرق پڑ سکتا ہے کہ کوئی آوے یا جاوے۔ کہتے ہیں نا، ہاتھی اگر زندہ ہو تو لاکھ کا، مرا ہوا ہو تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ بیچارہ حامد میر ان باریکیوں کو سمجھنے سے ہمیشہ ہی قاصر رہا ہے۔ حالانکہ وہ ایک بہت بڑے لکھاری اور دانشور کا بیٹا ہے۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ خدا نے یہ کوئی شرط نہیں رکھی کہ باپ اگر بڑا انسان ہو تو بیٹا بھی ویسا ہی ہوگا۔ یہ جدی پشتی کا

کھیل صرف انسانوں نے ہی بنا رکھا ہے۔ اپنے ہمزادوں کو رعب میں رکھنے کے لئے۔ حامد میر جس ادارے سے منسلک تھا وہ اپنے فائدہ کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ایک مشہور کہاوت کچھ یوں ہے کہ کوئلے کی کان کے مالک کو اس کا منیجر کہتا ہے کہ سر! اگر کان سے مزید کوئلہ نکالیں گے تو کان میں پانی بھر جائے گا اور مزدور ڈوب جائیں گے۔ کان کا مالک پوچھتا ہے۔ کتنے مزدور کان میں کام کر رہے ہیں۔ منیجر جواب دیتا ہے کہ سر! چارسو۔ کان کا مالک دوسرا سوال پوچھتا ہے کہ کوئلہ کتنے کا اور نکل سکتا ہے۔ منیجر کہتا ہے کہ سر! جانی رسک کے ساتھ چار کروڑ کا۔ مالک منیجر کو ایک زناٹے دار پورے زور سے تھپڑ رسید کرتا ہے اور ساتھ کہتا ہے کہ کس نالائق کو منیجر بنا دیا ہے جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ چارسو سے چار کروڑ کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے حامد میر کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یہ معمہ ہمیشہ اُس کے ذہن میں اٹکا رہتا تھا۔ آخر کیوں اس کی کمپنی کے مالکان اس کو ہمیشہ کراچی بات بات پر طلب کرتے تھے۔ وہ یہ سوال بار بار اپنے کولیگ سے پوچھتا تھا اور بڑے اصرار سے کہتا تھا کہ یار کراچی میں اس کی زندگی کو نو گنا زیادہ خطرات ہیں۔ اس کے دشمن اس شہر میں بہت زیادہ ہیں۔ میرے ادارے والے آخر کیوں بار بار یہاں بلاتے ہیں۔ وہ خود تو اتنا زیرک اور دوراندیش نہیں تھا کہ یہ سمجھ سکتا۔ وہ تو اپنی زندگی ہمیشہ سے جذبات کے سہارے گزارنے کا قائل تھا۔ اپنے جذبات کو کیش کرنے کے بھوت پر سوار رہتا تھا۔ اس کی اس کمزوری کا فائدہ اس کی کمپنی والے اٹھاتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے حملے کے آدھ گھنٹے کے ندر ہی فوج کے ادارے آئی ایس آئی پر الزام ہی نہیں بلکہ اس کے سربراہ کو مجرم بھی ثابت کر دیا تھا۔ آٹھ دس گھنٹے اس کی تصویر کو اپنے نیٹ ورک اور ٹی وی پر خوب گھمایا، پھر حملے کے دس گھنٹے بعد اس کمپنی کے ہوش اڑنے شروع ہو گئے تھے۔

بعد میں سوری سوری کہہ کر غلطی کا اعتراف کرنے کو جرأت مندی کا تمغہ بھی خود کو دینے لگے۔ حالانکہ یہ سارا کھیل غلطی نہیں تھا۔ یہ ایک پرفیکٹ فول پروف پلان تھا۔ اس میں کوئی خامی نہیں تھی۔ فوج کو اور اس کے ادارے کو بدنام اور تباہ کرنے کی بہترین سازش رچائی گئی تھی۔ آئی ایس آئی کے سربراہ کو مجرم گردانئے میں کوئی غلطی نہ تھی۔ حامد میر زندہ لاکھ کا تو مرا ہوا سوا لاکھ کا نہیں اربوں کا ضرور ثابت ہونا تھا۔ کیونکہ یہ صرف اس کے ادارے کو پتہ تھا۔ چھ گولیاں اس کے جسم میں اتر چکی

ہیں۔ پہلے دن دنیا کو صرف تین گولیوں کا بتایا گیا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کا جسم تھا کہ علاقہ غیر تھا جہاں پر ڈاکٹروں کو تین گولیاں دوسرے دن ملیں؟۔ ذرا سوچیے!!!! وہ تو موت ہی اتنی بزدل نکلی جو چھ گولیوں کے باوجود اس کی روح قبض نہ کرسکی۔ موت نے تو کراچی کے قاتلوں کی بے عزتی کر دی۔ اُن کے قاتلانہ ریٹ بھی اس وجہ گراوٹ میں آ گئے۔ اب ان کے پھنسنے کے چانس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ آپ لوگ پھر ذرا غور سے سوچیں کہ اگر خدانخواستہ حامد میر پر موت غالب آ جاتی تو کیا ہوتا۔ کیا اکیلا حامد میر لاکھوں کی فوج پر بھاری پڑتا۔ فون اور اس کے خفیہ ادارے کی میڈیا پر ساری دنیا میں اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی۔ ملکی اداروں کی دھجیاں اُڑا دی جاتیں۔ کسی کو معلوم ہی نہیں ہونے دینا تھا اصل حقائق کیا تھے۔ (بمبئی والے قصاب کی طرح جس میں بھی جیو کے کمالات تھے) اگر ہمت کی جائے تو بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔ حیرانگی کی بات ہے۔ ڈرائیور کمپنی کا گارڈ کمپنی کا، جگہ کا انتخاب بھی کمپنی کا۔ نہ ڈرائیور زخمی، نہ گارڈ زخمی، نہ جانے کتنی گولیاں چلائی ہوں گی جن میں چھ گولیاں وہ بھی حامد میر کے جسم میں لگیں۔ اتنے ماہر نشانہ باز تو پھر اپنے ہی سدھائے ہو سکتے ہیں۔ ان سارے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آئی ایس آئی کو کیسے مجرم قرار دیا جا سکتا ہے؟؟

آخر میں حامد میر کو اتنا ہی کہوں گا، خدا کی بخشی ہوئی زندگی کو غنیمت جانیں۔ باریک بینی صحافت کا اصل جزو ہوتی اگر ہو سکے تو اس کو استعمال میں لائیں۔ اسی لئے ہمارے ہاں اکثر خبر لانے والے خود خبر بن جاتے ہیں۔ آج کل کی دنیا میں خبر لانا کوئی معرکہ نہیں۔ کیونکہ خبر دینے والے مسالے دار خبروں سے اکثر ٹریپ کر لیتے ہیں۔ اصل کام خبر ہضم کرنے کا ہوتا ہے، ورنہ بدہضمی ہو جاتی ہے۔ حامد میر اس بیماری کا دائمی مریض تھا۔ اب دوسرا جنم مبارک ہو۔ اُمید ہے اس بار اپنے اور پرائے کی پہچان ہوگی۔ اپنی کمپنی سے یہ کہہ کر اپنی جان بخشی کروالیں تم قتل کرو ہو کے کرامات کرے ہو۔ یہ فری مشورہ آپ کے والد محترم کی وجہ سے ہے۔ جہاں تک میں نے انہیں پڑھا ہے وہ ایک اعلیٰ عمدہ انسان تھے۔ (ماخوذ)



# پاکستانی عدلیہ



جب سے دنیا قائم ہوئی ہے، عدل اور ظلم کا چولی دامن کا ساتھ چلا آ رہا ہے، ہامان، فرعون، شداد، آذر، ہلاکو خان، چنگیز خان، یزید اور ضیاء الحق اور ان کے علاوہ بہت سے ظالموں کا نام تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے۔ جن کے مظالم کا بدلہ خدا تعالیٰ نے ہی لیا مگر عوام کچھ نہ کر سکی۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ نے عدل کی تاریخ کو بھی محفوظ رکھا ہے۔ مثلاً نوشیروانِ عادل، عدل فاروقی، عدلِ جہانگیری، وغیرہ وغیرہ۔ مگر بندہ آج عدلِ پاکستان پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہمارے خطے کی تاریخ بیرونی حملہ آوروں کی بھر مار سے مظالم کا شکار رہی ہے۔ مظالم سے خوفزدہ یہ قوم درباری اور خوشامدی اذہان کی مالک ہے۔ جس کا اثر اب تک ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد وہ فتنہ پرداز طبقہ مولویاں جو مخالف پاکستان تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کر کے، الاٹمنٹ کلچر کو اپنایا، بیوروکریسی کی پوسٹوں کو چھینا، اور خاص مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہو گئی۔ مسلم لیگ (اصل) سے اُسکے اندر کے تصادم کی بنا پر اس دشمن طبقے کی نشاندہی نہ ہو سکی۔ پاک فوج نے (ملک کے دولخت ہونے کے بعد) ایک خطے کو تو اب تک متحد رکھنے کی مناسب کوشش کی ہے۔ مگر جمہوریت کے نام پر غلط اذہان معاشرے کے اندر مدغم ہو چکے ہیں۔

اسلامی عدلیہ تو کیا اسلامی اقدار کو اب خطرہ لاحق ہے۔ رنگ برنگے اسلام متعارف ہو رہے ہیں۔ ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر عربوں سے امداد حاصل کر کے اپنی اہمیت اور قوت دکھانے کے چکر میں ہے۔ دولت کے پجاری صرف عدل ہی کو نہیں اپنی معاشرتی، معاشی، اسلامی اقدار کی صف لپیٹنے کے چکر میں ہیں۔ اس چاندی کی دوڑ میں عدلیہ بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ مگر ساری عدلیہ نہیں چند بدقماش ججز نے خوب دولت سے ہاتھ رنگ کر عدلیہ کا منہ کالا کر دیا ہے۔ بعض ججز سے زیادہ امیر اُن کے ریڈر زحضرات ہیں۔ بعض ججز سے زیادہ امیر اُن کے رشتہ دار، دلال، چپڑاسی، سالے، کزن، بھائی، ہم زلف، منیجرز، ہیں۔ کیونکہ وہ بعض مقدمات میں سفارش کر کے کافی دولت

کماتے ہیں۔اور ججز کو مناسب حصہ بھی نہیں ملتا۔بعض مقدمات چالیس چالیس سال سے صرف STAY ORDERS پر پڑے ہیں۔جن کا میں بھی عینی شاہد ہوں۔ایسی سینکڑوں مثالیں آپ کو مل جائیں گی ان سٹے آرڈرز کے پیچھے مفادات کی ایک منصوبہ بندی کارفرما ہوتی ہے۔اوران مفادات کی قیمت کا کچھ حصہ جناب جج صاحبان کو مک مکا کے بعد ماہانہ دیا جاتا ہے۔ان کی طوالت زیادسود مند ہوتی ہے۔ججز کی آمدنی کا ذریعہ ایک تو یہ اسٹے آرڈرز ہوتے ہیں دوسرے ان کے فیصلہ جات کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔پہلے ایف آئی آر کے لئے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں پھر تفتیشی عمل سے گزرتے ہوئے لاکھوں روپیہ دے کر مقدمے کو عدالت تک لے جایا جاتا ہے۔کمزور مدعی تو یہاں تک ہی کنگال ہو جاتا ہے۔مگر ضدی اور امیر مدعی کو جب عدلیہ سے واسطہ پڑتا ہے اور انصاف خریدنا پڑتا ہے تو لاکھوں اور کروڑوں کی رقم لگ جاتی ہے۔

ججز کو ورغلانے کا بہترین ذریعہ وکلاء حضرات ہیں جو منفی ایڈوائز دے کر درمیانے ٹاؤٹ کا کردار ادا کر کے رشوت ستانی کا محور بن جاتے ہیں۔عدلیہ آج کل ناجائز کمائی کا بہترین ذریعہ ہے۔کیونکہ اس پر انگلی اُٹھانے والا توہین عدالت کا مرتکب ہو کر سلاخوں کے پیچھے جانے کے ڈر سے خاموش ہو جاتا ہے۔آپ نے ملک ریاض اور ارسلان افتخار کے کیس میں رشوت کا لین دین ملاحظہ کیا ہوگا۔اسی طرح چند ایک بے ضمیر ججز کا ذکر کرنا کافی ہوگا جنہوں نے ہماری عدلیہ کے امیج کو تباہ کرنے میں بے ضمیری کی حدود کو بے غیرتی سے پھلانگنے کی یزیدانہ دلیری سے کام لیا۔ضیاءالحق کے درباری مولوی مشتاق احمد نے تو اپنی پرموشن کی خاطر بھٹو مرحوم کو پھانسی تک پہنچانے میں یزیدی کردار ادا کیا اور پھر اُس کی پیروی میں بعض ججز نے بھی حقِ نمک ادا کیا۔اسی طرح رفیق تارڑ جو شریف خاندان کا درباری ہونے کے ناطے صدارت کی کرسی تک پہنچا۔(اور در پردہ اسرائیلی صدر سے بھی ملاقات کرتا رہا)، جو کہ صائب الرائے جج نہیں تھا۔اسی طرح عبدالحمید ڈوگر کا نام بھی ڈوگرے راج کی طرح ظالم اور درباری نکلا۔اس نے اپنے ضمیر کو نامعلوم کتنے سکّوں میں فروخت کیا۔ایک شقی القلب انسان جس کا نام افتخار چوہدری جو کہ ساری سروس میں ضمیر فروشی کی مثال بنا

رہا۔جس نے پاک عدلیہ کے نام کو دھبہ لگا دیا۔شریف خاندان کا وفادار نکلا۔اپنے نامعقول پسر کو پروموٹ کرنے کی خاطر اپنی مرضی سے اپنے مطلب کے مقدمات پر (سوءَ موٹو) نوٹس لینا اس کا مشغلہ بنا۔ پاک عدلیہ کی رہی سہی ساکھ بھی اس نے تباہ کردی۔ پہلے مشرف کے حق میں مارشل لاء کی توثیق کردی۔ پھر ذاتی مقاصد کی بنا پر اسی مارشل لاء کے خلاف وکلاء کو بے وقوف بنا کر اپنی چاندی کرتا رہا۔الیکشن 2013ءکو دیدہ دانستہ متنازعہ بنانے میں اس کا بھیانک کردار شامل ہے۔آر،اوکوغیر قانونی الیکشن میں دھاندلی کی منصوبہ بندی کرنے کی ہدایات کھلے عام دیتا رہا۔اس کے بدلے میں نہ معلوم اسے کیا کیا ملا ہے۔ میں (مشتے ازخروارے) نے صرف چند ججز کا کردار منصفانہ طریقے سے بیان کر کے عدل کی پاکستان میں دستیابی پر تفصیل بیان کی ہے۔ کہ یہ ہماری قوم کا المیہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم اپنی اخلاقی حالت، سے اسقدر ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، کہ ہر عیب میں ہم سب بدترین اقوام سے نمبر اوّل پر ہیں۔اور عجیب ہے کہ پھر بھی ہم اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام کے متوالے کہہ رہے ہیں۔خدارا اسلام کو اور پیغمبر اسلامؐ کے امیج کو تباہ نہ کریں۔

اسے پاکستانی عدل تو کہہ سکتے ہیں مگر اسلامی نہیں۔اس معاشرے کو، ان لیڈران کو، ان ججز کو، ان بیوروکریٹس کو، ان ملاوٹ فروشوں کو، ان سودخوروں کو، ان قبضہ گروپوں کو، ان طالبانی اذہان کو ،ان نام نہاد فتویٰ فروشوں کو، ان ڈرگ فروشوں کو، ان بردہ فروشوں کو، ان ایمان فرشوں کو، ان ضمیر فروشوں کو، ان غداروں کو، ان ڈاکوؤں کو، ان بدکاروں کو، ان منافع خوروں کو، پاکستانی تو کہہ سکتے ہیں مگر ان کو اسلام کا نمائندہ نہیں کہہ سکتے۔مگر اس ملک میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی جج رشوت نہ لے اور فیصلے اپنے ضمیر سے کرے تو اُسے احمدی یا عیسائی اور وہابی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عدل کرنا پاکستانی نام نہاد مسلمان کا کام نہیں ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں یہود
یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

مکاری و عیاری و غداری و ہیجان
اب بنتا ہے ان چار عناصر سے مسلمان
قاری اسے کہنا تو بڑی بات ہے یارو!
اس نے تو کبھی کھول کے دیکھا نہیں قرآن
جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا ڈر ہو
وہ رزق بڑے شوق سے کھاتا ہے مومن
کردار کا گفتار کا اعمال کا مومن
سرحد کا ہے مومن کوئی بنگال کا مومن
ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مومن
بیباکی و حق گوئی سے گھبراتا ہے مومن
مکاری و روباہی پہ اتراتا ہے مومن



# ہماری اقدار کیا ہیں؟...خیال کریں

ہم کہنے کوتو مسلمان ہیں مگر ہم انسانی حقوق سے نابلد ہیں۔ہم ایمان سے مبرا ہیں۔انسانیت سوز جرائم میں یہ معاشرہ اپنا کیسا بھیانک تشخص پیش کر رہا ہے۔انسانوں سے جو سلوک ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا اس کا عشر عشیر بھی اس قوم میں نہیں غیروں سے علیٰحدہ ملک بنانے کا مقصد یہ تھا کہ ہم بھائیوں کی طرح رہیں گے۔ ہر قسم کی مذہبی آزادی ہوگی۔ایک دوسرے کے دکھ میں شامل ہونگے۔ مذہبی رسوم آزادی سے ادا کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ مگر پھر بھی اس وقت ان مذہب کے اجارہ داروں نے قائداعظمؒ کی بھر پور مخالفت کی تھی اور گاندھی نہرو کا ساتھ دیا۔ پھر پاکستان وجود میں آ گیا تو جب ان مذہبی لیڈروں کو ایک عرصہ دراز تک نہ پوچھا گیا تو انہوں نے اپنی جگہ بنانی شروع کی۔اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کوئی بھی نہی عن المنکر بھی قبول کرنے سے گریز نہیں کیا۔اور پھر قوم کی تربیت کرنے میں کلیتاً ناکام رہے۔حتیٰ کہ ضیاءالحق کے ساتھ ملکر جہاد کا ایسا چھکا مارا کہ اب بال انہی کے کورٹ میں ہے۔اور سیاسی لیڈروں نے احترام کی وجہ سے اور سعودیہ کی حمایت کی وجہ سے ایسی پسپائی دکھلائی کہ اب وہی جہادی فسادی کا روپ دھار چکا ہے۔

اس کلچر کو پروموٹ کرنے میں سب محکمہ جات اور فوج تک ملوث ہیں۔اب یہ جہادی کلچر پاک وطن کے خلاف بلکہ اس کے جسم میں پنجے گاڑے ہوئے ہے۔قانون اس کے ہاتھ میں ہے،اسلام اس کے ہاتھ میں،اور اسلام آباد بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔یہ علمائے سو ساری قوم کی تربیت اپنے مذموم مقاصد کے کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔اور ہمارے لیڈر جن کو **قل ھو اللہ** بھی نہیں آتی وہ ان سے ڈرتے ہوئے پسپائی اختیار کر چکے ہیں۔ان کی اسلامی تربیت نے ہر محکمے کو کنگال کر دیا ہے۔ ہر انسان کو اعلیٰ قسم کا کرپٹ انسان بنا دیا ہے۔ہم ملاوٹ میں دنیا کے نمبر ون ہیں۔قتل وغارت میں نمبر ون ہیں،لوٹ مار،وعدہ خلافی اور چوری سینہ زوری میں صفِ اوّل کے شاہکار ہیں۔ روپے کی سب کچھ قابل فروخت ہے۔غداری مجسم ہیں۔ہم کیا ہیں منافق،یزیدی،فرعونی کردار

سے بھی ہم کچھ دور تی اوپر ہیں ۔فرعون بھی اس قدر دو نمبر نہ تھا۔افسران بالا ،ممبران پارلیمنٹ جعلی ڈگری ہولڈر ہیں۔کسی کو جھوٹ بولتے ہوئے ندامت نہیں ہوتی ،کسی کو جھوٹے قرآن اُٹھا کر عدالتوں میں گواہی دیتے خدا کا خوف نہیں۔ہم کیا ہیں،انسان کی کونسی قسم ہیں ہمارے شر سے نہ کوئی عبادت گاہ ،نہ مندر، نہ گرجا،نہ مسجد ،نہ امام بارگاہ،نہ کسی کی بیٹی محفوظ ہے ۔کیا یہ دور کسی عذاب کا منتظر ہے۔ہم اپنے والدین کا کہا نہیں مانتے ،ہم اپنے علماء کا مثبت فرمان بھی نہیں مانتے ۔ہم خدا اور رسول کے فرمودات کو بھی پسِ پشت ڈال رہے ہیں۔اے خدا اس قوم پر رحم کر۔

تم مسلماں ہو کہ جن کو دیکھ کے شرمائے یہود



## آلاتِ غنا

پطرس جب ولایت سے انگریزی ادب پڑھ کر انڈیا واپس آئے تو پہلی نوکری آل انڈیا ریڈیو پر ملی. پطرس کلاسیکی موسیقی کے پروگرام کرواتے تھے. پطرس کے پروگرام کے خاتمے کے بعد مولانا احتشام الحق تھانوی کا درس قرآن ہوتا تھا۔ایک دن مولانا سٹوڈیو پہنچے تو موسیقی کا پروگرام ختم ہو چکا تھا لیکن ساز سٹوڈیو میں ہی رکھے تھے اور پطرس بھی وہیں کھڑے تھے۔مولانا سازوں کو دیکھتے ہی تپ گئے اور فرمایا" لاحول ولاقوہ! آلات غنا کی موجودگی میں درس قرآن کیسے ہوسکتا ہے؟"

پطرس سے نہ رہا گیا اور بولے مولانا آلات زنا آپکے ساتھ لگے ہیں۔اگر ان کی موجودگی میں درس قرآن ہوسکتا ہے تو آلات غنا کی موجودگی میں کیوں نہیں؟

## افسوس کی بات

بعض لوگوں کا جنازہ ہی مسجد پہنچتا ہے وہ زندگی میں مسجد نہیں آتے اور بعض عورتوں کو کفن کے ذریعے ہی پردہ کرایا جاتا ہے زندگی میں وہ پردہ نہیں کرتیں۔

# رونا بھی مفید ہے

زمانہ اتنا تیز رفتار ہے کہ آدمی کو اچھے اچھے کاموں کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔ کسی کو اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی یہ الگ بات ہے کہ اس کی آدھی عمر دوسروں کے بارے میں سوچتے گزر جاتی ہے اپنے بارے میں سوچ لینا اچھی بات ہے لیکن اس سے بھی اچھا کام کبھی کبھی جی بھر کے رو لینا ہے اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ رونا کتنا مفید ہوتا ہے تو آپ سب کام کاج چھوڑ کر رونا شروع کر دیں۔ رونا نہ صرف بخشش کا ایک ذریعہ ہوتا ہے بلکہ رونے سے آنکھوں کی صفائی بھی ہو جاتی ہے۔ آپ رو کر ہر بات منوا سکتے ہیں چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو یہی وجہ ہے کہ بچوں اور خواتین کی فرمائشیں اگر کسی اور طریقے سے پوری نہ ہوں تو وہ رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بڑے رقت انگیز قسم کے ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ اگر آپ وقت بے وقت خوب رو سکتے ہیں تو ہر کوئی فوراً آپ کی بات کا اعتبار کر لے گا۔

اس کے برعکس اگر آپ ہنس ہنس کر بات کریں گے تو کوئی آپ کی بات کا اعتبار نہیں کرے گا الٹا وہ یہ سمجھے گا کہ آپ اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ یہ دنیا اک معمہ ہے ایک طرف کہتی ہے ہنسنا چاہیئے تو دوسری طرف کسی کو ہنستے بھی نہیں دیکھ سکتی اگر آپ غم سے آفاقہ کرنے کے لئے ہنسیں گے تو لوگ آپ کو پاگل، سنگ دل، بے وقوف اور نہ جانے کیا کیا کہا جائے بجائے اس کے آپ رو کر دیکھ لیں لوگ فوراً آپ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے، آپ سے ہمدردی کا اظہار کریں گے تسلی و تشفی کے کئے حوصلہ بڑھائیں گے آپ کی ہر جائز و ناجائز خواہش بلا تامّل پوری کر دی جائے گی۔ اور آپ کو درد دل رکھنے والا کہا جائے گا۔ آج تک جتنے بھی ولی اللہ ہوئے ہیں ریاضت و عبادت تو ان کا معمول تھا ہی ایک کام جو وہ بہت باقاعدگی سے کیا کرتے تھے وہ تھا ہر رات گوشہء تنہائی میں بیٹھ کر خدا اور محبوب خدا کی یاد میں خوب خوب رونا، یقیناً آپ بھی رو رو کر خدا کا قُرب حاصل کر سکتے ہیں۔ کائنات کے بڑے بڑے راز آپ پر بھی منکشف ہو سکتے ہیں ذرا تنہائی میں بیٹھیۓ اور رو کر دیکھیۓ۔ آدم وحوا کو جب جنت سے نکالا گیا تو ہر وقت روتے رہنا ہی ان کی بخشش کا باعث بنا،

بچھڑے ہوئے محبوب کولوگ روروکر یاد کرتے ہیں اور روٹھے ہوئے محبوب کوبھی روروکرہی مناتے ہیں کیونکہ رونا ایک امید ہے اور امید پہ دنیا قائم ہے۔اس لئے اگرآپ کواپنی دنیا قائم رکھنی ہےتو رونا ناگزیر ہوگا کہتے ہیں کہ زیادہ ہنسنے والوں کا دل مردہ ہوجاتا ہے اگر یہ سچ ہےتو رونے والوں کا دل ضرور ہنسنے ہنسانے والا ہوتا ہوگا۔ چنانچہ اگرآپ زندہ دل بننا چاہتے ہوں تو اپنے آپ کورونے دھونے کا عادی بنائیں ہر وقت روتے رہا کریں اپنی خطاؤں پر،محبوب کی جفاؤں پر، بیوی کی اداؤں پر، دشمن بدنواؤں پر، اپنے جرائم کی سزاؤں پر، موسم کی یخ فضاؤں پر، بے وقت گداؤں پر، نا کردہ گناہوں پر،غرض کتنی ایسی باتیں ہیں جن پر پھوٹ پھوٹ کراور بے اختیار رویا جاسکتا ہے ضرورت صرف آنکھ کھولنے کی ہے۔❁❁

## عشق

روایت ہے کہ مولانا رومیؒ ایک دن خرید وفروخت کے سلسلے میں بازار تشریف لے گئے۔ایک دکان پر جا کر رک گئے۔دیکھا کہ ایک عورت کچھ سودا سلف لے رہی ہے۔سودا خریدنے کے بعد اس عورت نے جب رقم ادا کرنی چاہی تو دکان دار نے کہا:

''عشق میں حساب کتاب کہاں ہوتا ہے، چھوڑو پیسے اور جاؤ۔''

مولانا رومیؒ یہ سن کرغش کھا کر گر پڑے۔دکان دار سخت گھبرایا اس دوران وہ عورت وہاں سے چلی گئی۔خاصی دیر بعد جب مولانا رومی کو ہوش آیا تو دکاندار نے پوچھا۔

''مولانا صاحب آپ کیوں بے ہوش ہوئے؟''

مولانا رومیؒ نے جواب دیا:

''میں اس بات پر بے ہوش ہوا کے تم دونوں میں اتنا قوی اور مضبوط عشق ہے کہ آپس میں کوئی حساب کتاب نہیں جب کہ اللہ کے ساتھ میرا عشق کتنا کمزور ہے کہ میں تسبیح کے دانے گن گن کر گراتا ہوں۔''

# مُلاں کی وحشیانہ یہودیانہ حرکات

آج عید کا دن ہے۔ میں عید مبارک کہوں یا نہ کہوں یا کہ میں عید کی خوشی کیسے مناؤں۔ میرے دو بچے زندہ جلا دیئے گئے۔ میری ماں کو بھی جلا دیا گیا۔ میں کسی غزوہ کی بات نہیں کر رہا۔ 29/ماہ رمضان کو گجرانوالہ میں علمائے سُو نے اس کالونی کو جہنم بنا دیا۔ چھ گھروں کا سامان اہلِ اسلام لُوٹ کر لے گئے۔ جو اُن کے کام نہ آنے والا تھا اُسے آگ لگا دی۔ اور پھر لگے اسلام زندہ باد کے نعرے لگانے۔ بچوں کو اور نہتے احمدیوں کو جلا کر مار ڈالا۔ جب فائر بریگیڈ آیا اور ایمبولینس آئی تو اُن کو بھی ان نام نہاد جہادیوں نے مار بھگایا رمضان میں جبکہ شیطان بندھا ہوتا ہے۔ (مگر اس کے بچے بہت زیادہ ہو گئے ہیں جو کھلے پھر رہے ہیں)۔ میں عراق کی بات نہیں کر رہا نہ بوسنیا کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں گجرانوالہ کی، اور اسلام کے قلعے پاکستان کی بات کر رہا ہوں۔ جہاں اسلام کا دور دورہ ہے۔

فیس بُک کا نام نہاد بہانہ بنا کر اس فساد کا آغاز کیا گیا۔ وہ بھی رمضان میں۔ اس میں سب نے حصہ لیا۔ مقامی محلے داروں نے جب دیکھا کہ زیادہ مال تو باہر کے بلوائی لے گئے۔ ہم کیوں پیچھے رہ جائیں۔ تو انہوں نے بھی اس ظلم کی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ شیعہ بھی پیچھے نہیں رہنے والے تھے حضرت علیؓ کے نعرے لگائے گئے۔ علمائے سُو کی حوصلہ افزائی سے تو بڑے بڑے خود کُش بم بردار، جنت کے طلبگار اپنے کلمہ گوؤں کو نہیں بخشتے۔

یہ تو احمدیوں کا مال ہے۔ پولیس ملعون و مغشوش محافظوں کی طرح تماشہ دیکھتی رہی۔ اور خرم دستگیر بھی کسی کی دستگیری نہ کر سکے۔ جب سب کام تمام ہو چکا تو سبھی اپنی اپنی کاروائی ڈالنے پہنچے۔ کذب بیانیوں کی انتہا کے ساتھ، فوٹو سیشن بھی ہوئے۔ مگر رمضان اور عید کی روح کی سرِ بازار تذلیل کی گئی۔ کیا یہ لوگ انسان بھی کہلانے کے حق دار ہیں۔ یہ حکمران، یہ صاحب اقتدار، یہ اہلِ علم، یہ محلے دار، جل کر مرنے والے معصوم پھول تو ابھی کھلے بھی نہ تھے۔ ابھی اُن کو اپنے مذہب کا بھی علم نہیں تھا۔ اُن کو کس جُرم کی سزا دی گئی۔ کس سے پوچھوں یہاں تو ویسے بھی ظلم ہی ظلم ہے۔ نہ عدل

ہے نہ انصاف ہے۔نہ انسانیت ہے۔نہ ایمان ہے۔نہ میزان ہے۔ ہرطرف شیطان ہے جس نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔بس اے مظلوم! خدا سے مدد طلب کر۔اے میرے مالک اُن ظالموں کوتُوتو پہچانتا ہے جن یہود وہنود نے اِن معصوموں کو ناجائز جلایا ہے۔اور جس نے فتوے سے اُکسایا ہے۔اے میرے قدیر جلد اُن کا حساب کر اور اُن کو عبرت کا نشان بنا دے۔انصاف کے لئے تو عدالتیں لاکھوں روپے مانگتی ہیں۔اور پولیس ایف آئی آر کے لئے رشوت لیتی ہے۔

ایک تو گھر جل گئے۔ پیارے بھی جل کر مر گئے اب رشوت کے لئے کہاں سے رقم آئے گی۔ پھر تعصب کا عفریت ہر جگہ کمزور اور مظلوم کا پیچھا کر رہا ہے۔کوئی بھی کمزور،نہتا،اس عیار و مکار گندے سسٹم میں کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔اے خدا تو ہی ان کمزوروں کی حفاظت کر۔اس خرم دستگیر سے کچھ نہیں ہونے والا۔اے میرے رحمان ورحیم خدا تو ہی ہماری دستگیری کر۔



## ابتدائی حساب

حساب کے چار بڑے قاعدے ہیں۔جمع۔تفریق۔ضرب۔تقسیم۔

### جمع

جمع کے قاعدہ پر عمل کرنا آسان نہیں۔خصوصاً مہنگائی کے دنوں میں۔سب کچھ خرچ ہوجاتا ہے۔کچھ جمع نہیں ہو پاتا۔جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہے۔عام لوگوں کے لئے ایک جمع ایک مساوی ڈیڑھ۔کیونکہ آدھا انکم ٹیکس والے کھا جاتے ہیں۔تجارت دو کے قاعدے سے جمع کریں تو ایک جمع ایک کا مطلب ہے گیارہ۔ناجائز آمد سے قاعدے کا حاصل جمع اور زیادہ ہوجاتا ہے۔قاعدہ وہی اچھا ہے جس میں حاصل جمع زیادہ سے زیادہ آئے۔بشرطیکہ قانون حائل نہ ہو۔ایک قاعدہ زبانی جمع خرچ کا ہوتا ہے جو ملک کے مسائل حل کرنے کے کام آتا ہے۔

(ابن انشاء)

# خودفریبی یا ایک حقیقت سے فرار

## (یہ میرے ساتھ نہیں ہوسکتا)

اصفہانی خاندان کا تعلق کلکتہ سے تھا۔ یہ لوگ کلکتہ کے انتہائی متموّل خاندانوں میں شمار ہوتے تھے۔ ابوالحسن کا تعلق اسی اصفہانی خاندان سے تھا۔ یہ کیمرج میں پڑھتے تھے۔ وہاں قائداعظم کی تقریر سُنی۔ قائداعظم کے عاشق ہوئے۔ اور باقی زندگی قائداعظم اور آل انڈیا مسلم لیگ کی خدمت میں گزار دی۔ مسلم لیگ کے ساتھ مختلف عہدوں پر کام کیا۔ پاکستان بنا تو ابوالحسن اصفہانی کروڑوں روپے کے اَثاثوں کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو گئے۔ ڈھاکہ اور کراچی دونوں ان کے کاروباری مراکز تھے۔ دونوں شہروں میں ان کے کارخانے، کوٹھیاں، پلازے، فارمز ہاؤسز اور زمینیں تھیں۔ امریکہ میں سفیر کی تعیناتی کا مرحلہ آیا تو قائداعظم نے اَصفہانی صاحب کو پہلا سفیر بنا کر امریکہ بھجوایا۔ یہ وہاں پانچ سال سفیر رہے۔ پھر دو سال برطانیہ میں ہائی کمشنر رہے پھر ایک سال صنعت و تجارت کے وفاقی وزیر بنے۔ بھٹو صاحب کا دور آیا تو انہیں افغانستان میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔ یہ اَصفہانی صاحب کا سفارتی اور سیاسی پروفائل تھا۔ جبکہ دوسری طرف یہ معاشی اور تجارتی میدانوں میں بھی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتے رہے۔

یہ صدر ایوب خان دور میں اُن خاندانوں میں شامل تھے جو ملک کے زیادہ تر وسائل کے مالک تھے۔ اَصفہانیوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ آپ پاکستان کے کسی حصے سے کوئی چیز خریدیں تو منافع کا ایک حصہ کسی نہ کسی ذریعے سے ہوتا ہوا اصفہانی گروپ تک پہنچ جائے گا۔ ابوالحسن اصفہانی کے تین بچے تھے۔ سکندر اصفہانی، ان کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی صاحب سفارت اور سیاست میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ کاروبار کی ذمہ داری سکندر کے کندھوں پر تھی۔ یہ خاندان ایوب خان اور بھٹو کے زمانے میں کھرب پتی ہو گیا۔ بھٹو صاحب نے صنعتیں قومیا لیں۔ لیکن اس کے باوجود ابوالحسن اصفہانی خاندان کے پاس کراچی میں اَربوں روپے کی پراپرٹی تھی۔ سکندر اصفہانی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اہلیہ سے چار بچے دوسری بے اولاد رہی۔ 1990ء کی دہائی

میں جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا، عدالتوں اور کچہریوں کا معاملہ چلا تو نوبت اینجا رسید کہ وہ کراچی شہر جو کبھی اصفہانی خاندان کا گھر کہلاتا تھا۔ اس شہر میں سکندر اصفہانی کے رہنے کے لئے کوئی چھت نہ بچی سکندر اصفہانی سندھ کلب میں شفٹ ہو گئے۔ یہ دو سال کلب میں ہی رہے اور دسمبر 2013ء میں سندھ کلب میں انتقال کر گئے۔ کلب ہی سے ان کا جنازہ اُٹھا۔ جنازے میں چند لوگ شامل تھے اور ان لوگوں میں ان کے خاندان کا کوئی شخص شامل نہ تھا۔ سکندر اصفہانی فرح ناز اصفہانی کے والد اور حسین حقانی کے سُسر تھے۔ یہ دولت کی بے وفائی اور دنیا کی بے ثباتی کا ایک واقعہ ہے۔

آپ اب ایک پاکستان کے پانچ بڑے صنعتی گروپوں میں شامل ایک دوسرے خاندان کی کہانی بھی ملاحظہ کیجیئے۔ سہگل خاندان ایوب خان کے دور کے پہلے پانچ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ لوگ چکوال کے رہنے والے تھے۔ یہ دوسری عالمی جنگ کے وقت کلکتہ گئے۔ وہاں چمڑے کا کاروبار شروع کیا اور مناپلی قائم کر لی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ سہگل خاندان نے پچاس کی دہائی میں کوہِ نور ٹیکسٹائل کے نام سے فیصل آباد اور راولپنڈی میں دو کارخانے لگائے کہ یہ کارخانے اتنے بڑے اور اتنے کامیاب تھے کہ آج بھی ان علاقوں کو کوہِ نور کہا جاتا ہے۔

ایوب خان کے دور کو سہگل خاندان کے عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ سہگلوں نے پاکستان کا تیسرا بڑا بینک بنایا تھا۔ یہ گھی کی صنعت میں آئے، ریان کپڑا شروع کیا، کیمیکل اور مشینری کے شعبے میں آئے۔ اور عروج کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ محمد یوسف سہگل اس خاندان کے سربراہ تھے۔ یہ 1993ء میں فوت ہوئے ان کی تدفین سے پہلے خاندان میں پھوٹ پڑ گئی۔ بچے آپس میں دولت کے لئے لڑنے لگے۔ اور آج اس خاندان کا صرف نام بچا ہے۔ اب آپ لاہور کے ایک فلمساز خاندان کی کہانی بھی سُنیئے۔ وہ پاکستان کے چوٹی کے فلمساز تھے۔ یہ پشاور کے رہنے والے تھے۔ یہ 21 سال کی عمر میں فلمی لائن میں آئے۔ صوبہ سرحد میں فلموں کے ڈسٹری بیوٹر بنے۔ جگت ٹاکیز اس وقت ہندوستان کی بہت بڑی کمپنی تھی۔ وہ اس کمپنی کی فلمیں ریلیز کرنے لگے۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں ذاتی سینماز بنا لئے تھے۔ یہ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور شفٹ ہو گئے۔ انہوں نے 1950ء میں ''مندری'' فلم بنائی۔ فلم کامیاب ہوگئی۔ تو پھر انہوں نے ایک فلم کمپنی بنائی۔ یہ بعد میں

پاکستان کے ایک معروف سٹوڈیو میں تبدیل ہوگئی، اس سٹوڈیو میں سینکڑوں فلمیں بنیں۔ ملک کے درجنوں سپر سٹارز نے اس سٹوڈیو میں آنکھیں کھولیں۔ وہ فلمساز لاہور کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ گلبرگ میں ان کی کئی کنال کی کوٹھی تھی۔ یہ 1974ء میں بیمار ہوگئے اور گھر تک محدود ہوگئے۔ نعیم بخاری صاحب نے اُن دنوں نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی۔ یہ اس فلمساز کے ایک صاحبزادے کے وکیل تھے۔ اسی صاحبزادے نے نعیم بخاری کو ساتھ لیا اور والد کے گھر پہنچ گیا اور والد سے گھر کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اداکار محمد علی بھی وہیں موجود تھے۔ بیٹا باپ سے گلبرگ والی کوٹھی لینا چاہتا تھا۔ باپ نے منت سماجت کی کہ میں ابھی بیمار ہوں۔ میں اس حالت میں کہاں جاؤں گا۔ میں یہ کوٹھی آپ کو لکھ دیتا ہوں۔ کاغذات اپنے پاس رکھ لینا اور میرے مرنے کے بعد اس کوٹھی پر قبضہ کر لینا۔ بیٹے نے انکار کر دیا اور کہا ''ابا جی آپ کو یہ گھر ابھی خالی کرنا ہوگا''۔ فلمسٹار محمد علی اور نعیم بخاری دونوں کو ترس آ گیا اور محمد علی نے فلمساز کے صاحبزادے کو پیشکش کی کہ ''زیبا بیگم کے پاس ڈیڑھ کروڑ روپے کے زیورات ہیں آپ یہ زیورات اپنے پاس رکھ لیں۔ لیکن اپنے باپ کو اس مکان میں رہنے دیں۔ آپ کو جب یہ گھر مل جائے گا تو میرے زیورات واپس کر دینا اور اپنا گھر سنبھال لینا۔ بیٹا نہ مانا۔ یہ معاملہ طول پکڑ گیا۔ اور بیٹے نے باپ کے اوپر بریف کیس سے پستول نکال لیا۔ والد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اُٹھ کر اندر گیا۔ چیک بک لے کر باہر آئے۔ ستر لاکھ کا چیک کاٹ کر اسے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اب تم میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔ صاحبزادے نے چیک لیا اور نعیم بخاری کے ساتھ واپس چلا گیا۔ یہ فلمساز 1983ء میں انتقال کر گئے۔ انتقال کے وقت ان کا کوئی اپنا وہاں موجود نہ تھا۔ نعیم بخاری کے بقول ''یہ منظر دیکھنے کے بعد میرے دل میں پوری زندگی کے لئے دولت کی خواہش ختم ہوگئی۔''

یہ صرف تین واقعات ہیں۔ آپ چند لمحات کے لئے دائیں، بائیں آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ آپ کو اپنے اردگرد سینکڑوں ایسی مثالیں ملیں گی۔ آپ نے بھی درجنوں لوگوں کے عروج کا سورج زوال کے اندھیرے غار میں اُترتا دیکھا ہوگا۔ ہم سے زندگی میں صرف تین چیزیں بے وفائی کرتی ہیں۔ ہم اگر ان بے وفاؤں کی فہرست بنائیں تو عہدہ، دولت اور اولاد پہلے تین نمبر پر آئے گی۔ ہم

عہدے کے لئے ایمان، عزت، سیلف ریسپیکٹ، اخلاقیات، صحت اور خاندان تک قربان کر دیتے ہیں۔لیکن یہ عہدہ سب سے بے وفا نکلتا ہے۔ میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں کو اپنے عہدے کی خاطر دوسروں کے قدموں میں بیٹھے اپنے کرتے کے دامن سے دوسروں کی رال صاف کرتے ہوئے، دوسروں کے کتے نہلاتے ہوئے، اپنی پگڑی کے پلو سے صاحب کی گاڑی کا شیشہ صاف کرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن عہدہ اس اس کے باوجود ان کے نیچے سے نکل گیا۔ میں نے کرسی پر بیٹھے لوگوں کو فرعون اور نمرود بنتے بھی دیکھا ہے۔ اور ''نسلیں ختم کر دو'' جیسے احکام دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔لیکن جب عہدے نے بے وفائی کی تو میں نے اپنی آنکھوں سے بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف جیسے بااختیار لوگوں کو عدالت کے باہر گندی اینٹوں پر اور قلعوں کی حبس زدہ کوٹھڑیوں میں محبوس دیکھا ہے۔ میں نے بے شمار ارب کھرب پتیوں کو پیسے پیسے کا محتاج ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں جب اسلام آباد کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ آج جہاں مارکیٹیں، گراؤنڈز، اور سڑکیں بنی ہیں۔ وہاں آج سے چالیس سال قبل گاؤں ہوتے تھے اور گاؤں کے مالک، چودھری، ملک، وڈیرے بھی ہوتے تھے۔ ان وڈیروں کی انا بھی بانس کی آخری چوٹی کو چھوتی ہوگی۔لیکن آج وہ چودھری، وڈیرے اُن کی زمینیں اور اُن کے گاؤں دیہات کہاں ہیں؟۔ شاید سپر مارکیٹ کے نیچے دفن ہوں۔ یا پھر مارگلہ روڈ کی گولائیوں میں گُم ہوں۔ اور یہ صرف چالیس سال ہی تو پرانا قصہ ہے۔ چار دہائیوں میں زمین کی ہیئت تبدیل ہوگئی؟ دولت مند غریب ہو گئے۔ مالک ملازم بن گئے اور نمبردار وقت کے سیاہ صفحات میں جذب ہو گئے۔ چنانچہ پھر دولت سے بڑی بے وفا چیز کیا ہوگی۔ اور رہ گئی اولاد۔ میں نے بے شمار لوگوں کو اپنی اولاد سے محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ لوگ اپنی اولاد کے سُکھ کے لئے ساری زندگی خود دُکھ جھیلتے رہے۔لیکن پھر کیا ہوا؟ وہی اولاد زمین و جائیداد کے لئے اپنے والدین کے انتقال کا انتظار کرنے لگی، میں نے بچوں کو اپنے منہ سے یہ کہتے ہوئے سنا۔ ''ابا جی بیمار ہیں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی مشکل آسان کر دے''۔ اور یہ وہ باپ تھا جو بچوں کے نوالوں کے لئے اپنا ضمیر تک بیچ آتا تھا۔ میں نے ایسے مناظر بھی دیکھے، بابا جی کے سارے بچے

ملک سے باہر چلے گئے، بابا جی نے تنہائی کی چادر بُن بُن کر زندگی کے آخری دن گزارے اور انتقال ہوا تو بچوں کو وقت پر جہاز کی سیٹ نہ مل سکی، چنانچہ تدفین کی ذمہ داری ایدھی فاؤنڈیشن نے نبھائی۔ یا پھر محلے داروں نے! یہ ہے کُل زندگی اولاد، دولت اور عہدے کی بے وفائی! ان بے وفائیوں کے داغ اور آخر میں قبر کا اندھیرا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے ہر شخص واقف ہے۔لیکن اس کے باوجود انسان کا کمال ہے، یہ دیکھتا ہے مگر اسے نظر نہیں آتا، یہ سُنتا ہے مگر اسے سنائی نہیں دیتا، اور یہ سمجھتا ہے مگر اسے سمجھایا نہیں جا سکتا، ہر روز لوگوں کو تباہ ہوتا، مرتا ہوا، ذلیل ہوتا ہوا، دیکھتا ہے مگر ہر بار خود کو یقین دلاتا ہے۔ ''یہ میرے ساتھ نہیں ہوگا'' کیونکہ ''میں دوسروں سے مختلف ہوں''۔



## تفریق

میں سندھی ہوں تو سندھی نہیں۔ میں پنجابی ہوں تو پنجابی نہیں۔ میں مسلمان ہوں تو مسلمان نہیں۔اس کو تفریق پیدا کرنا کہتے ہیں۔حساب کا یہ قاعدہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔تفریق کا ایک مطلب ہے، منہا کرنا۔یعنی نکالنا ایک عدد کو دوسرے عدد سے۔بعض عدد از خود نکل جاتے ہیں۔بعضوں کو زبردستی نکالنا پڑتا ہے۔ڈنڈے مار کر نکالنا پڑتا ہے۔فتوے دے کر نکالنا پڑتا ہے۔ایک بات یاد رکھیئے۔جو لوگ زیادہ جمع کر لیتے ہیں۔وہی زیادہ تفریق بھی کرتے ہیں۔انسانوں اور انسانوں میں۔مسلمانوں اور مسلمانوں میں۔عام لوگ تفریق کے قاعدے کو پسند نہیں کرتے۔کیونکہ حاصل تفریق کچھ نہیں آتا۔آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

(ابن انشاء)

*-*-*

# ہمارا معاشرہ یا ایک ریوڑ

مخلوط پاکستانی معاشرہ جسے پاکستان معاشرہ تو کہا جاسکتا ہے مگر کسی طور بھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا جبکہ ہم سب اور اشرافیہ اور علماء اسے اسلامی کہنے پر تو بضد ہیں مگر اسے اسلامی بنانے کے لئے کوشاں نہیں۔اس میں بے جا مقامی رسم ورواج کو مقدم رکھا جاتا ہے۔قبائلی، خاندانی رسوم وروایات کو اوّلیت دی جاتی ہے۔اپنی اَنانیت اور چودھراہٹ کو قائم رکھنے کی خاطر اسلامی قواعد تک کو بالائے طاق رکھا جاتا ہے۔علماء دین بھی اس کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔کیونکہ دنیوی معاشرے میں ان کی کوڑی کی حیثیت نہیں۔سارے پاکستان میں وڈیروں کے رسم ورواج، جاگیرداروں کے حکم، صاحب ثروت لوگوں کی من مانی کے قوانین چلتے ہیں۔معاشرہ اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے اس کے لیڈران کو بھی اَن پڑھوں جیسا رویہ رکھنا پڑتا ہے۔ورنہ وہ اپنی مقبولیت کھو بیٹھتا ہے۔اس کی جگہ نئی نسل کا کوئی اور بااثر لیڈر جگہ لے لیتا ہے۔ووٹ بھی اسی وجہ سے غلط استعمال ہوتا ہے۔غریب لوگوں یا مذہبی لوگوں کو رام کرنے کے لئے لیڈر حضرات مقامی ماحول کے مطابق چلتے ہیں۔اگر کسی ناجائز کام کی بھی تائید کرنی پڑے تو کر ڈالتے ہیں۔مثلاً کسی چور کی چوری کو تحفظ دینا، کسی زانی کو تحفظ دینا، کسی غلط کار کو تحفظ دینا، راشی کی حوصلہ افزائی کرنا، اقرباء پروری، پردہ پوشی، ناجائز حمایت، کمزور کو دبانا، طاقتور کی حمایت کرنا، جھوٹی گواہی دینا اور اس کی ترغیب دینا، انصاف سے نابلد یہ سب کام پاکستانی تو ہیں مگر اسلامی نہیں۔ہمارا معاشرہ قبل اسلام اور پرانے جاہل عرب دور سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔جن میں ہر قسم کی برائی پائی جاتی تھی۔بلوچستان، کے پی کے، سندھ اور پنجاب میں مقامی رسم ورواج اور روایات کو قانون کی حیثیت اور اوّلیت حاصل ہے۔کاروکاری، وٹہ سٹے کی شادی، کم عمری میں منگنی یا نکاح، چوری کا بھگاہ، بیوہ کی شادی نہ کرنا، نام نہاد پیروں کو نذرانے دینا، ان کو سجدے کرنا، قبروں پر منتیں ماننا، اولیاء اللہ کے مزاروں پر چرس اور بھنگ اور بدکاری کے اڈے چلانا، جیب کتروں کے گروہ پالنا، قرآن سے نکاح کرنا، چور کی حوصلہ افزائی کرنا، جائز و ناجائز سفارش، رشوت ستانی، کام کرنے والے کو بخشیش دینا، علاقائی، گروہی، قومی و برادری اور

اہلِ دیہہ کو جائز و ناجائز سپورٹ کرنا، نئی نسل کی غلط تربیت کرنا، نیم حکیموں کو پروموٹ کرنا، غلط اور شہوت کار لوگوں کو کھلے عام چھٹی دینا، یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے اسلام کا نہیں۔ کہیں جرگہ اور کہیں پنچایت کا دور دورہ ہے۔مگر اسلامی قوانین کو اوّلیت نہیں۔ہم سب لوگ شریعت کی تنفید کا مطالبہ کرتے ہیں مگر ہم خود اپنے اوپر اور علماء کرام بھی اپنے اوپر نافذ کرتے نظر نہیں آتے۔مردِ مومن مردِ حق کے زمانے میں دولت کے زور پر ہیروئن اور کلاشنکوف کو عام کیا گیا۔خود ساختہ فتاویٰ کے بل بوتے پر روس کے ڈر سے امریکہ کے منصوبے کو سعودی عرب کی وساطت سے سرانجام دیا گیا۔قومی املاک کو نقصان پہنچانا ہمارے معاشرے میں کوئی برائی نہیں۔کسی فرقے کو کافر کہنا کوئی برائی نہیں، کسی فرقے کے خلاف قتل کا فتویٰ دینا کوئی برائی نہیں۔

توہین رسالت کی آڑ میں جس کو من مرضی سے کوئی بھی جاہل نیم ملاں اینٹوں کے بھٹے میں جلا دے، اس کے گھر کو جلا دے، یا اُسے بدنام کر کے اُسے اپنے گھر کو چھوڑنے پر مجبور کر دے۔نہ اُسے عدالت پکڑتی ہے اور نہ کوئی اور ادارہ۔ بے لگام حکومت ہے، بدکار عوام ہے۔اور سب سے بڑھ کر اس قوم کو غلط سبق دینے والا اس کا جاہل ملاں۔ ہماری قوم عاد اور ثمود اور یہود سے بڑھ کر مردود ہو چکی ہے۔ بتائیں ان کے جرائم کیا تھے جب اُن کو عذاب نے آلیا۔یقیناً یہی گناہ تھے۔اب مہنگائی کا، بے انصافی کا، بے امنی کا، ہر قسم کا عذاب اس قوم کا مقدر بن چکا ہے۔آپ ہماری قوم کے ہر طبقے میں بے ایمان اور کرپٹ عناصر آسانی سے دستیاب ہیں۔مولوی سے لے کر اساتذہ تک پھر انتظامیہ سے لے کر جج تک یا عدلیہ تک۔آپ کو اکثریت چاندی کی (مال و دولت) کی پجاری ملے گی۔ ہر عیب اس طبقے میں ملے گا۔کوئی منافع خور ہے، کوئی ملاوٹ کنندہ ہے، کوئی رشوت خور ہے، کوئی جعلی ڈگری والا ہے۔ان اعمال کے باوجود اپنی سرکاری مسلمانی پر بضد ہیں جبکہ ان کے عمل سے ظاہر ہے کہ بھیڑیئے ہیں مگر اپنے آپ کو بھیڑ ثابت کرنے پر مصر ہیں۔واللہ مجھے بتائیں انصاف سے، کہ کونسی برائی آج میری قوم میں نہیں۔کمزور کے ساتھ ہر قسم کی برائی جائز ہے، ایم پی اے یا ایم این اے، ضلعی ناظم، یا سرکاری افسر کی ہر جائز و ناجائز بات ماننا ہمارے معاشرے کے رواج میں شامل ہے، کسی سامنے سچی بات کرنا کوئی ضروری نہیں، حتیٰ کہ ہماری اشرافیہ بھی اب سہم گئی ہے، مولوی بھی

اپنی روزی روٹی کی خاطر دبک سا گیا ہے۔اب ہمارے معاشرے میں اسلحے اور بارود کا راج ہے۔ چوری ڈکیتی عام ہے، دھونس اور دھاندلی عام ہے۔جس کے پاس کوئی سفارش ہے وہ تو ٹھہرا کامیاب ورنہ ہر لحاظ سے فیل ہے۔گاؤں کا مولوی جو کچھ بھی کرے،علاقے کا پٹواری جو بھی کرے اس کی کوئی شکایت نہیں کرتا،علاقے میں جنگل کا گارڈ جو مرضی کرے،جنگل سے دن دہاڑے لکڑی فروخت کرے،جس کو مرضی اس میں جانور چرانے کی اجازت دے،جس کو چاہے شکار کی اجازت دے، یہ خودمختار اور سیاہ وسفید کے مالک ہوتے ہیں۔

گاؤں کے نمبردار، چیئرمین عشر زکوٰۃ کمیٹی اپنی من مانی کرتے ہیں اور ان میں کم ہی محب وطن یا دیانت دار لوگ ہوتے ہیں۔اسی طرح سب محکمہ جات ہیں جن میں اب تو منظم انداز سے خرد بُرد جاری ہے۔بجلی چوری کرنا، پانی چوری کرنا،شوگر ملوں کے کنڈوں پر دیدہ دانستہ وزن کم تولنا،ٹیکس دہندہ کا ڈبل رجسٹر رکھنا، ہاتھی کی طرح (دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور)،منافقت عروج پر ہے۔بددیانتی عروج پر ہے۔کونسی بُرائی نہیں جو انتہا تک نہیں پہنچی۔ان اسلامی جماعتوں نے اب تک اس قوم کی کیا تربیت کی ہے۔قوم کو اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔اور اس کے لئے کوئی ٹانک کامیاب نہیں ہو رہا۔کیونکہ ہم سب اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں۔قوم کا باہمی اتفاق و اتحاد،تنظیم وایمان پارہ پارہ ہو چکا ہے۔

ہم اسلام کی بات تو کرتے ہیں مگر کتنے نمازی ،دیانتدار اور متقی ممبران پارلیمنٹیرین آج پارلیمنٹ میں موجود ہیں۔کتنے صادق اور امین ہیں۔جج اور اساتذہ کرام کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ مگر اس الیکشن میں دیدہ دانستہ دھاندلی پر خاموشی سے اس طبقے کا بھی کیریکٹر سامنے آ گیا ہے۔اس دھاندلی اور بے ایمانی میں ہر قسم کی اشرافیہ ملوث تھی ،عدلیہ،انتظامیہ،محکمہ تعلیم کے اساتذہ بھی ملوث تھے۔سب نیب زدہ پارٹیاں دھاندلی ماننے کے باوجود اس کی تحقیق کرنے سے دیدہ دانستہ انکاری ہیں۔یہاں عمران خان اور قادری جیسے لیڈر کو انصاف تین ماہ سے نہیں مل رہا۔اس دور میں ایک عام،غریب، یا مظلوم آدمی کو کیسے انصاف ملنا ممکن ہے۔ایسے ظالم،کرپٹ حکمران ایسی گنہگار قوموں پر اللہ تعالیٰ مسلط کر دیا کرتا ہے۔لگتا ہے ہمارے اعمال کی وجہ سے خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہے۔اسی لئے ہم پر کرپٹ حکمران وہ خدائے علیم ہم پر مسلط کرتا ہے اے اللہ ہمیں معاف کر ❁❁

# پاکستان کا قصور

کچھ دیر کے لئے یہ مان لینے میں کیا حرج ہے کہ دنیا کو پاکستان میں کچھ اچھا نظر نہیں آتا اور سب ممالک اس تاڑ میں ہیں کہ وہاں سے کوئی بُری خبر آئے اور یہ پراپیگنڈہ کریں اور پاکستان کو بدنام کریں۔اس میں پاکستان کا کیا قصور کہ جغرافیائی کے لحاظ سے پاکستان کو مشکوک نظروں سے ہر وقت دیکھتے ہیں۔مگر چین کی پاکستان سے کیسے ہمالیہ جیسی دوستی ہے۔جبکہ نہ اُن کا دین ایک، نہ زبان ایک، نہ کلچر ایک، نہ رنگ ایک، نہ نسل اور نہ تہذیب ایک۔جن اقوام کی سرحدیں پاکستان سے نہیں ملتی وہ کیوں اس ملک خداداد سے خداواسطے کا بیر رکھتے ہیں۔امریکہ وہ پاکستان کو ایک جوتا ڈرون کا مارتا ہے اور پھر تشریف پر امداد کا مرہم رکھ دیتا ہے۔پاکستان کے بے ضمیر کشکول برداران کی جیب کی گھڑی بن جاتے ہیں۔

ذرا اپنی کرتوتوں پر بھی غور کرلیا کرو۔ہر وقت مذہب کا ڈھنڈورا پیٹتے ہو جبکہ ساری عوام کا اسلام سے عملاً کوئی تعلق نہیں۔نعرہ اسلام کا چکر اسلام آباد کا۔سارے غیر اسلامی اعمال ہیں میری قوم کے۔کون سا عمل یہود کا پاکستانی قوم میں نہیں۔تم لوگوں نے ایٹم بم تو ساری قوم کی دولت لگا کر راتوں رات بنالیا۔مگر اسلامی اصولوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے انسانیت کی خاطر بنیادی سہولتیں اپنی قوم کو آج تک نہ دے سکے۔صحت، تعلیم، پانی، بجلی، انصاف، روزگار، امن، وغیرہ۔دہشت گردی میں جذباتی نوجوانوں کو (اسلام اور جہاد کے نام پر) جھونک کر مسلم کے لئے ہی مسلم کا خون اَرزاں کر دیا۔اسلام کے نام نہاد ٹھیکدار ممالک نے ضیاء الحق کے اسلام کو پروموٹ کرتے ہوئے اُمت مسلمہ کو گمراہ کیا۔جو اس وقت جہاد کے فتاویٰ دے رہے تھے آج انکل سام کے کہنے پر امامِ کعبہ اور نام نہاد علمائے سُو اُسی جہاد کو دہشت گردی قرار دینے لگے ہیں۔اُسی جہاد نے پاکستان کا نام ساری دنیا میں بدنام کیا اور اسلام کا چہرہ بھی مسخ کیا۔بلکہ سارے پاکستان کے چہرے کو لہولہان کر دیا۔جن ممالک نے جہادِ افغانستان میں روس کے خلاف امریکہ کی کھلے دل سے مدد کی تھی ان کے سر

براہوں کا انجام کیا ہوا۔ پاکستان کو اپنی پالیسیاں انسانی اور پُرامن بنانی چاہیئے۔ ایٹم بم جو بنایا تو ایک کالا باغ ڈیم بھی بنایا ہوتا۔ پاگلوں کی طرح انکل سام کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں اور آج پھر بڑا سا کشکول پکڑے در بدر پھر رہے ہیں۔مُلاں کو سر پر چڑھا کر تم نے اپنا چہرہ لہولہان کر لیا ہے۔ مذہب کی بے شک ضرورت ہوتی ہے مگر اُسے مقدم کر کے انسانی حقوق کا خون کرنا بھلا یہ تو اسلام نہیں۔

مساجد اور چرچز میں خون، کراچی میں خون، اقلیتوں کا خون، یہ سب کیا ہے۔اسلام ہے یا اسلام آباد۔اپنے محسنوں کو تم نے ایک ایک کر کے مارا اور بے عزت کیا، کیا یہ احسان فراموشی کی حد نہیں کی گئی؟۔احسان فراموشوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام کی ہماری قوم نے عزت نہیں دی۔یہاں تک کہ علمائے سُو کے کہنے پر اس کے قبر کے کتبے کو بھی کالا کر دیا۔اپنے ملک کو تم کچھ دے نہیں سکے۔اور اب بلوچوں کی کیا عزت ہوری ہے 70 لاکھ بلوچوں کو آپ سنبھال نہیں سکتے اور ٹھیکیدار بنتے ہو فلسطین کے، کشمیر کے، شام کے، عراق کے، مصر کے اور خود کو ایٹمی قلعہ کہتے ہو۔یہ ایٹم بم نہیں یہ غریب کے در پر بندھا ہوا ہاتھی ہے جس کی خوراک پوری نہیں ہو رہی۔سارے ادارے، واپڈا، سٹیل ملز، پی آئی اے، ریلوے، تمام تباہی کے کنارے پر ہیں۔تعمیر پاکستان میں جانیں دینے والے خاندانوں کو تم عزت نہ دے بلکہ ان کی عزت کا خون کیا۔چوہدری سر ظفر اللہ خان تو قادیانی تھے جو پہلے وزیر خارجہ مملکت خداداد تھے۔اُن کی آپ سے عزت نہ ہو سکی مگر عالمی عدالت نے اُنکو عزت دے دی پھر اُس کی جماعت کو دھونس اور دھاندلی سے، علمائے سُو کو راضی کرنے کے لئے غیر مسلم قرار دے دیا۔یوں ایک تحریک پاکستان میں حصہ لینے والی واحد جماعت کو قومی دھارے سے الگ کر دیا گیا۔اور منکرین پاکستان کو اسلام کے نام پر پروموٹ کیا گیا اور لال مسجد ان کا مرکز بنی، اسی طرح اب شیعہ کمیونٹی اور ہزارہ کمیونٹی کو شکار کیا جا رہا ہے۔کیا آفتابِ موسیقی بڑے غلام علی خاں بھی قادیانی تھے جو آپ کے سلوک سے تنگ آ کر واپس انڈیا سدھارے، قرۃ العین حیدر تو کرسچین نہ تھی مگر اسے بھی پاکستان چھوڑنا پڑا، سب دوسری اقلیتیں ملک چھوڑنے پر کیوں

مجبور کر دی گئیں، حسین شہید سہروردی کو پہلے وزیر اعظم بنایا پھر غدار بنا دیا، ملالہ اگر قوم کی بیٹی ہے تو وہ پاکستان کیوں نہیں آسکتی ۔ مانا کہ تمہاری بیرون ممالک میں کوئی عزت نہیں کرتا تم اپنوں کی کتنی عزت کرتے ہو، محمد علی جناح کو کتنی عزت دی، بس نوٹوں پر اس کی تصویر چھاپ دی۔ دفتر میں اُس کی تصویر لگا کر ہر وہ کام کیا جس کی اس نے ممانعت کی تھی ۔ خان لیاقت علی خان کو شہید کروایا گیا بھٹو کا جوڈیشنل قتل کیا گیا ، بے نظیر کو طالبان سے مروا دیا گیا ۔ فاطمہ جناح کو دیدہ دانستہ ہرا دیا گیا۔ جب 13 سال کی بچی توہین رسالت میں بری ہوتی ہے تو اُسے بھی جاں بخشی کے لئے بیرون ممالک رہنا پڑتا ہے۔ اور اس پر الزام لگانے والا پھولوں کا ہار پہنے انہی گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ بنگالیوں کو اتنی عزت دی کہ سات ہزار سالہ تاریخ میں اکثریت، اقلیت سے تنگ آکر بھاگ گئی تمہیں تو اس حرکت پر نوبلز پرائز ملنا چاہیئے تھا۔ جوش ملیح آبادی فقیر ہو کے کیوں مرا۔

فیض صاحب تو کہیں سے نہیں آئے تھے تو وہ بیروت، ماسکو، اور لندن رہنے پر کیوں مجبور ہوئے ۔ پھر تمہارے علمائے سوء اُسامہ بن لادن کو شہید، طالبان کو شہید، اور پاک فوج کے جوانوں کی شہادت کو حرام موت قرار دے رہے ہیں ۔ بے گناہ گورنر پنجاب جناب سلمان تاثیر کو قتل کرنے والا قادری، جیل میں وی آئی پی قید کاٹ رہا ہے جبکہ پاکستانی قوم کو خون میں نہلانے والے طالبان، جو جیلوں میں بند ہیں، ججز انکو سزائے موت دینے سے ڈرتے ہیں اور انتظامیہ طالبان سے ملی بھگت سے جیلیں تڑوانے میں ملوث ہے ۔ پاکستانی قوم، دونمبری، ڈرگ سمگلنگ، دہشت گردی، ملاوٹ، اقرباء پروری، دھونس دھاندلی، انٹرنیشنل بدمعاشی، سانحہ بمبئی، مجاہدین کی فراہمی، لال مسجد کیس، بے ایمانی اور کذب بیانی، کافر سازی میں نام پیدا کر چکی ہے۔ تم ایک غلام قوم کی ذہنیت رکھتے ہو۔ کبھی سرمایہ دار، کبھی تاجر کبھی امریکہ کبھی برطانیہ کو اور اب انتہا پسند کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ کوئی محبِ وطن پالیسی آپ سے نہیں بنتی، اقرباء پروری کی بدترین مثال تم ساری دنیا میں بن چکے ہو۔ بڑا بھائی وزیر اعظم، چھوٹا وزیر اعلیٰ، بیٹی سوارب کے پروگرام کی انچارج، بھانجا وفاقی وزیر بجلی، سمدھی، وزیر خزانہ، اس سے بھی ایک طویل فہرست اقرباء پروری کی ہے ۔ یوں بنے چلے ہیں امیر المومنین ۔ یہ

ایسے ہیں جو ہماری قوم کے بڑے بڑے بیوقوفوں سے سرزد ہوئے ہیں اس لئے پاکستان کا چہرہ مسخ ہوا ہے۔اور اسی لئے تن تنہا اور پریشان ہے۔اس قوم نے ملک کے ہر ایک محکمہ، ہر ایک شعبے میں ڈاکے ڈالے ہیں کہ اب سب اقوامِ عالم کا اس سے اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ پاکستان کا یہی قصور ہے۔ تاریخ گواہ ہے جب اقوام اپنا قبلہ درست نہیں کرتیں تو ہلاکو خان، چنگیز خان، کمال اتاترک کے ذریعہ خدا ظالموں پر بڑے ظالم مسلط کر کے انقلاب لایا کرتا ہے۔



# مختلف باتیں معذرت کے ساتھ

## تقسیم

یہ حساب کا بہت ضروری قاعدہ ہے۔سب سے زیادہ جھگڑے اسی پر ہوتے ہیں۔تقسیم کا مطلب ہے بانٹنا۔اندھوں کا آپس میں ریوڑیاں بانٹنا، بندروں کا بلیوں میں روٹی بانٹنا۔چوروں کا آپس میں مال بانٹنا۔اہلکاروں کا آپس میں رشوت بانٹنا۔مل بیٹھ کر کھانا اچھا ہوتا ہے۔بعض لوگ دال تک جوتوں میں بانٹ کر کھاتے ہیں ورنہ قبض کرتی ہے۔تقسیم کا طریقہ کچھ مشکل نہیں۔حقوق اپنے پاس رکھیئے۔فرائض دوسروں میں بانٹ دیجیئے۔روپیہ پیسہ اپنے کیسے میں ڈالئے۔قناعت کی تلقین دوسروں کو کیجیئے۔آپ کو مکمل پہاڑہ مع گر یاد ہو تو کسی کو تقسیم کی کانوں کان خبر نہیں ہوسکتی۔

## آخر میں ایک نصیحت

جو نہیں جانتا۔جو نہیں جانتا اور وہ نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا، وہ بے وقوف ہے اس سے بچو! جو جانتا ہے اور وہ نہیں جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے، وہ سویا ہوا ہے، اس کو جگاؤ جو جانتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے وہ عقلمند ہے اس کے پیچھے چلو!

*—*—*

# پاکستان

عزتِ نفس کسی شخص کی محفوظ نہیں
اب تو اپنے نگہبانوں سے ڈر لگتا ہے
ڈنکے کی چوٹ پر فرعونوں کو کہتا ہوں
مجھے سولی سے نہ زندان سے ڈر لگتا ہے

وطن عزیز کے نام نہاد معمارو! وطن عزیز کے گنہگارو! اے وطن عزیز کے بے غیرت کشکول بردار گداگرو! اُمت کے غدارو! ایمان وضمیر فروشو!

اے جعلی عدلِ جہانگیری کے نمائندو! غلام قوم کے غلام نالائقو! احساسِ کمتری کے متوالو! اے یزیدی طاقتوں کے پروردہ شمرو! ابن الوقت درباریو! بہترین اور بدترین خوشامدیو! منہ میں رام رام کرنے والو اور اوپر سے اللہ اکبر کا نعرہ لگانے والو منافقو! قبور کے پجاریو! لوط قوم کے نمائندو! دولت کے پجاریو! مُردوں کا کفن اُتارنے والو! پاکستان کو ازل سے نہ تسلیم کرنے والے مدنی، بخاریو، مودودیو! جج کے بیوپاریو! ابوالکلام کے شاگردو! لال رومال کے اور باچا خان کے پجاریو! منافقو! مفتی محمود کے جعلی فتویٰ بردارو! سرمایہ دارو! جاگیردارو! دھوکہ باز تاجرو! اسلام فروش مولویو! رویت ہلال کمیٹی کے نام پر حرام کھانے والو! ملک میں تین تین عیدیں کروانے والو! پنجابی طالبانو! سعودیہ سے مدرسوں کے نام پر مال کھانے والو! اُسامہ بن لادن کو امام اور والدمحترم ماننے والو! ضیاء الحق کو مردِ مومن کہنے والو! وطنِ عزیز کے معصوم مسلمانوں کی گندی تربیت کرنے والو خبیث مولویو! نکاحوں کے ٹوٹنے کا نام نہاد فتویٰ دینے والو! ملاوٹ کرنے والو! ساری مسلمان قوم کو اسلام کے نام پر لوٹنے والو! بردہ فروشو! نشہ، شراب، افیون ہیروئن کا سرِ عام کاروبار کرنے اور کرانے والو! جعلی ڈگری بردارو! کرپٹ کارکنوں! بوری بند لاشیں گرانے والو! ساری قوم کو ایک دوسرے سے لڑانے والے چوہدریو! انگریز کے جدّی پشتی غلامو! تم سب نے مل کر اپنا نہ ایمان قائم رکھا ہے اور نہ اس مملکتِ خداداد کو پروان چڑھنے دیا ہے۔ نہ اسلام کا دامن تھاما ہے اور نہ انسانیت کا۔ آخر تم

کون سی مخلوق ہو۔

کیا تم یہودیوں سے بھی بدتر ہو جو اسرائیل بنا کر اس کی ساری دنیا سے آبیاری کر رہے ہیں۔ بیوروکریٹو! تھانے فروخت کرنے والو! مساجد کو اپنا ذاتی گھر سمجھنے والے خود ساختہ نام نہاد عالمو! اس ملک کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے قربانیاں دیں۔ لاکھوں ماؤں نے اپنے جگر گوشے شہید کرائے۔ ہزاروں بیوہ ہوئیں۔ لاکھوں کے سامنے ان کے والدین اور جوان بیٹے کر پانیں مار مار کر شہید کر دیئے۔ تم سب کو اُن شہیدوں کی قسم۔ تم سب کو قائداعظم کی قسم، تمہیں اسلام اور ایمان کی قسم ! جاگو اور ملک کو جگاؤ۔ دیکھو افیمی چین کیسے جاگ اُٹھا ہے۔ تمہارے پاس تو قرآن کی دولت ہے اُسوہ حسنہ ﷺ ہے۔ تمہارے پاس ایک سراجاً منیرا ہے۔ جس سے تم استفادہ کر سکتے ہو۔ شرم کرو اپنی قوم کا سر نہ جھکاؤ۔ غیرت کرو۔ اپنے وطن کی ترقی کا سوچو۔ اپنی عزت کا سوچو۔ اپنے غریب بھائی کی طرف دیکھو۔ لالچ اور طمع کو چھوڑ دو۔ امن قائم کرو۔ سچ بولو۔ سب انسانوں کو برابری کے حقوق دو۔ انکساری اور عجز کو فروغ دو۔ محنت کرو۔ رشک کرو حسد نہ کرو۔ خالص اشیاء فروخت کرو۔ ملاوٹ نہ کرو۔ کسی کا حق نہ مارو۔ انصاف کرو۔ سچی گواہی دو۔ حق نہ چھپاؤ۔ اس زمین کو امن اور خیر سے بھر دو۔ لسانی، مذہبی، گروہی، صوبائی، رنگ ونسل کے تعصب سے بچو۔ خدا سے لو لگاؤ! قانون کی پاسداری کرو۔ ان چیزوں نے تمہیں گھن کی طرح کھا لیا ہے۔ تمہارا دشمن چالاک اور تم بے وقوف ہو۔ انسان بنو۔



# سینٹ کا الیکشن۔گدھے اور گھوڑے

غالباً 1975 میں فلمساز رنگیلے نے اس نام سے فلم بنائی تھی۔جس کا نام ''گدھا اور انسان'' تھا۔ یوں تو لوگ بڑی آسانی سے ایک دوسرے کو گدھا کہہ دیتے ہیں مگر خود کو کبھی بھی گدھا تصور نہیں کرتے۔گدھا ایک بہت ہی خوب جانور ہے جو ازل سے بار برداری کے کام آتا ہے۔یہاں اگر کوئی بھلا آدمی ہر وقت ہر کسی کے کام آئے تو آج کل لوگ اُسے بھی گدھا ہی کہنے لگ جاتے ہیں۔ جیسے کہ انسان کو شاطر،مکار، چالباز ہونا ضروری ہے۔ہر انسان زندگی میں کبھی کبھی گدھا ضرور بن جاتا ہے یا خود محسوس کرتا ہے۔مثلاً کسی کے بےلوث کام آنا، یا کسی سے دھوکہ کھا جانا، یا سادگی میں کوئی غلطی کر جانے سے انسان خود کو کبھی کبھی گدھا سمجھتا ہے۔گدھا یوں تو کوئی مکروہ چیز نہیں۔ایک پالتو جانور ہے۔مگر آج کل گدھے کی شان بلند ہو رہی ہے۔دیکھا جائے تو امریکہ کی حکمران پارٹی کا نشان گدھا ہے۔اگر مزید غور کیا جائے تو سب سے بڑا گدھا تو اُبامہ ہے۔جس کو بڑے بڑے جانور کیا بادشاہ، کنگ،صدور،سلام کرنے میں ہی اپنا بھلا سمجھتے ہیں۔

ہمارے ملک پاکستان کا شیر تو دُم ہلائے اُس گدھے کے آگے پیچھے پھرتا ہے مگر وہ اُسے گھاس تک نہیں ڈالتا کیونکہ گھاس تو وہ خود ہی کھا جاتا ہے۔پھر ہم نے بہت اقسام کے گدھے دیکھے ہیں خصوصاً عرب علاقے میں جب سے تیل نکل آیا ہے گدھے تو گئے کام سے۔گدھوں کی جگہ حضرتِ انسان نے لے لی ہے۔سچ مچ انسان گدھا بن گیا ہے۔جس ہستی نے ان ریگزاروں کو تیل جیسی دولت دے کر سونا بنا دیا۔اس ہستی کو تو یہ لوگ بھول بیٹھے مگر گدھوں کو سلام کرتے کرتے خود ہی گدھے بن گئے ہیں۔اب ان عربوں کی حماقتوں کے قصے سب دنیا میں لوگ حقارت سے بیان کرتے ہیں۔ان کی شاہ خرچیاں، ان کے گدھوں جیسے فیصلے،حرکات، زبان زدِ عام ہیں۔جیسے گدھے کو مستقبل کی فکر نہیں ہوتی، اپنی قوم کی فکر نہیں ہوتی، اپنی برادری کی فکر نہیں ہوتی، کوئی مدّو جزر کی فکر نہیں ہوتی یہی ان کا حال ہے۔پھر ہماری قوم پاکستانی تو اس کام میں بھی آگے نکل گئی۔کیونکہ

ہر کام میں یہ ہمیشہ آگے ہوتی ہے۔ عربی علاقے کا گدھا تو کیا، کوئی کتا بھی سامنے آجائے تو ہمارے گدھے لالچ اور عقیدت سے دُم ہلانے لگ جاتے ہیں۔ دُم ہلاتے ہلاتے ہم نے اپنا ستیاناس ہی کر ڈالا۔ پہلے جہادِ افغانستان کے چکر میں مدرسے کھول کر اپنی قوم کو بے وقوف بنایا، پھر اس مسلسل شکم پُری کے لئے نیم ملاں نے ان گدھوں کی پیروی میں اور امریکی گدھوں کی جی حضوری میں اپنا جسم تار تار کر لیا۔ اب وہ خون منہ کو لگ گیا ہے۔ جو گدھے کبھی گھاس کھاتے تھے اب ایک دوسرے کا مذہب کے نام پر خون پیتے ہیں۔ گدھوں سے بھی آگے دو ہاتھ بڑھ کر گندی حرکات کرتے ہیں جعلی ڈگری سے، لے کر قتل و غارت، ڈرگ، ملاوٹ، دھوکہ دہی، فریب دہی، مکاری، بے ایمانی ان کا وطیرہ بن گئی ہے بلکہ عربی اور امریکی گدھوں سے زیادہ آگے ہیں۔ ساری پارلیمنٹ میں بھی گدھوں جیسی سوچ کی قراردادیں پاس ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً کسی بھی کلمہ گو کو کافر قرار دے دینا یہ گدھا پن نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ پھر سب سے بڑی جمہوری پارٹی کے صدر کو پھانسی دے دینا گدھا پن ہی تو ہے۔ بعد میں عدلیہ کا یہ تسلیم کر لینا کہ یہ عدالتی قتل تھا۔ گدھوں جیسی حرکت ہے۔ اب کچھ گدھے ڈھینچوں، ڈھینچوں کر رہے ہیں۔ نہ جانے کون سے گدھوں کی پیروی میں حکومت کو گرا رہے ہیں کیونکہ حکومت نے الیکشن میں گدھے پن کا ثبوت دیا ہے۔ گدھے کو بے شرمی کا سمبل بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے گدھے بھی موجود ہیں جن کے بزرگ، بہن بھائیوں نے تحریک آزادی پاکستان میں اپنے خون کی، عصمت کی، اولاد کی، مال جائیداد کی قربانیاں دیں۔ اس میں بڑے بڑے گدھے شامل ہیں بلکہ گدھیاں بھی۔ پھر ہماری قومی عادت یہ ٹھہری ہے کہ جب کوئی حکمران آتا ہے۔ پہلے پہلے تو ہم اسے انسان ہی قرار دیتے ہیں جب وہ ہماری ذاتی خواہشات کو پورا نہیں کر پاتا تو پھر ہم سب اسے گدھا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں ہر بات بعد میں سمجھ آتی ہے۔

بات کہاں سے نکلی اور کہاں چلے گئی، اب آپ کو گدھے اور انسان کی صفات میں واضح فرق نظر آ گیا ہوگا۔ آج کل سینٹ کے انتخابات زوروں پر ہیں۔ گھوڑوں اور گدھوں کے دام لگ رہے

ہیں۔کچھ باریش بھی ہیں اور کئی باطنی باریش ہیں۔ان سب نے بہت بڑے گدھے پن کا ثبوت دیا ہے۔مقصد تعمیر وطن بدل کر رکھ دیا ہے۔دنیا کے گدھے تو گھاس کھاتے ہیں مگر ہمارے گدھے، گھوڑے سب کچھ کھا جاتے ہیں صرف غیرت کے سوا۔بعض گدھے کرکٹ کے بدل میں بھی ڈالر کھاتے ہیں اور اپنی قوم کا نام خوب روشن کر رہے ہیں۔ہمارے گدھے کرپشن میں ماہر مگر گوشت حلال کھاتے ہیں۔ویسے نفع زیادہ کمانے کے کے لئے اب گدھوں گھوڑوں کا گوشت بھی فروخت ہونے لگ گیا ہے۔مردہ جانوروں کا بھی گوشت عام فروخت ہوتا دیکھا گیا ہے۔ہمیں اس لئے ان منافع بخش کاروبار سے گھن نہیں آتی گدھے جو ہوئے۔ہمارے گدھے اتنے بھی گدھے نہیں کہ بھوکے رہیں ان سب نے اپنی نسلوں کو سنوارنے کے لئے خوب دولت جمع کی ہے۔بعض تو اتنے ڈھیٹ نکلے کہ حج سکینڈل سے بھی روپے اکٹھے کرنے کا رستہ نکال لیا۔کئی نے تو عدل کو بھی فروخت کیا ہے۔

آج کل گدھے صرف گھاس پر ہی گزارہ نہیں کرتے ان کو ہر وہ چیز درکار ہے جو اہل مغرب کے معیار سے بھی بلند ہو۔شان والی ہو۔مگر عجیب بات ہے ہمارے گدھے اُن گدھوں سے بھی بہت ڈھیٹ ہیں جن کی پیٹھ پر ڈنڈے برس رہے ہوں اور خود بڑی بے غیرتی سے سب کچھ ہڑپ کئے جاتے ہوں۔اور کھانے کی سپیڈ اس قدر تیز ہے کہ اللہ پناہ۔سارے محکمہ جات کو چٹ کر گئے ہیں۔پی آئی اے،اسٹیل ملز، واپڈا، یعنی کہ سب محکمے ان کی خوراک بن گئے ہیں۔بعض گدھے مسلسل کھا کھا کر ترقی کر کے خچر بھی بن گئے ہیں اور بعض نے تو اسقدر ترقی کی ہے کہ گھوڑے لگنے لگے ہیں۔بعض گدھے جب اپنی لدھ کھلارنے لگ جاتے ہیں تو وہ ترقی نہیں کر پاتے اور صرف لوکل گدھوں میں ہی ان کا شمار رہتا ہے۔بعض گدھے تو اتنے خونخوار ہو چکے ہیں کہ دن دہاڑے لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کا خون تک پی جاتے ہیں ان گدھوں کی غالباً ماں شیرنی تھی۔اتنے خونخوار ہیں کہ خود تو بصیرت سے محروم ہیں ہی مگر بصارت سے محروم انسانوں پر بھی ظلم سے بھی نہیں باز آتے۔ایسے ڈھیٹ ہیں کہ اگر ان کی کوئی غلطی یاد دلائی جاتی ہے تو ڈھیچوں ڈھیچوں کرتے اپنا

قصور دوسرے گدھوں پر تھوپ دیتے ہیں افسوس ان گدھوں نے مذہب کو بھی نہیں بخشا۔ اسے خوب سب چیزوں کی طرح مس یوز کیا ہے ۔مغرب کے لوگ گدھیوں کی طرح ننگے پھرتے ہیں مگر ہمارے گدھے مادر پدر آزاد ہیں۔افسوس کہ میرے وطن کے امیج کو ان گدھوں نے تباہ کر دیا ہے۔ ساری دنیا میں جگ ہنسائی ہو رہی ہے مگر گدھوں کو اس سے کیا۔ جو بھی دو نمبر کام ہوتا ہے ساری دنیا میں ۔اس کا کھرا میرے وطن کو ہی آتا ہے ۔اور میرے وطن کے گدھے اس بدنامی پر بڑے فخر کناں ہیں کیونکہ گدھے جو ہوئے ۔ ہماری سب کھیلیں بھی تباہی کا شکار ہو گئی ہیں ۔ کیونکہ ہم اس کے بدل میں ڈالر بھی لیتے ہیں سمجھ جو نہیں گدھے جو ہوئے ۔ یقیناً ہم سب گدھے تو نہیں ۔ بہت اچھے انسان بھی ہیں مگر گدھوں کی اکثریت نے ہمارا دماغ بھی اپنے جیسا کر لیا ہے۔اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہمارے اردگرد کے علاقوں میں بھی گدھے کثرت سے ہیں، پہاڑی علاقے کشمیر، سرحد، افغانستان، پنجاب میں بھی گدھا صدیوں سے زیادہ بار برداری کے کام آ رہا ہے۔ ہم نے گدھے کی انتھک محنت سے تو کوئی اثر نہیں لیا مگر اس کے دماغ کو اپنا لیا ہے۔اس لئے ہم اپنے مقام، اپنے دین ،اپنے وطن سے، اپنے آباواجداد سے بالکل بے خبر اور گدھوں جیسا رویہ رکھے ہوئے ہیں۔میرے وطن کو قائداعظم نے اچھے انسانوں کے بنایا تھا۔ مگر اب اس پر گدھوں کا قبضہ ہے۔ایٹم بم تو بنا لیا مگر روٹی کپڑے اور مکان کا کچھ نہ کیا بلکہ بجلی صاف پانی صحت و تعلیم کے لئے بھی کچھ نہ کر سکے۔ گدھے جو ہوئے ۔مگر ہم پھر بھی اپنی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھتے گدھے جو ہوئے ۔ اے اللہ اس قوم پر اپنا فضل کر۔



# کیا ہم مہذب اور معقول انسان ہیں؟

## جوزف کالونی کا واقعہ

مولوی مشتاق ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چٹکی میں شناختی کارڈ بھی پکڑا ہوا تھا، وہ ہاتھ جوڑتا تھا، ہجوم کی منتیں کرتا تھا۔ انہیں شناختی کارڈ دکھاتا تھا، اور دُہائیاں دیتا تھا، مگر ہجوم جب بپھر جائے تو پھر اسے مشتاق اور جوزف میں فرق نظر نہیں آتا۔ یہ مولوی اور فادر دونوں کی پہچان کھو بیٹھتا ہے اور بادامی باغ کی عیسائی بستی جوزف کالونی میں بھی اس وقت یہی ہو رہا ہے۔ مولوی مشتاق نے اپنے گھر کے دروازے پر ''یہ مسلمان کا گھر ہے'' بھی لکھ کر لگا دیا۔ اس نے دیوار پر کوئلے سے اللہ اور رسول کا نام بھی لکھ دیا۔ لیکن ہجوم جنونی ہو چکا تھا۔ اور انسان سب سے پہلے انسانیت کھوتا ہے۔ یہ بھول جاتا ہے کہ میں انسان ہوں۔ اور میرے سامنے موجود لوگ بھی انسان ہیں۔ اور ہم سب ایک جیسے ہیں۔ گوشت پوست کے دھڑکتے پریشان ہوتے انسان جنہیں بارش گیلا، دھوپ گرم، برف ٹھنڈا، اور آگ جلا دیتی ہے۔

یہ بھول جاتا ہے کہ کہ ہم سب ایک جیسے ہیں، دُکھی، پریشان، متکبر، اکڑ خان، شیخی خور اور کنفیوز، ہم سب ایک جیسے ہی تشکیک کے شکار، تھُڑ دلے، جلد باز، چغل خور، ناراض اور منافق، اور ہم سب ایک جیسے ہیں، چیختے چلاتے، منتیں کرتے، اور اگر ہاتھ میں ڈنڈا ہو تو فرعون، مگر جنون میں ہم یہ تمام حقیقتیں کھو بیٹھتے ہیں، ہم دوسرے انسان کا قیمہ بنا دیتے ہیں، دنیا میں شیر کو شیر نہیں کھاتا، کتے پر کتے کا گوشت حرام ہوتا ہے، چیلیں چیلوں پر حملہ نہیں کرتیں، اور حتیٰ کہ سور بھی سور پر حملہ نہیں کرتا، مگر انسان انسان کو کھا جاتا ہے، یہ دوسرے انسان کو چیر پھاڑ جاتا ہے، یہ اس کا قیمہ کر ڈالتا ہے، یہ اس کے گلے میں جنون کا ڈھول لٹکا کر دیوانہ وار رقص کرتا ہے۔ اور مولوی مشتاق بھی انسانی جنون میں پھنس گیا تھا، لوگ اللہ اور رسول کے نعرے لگا رہے تھے، یہ غلامی رسول میں موت کی حدیں عبور کر جانا چاہتے تھے اور نعرہ بازی کے اس ریلے میں یہ بھول گئے تھے کہ ان کے سامنے کوئی عیسائی یا

گستاخ رسولؐ نہیں کھڑا اُن کے سامنے ان کا ہم مذہب، ہم مسلک مولوی مشتاق کھڑا ہے، تین جوان بچیوں کا باپ مولوی مشتاق ہاتھ جوڑ کر انہیں خدا رسول کا واسطہ دے رہا ہے۔ یہ انہیں کلمہ پڑھ پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا یقین بھی دلا رہا ہے، لیکن ہجوم نے اسے مولوی اور مسلمان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہجوم نے مولوی مشتاق کو دھکا دیا وہ دہلیز سے دور جا گرا۔ ہجوم نے اس کے دروازے کی کنڈی توڑی، اور اس کے گھر کو آگ لگا دی، مولوی کا گھر اس کی تین بچیوں کے جہیز کے سامان کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا، مگر ہجوم کے دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی، یہ آگے سے آگے ہی بڑھتا گیا اور یوں ہفتہ 9 مارچ کے دن بادامی باغ لاہور کی جوزف کالونی کے 177 گھر اور 16 دکانیں راکھ ہو گئیں۔ دس ہزار سے زائد فرزندانِ توحید پانچ گھنٹے جوزف کالونی میں جنون کا رقص دہکاتے رہے اور حکومت جی او آر میں اقتدار کے مزے لوٹتی رہی۔

یہ تماشہ جمعرات 7 / مارچ کے دن دو نشیئوں کی لڑائی سے شروع ہوا، اخباری اطلاع کے مطابق ساون مسیح نشے میں دُھت حجام شاہد عمران کی دکان پر آیا، دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی، دونوں ایک دوسرے کو گالی گلوچ کرنے لگے، اس دوران دوسرا نشئی شفیق عرف چھیکو وہاں پہنچا، یہ بھی نشے میں دُھت تھا، یہ ساون مسیح کا مخالف تھا، اس نے شور کر دیا، ساون گستاخی کر رہا تھا اور یوں دو لوگوں کی لڑائی صلیبی جنگ میں تبدیل ہو گئی، یہ معامل اگلے دن مسجد تک پہنچ گیا، وہاں سے مختلف پریشر گروپس تک آیا اور یوں دس ہزار لوگوں نے جوزف کالونی پر حملہ کر دیا، ساون مسیح اس وقت تک بھاگ چکا تھا، مگر جوزف کالونی میں 255 خاندان، 278 گھر، درجنوں دکانیں، اور ساڑھے چار ہزار مکین وہاں موجود تھے، ہجوم نے ساون مسیح کا بدلہ جوزف مسیح کی کالونی سے لینا شروع کر دیا، گھروں کو آگ لگا دی گئی، سامان لوٹ لیا گیا، (جو کہ مسلمانوں پر حلال ٹھہرا) دکانیں جلا کر راکھ کر دی گئیں، اسلام کی یہ تصویر پوری دنیا میں ہمارا اشتہار بن گئی، پاکستان کی مسیحی برادری ہڑتال پر ہے اور سڑکوں پر مارچ کر رہی ہے، یہ دھرنے دے کر بیٹھی ہے، پاکستان کے تمام مشنری سکول بند کر دیئے گئے ہیں اور چرچ کا سٹاف حکومت کی بے بسی پر بددعائیں دے رہا ہے۔

کیا یہ اسلام ہے؟ اور کیا یہ ہے اللہ کے سچے نبی اور دین کی اصل تصویر؟ لیکن کیا ہم نے جوزف کالونی پر حملہ کر کے یہ ثابت نہیں کر دیا ہم میں اور شیطان میں کوئی فرق نہیں۔ہم بھی ایک شخص کی ذاتی لڑائی کی سزا پوری بستی یا پوری کمیونٹی کو دیتے ہیں، اور ہمارا جنون جوزف کالونی میں رہنے والے مولوی مشتاق کو بھی نہیں بخشتا۔ہم مسلمان بچیوں کا جہیز جلا دیتے ہیں، ہم میں اور شیطان میں کیا فرق ہے؟ جوزف کالونی کے واقعہ نے تین باتیں ثابت کر دیں۔ایک ہم من حیث القوم جنون کا شکار ہیں یہ ملک ساڑھے سات لاکھ مربع کلومیٹر پاگل خانہ بن چکا ہے، اور نیم ملاں نے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔اور ہم میں سے سب نے اس پاگل خانے میں ڈیڑھ اینٹ کی اپنی اپنی مسجد بنا لی ہے، ہماری اس مسجد کے باہر ہر شخص کافر ہے۔ ہر شخص گستاخ ہے، ہر شخص غدار ہے، ہر شخص منافق ہے، اور یہ سب قابل گردن زدنی ہیں یہ اگر نہ ملیں تو ان کا گھر، اُن کا خاندان، اُن کی دکان، اُن کا کھیت ہم پر حلال ہوجاتا ہے۔

ہم دوسرے کے مندر، چرچ،، اور عبادت خانے تو دور کی بات اُنکی مسجد قبول نہیں کرتے، ہم اس کی نماز، روزے، اس کے قران مجید اور اس کی داڑھی کو مشکوک سمجھتے ہیں ہم نے اس ملک میں برادریوں، خاندانوں، قبیلوں، نسلوں، زبانوں اور مسالک کو بھی مساجد کی سہولت دے دی ہے۔ہم پٹھان ہیں تو ہماری پٹھانیت ہماری مسجد ہے، ہم پنجاب، سندھی یا بلوچی ہیں ہم اُردو سپیکینگ یا لبرل ہیں تو ہماری مسجد ہے اور ہم اس مسجد میں کسی اور کو قبول ہی نہیں کرتے۔اور نہ اپنی مسجد کی بغل میں کسی دوسری مسجد کو برداشت کرتے ہیں اور یہ جنون ہمارا لائف سٹائل بن چکا ہے۔دوسری حقیقت اس ملک میں غریب کا صرف ایک مذہب ہے اور اس مذہب کا نام غربت ہے۔کسی ایک غریب بدبخت کی سزا پوری بستی کو ملتی ہے اور اس بستی کا مولوی مشتاق بھی اس کی زد میں آجاتا ہے اور ریاست جوزف کو بچا سکتی ہے اور نہ ہی مولوی مشتاق کو، اور تیسری اور آخری حقیقت ہم اس ملک میں ڈگری کے بغیر کسی کا دانت بھی نہیں نکال سکتے، ہم گردے کے علاج کے لئے کسی سپیشلسٹ کے پاس جائیں گے اور علاج بھی کسی مستند ڈاکٹر سے کروائیں گے لیکن گستاخی کے فیصلے کے لئے ہم اپنی

ذات میں مفتی اعظم ہیں ہم کسی کو بھی کسی وقت گستاخ قرار دے کر اس کے پورے خاندان کو قتل کرنے ،اس کی پوری بستی کو آگ لگانے کا حکم دے سکتے ہیں اور پورا شہر ہمارا اس معاملے میں ہمارا مقتدی بن جائے گا۔ یہ فتویٰ کوئی شفیق عرف چھیکو یا نیم ملاں ہی کیوں نہ دے، ہم مرنا اور مارنا اپنے اوپر فرض کر لیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات فراموش کر دیں گے اور قرآن مجید کو طاق میں رکھ کر بھول جائیں گے ۔نماز ہمیں آتی نہیں پھر بھی کسی داڑھی دار ملاں کے فتوے پر جوزف کالونی جلا کر راکھ کر دیں گے اور پھر اس کارنامے کے بعد اللہ تعالیٰ سے توقع کریں گے کہ وہ ہمارے سارے گناہ معاف کر دے گا۔ یہ ہے ہمارا اسلام، اسلام آباد زندہ باد۔

(ماخوذ)



# عقل

کسی نے عقل سے پوچھا کہ تم کہاں رہتی ہو اس نے جواب دیا دماغ میں۔ پھر شرم سے پوچھا کہ تم کہاں رہتی ہو اس نے کہا کہ آنکھ میں۔محبت سے پوچھا تو اس نے کہا دل میں۔ پھر غصہ کی باری آئی تو اس نے کہا دماغ میں۔لیکن دماغ میں تو عقل رہتی ہے غصہ بولا کہ جب میں آتا ہوں تو عقل بھاگ جاتی ہے۔عشق سے پوچھا تو کہاں رہتا ہے۔ بولا آنکھ میں۔آنکھ میں تو شرم رہتی ہے عشق بولا میرے آنے سے شرم بھاگ جاتی ہے۔لالچ سے پوچھا تیرا ٹھکانا کہاں ہے بولا دل میں۔لیکن دل میں تو محبت رہتی ہے لالچ نے کہا میرے آنے سے وہ رفو چکر ہو جاتی ہے۔

*-*-*

# وطن پاک

پاکستانی اخلاق باختہ قوم بن چکے ہیں۔ پاکستانی ہر محکمہ اپنا معیار اور وقار کھو چکا ہے۔ اپنے حقوق وفرائض سے غافل یہ لوگ جانوروں کی طرح اپنے نظام کو چلا رہے ہیں برائے نام یہ ادارے زندہ ہیں۔ کسمپرسی کی حالت ہے۔ ہر محکمہ خسارے کی طرف رواں دواں ہے۔ ہر ذمہ دار افسر اپنی شکم پُری کے چکر میں محکمے کو کھانے میں مصروف ہے۔ محکمہ ریلوے چار ہزار ریلوے لائن اکھیڑ کر فروخت کر چکا ہے۔ اور اُس کی زمینوں پر بڑے بڑے مگرمچھوں کا قبضہ ہے۔ اسٹیل ملز بھی زبوں حالی کا شکار ہے۔ پی آئی اے کے جسم پر پیاسی (لیبر یونین) نے اور بڑے بڑے مگرمچھوں نے اپنے خونخوار پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ واپڈا کا حال بھی اُس سفید ہاتھی جیسا ہے کہ جس کی خوراک پوری نہیں ہو رہی۔ چیک اور بیلنس کا کوئی نظام نہیں۔ طالبان کی طرح ہر چیز سزا اور جزا سے بالاتر ہے اور سب محکمے اللہ کے نام پر زندہ ہیں۔ محکمہ صحت مردِ بیمار کی طرح ہے۔ گورنمنٹ ہسپتال ویران پڑے ہیں۔ نہ ڈاکٹرز ہیں نہ دوائی۔ پرائیویٹ ہسپتالوں کے اندر رونق خوب ہے مگر وہاں بھی انسانیت سوز واقعات عام ہیں۔ تھر اور مٹھی بڑی مثال آپ کے سامنے ہے۔ بیروزگاری عام ہے۔ حکومت نام کی چیز نظر نہیں آتی۔ پانی، بجلی، تیل، گیس اکثر نایاب۔ غریب کا چولہا نہیں جل رہا، لوگ خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ قانون نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ قانون غریب کے لئے ہے جو پکڑا جائے۔ تاجر اور جاگیردار کے وارے نیارے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس وسائل ہیں اُن لوگوں نے اس جہنمی ملک سے ہجرت شروع کر دی ہے۔ آپ کو کوئی معیاری، لائق، ذہین، ٹیلنٹڈ انسان کم ہی ملے گا۔ میرٹ پر تو بھرتی ممکن نہیں بھرتی رشوت کے حساب سے ہوتی ہے یا اقرباء پروری عام ہے۔ بے شک جعلی ڈگری ہو۔ اگر آپ کو کسی خلاف شکایت ہے تو کورٹ میں جائیں گے مگر وہاں آپ کا مخالف بیس سال اسٹے آڈر پر بچتا رہے گا۔ اور آپ اپنا روپیہ برباد کر کے ناکام و نامراد رہیں گے۔ حکومت کے نام پر کوئی بھی کام یا کاروبار کامیاب نہیں بلکہ فیل ہے۔ اگر کوئی نجی طور پر کام یا کمپنی چلائے تو یہ ممکن ہے کہ چل جائے۔ مگر وہ بھی منتھلی دے کر یا بھتہ دے کر۔

پاکستانی ہر سیاسی بھی لیڈر بد کردار ہے۔ پاکستانی ہر فرد کیریکٹر کے لحاظ سے بدنام زمانہ ہے۔ علمائے سُوا اپنے شکم کے چکر میں قوم کی تربیت نہ کر سکے۔ خود کو کم علم و جاہل ہونے کی وجہ سے صحیح منزل کا بروقت تعین نہ کر سکا۔ پاکستانی اگر کہیں بھی جاتا ہے وہ نہ تو اخلاقی قوانین کی، نہ ملکی قوانین کی، نہ ہی انسانی قوانین کی پاسداری کرتا ہے۔ حتیٰ کہ حج اور عمرے کے بہانے بھی امیگریشن قوانین کی خلاف ورزی کر کے عربوں کی جیلوں میں کافی تعداد میں قیدی بنا ہوا ہے۔ ضیاءالحق کے دور میں ڈرگ مافیاء کا کاروبار چونکہ جوبن پر تھا۔ اور یہ اسلامی کاروبار کرنے میں ہر مومن ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو تھا۔ اس طرح ملک پاک کی خوب عزت افزائی ہوئی۔ جہاد افغانستان میں سعودیہ اور امریکہ نے روس کے مخالف ہر جوان کو افغانستان پہنچنے کی ترغیب دی۔ دیوبندیوں کو مدرسے کھولنے کی عام اجازت ملی۔ اور علمائے سُو کے ہاتھ میں ڈالر اور کلاشنکوف آئی۔ جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام اس گروہ کی سرخیل بنیں۔ وہ ملاں جو آج تک جمعرات کی روٹی پر پل رہا تھا وہ جہاد کے نام پر فسادی بن بیٹھا۔ اور اس نے بازیچہ اطفال کی طرح اس خطہ اُمن کو آگ میں جلا دیا۔ مجبوراً اس وقت کے جرنیل اور بڑے بڑے طرلے خان اس آگ کو لگانے کے حامی بن گئے۔ اُس زمانے سے ان کے نیچ گدھے گھوڑوں کی جگہ بڑے بڑے ڈالے، فوروِیل ڈرائیو گاڑیاں آگئیں۔ طالبان بھی ان لوگوں نے بنائی جو کہ اب ظالمان بن چکی ہے۔ یہ سب لوگ فوج سمیت، سیاسی لیڈروں، اور علمائے کرام سمیت کہتے تھے کہ طالبان ہمارے بچے ہیں۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

خدا کی قدرت اللہ تعالیٰ کمینے کو رزق کی فراخی اور آسائش سے بھی آزماتا ہے۔ ایسی ہوا چلی کی میرے پاک وطن کا بچہ بچہ اس فیشن میں بہہ گیا۔ سیاسی لیڈروں نے اپنا سٹینڈرڈ بھی اونچا کر لیا مگر حرام خوری سے۔ اخلاقی معیار گرتا گیا اور ذاتی معیار زندگی دوبالا ہو گیا۔ جھوٹ سچ کی تمیز باقی نہ رہی۔ انتخابات میں کروڑوں روپے خرچ کر کے مرضی کے ممبر کو جتوانے کا رواج ہو گیا۔ پھر گھوڑے بکنے لگے اور نظامِ بچہ سقّہ چلنے لگا۔ قوم کلیتاً اخلاقی پٹڑی سے اُتر گئی۔ مُلاں نے دین کی تشریح بھی

وقت کے عین مطابق کر ڈالی، متعہ حلال ہو گیا، جھوٹ جائز ہو گیا، مجبوری میں رشوت کھانا بھی جائز ٹھہرا۔ اغواء برائے تاوان بھی جائز ہوا جس طرح کہ ایک ہی ملک میں تین تین عیدیں ہونے لگیں۔ اس طرح علمائے سُو نے اسلام کی شکل اسلام آباد جیسی بنا ڈالی۔ اب ہم رو رہے ہیں پہلے چُپ رہے جب مزا آ رہا تھا۔ پھر نائن الیون کا زمانہ آیا تو ہمارے لیڈروں نے امریکہ سرکار کو بے وقوف بنانے کے لئے خوب اُن سے ڈالر لے کر اُن ہی سے چالاکیاں کرتے رہے۔ جیسے ایک نادان بچہ اپنے ہی والدین سے ہیرا پھیری کیا کرتا ہے۔ آخر نقصان اپنے ملک کا ہی ہوا۔ افغانستان سے تو ہمارے لیڈر اور ملک قابو نہ آتے تھے۔ ہمارے لیڈر امن کی آشا لے کر لیڈروں کے اردگرد پھر رہے ہیں۔ ہم اسلام کے دھوکے میں میر جعفر و میر صادق کو اپنا راہنما بنا بیٹھے ہیں۔ اب ہمارا انجام بخیر نہیں۔ پہلے تو ہم روز بروز تنزل کی طرف جا رہے رہے تھے مگر اب جہنم کی طرف رواں دواں ہیں۔ کیونکہ ہم نہ تو انسان کے معیار پر پورے اُترتے ہیں نہ مسلمان کے معیار پر۔ ہنود و یہود سے ہم مکاری و عیاری میں آگے ہیں، ظلم و بربریت میں بھیڑیئے ہیں۔ دوستی دشمنی کا ہمیں پتہ نہیں۔ ہم میں کردار نام کی کوئی چیز نہیں، اتفاق و اتحاد عنقا ہو چکا ہے، علم و عمل سے ہم بالکل فارغ، عزت و ناموس سے نابلد جانور ہیں۔ ایسی اقوام کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہو رہا ہے بظاہر ہم خدا کو ایک مانتے ہیں مگر خدا کی ایک بھی نہیں مانتے۔



## آب و ہوا

عورت کی آب و ہوا کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مشاہدات یہ بتلاتے ہیں کہ اوائل عمر میں آب و ہوا سرد خشک ہوتی ہے بگولے چلتے ہیں اور آندھیاں بکثرت آتی ہیں'' درمیانی عمر میں گرم مرطوب ہو جاتی ہے۔ طوفان آتے ہیں۔ بعض اوقات اولے پڑتے ہیں جس کے بعد بعض غیرت مند سر منڈوا لیتے ہیں اکثر بجلیاں کڑکتی ہیں اور بار بار گرتی ہیں۔ کئی بار سرد لہر آتی ہے جس کے باعث مردوں کے دانت کڑکڑانے لگتے ہیں۔

# اخلاق وانسانیت کا فقدان

بنیادی طور پر ہمارے ملک میں اخلاقیت کا فقدان ہے۔اصل میں اس قوم کی تربیت غلط رنگ سے کی گئی ہے۔بھوکے لیڈروں نے اور غلام قوم کے مکروہ چہروں نے ان کی اپنی فطرت کے آئینے میں اس معصوم قوم کو جانور بنادیا ہے۔اس میں زیادہ تر مدرسے اور مساجد میں درس دینے والوں نے ،غلط مکتبِ فکر والوں نے ،خودساختہ اسلام کے علمائے سُو نے اس قوم کو فرقوں میں بانٹ کر، نئے نئے برانڈ کے مذاہب کا تعارف دے کر اس قوم کا دیوالیہ نکال دیا ہے۔کسی فرقے نے بھی اپنے لوگوں کی کردار سازی نہیں کی۔اپنی شکم پُری کے سامان تو کئے ہیں۔مگر قوم کے درد میں علمائے سُو نے کوئی معقول کردارادانہیں کیا۔جب پاکستان بناتو یہ طبقہ مولویاں سبھی پاکستان کے خلاف تھے۔اگر آپ تاریخ پڑھیں تو عجیب حقایق پر آپ کی نظر پڑے گی۔

یہ دیوبندی، بریلوی،مودودی، مدنی، چکڑالوی، بخاری، قادری،چشتی،سلفی، باچا خانی سب ایجنٹ بن کر پاکستان کے متعلق عجیب عجیب ہرزہ سرائیاں کرتے تھے۔جب پاکستان بن گیاتو کسی نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ اب آپ اسی پاکستان میں آگئے ہیں۔تو کہنے لگے۔''ہم نے اس پاکستان کو بازاری عورت کی طرح قبول کر لیا ہے۔اسی طرح باقی علمائے سُو کا نام لینا مناسب نہیں۔ایک ہی مثال کافی ہے۔باقیوں کے خیالات پاکستان کے متعلق بہت ہی نازیبا اور مکروہ تھے۔جب پاکستان بناتو یہ سب نے اسی پلیدستان میں پناہ لی۔اور اپنی بدنیتی کے مطابق اس ان پڑھ قوم کی تربیت کی جو ناخواندہ ہونے کی وجہ سے پیر پرست،قبر پرست، کی جہالت کے اندھیروں میں بھٹکادی گئی اور اسے واقعی پلیدستان بنا کر دم لیا۔اب اخلاقی بحران اسقدر بڑھ چکا ہے کہ آپ کو ایک بھی باکردار انسان نہیں ملتا۔کیونکہ اگر اب کوئی نیک بننا بھی چاہتا ہے تو اس کو نیک بننے نہیں دیتے۔کیونکہ اکثر اخلاقیات کی پٹڑی سے اُتر چکے ہیں۔رشوت، چوری، کرپشن، جھوٹ، ملاوٹ، چوری، زنا،شراب خوری،حرام خوری، بےایمانی، بددیانتی نے سارے معاشرے کو بُری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔اسلامی اقدار کو اسقدر اُن کی غلط تفسیر کی ہے کہ لوگوں کو صراطِ مستقیم کا پتہ ہی

نہیں چلتا۔عوام کی کوئی مدد نہیں کرتا۔حکومت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔امن نظر نہیں آتا۔عدول و انصاف عنقا ہو چکا ہے۔عالمی لیول پر ہم یا بھکاری مشہور ہیں۔یا دونمبر، یا بے ایمان یا تشدد پسند، یا دہشت گرد۔جو بھی انفرادی طور پر کوئی علمی لحاظ سے نوبل انعام حاصل کرتا ہے تو یہ علمائے سُوء اُسے وطن کے اندر آنے نہیں دیتے کہ یہ یہودی ایجنٹ ہیں۔جیسا کہ ڈاکٹر عبدالسلام اور ملالہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ہر مولوی کسی نہ کسی تشدد پسند تنظیم کا نمک خوار ہے۔جن کا وظیفہ عرب ممالک سے جاتا ہے۔یہ جمعرات کی روٹیوں پر پلنے والے کروڑ کروڑ کی گاڑیوں میں پھرتے ہیں۔اور بعض ممالک اور تنظیموں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔عام مسلمان بے چارہ کنفیوژ ہو چکا ہے۔ان علمائے سُوء نے کفر کی فیکٹریاں لگا کر اکثریت کو کافر قرار دے دیا ہے۔بے شک وہ پانچ ارکان پر عمل بھی کرے۔یا واجب القتل قرار دے دیا ہے۔بلکہ اگر کوئی سلمان تاثیر جیسا قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کے قاتل کو غازی قرار دیا جاتا ہے۔جیسا کہ ان علماء نے ہی قائداعظم، علامہ اقبال بلکہ سب لیڈران کو کافر قرار دیا تھا۔

یہ ان علمائے سُوء کے پاس بڑا ہتھیا ہے جو حکومت وقت کو ان سے چھین لینا چاہیئے۔جماعت اسلامی کا لیڈر مولانا منور حسن سرِ عام ہرزہ سرائی کرتا ہے کہ طالبان کے مرنے والے شہید ہیں۔لال مسجد کا مولانا عبدالعزیز کہتا ہے کہ پشاور کے مدرسے میں مرنے والے بچوں کا مجھے ذرا بھر افسوس نہیں۔مولانا فضل الرحمن کہتا ہے کہ آرمی ایکٹ بنانے کے گناہ میں ہم شریک نہیں۔جس طرح ان کے والد محترم مولانا مفتی محمود نے 1971ء میں ہرزہ سرائی کی تھی کہ خدا کا شکر ہے کہ ''ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہ تھے۔'' ہماری قوم سو رہی ہے۔اخلاقی پستی کے ساتھ ساتھ ضمیر بھی مر چکا ہے۔ان باغیوں کو لگام دینے کے لئے نہ جانے خدا تعالیٰ کب کوئی صلاح الدین یا خالد بن ولید بھیجے گا۔میری قوم کا بیڑا غرق کرنے میں یہ علمائے سُوء مکمل طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔بعض غیر تمند شور بھی مچا رہے ہیں مگر وہ بہت کم ہیں۔میرا ملک جگ ہنسائی کا موجب ہے۔میری قوم کی ساری دنیا میں تذلیل ہو رہی ہے۔ہم پاگلوں کے پیچھے لگ چکے ہیں۔ان علمائے سُوء نے غیر ملکی امداد کے نشے

میں چور ہوکر آرمی ایکٹ میں بھی ساری قوم کی مخالفت کی ہے۔ان کو معلوم ہے کہ آخر جنازہ ،نکاح، قرآن، نماز،عید، جمعہ، ہم نے ہی پڑھانا ہے۔اے مرے مادرِ وطن کے سپوتو ! سوچو! سوچو! پھر سوچو!۔ ہماری قوم کس راستہ پر جارہی ہے۔چین ہمارے ایک سال بعد آزاد ہوا تھا۔اب ہمیں ان علمائے سُوسے آزاد ہونا ہے۔جس طرح مصطفٰی کمال پاشا اتاترک آزاد ہوا تھا۔اپنا مقام بناؤ۔ہم نے اس اَن پڑھ ملا کو بھی سر پر چڑھالیا ہے۔قوم کی تربیت اچھے رنگ میں کرو۔لوگوں کو انسان بناؤ، پھر باخدا انسان بناؤ۔نہ کہ دہشت گرد۔اور پھر خدا اور اُس کے رسولؐ کی ہدایت کے مطابق سب کی تربیت کرو۔اور ساری دنیا میں چین کی طرح نیک نامی حاصل کرنے کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ ہردم تمہارے ساتھ ہو۔



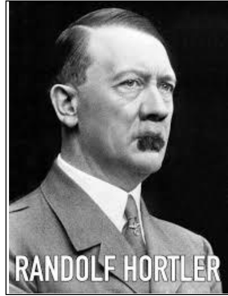
## درباری

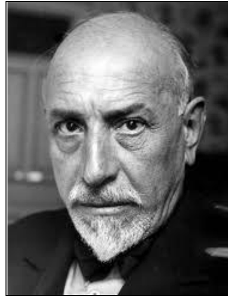
ایک دانشور نے ایک بادشاہ سے کہا کہ آپ کے تمام درباری جھوٹے ،خوشامدی اور کھوٹے ہیں۔بادشاہ نے کہا کہ میں آپ کی یہ رائے کیسے مان لُوں جو میرے اشاروں پر جان نچھاور کرنے کو ہردم تیار رہتے ہیں۔اس دانشور نے بادشاہ کو کچن میں چلنے کو کہا۔کچن میں پہنچ کر دانشور فلسفی نے پانی گرم کیا اور کیتلی میں چائے کی بجائے تمبا کو ڈال کر اسے دربار میں لے آیا اور بادشاہ سے کہا کہ اب اپنے درباریوں کو بلایئے اور ہر ایک کو ایک ایک پیالی تمبا کو کے قہوے کی عطا فرمایئے۔لیکن اس سے پہلے اپنی پیالی کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر قہوہ کے ذائقے کی تعریف کر دیجیئے۔بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ کے قہوہ کی تعریف کرنا تھا کہ درباریوں نے قہوے کی تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ہرطرف سے ''واہ واہ'' کے دونگڑے برسنے لگے ایک نے کہا ''سبحان اللہ'' آبِ حیات ہے۔دوسرا بولا '' آبِ کوثر ہے۔تیسرے نے کہا کہ جُوئے شہد ہے۔یہ دیکھ کر بادشاہ نے حکم دیا کہ '' ان سب کو لے جا کر طویلے میں باندھ دو۔

*--*--*

# اصل دہشت گرد کون؟

## دنیائے تاریخ کے سب سے بڑے قاتل اور دہشت گرد کون ہیں؟





ذرا ملاحظہ فرمائیں:

1۔ہٹلر (جو کہ کرسچین تھا) اُس نے لاکھوں یہودی اور دوسرے انسانوں کا قتل کروایا۔2۔جوزف سٹالن (جو کہ کرسچین تھا) اُس نے 20 ملین لوگوں کو جنگ میں قتل کروایا۔3۔ماؤزے تنگ (جو مسلم نہ تھا) اُس نے بھی 20 ملین لوگوں کی جان لی۔4۔مسولینی (جو مسلم نہ تھا) اُسنے چار لاکھ لوگوں کو قتل کروایا۔5۔اشوکا نے کیلنگا کی جنگ میں (جو کہ ہندو تھا) اُس نے ایک لاکھ معصوم لوگوں کو جان سے مارا تھا۔6۔جارج بُش (جو کہ کرسچین ہے) اُسنے پانچ لاکھ بچوں کو عراق کی جنگ میں قتل کرایا۔7۔پہلی جنگِ عظیم میں 17 ملین لوگ مارے گئے۔ 8۔دوسری عالمی جنگ میں 50 ملین لوگ کام آئے۔9۔ناگاساکی میں ایٹم بم گرا کر دو لاکھ لوگوں کی جان لی۔10۔ویت نام کی جنگ میں امریکہ نے 5 ملین لوگوں کو جان سے مارا۔11۔کمبوڈیا میں 1975 سے 1979 تک 3 ملین لوگ مارے گئے۔افغانستان اور برما میں بھی غیر مسلم قتل کرواتے ہیں۔12۔بوسنیا اور کوسووو میں پانچ لاکھ لوگوں کو کس نے مارا تھا۔؟۔

13۔جنگِ عراق میں اب تک 12 ملین لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا چکا ہے۔ 14۔افغانستان میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو نیٹو کی افواج نے مارا۔اس ماڈرن دور میں ان غیر مسلم اکابرین نے دنیا میں اپنی من مرضی کی دہشت گردی چلائی ہوئی ہے کہ خدا پناہ۔ذرا تاریخ پر

نظر ڈال کر دیکھیئے ۔ یہ ظالم بھیڑ یئے ساری دنیا پر حکومت کے شوق میں کتنے معصوم انسانوں کا خون پی چکے ہیں ۔فرانس میں اگر دس لوگ مرتے ہیں تو یہ لوگ مسلمانوں کو اس کا قصوروار ٹھہراتے ہیں ۔ مندرجہ بالا قتال جو تاریخ میں ارادتاً کروایا گیا تو جب کیوں مذہب کا نام نہیں لیا گیا ۔ اصل میں دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ۔مغرب میں جب بھی کوئی دہشت گردی کا واقعہ ہوتا ہے تو مسلمانوں پر زمین تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔اگر غور سے دیکھا جائے تو آج دنیا میں سب سے بڑے دہشت گرد یہی ہنود و یہود و نصاریٰ ہیں ۔مسلم مما لک میں بھی یہی اپنی دجالیت سے فتنے بر پا کرتے ہیں اور پھر اُن کو رفع کرنے کے لئے وہاں کے حکام کی مدد کے بہانے اپنے پاؤں جماتے ہیں ۔کیا مغربی مما لک میں عیسائی لوگوں نے معصوم بچوں کو نہیں مارا ۔ ناروے، امریکہ، وغیرہ میں ۔وہاں مذہب کو نشانہ کیوں نہیں بنایا جاتا ۔ یہ مسلم دشمنی میں سب کچھ کیا جاتا ہے ۔امریکہ سب سے بڑا دہشت گرد ہے جو ہر ملک میں سیاسی اقتدار کے چکر میں اپنے چمچوں کو اقتدار دلانے کے لئے کروڑوں مسلمان معصوم بچوں عورتوں کو قتل کرواتا رہتا ہے ۔ نائجیریا میں بوکوحرام کی ملی بھگت سے کتنے ہزار لوگ مروا دیئے گئے ۔شام، لیبیا، مصر، عراق، افغانستان، برما، لاکھوں لوگوں کو امریکہ بہادر اپنی من مرضی کی پالیسی کے تحت انسانیت سوز مظالم میں اور قتل میں ملوث ہے ۔اور اسرائیل اس کا گماشتہ ہے ۔ یو این او امریکہ کی باندی ہے ۔جس نے کشمیر، فلسطین، کے مسائل کو حل کرنے میں جانبداری کا مظاہرہ کیا اور اپنی عزت وساکھ تباہ کر لی ۔اصل دہشت گرد تو یہی قومیں ہیں جو مسلم دشمنی میں آگے بڑھتے چلے جا رہی ہیں ۔اور ہمارے مسلم مما لک اپنی بیوقوفی ، نا اہلی ،عیش پرستی، کی وجہ سے ان مغربی طاقتوں کے اشارے پر ناچ رہے ہیں ۔اتحاد نام کی کوئی چیز نہیں اکیلے اکیلے صدام حسین، حسنی مبارک، قذافی کی طرح اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں ۔ اے اللہ ان مسلم مما لک کو عقل دے ۔آمین ۔



# مسلم لیگ ن فوج اورعوام سے انتقام لے رہی ہے

## پاکستان کواَفراطِ زَر سے نہیں اَفرادِزَر سے خطرہ ہے

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پرانی کہاوت ہے۔ پہلے تو اس پودے کا بیج ہی صحیح نہ تھا پھر اس کی پرورش بھی غلط جگہ یعنی کہ آمریت کی گود میں ہوئی۔آمریت بھی ایسی کہ جس کوعوامی لیڈر یعنی بھٹو سے خداواسطے کا ویر تھا۔ کیونکہ پہلا چیلنج دینے والا لیڈر بھٹو ہی تھا۔جس نے فوج سے متھالگایا اوراپنے انجام کو پہنچا۔عوام تو کسی کی نہیں ہوتی۔ وہ تو چڑھتے سورج کوسلام کرتی ہے۔بھٹوکوجن دوستوں پر ناز تھا وہ اُس کا سہارا نہ بنے۔ پاکستان کی بانی جماعت کے بڑے عرصہ سے دھتکارے ہوئے علمائے سُو نے سعودیہ سے مل کر براستہ بھٹواحمدیوں کوراستے سے ہٹا کراپنی جگہ بنائی۔اورروس کی آمد(افغانستان) کی وجہ سے امریکہ اورسعودیہ نے جہاد کا نعرہ لگایا اوران جمعراتیوں کی مسلسل روٹی کا سامان بن گیا۔ان علمائے سُو کے مدرسوں نے اب یونیورسٹیوں کی صورت اختیار کرلی ہے۔اورفوج نے اُن پر بے پناہ رقم خرچ کی۔اورمجاہدین کی فوج ظفرموج تیار کی۔رُوس کوشکست ہوئی،امریکہ نے اپنے گھر کی راہ لی۔ اسی اثناء میں ضیاءالحق بھی اپنے مشیران سمیت انجام کو پہنچا۔1988ء میں عوام کے پُرزوراصرار پر بھٹو کی بیٹی غیر متوقع طور پر پھر برسراقتدار آ گئی۔آئی جے آئی بھی بنی مگر وہ اس عوامی سیلاب کے آگے کوئی بند نہ باندسکی۔فوج دیکھتی رہ گئی۔اورجنرل حمید گل شکست کھا گئے۔ جب بے نظیر نے عراق میں پاکستانی فوج بھیجنے سے انکار کیا تو فوج نے بذریعہ اسحاق خان پھر بے نظیر کو پچھاڑا۔اور پھر پسرِ ضیاءالحق (نواز شریف) کومیدان میں لایا گیا بلکہ باقیاتِ ضیاء کی پرورش کی گئی۔اصل تو حکومت کی ڈورکسی اور ہاتھ میں تھی۔مجبوری سمجھیئے۔اسی وجہ سے یہ ملاں اس قوم کے سر پر چڑھ گیا ہے جو کہ کرائے کا جگا ہے۔فوج میں بھی اذہان بدلتے رہتے ہیں۔مگر اسلام کی تاویل بھی یہی ملاں ہی کرسکتا ہے۔کسی اور کے پاس تو اس کا ٹھیکہ بھی نہیں۔ مسلم لیگ ن نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اورعلمائے سُو سے بھی راستے بڑھا دیئے۔سعودیہ سے بھی۔اورعدلیہ سے بھی راستے بڑھا کرفوج کا بدل تلاش کرتے رہے۔مگرفوج توفوج ہے جناب۔نوازشریف جب دوسری بار برسراقتدار آیا تو اس نے اپنے اقتدار کی طوالنی کے لئے ایٹمی

دھما کہ کیا مگر جلد ہی اس کو کارگل کی وجہ سے اور اپنی جلد بازی کی بنا پر تخت چھوڑنا پڑا۔ اور پھر اتنا ڈرا کہ معافی مانگ کر سعودیہ میں پناہ لی۔ اصل میں اس کے سارے خواب اُدھورے رہ گئے تھے۔ پھر اقتدار کے لئے (جس کا چہرہ بھی دیکھنا اُسے گوارا نہ تھا) بے نظیر سے معاہدہ کیا۔ جسے میثاق جمہوریت کا نام دیا۔ جس نے باہمی مشورہ سے مشرف سے این آر او کیا۔ یوں نواز شریف کے لئے بھی راستہ بن گیا۔ اور پھر پانچ سال دوستانہ اپوزیشن کے بعد پانچ سال اقتدار کا شاہین تیسری بار اس کے سر پر بیٹھا یا گیا۔ جبکہ ملاں اِن آٹھ سالوں میں بہت طاقتور ہو چکا تھا۔ نواز شریف نے بھی پرانی راہ ورسم تازہ کی اور طالبان کے کندھے پر بیٹھ کر اقتدار کو منہ مارا۔ طالبان سے مذاکرات کا جو ڈرامہ تھا اُسی دوستی کا حق ادا کیا جا رہا تھا۔ اس بار نواز شریف نے مرکزی اقتدار اور بڑے صوبے کے علاوہ کسی اور طرف جھک مارنے کی جسارت نہیں کی۔ کیونکہ اُس کا ٹارگٹ صرف اور صرف دولت اکٹھی کرنا ہے۔

پی پی پی سے بھی دوستی ،فوج سے بھی دوستی ،ترکی سے بھی دوستی ،عمران سے بھی دوستی کر کے اپنا بلین ڈالرز کا ٹارگٹ پورا کرنا ہے۔ کیونکہ دوبارہ اس کے آنے کا کوئی چانس نہیں۔ وہ ان منصوبہ جات کو ہاتھ ڈالے گا جن سے روپیہ بنتا ہے۔ صحت تعلیم ،ریلوے ، پی آئی اے ،اسٹیل ملز وغیرہ جائیں بھاڑ میں ۔ یہ تو خسارے کا سودا ہیں ۔ بجلی کے ، جنگلہ بس سروس سے ، گوادر سے چین تک سڑک سے کابل تک سڑک سے ،تو بڑا بڑا کمیشن آئے گا اور جب تک اس کا ٹرن بھی پورا ہو جائے گا۔ اسے ساؤتھ پنجاب کا صوبہ بنانے سے کیا ملے گا۔ اسے عوام کو خوشحال کرنے سے کیا ملے گا۔ عوام نے اس کے لئے کیا کیا۔ جب مشرف نے اس کا جہاز واپس کیا تھا تو کیا عوام اس کے لئے لڑے مرے تھے جو وہ آج اُن کے لئے مرے۔ آج میں دیکھ رہا ہوں اس مادرِ وطن کا کوئی ہمدرد نہیں۔ ہر کوئی اپنی شکم پری کے چکر میں اس ملک کو لوٹ رہا ہے۔ کسی کو اسلام سے بھی پیار نہیں اسلام آباد سے پیار ہے۔ جس کا جو داؤ بھی لگ رہا ہے وہ لگا رہا ہے۔ یہ سب بڑے بڑے پیٹوں والے، درندوں کی طرح میرے وطن کو نوچ رہے ہیں۔ اور کوئی آگے بڑھ کر بچانے والا نظر نہیں آتا۔ ہر کوئی اس کا ہمدرد بنکر آتا ہے اور اپنا پیٹ بھر کر اپنی راہ لگتا ہے۔ ہر محکمے میں کرپشن اس لئے بڑھ گئی ہے کہ اس کا حصہ اوپر ایوانوں تک جاتا ہے۔ جس محکمے کو فنڈ ملتے ہیں وہ اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔ ذاتی استعمال، دفتری گاڑی خرید لی ، اپنا ٹی اے ڈی اے

بنالیاوغیرہ وغیرہ۔سارے محکمے برباد ہو چکے ہیں۔ہسپتال ویران ہیں،سکولوں میں جاگیرداروں کے مویشی بندھے ہیں۔گھوسٹ سولز کی تعداد زیادہ ہے۔مسلم لیگ ن اپنے کمیشنوں میں اور کک بیکس میں مصروف ہے۔اور وزراءاپنااپنا مالی ٹارگٹ پورا کررہے ہیں۔عوام کی کسی کو فکرنہیں۔ملک کی فکر اگر ہے تو وہ فوج کو ہے۔کوئی بھی غریب عوام کے سوائے محب وطن نہیں۔پی پی پی نے اپنے دور میں خوب کمایا ،اب مسلم لیگ ن کی باری ہے۔ملاں اپنی بانسری بجارہا ہے۔غریب عوام کو کوئی سمجھ نہیں آتی۔متوسط طبقہ اور سفید پوش، ملک چھوڑنے کی فکر میں ہے۔گورنر سرور بھی رو کر گورنر ہاؤس سے نکلے ہیں۔مسلم لیگ ن کے پرانے دوست اُن کو چھوڑتے جارہے ہیں۔وہ مستقبل میں ن لیگ کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔یہاں جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ہے۔لارڈ سرور تو کیا اس ملک میں سرورِکونین کی بھی دل سے پرواہ نہیں کی جاتی۔توہین رسالت بھی انتقامی کاروائیوں کے لئے بنایا ہے۔سب کچھ اس سول آمر نواز شریف کے ہاتھ میں ہے۔کیونکہ اُن کے اقرباء کی فوج ظفر موج نے سب وزارتیں سنبھال رکھی ہیں۔ابھی تک دوسال ہونے کو آئے مسلم لیگ ن کو وزیر دفاع،وزیر خارجہ،وزیر قانون،کی اسامیاں پر کرنے کے لئے کوئی معقول لوگ نہیں مل سکے۔بڑے بڑے محکمے اپنے سربراہوں کے بغیر خود یہ شریف چلارہے ہیں۔

ہمارے ملک میں ہر چیز متضاد ہے۔جو شریف نہیں اس کا نام شریف رکھ دیتے ہیں۔جو مسلمان نہیں اسے مسلمان کہا جاتا ہے۔جو عالم نہیں اسے عالم کہا جاتا ہے۔جو گاڑی چلتی نہیں اسے فلائنگ کوچ کہا جاتا ہے۔جو ڈرگ میں دُھت رہے اُسے جہاز کہتے ہیں۔مسلم لیگ ن کی توجہ دھن اکٹھا کرنے طرف ہے اور ملکی انتظام میں وہ فوج کے آگے ہتھیار ڈال چکی ہے۔کسی بھی محکمے کو صحیح معنوں میں چلانے کے لئے سنجیدگی سے رواں دواں نظر نہیں آتی۔اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کے چکر میں ہے۔ملک جائے بھاڑ میں۔عوام کالانعام کو ان بڑے بڑے جاگیرداروں،تاجروں کے سوا کوئی اور مسیحا نظر نہیں آتا۔اگر کوئی اچھی اور تعمیری سوچ دینے والا آئے بھی تو یہ اسے قبول کرنے کو تیار نہیں۔کیونکہ عوام کی سوچ اور عقل کو مسلسل علمائے سو کی تربیت نے ٹیڑھا کردیا ہے۔یہ قوم کسی عذاب کی منتظر ہے۔جواب آنے ہی کو ہے۔اے خدا اس قوم پر فضل کر اور اس قحط الرجالی سے اس قوم کو نجات دے۔آمین۔

# یتیم لاوارث بچہ- پاکستان

یہ وہ یتیم بچہ ہے جونوزائیدگی میں ہی یتیم ہوجائے۔جس کی عمر جب ایک سال اٹھائیس دن تھی جب اس کا حقیقی باپ وفات پا گیا۔اوراس کے بھائیوں کوکسی نہ کسی طریقے سے فوج نے منظر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ایک کوتو گولی سے راولپنڈی میں شہید کردیا گیا۔دوسروں کو پردہ سے ہی ہٹا کر خودمرضی کی حکومتیں بنالی گئیں۔جب یہ مسلسل پے در پے حکومتیں بدلتی اس کے پہریدار نے دیکھیں تو نہ جانے کس کے اشارے پر اس سارے گھر پر ہی قبضہ کرلیا۔جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا معاملہ ہوا۔جب 1967ء میں قوم کا درد لے کر اس کی والدہ (فاطمہ جناح) میدانِ عمل میں آئیں تو آمریت کے چیلے چانٹوں نے اسے بھی شکستِ فاش دے دی۔یہ یتیم بچہ اب تک اپنے مقام اپنی جائیداد،اپنے اختیارات،اپنا نظام حکومت تک وضع نہیں کر پایا۔اس کے خوشامدی اور وقتی یار جو کہ اس کے قیام کے بھی مخالف تھے وہ اب اسے لوٹنے کے درپے ہیں اور یہ یتیم بچہ باامرِ مجبوری ان کے درمیان اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتا ہے۔ایک مفاد پرستوں کا ٹولہ ہے جو کہ اس بچے کے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اثاثے اور مال ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی ہڑپ کئے جارہا ہے۔کچھ مذہب کے نام پر اور کچھ دشمن سے ڈرا کر اس یتیم بچے کو لوٹا جارہا ہے۔

1971ء میں جب اس کا ایک بھائی اپنے حقوق مانگنے لگا تو اس کے ساتھیوں نے اسے گھر سے ہی نکال دیا،وہ اب وہ کسی کے سہارے بنگلہ دیش کے نام سے ترقی پر گامزن ہے۔اس دوران ایک جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر اس شاطر اور چالاک صاحب آئے جو کہ اپنے ملک کے علاوہ تیسری دنیا کے لیڈر بننے کی ناکام کوشش میں تھے کبھی صدر،وزیراعظم،مارشل لا ایڈمنسٹریٹر،مفتی دین متین بننے کی ناکام کوششیں کیں۔مگر خود ہی اپنے جال میں پھنس کر پھانسی چڑھ گئے۔اس سے قبل بھی ایک شخص کو ہمارے مریدی صفت عوام نے خلیفۃ المسلمین بنانے کی کوشش کی تھی مگر اسے بھی مشیت ایزدی سے اس کے ایک بھتیجے نے چاقو سے کام تمام کردیا۔وہ بھی اپنے انجام کو پہنچے۔بعدازاں جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو امریکہ نے بوساطت سعودیہ (جو کہ ہماری سب مسلمانوں کے

لئے محترم ہے )اس یتیم بچے کو ہلہ شیری دے کر روس سے لڑوا دیا۔ یہ یتیم بچہ پہلے ہی معصوم اور مذہبی دوستوں میں گھرا ہوا تھا۔اس جھانسے میں ایسا آیا کہ اب تک بلبلا رہا ہے۔اب نہ سعودیہ اور نہ امریکہ زخموں پر مرہم رکھ رہا ہے بلکہ اس یتیم بچے کے شریک اس کو کھائے جا رہے ہیں۔اسی دوران ایک امیر المومنین یا مردِ مومن نے ملک میں اسلام لانے کی ناکام کوشش کی (جو کہ اپنے منہ پر اسلام نہ لا سکے تھے )۔اپنی حرکات کی بنا پر بے چارے اسی دنیا میں دوزخ کی آگ میں جلائے گئے ۔ساری دنیا نے یہ نظارا دیکھا اور اکثر نے تو اسے اسمبلی میں یزید اور فرعون کے نام سے پکارا۔ بعض ازاں اسی فرعون کو شہید قرار دینے والوں نے اس کا ایک نام نہاد فرزندار جمند لوہار نامی سامنے لائے کہ اب یہ اس یتیم کو سہارا دے گا مگر جلد ہی وہ اتنا کمزور نکلا کہ جب مشکل آن پڑی تو اسے بھی سعودیہ کا ہی سہارا لینا پڑا۔ پہریدار مضبوط نکلے۔پھر ایک زردار انکل سام کی سازش سے پانچ سال کے لئے پھر آبراجمان ہوئے۔اس کے بہی خواہوں نے اور اس کے چیلے چانٹوں نے خوب اس یتیم بچے کو لوٹا۔اور پھر دوبئی سدھار گئے ۔اب پھر وہی لوہار جس کے سینے کے اندر داڑھی ہے وہ نہ جانے اب کس نئے طریقے سے اس یتیم بچے کو لوٹنے کے چکر میں ہے ۔اسلام کے نام پر یا سلام آباد کے نام پر۔مگر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یتیم کی خبر گیری کا حکم قرآن میں فرمایا ہے۔مگر یہ لوگ اس یتیم کی اچھی طرح خبر لے رہے ہیں ان کو اللہ اور رسول ﷺ کا حکم یاد رکھنا چاہیئے ۔ورنہ خدا سب سے بڑا ہے۔ ❀❀❀

ایک نوجوان نے اپنے دادا سے پوچھا؟

دادا جان ! آپ لوگ پہلے کیسے رہتے تھے؟ نہ کوئی ٹیکنالوجی ۔نہ کوئی جہاز ۔نہ ٹرین ۔نہ انٹرنیٹ، نہ کمپیوٹر، نہ فلم، نہ ڈرامہ، نہ ٹی وی، نہ اے سی، نہ گاڑیاں، نہ موبائل۔

دادا نے جواب دیا: جیسے تم لوگ ابھی رہتے ہو، نہ کوئی نماز ،نہ قرآن ،نہ دین، نہ اسلام، نہ روزہ، نہ شفقت، نہ احترام، نہ ادب، نہ اخلاق، نہ شرم، نہ حیا۔

احباب گرامی! یہ بات سوچیئے لمحہ فکر یہ ہے ہم سب کے لیے۔

# کیا ہم آزاد ہیں؟

ہاں ہم مادر پدر آزاد ہیں۔ ہماری نہ کوئی منصوبہ بندی ہے۔ اور نہ ہی کوئی ٹارگٹ ہے۔ ہم ایک منتشر قوم کی طرح کشکولِ گدائی لئے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں بھی اور ملک کی ترقی کے لئے بھی ہم ڈکٹیشن لیتے چلے آرہے ہیں۔ اطاعت کا جذبہ کم اور تنقید کا مادہ زیادہ لئے ہوئے ہماری ساری قوم منزل مقصود سے دور ہٹ گئی ہے۔ ہماری کوئی بھی پالیسی حب الوطنی پر مشتمل نہیں۔ ہمارا دارومدار منافقت اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ ہم سچ کی تلقین تو کرتے ہیں مگر خود جھوٹ پر گزارہ کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر بلکہ بڑے بڑے علمائے سُو ساری قوم کی اپنی بے عملی سے نام نہاد تربیت کے لئے کوشاں ہیں۔ باطنی طور پر دشمن کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔ ہماری غیرت وحمیت امریکہ اور سعودیہ کے سامنے ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب ریمنڈ ڈیوس ہمارے پاکستانی ہم وطنوں کو شہید کرتا ہے تو حکومت اس سے بڑی بے شرمی سے سودا بازی میں مصروف ہو جاتی ہے۔ امن کی آشا کی خاطر ہم اپنے تحریک آزادی کے شہداء کے خون کو فروخت کرنے کے درپے ہیں۔ ہماری ساری قوم میں میر جعفروں، کی کثیر تعداد ہمیں اپنے دوقومی نظریے سے دور لے جارہی ہے۔ ہم مذہبی انتہا پسندی میں اسقدر بڑھ چکے ہیں کہ اپنے مخالف فریق کو بے ایمان پارلیمینٹیرین کو فتویٰ فروش بنا لیتے ہیں جن کو اپنے دین تک کی خبر نہیں۔ اقلیتوں کو ہم انسان نہیں سمجھتے۔ اُن کا قتل بلکہ احمدی، شیعہ، ہزارہ کا قتل کارثواب سمجھا جاتا ہے۔

ہر تین میل کے فاصلے پر ہمارا اسلام مختلف ہو جاتا ہے۔ ہم ایماندار اسقدر ہے کہ کرپشن ساری قوم کا اوڑھنا بچھونا بن چکا ہے۔ رشوت عام ہے۔ ملاوٹ لازمی ہے، کسی کے حق پر ڈاکہ زنی ہمارا نصب العین بن چکا ہے۔ ہمارے لیڈر اسقدر بے ایمان ہیں کہ فرعون و یزید بھی ان کو دیکھ کر شرماتے ہیں۔ ہر محکمے کو ہم نے کنگال کر دیا ہے۔ ہمارے سب ادارے اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ ہم مسجد کے نام پر، حج کے نام پر اللہ اور رسول کے نام پر مال، عشر زکوٰۃ تک کھانا جائز سمجھتے ہیں۔ اب تو ایک ماہ ہوا جامعہ بنوریہ ٹاؤن کراچی نے شراب بھی حلال کر دی ہے۔ متعہ تو پہلے ہی عربوں نے

(رحیم یارخاں میں ) جائز قرار دیا ہوا ہے اگر نہیں تو اسمبلی کے شراب خوروں (بقول جمشید دستی ) سے قرار داد کسی بھی قسم کی پاس کروائی جا سکتی ہے۔کالے باغ ڈیم پر ہم راضی نہیں بے شک بجلی سے محروم رہیں۔ہر قسم کے جھگڑوں میں ہم مصروف ہیں۔لسانی ،مذہبی ، سیاسی ،گروہی ،فرقوں میں ہم منقسم ہیں۔دونمبری میں ہم چیمپین ہیں۔ڈرگ کا چیمپیئن تو ہمیں ضیاء الحق بنا گیا تھا۔اشرافیہ اور مقتدر طبقہ، پڑھا لکھا طبقہ، ڈاکٹرز ، انجنیئر ز ،حلال کمائی پسند کرنے والے، امن پسند، اپنی اولاد کو مردِمومن بنانے والے، اُن کے روشن مستقبل کے خواہاں ملک چھوڑ رہے ہیں۔نہ کسی گلی محلے میں، نہ کسی شہر یا گاؤں میں ،نہ کسی مزار یا مسجد میں سکون میسر ہے۔ہرطرف جعلی ڈگری والوں ، ظالموں، کرپٹ سیاستدانوں ، ایم پی اے، ایم این اے، سنیٹرز کا راج ہے۔پولیس کے ایس ایچ اوز کا راج ہے۔غریب مر رہا ہے۔امیر امیر تر ہورہا ہے۔جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ہے۔پاکسان کو تاجروں نے لوٹ لیا ہے۔یا جاگیرداروں نے۔ظلم کا ہرطرف راج ہے عدلیہ سوئی ہوئی ہے فوج ضربِ عضب میں کھوئی ہوئی ہے۔ہاں ہم آزاد ہیں ،غریب کا حق مارنے میں ، ہاں ہم آزاد ہیں ،عورت کو ان پڑھ رکھنے میں ،عورت پر ظلم کرنے میں ، ہاں ہم آزاد ہیں اقلیتوں پر ظلم کرنے میں ، ہاں ہم آزاد ہیں ہر برائی کرنے میں ، ہر رشوت لینے میں ، زبان درازی میں ، مسجد کے سپیکرز سے جو دل میں آئے کہنے میں ، ہاں ہم آزاد ہیں ہر غیر انسانی حرکات کرنے میں ، ہاں ہم آزاد ہیں ، قائداعظم کے سب فرمانوں کی دھجیاں اُڑانے میں ، جعلی ادویہ بنانے میں ، دونمبری میں ، ہاں ہم آزاد ہیں مادر پدر آزاد ہیں ۔ہم اہل علم کو قبول نہ کرنے میں آزاد ہیں ، ڈاکٹر عبدالسلام اور ملالہ کو یہودیوں اور عیسائیوں کا ایجنٹ کہنے میں آزاد ہیں ، ہاں ہم آزاد ہیں ، تھر میں بے شک بھوک سے سو بچہ ماہانہ مرے مگر ہم جنگلہ بس بنانے میں آزاد ہیں۔ہسپتال دواؤں اور ڈاکٹروں سے خالی رکھنے میں ہم آزاد ہیں ۔قوم کو تعلیم سے محروم رکھنے میں ہم آزاد ہیں۔ہمارے قومی کھلاڑی ہر قسم کی رشوت لینے میں آزاد ہیں۔ہم ڈاکوؤں کو وزیر اعظم اور صدر بنانے میں آزاد ہیں۔قوم کا مال کھانے اور اپنا مال بچانے میں ہم آزاد ہیں۔ہم اقربا پروری کرنے میں آزاد ہیں۔اگر آزادی کا یہی مفہوم ہے تو ہماری قوم نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔اے اللہ تو اس قوم پر اپنا فضل نازل کرنا کہ عذاب۔آمین۔

---

# جنت کی تلاش

اے مری گل زمیں تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہل کتاب نے مگر کیا ترا حال کیا

سیانے کہتے ہیں، جہاں پر خوش فہمی اور غلط فہمی کا ملاپ کروا دیا جائے تو وہاں سے ہی احمقوں کی جنت شروع ہو جاتی ہے۔ انسانوں کی بھاری اکثریت اس جنت میں رہنا پسند کرتی ہے۔ وقت نے ثابت کیا ہے سو سال سے کچھ قبل اس خوش فہمی اور غلط فہمی کا شکار برصغیر کے مسلمانوں کو بنایا گیا تھا کہ اگر مذہب کے نام پر ملک بنایا جائے تو یہ مسلمانوں کے لئے جنت کا سماں ہوگا۔ جہاں پر ہر طرف ایک کتاب کو ماننے والے چین اور سکون سے رہیں گے۔ سادہ لوح جذباتی لوگوں نے اس آئیڈیا کو پسند کیا (کیونکہ ہم لوگ تو جنت میں جانے کی خاطر مرنے مارنے کو تیار رہتے ہیں) لہٰذا ایک کتاب ایک مذہب کے فارمولے کو پسند کیا گیا اور علیحدگی کا نعرہ لگا دیا۔ شکاریوں نے شکار کو اس غلط فہمیوں میں ٹریپ کر لیا تھا۔ پھر جو کچھ ہوا اور جو ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت اور طاقت کا برصغیر میں جو رعب اور دبدبا تھا۔ بڑے طریقہ سے ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس خطے کے مسلمانوں کو تین حصوں میں بانٹ کر اُن کو تقسیم در تقسیم کر دیا اور آہستہ آہستہ نہ ختم ہونے والی آپ کی مذہبی لڑائیوں میں اُلجھا دیا گیا۔ ایک قوم کو ایک بہت بڑے حصے کا مالک بنا دیا گیا کیونکہ وہ اکثریت میں ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں سے سخت خوف کھاتے تھے۔ اُن دور اندیش ماسٹر مائنڈ کاریگروں کو معلوم تھا۔

مسلمانوں کو اگر مذہب کے نام پر قابو کر کے ان کو زمینی ٹکڑوں کے لالچ میں پھانس کر کمزور کر دیا جائے تاکہ وہ کبھی حکمرانی کا سوچ ہی نہ سکیں۔ اگر یہ ایک ہی خطے میں اکٹھے رہے تو ہمارے جانے کے بعد پھر سے اگلے ہزار برس چھائے رہیں گے۔ اُن کو یقین تھا، اس دل فریب نعرے سے مسلمان قابو میں آ جائیں گے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا مذہب کے نام پر ملک تو بنائے جا سکتے ہیں۔ مگر اُن کو مذہب کے نام پر سکون سے چلانا ایک ناممکن عمل ہے۔ اور پھر یہاں کے مسلمان ہمیشہ سے

مذہبی جنونیت کا شکار ہوکر رہ جائیں گے۔اس دنیا میں تقریباً دوسوممالک ہیں۔ جہاں جہاں بھی مذہبی طریقہ سے کسی ملک کو چلانے کی کوششیں ہوئیں یا ہورہی ہیں، وہاں پر سوائے خون خرابے کے کچھ حاصل نہیں ہوسکا۔ کیونکہ وہاں کے اکثریتی مذہب والے اقلیتوں کا جینا حرام کردیتے ہیں۔ یا پھر ایک ہی مذہب کے بڑے فرقے والے چھوٹے فرقوں کے لوگوں کا نہ ختم ہونے ولا حصار کردیتے ہیں اور ریاست میں اپنی مرضی کی قانون سازی کروادی جاتی ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں دنیا کے کسی ایک ملک کے باشندے سوفی صد ایک ہی مذہب اور پھر ایک ہی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔اس روئے زمین کے ہر ملک میں اکثریتی اور اقلیتی مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔اگر ایک ملک میں ایک مذہب کو اکثریت حاصل ہے تو اسی مذہب کو کسی دوسرے ملک میں اقلیت کے طور پر لیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک کو ہی لیں یہاں پر بھاری اکثریت میں مسلمان بستے ہیں، عیسائی اقلیت میں ہیں جبکہ یورپین ممالک کے ہر ملک میں عیسائی اکثریت میں، مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ذرا سوچیں عیسائی ممالک اگر ہمارے ملک کی طرح عیسائیت کے سہارے اپنے ملکوں کو چلانے لگیں تو پھر کیا ہو گا؟؟؟؟!!۔ وہ کچھ بھی نہ کریں وہاں پر صرف حلال چیزوں پر پابندی لگا دیں، تو سوچیں وہاں پر مسلمانوں کا کیا حال ہوگا۔ وہاں پر ایک گرام بھی حلال چیز ملنا ناممکن ہوجائے گی۔مگر ہم ہیں کہ جس بے خبری میں جنت کی تلاش میں ہیں۔ وہ تو صرف احمقوں کی جنت ہی ہوسکتی ہے۔اس جنت کی تلاش ہم نے 1974ء کو شروع کی تھی۔ ڈنکے کی چوٹ پر ایک فرقے کو کافر قرار دے کر اس کی سنگ بنیاد رکھ دی تھی۔اب تو یہ ایک ہیبت ناک آسیب زدہ عمارت بن چکی ہے، جو آہستہ آہستہ اس ملک کو کھوکھلا کررہی ہے۔اب اس عمارت کا ختم ہونا ناممکن ہے، اب تو دوسرے اقلیتی فرقوں کو بھی اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔اس قوم میں ایسا مذہبی جنون بھر دیا گیا ہے یہاں کے باشندے اسی کو حقیقت سمجھنے لگے ہیں۔ کہ دنیا میں ایک ہی ملک ہے جو راہِ راست پر قائم ہے۔ باقی ساری دنیا گمراہی کے اندھیروں میں دفن ہوچکی ہے۔ ہر ملک ان کے ملک کے خلاف سازش کررہا ہے۔اپنی ہر ناکامی کو سلام کے خلاف ایک سازش سمجھنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔خوش فہمی میں غلط فہمی کی حد یہ ہے،

اپنے آپ کو ہم اسلام کا آخری قلعہ سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارے لیڈران بھی اسی فارمولے کو بیچتے نظر آتے ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ یہ کہہ سکے۔ مذہب کا ریاست سے تعلق نہیں ہوتا۔ مذہب ہر کسی کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، ریاست کا کام ہے اُن سے مذاہب کے ماننے والوں کی حفاظت کرنا۔ اکثریت کے ہاتھوں کو محفوظ رکھنا انسانی حقوق کی پامالی نہ ہونے دینا ہوتا ہے۔ اس طرز حکومت کو سیکولر کہا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں سیکولر کہنا گناہ ہائے کبیرہ کے زُمرے میں ڈالا جاتا ہے۔ حالانکہ کروڑوں انسانی جانوں کو ہلاک کرنے کے بعد انسان آخرکار اس نقطہ کو پا گیا ہے کہ مذہب اور ریاست دو علیحدہ نظام ہیں۔ جن ممالک نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا وہ تو امن اور سکون میں آ گئے۔ جہاں جہاں بھی غدر اور ظلم وستم ہے، وہاں پر مذہب کے نام پر ریاست چلائی جا رہی ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارا ملک بھی انہی ممالک میں سرفہرست ہے۔ جہاں پر حکومت کی نگرانی میں اقلیتوں کو اکثریت سے مروایا جا رہا ہے۔ پولیس اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مذہبی جنونیوں کے آگے پھینکتی ہے۔ حکومت اُن کی املاک جائیدادیں برباد کرنے میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اُن بے بس مجبور اقلیتوں کی بلی چڑھا کر اپنے دن پورے کرتی نظر آتی ہے۔ چند دن پہلے راولپنڈی کی جیل میں ایک عیسائی کو اور ایک برٹش پاکستانی جو توہین رسالت کے جرم میں سزائے موت کے قیدی تھے۔ ان کو وہاں کی جیل کے گارڈ نے گولیوں سے بھون ڈالا۔ اسی دن سندھ میں ایک احمدی ڈاکٹر کو اس کے کلینک میں قتل کر دیا۔ اسی طرح کوٹ رادھا کشن میں دو مسیحی میاں بیوی بے گناہوں کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا اور قانون خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔ چونکہ طالبان کا زیادہ تعلق وہابی، دیوبندی اور سنی العقیدہ فرقوں سے ہے۔ اب متواتر حملے امام بارگاہوں پر ہو رہے ہیں۔ آئے دن شیعہ اقلیتی فرقہ ذبح کیا جا رہا ہے۔ علمائے سُو کے وعظ اور فتاویٰ اپنا اثر دکھلا رہے ہیں۔ حکومت اور فوج ماضی کے خود پالے ہوئے سانپوں کے آگے بے بس نظر آتی ہے۔ اب کون سا مدرسہ رکھے اور کونسا بند کرے۔ آئے دن اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ حکومت والوں کو نہ ہی عوام کو،

کوئی پچھتاوا ہوتا ہے نہ ہی کوئی کسی چہرے پر پریشانی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انسانوں کو قتل کر کے ثواب اور جنت حاصل کرنے کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ظلمات کے ایسے گہرے اور گھنے بادل ہم پر چھا چکے ہیں۔ کسی بشر کے بس میں نہیں رہا ان ظلمات سے نجات پائی جا سکے۔ ہمارے سیاسی اُفق پر اب تو ایسی خوفناک فضا بن چکی ہے، کوئی ایسا رہنما نہیں کہ قوم کو جہالت کے اندھیروں سے روشنی کی جانب سفر شروع کرا سکے۔ ہمیں خوش فہمی ہے۔ اللہ کی ہم پسندیدہ اُمت ہیں چاہے ہم جو مرضی ظلم و ستم کرتے رہیں، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اسی غلط فہمی میں ہم احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہیں۔ کسی نہ کسی دور میں اس بدقسمتی کا خمیازہ تو بھگتنا ہی ہوگا۔ ابھی تو صرف ابتلاؤں کا سفر جاری ہے۔ ہم مکفر ہو کر مکفر کو ہی قتل کر رہے ہیں۔ کلمہ اور ایمان صرف نمائش کے لئے اپنائے ہوئے ہیں۔ باقی عمل صالحہ جو قرآن نے بتائے ہیں وہ تو سب علمائے سو اور مسلمانوں میں ناپید ہیں۔



## انمول موتی

تلاشِ گُم شدہ:: ہم سے ''خلوص'' گُم ہو گیا ہے۔ اُس کی عمر سو سال ہے بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہے۔ گھر میں خود غرضی کا ماحول اور اَن بَن ہونے کی وجہ سے اِدھر اُدھر ہو گیا ہے شنید ہے کہ ہمدردی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ ابھی تک دونوں کی خبر نہیں۔ اُس کے بھائی ''اُخوت اور بہن حُب الوطنی'' اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ اُس کا بھائی اُخوت بہت ہی پریشان ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس کی بہن شرافت کا انتقال ہو گیا ہے۔ شرافت کے غم میں حیا بھی بستر مرگ پر پڑی ہے۔ اس کے والد ''معاشرہ صاحب'' کو سخت فکر لاحق ہے اور ماں ''انسانیت'' بھی سخت بے قرار ہے۔ وہ آخری بار اپنے جگر گوشے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ جس کسی کو ملے براہِ مہربانی پاکستان واپس پہنچا دے۔ ''خلوص'' اگر خود پڑھے تو واپس آ جائے۔ پاکستانی لوگوں کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔

# پاکستان سے محبت کرو۔ پاکستان کی تعمیر کرو

قوموں کی اصلاح نوجوانوں کے بغیر نہیں ہوسکتی، یہ ایک بزرگ کا قول ہے مگر ہم نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ہم نے دیدہ دانستہ اپنے تعلیمی نظام کو تباہ کردیا۔ صرف پکی روٹی پڑھے ہوئے، بہشتی زیور کے خواندہ کو اور محدود علم والے کو مولانا کہہ کر اپنے بچوں کی تربیت پر مقرر کرلیا۔ انگریزی نصاب کی نقل تو کی مگر نصف حد تک۔ بچوں کو اسلامی بنانے، جہادی، قاتل، متعصب، تنگ نظر، بے علم، بنا کر دم لیا۔ پھر کسی نہ کسی ناجائز طریقے سے جعلی ڈگری حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے رہے یوں ہماری ساری قوم اب تک ستر سال میں اَن پڑھ مُلا کے چنگل میں پھنس کر رہ گئی۔ ہم نے اپنے بچوں کی اچھی تربیت کی طرف توجہ نہیں دی۔ ابتدائی یا پرائمری تعلیم جس کی بنیاد ہی ہم نے ٹیڑھی رکھی اُس کی عمارت کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ مثلاً ہمارے ماہرین تعلیم کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی کہ مادری زبان سے بہتر کوئی ذریعہ تعلیم نہیں ہوتا۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ میٹرک یا مڈل کی لازمی تعلیم تک 20 فیصد بچے کسی سکول کی شکل ہی نہیں دیکھ پاتے۔ باقی 80 فیصد میں سے نصف سے زیادہ مڈل تک پہنچتے پہنچتے اس مدار سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اور ان میں بہت زیادہ تعداد سرکاری اور اُردو میڈیم والے سکولوں میں پڑھنے والوں کی ہوتی ہے۔ ان بچوں کی کتب اور طریقہ تعلیم سرکاری سکولوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ہی ملک میں پڑھنے والے بچے طبقاتی تقسیم کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وطن عزیز میں چار سے دس برس کی عمر کے بچے کم از کم چار چار نظام ہائے تعلیم میں بٹے ہوئے ہیں۔ جن کی درجہ بندی کچھ اس طرح سے کی جاسکتی ہے۔ نمبر 1۔ سرکاری سکول، نمبر 2، دینی مدارس، نمبر 3۔ نیم پختہ اور نام نہاد محلہ ٹائپ انگلش میڈیم سکول۔ نمبر 4۔ بھاری فیسوں والے باقاعدہ انگلش میڈیم سکول، یہ چوتھی اور آخری قسم گزشتہ تیس برس سے مسلسل پھل پھول رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سارے ملک میں پرائمری کی سطح تک ایک ہی قسم کا نصاب ہو۔ اور انگریزی کو تیسری یا چوتھی سے بطور زبان شروع کیا جائے۔

بچے کسی بھی معاشرے کا مستقبل ہوتے ہیں۔ جو قومیں اپنے بچوں پر توجہ دیتی ہیں، ان کی عمدہ تربیت اور کردار سازی کرتی ہیں وہ نہ صرف اپنے مستقبل کو تابناک اور درخشاں بناتی ہیں بلکہ دیگر اقوام کے مقابلے میں نمایاں مقام حاصل کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں بچوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ آج تک ہم نئی نسل کے لئے مناسب نصاب نہیں تیار کر سکے۔ نت نئے تجربات کئے جاتے ہیں یوں بچوں کی تربیت کے بجائے انہیں الجھا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ حکومتیں بیرون ملک سے ملنے والی امداد کے بدلے میں مستقبل کے معماروں پر ایسا نصاب مسلط کر کے جو انہیں شاہین بنانے کے بجائے کرگس بنا دیتی ہیں۔ خوددار بنانے کے بجائے احساس کمتری میں مبتلا کشکول بردار بنا دیتی ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ہاں کئی تعلیمی اداروں میں قومی زبان اردو بولنے پر پابندی ہے۔ ان اداروں میں ایسی ثقافت متعارف کروائی جاتی ہے جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ بچے اور بچیاں ایسا لباس پہنتی ہیں جو ہماری ثقافت اور معاشرت کے مطابق نہیں ہے۔

بچے معصوم ہوتے ہیں۔ وہ سادہ اور صاف کاغذ کی طرح ہوتے ہیں کہ اس پر جو چاہے لکھ لیں۔ اگر نئی نسل بگڑ رہی ہے تو حکومت، معاشرہ، اساتذہ اور والدین سب ذمہ دار ہیں اور سب کو اس المیے کا ادراک کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے۔ نئی نسل کی عمدہ تربیت کے لئے جہاں بہترین نصاب کی ضرورت ہوتی ہے وہاں بہترین ادب بھی ضروری ہے۔ بچوں کے رسائل، بچوں کی کتابیں، کہانیاں، نظمیں غیر محسوس انداز میں بچوں کی کردار سازی کرتی ہیں۔ بچے نصاب تو مجبوراً پڑھتے ہیں لیکن رسائل و کہانیاں کی کتابیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ حکومت اگر اس پہلو کو پیش نظر رکھے تو بہترین نصاب کے ساتھ ساتھ بہترین ادب کے فروغ پر بھی توجہ دے۔ پاکستان میں چار کروڑ بچوں کے لئے صرف چالیس رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ بہت سے رسائل وسائل کی کمی کے باعث بند ہو چکے ہیں اور بہت سے آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ بچوں کے لئے ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کو کوئی سہولت میسر نہیں۔ سرکاری ادبی ادارے ان کو ادیب ماننے کے لئے تیار نہیں لہٰذا نہ انہیں کسی ادبی کانفرنس میں مدعو کیا جاتا ہے اور نہ ہی ادیبوں کو دی جانے والی مراعات میں انہیں

کوئی حصہ دیا جاتا ہے۔ نہ ہی ان ادیبوں کو دی جانے والی مراعات میں انہیں کوئی حصہ دیا جاتا ہے۔ نہ ہی انہیں غیر ملکی دوروں پر بھیجا جاتا ہے۔ سرکاری سطح پر ہر شعبہ زندگی کے افراد کو سول اعزازات سے نوازا جاتا ہے لیکن آج تک بچوں کے کسی ادیب کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ انہیں کوئی سول ایوارڈ دیا جائے۔ لیکن بچوں کے ادیب مشکل حالات اور عدم سرپرستی کے باوجود نہایت لگن اور قومی جذبے سے نئی نسل کی تربیت اور کردار سازی کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ چار کروڑ بچوں کے بہتر مستقبل، ان کی بہترین تربیت اور پاکستان کا مستقبل محفوظ بنانے کے لئے بچوں کے بہتر مستقبل، ان کی بہترین تربیت اور پاکستان کا مستقبل محفوظ بنانے کے لئے بچوں کے لئے شائع ہونے والے رسائل اور بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کی سرپرستی کرے۔ بچوں کے رسائل کو سرکاری اشتہارات فراہم کئے جائیں اور ہر سکول کی اور پبلک لائبریری کے لئے بچوں کے لئے الگ شعبہ بنا کر بچوں کے رسائل اور کتب کی خریداری کو لازم قرار دیا جائے، سکولوں میں بزم ادب کا پیریڈ لازم قرار دیا جائے۔ بچوں کے ادب کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کو خصوصی طور پر سرکاری گرانٹ دی جائے، بچوں کے ادیبوں کو مراعات، ہیلتھ، انشورنس، سکالرشپ، غیر ملکی دوروں کے مواقع کے علاوہ سول ایوارڈز سے نوازا جائے۔ ادبی وثقافتی اداروں کے آڈیٹوریم اور میٹنگز روم میں بچوں کے ادب کے حوالے سے تقریبات کے انعقاد کے لئے دن مخصوص کئے جائیں۔ بچوں کے لئے شائع ہونے والی کتابوں پر سبسڈی دی جائے تاکہ سستی کتب بچوں تک پہنچ سکیں۔ حکومت کو یہ سب اقدامات کرنے چاہئیں۔ اگر وہ واقعی پاکستان کا مستقبل روشن، محفوظ اور باوقار بنانا چاہتی ہے۔



# کیا ایم کیو ایم کو دیوار سے لگایا جا رہا ہے؟

ایم کیو ایم کو وہ غیر منصف لوگ ٹارگٹ کر رہے ہیں جن کا اپنا دامن صاف نہیں۔ کچھ سازشی لوگوں کی ملی بھگت ہے۔ ایک مفاد پرست ٹولہ ہے۔ جو مسلسل ایم کیو ایم کی مقبولیت کے ڈر سے اس پر الزام تراشی کر کے اپنی جگہ کراچی میں بنانا چاہتا ہے۔ فوج اور رینجرز کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ 1992ء میں بھی ایسا ہی کیا گیا تھا۔ مگر باقی لوگ جو ایم کیو ایم کو نشانہ بنا رہے ہیں اُن کا دامن بھی صاف نہ ہے۔ عذیر بلوچ کس کا نام لے رہا ہے۔ زرداری صاحب، شرجیل میمن، جاوید ناگوری دودھ والا، قادر پٹیل کا۔ عذیر بلوچ نے 106 قتل کا اعتراف کیا ہے۔ جس کے گھر قائم علی شاہ وزارت علیہ کا حلف اُٹھانے سے قبل، قائداعظم کے مزار پر جانے سے قبل، کھانے پر گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے سب لیڈر عورتیں اور مرد ان سب جرائم میں ملوث ہیں۔ ان مذہب جماعتوں کے بھی کرمنل ونگ ہیں۔ جماعت احمدیہ کے ریکارڈ کے مطابق اس کے چارصد کے قریب معصوم اور بے گناہ لوگوں کو شہید کر دیا گیا۔ اوران کی ایف آئی آر تک بھی درج نہیں کی جاتی۔ آخر ان لوگوں کی آہوں اور دعاؤں نے بھی کوئی رنگ دکھانا ہے۔ کون سی سیاسی اور مذہبی جماعت کے پاس کرمنل ونگ نہیں ہیں۔ کاش خدائی فوجداروں کی جماعت پر ہاتھ ڈالا ہوتا۔ لسانی اور مذہبی فرقہ پرستی پھیلانے والوں کا، کاش طالبانی ایجنٹوں کا قلع قمع کیا ہوتا۔ کاش اُن لوگوں کی گردن پکڑی ہوتی جو کہتے تھے طالبان ہمارے بھائی ہیں۔ طالبان ہمارے بگڑے ہوئے بچے ہیں۔ کاش اُن مدرسوں کو ٹارگٹ کیا ہوتا جن میں مجاہدین کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔

کاش اُن لوگوں پر ہاتھ ڈالا جاتا جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہماری فوج کے جوان شہید نہیں طالبان شہید ہیں۔ کاش اُن لوگوں پر ہاتھ ڈالا جاتا جن کے گھروں سے، جن کے مدرسوں سے دہشت گرد پکڑے گئے ہیں۔ جس مجرم (صولت مرزا) 40 قتلوں کا مرتکب جسکی موت قریب ہے اور اُس کے ڈیتھ وارنٹ جاری ہو چکے ہیں اب حکومت اُس کو استعمال کر رہی ہے۔ ایسا ہمارے ملک میں شروع سے ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں، جماعت اسلامی کی

جمیعت طلبہ سے کس طرح ان مڈل کلاس کے طلباء کو استعمال کیا جاتا رہا۔رولنگ پارٹیاں اپنا نظام چلانے کے لئے بھی ایسے ہی لوگوں کو استعمال کیا کرتی ہیں ۔لاہور کے بٹ استعمال ہوتے رہے۔ خود الطاف حسین بھی ضیاء دور سے استعمال ہوا اور پھر لیڈر بنا۔ ہوسکتا ہے ایم کیو ایم کے پاس کرمنل ہوں۔مگر باقی پارٹیاں مقدس گائے تو نہیں۔سب پر ہاتھ یکساں ڈالنا ضروری ہے۔مسلم لیگ ن کو تو ایم کیو ایم سے خدا واسطے کا بیر ہے ۔ یہ خود پنجاب میں طالبان کی اتحادی ہے ۔ سپاہ صحابہ ان کی معاون جماعت ہے۔الیکشن میں ان کا تعاون انہیں حاصل رہا ہے ۔مسلم لیگ ن کے پاس بھی کرمنل گلو بٹوں کی ہر وقت ہوتی ہے ۔ جب ان سے کام لے چکتے ہیں تو خادم اعلیٰ پولیس مقابلوں میں اُن کرمنلز کو مروا دیتے ہیں ۔ جماعت اسلامی کے پاس بھی کرمنل ونگ ہے ۔حکومت کی یہ حکمت عملی اس کی باقی بے وقوفیوں کی طرح فیل ہوجائے گی ۔کراچی کا امن خراب کرنے کے لئے ، کراچی میں خانہ جنگی شروع ہونے کو ہے جسے یہ حکومت بالکل روکنے میں ناکام ہوگی ۔کل کو ڈھاکہ کی طرح یہاں بھی کوئی مکتی باہمنی نہ بن جائے ۔ یہ حکومت تو پہلے ہی شیخوں ،خوجوں،لوہاروں ، کمہاروں وغیرہ کی ہے۔جوجعلی مینڈٹ لے کر آئے ہیں۔پھر یہ ڈرپوک لوگ لڑائی فوج کے گلے میں ڈال کر سب دُم دبا کر بھاگ جائیں گے ۔اور پھر خاکم بدہن فال آف کراچی نہ ہو۔ہتھیار کوئی جنرل ہی ڈالے گا۔حکومت تو اپنے رائے ونڈ کے محل میں محوِ استراحت ہوگی یا بیرون ملک بھاگ جائے گی ۔غور کرو۔عقل کے ناخن لو۔تم بھی بُرے ہو، یہ پارٹیاں بھی بُری ہیں ۔ ذرا انصاف اور حوصلے سے کام لو۔اتنا نہ کھاؤ کہ گلے میں اَڑ جائے ۔عقل سے تو تم سب پہلے ہی پیدل ہو۔ یہ جو محل اور دولت آپ لوگوں نے بنا رکھی ہے یہ بھی تمہارے کام نہیں آئے گی ۔آخر عزت بڑی چیز ہوتی ہے عزت دار بنو۔ ( مگر عزت تو اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے ) کرمنل ونگ پہلے کس جماعت نے نہیں بنائے ۔آپ کو یاد ہوگا ذرا ماضی کی طرف جھانکیں ۔انہی اسلامی جماعتوں نے ۔انہی ملاؤں نے ،ان ہی اسلام کے ٹھیکیداروں نے ، انہی فتاویٰ فروخت کرنے والوں نے ،انہی جنت کے ٹکٹ فروخت کرنے والوں نے ،ملک کو دوزخ بنا دیا ان ہی بدطینت نام نہاد علماؤں نے ، وہابیوں کے خلاف فتاویٰ دینے والوں نے ان ہی سے مال کھا کر جہاد افغانستان کی بنیاد رکھی ۔اسی فوج نے ان

مجاہدین کو پالا ۔ مدرسے بنائے ۔ ملک میں انتہا پسندی، فرقہ واریت کی بنیاد رکھی ۔صرف دیو بندیوں کو پروان چڑھایا۔ایم کیوایم تو کراچی میں ان کے سامنے ڈھال بنی ہے۔اُن سب کی صف لپیٹی گئی ہے کراچی میں ۔اب یہ اُن کی سکیم ہے کہ اس ایم کیوایم کو غدار اور کرمنل قرار دے کر، اس کا امیج تباہ کر کے، اس کا گراف نیچے گرایا جائے اور کراچی کو گھیرا ڈال کر سیاسی طور پر اپنی جھولی میں کر لیا جائے ۔عمران خان بھی، نواز شریف بھی ، جماعت اسلامی بھی ، فضل الرحمن بھی، این اے پی بھی اور پی پی پی بھی بغض معاویہ سے کام لے رہے ہیں ۔

اگر ان ساری پارٹیوں کے لیڈروں اور کارکنوں کا محاسبہ کیا جائے ،اور ان کے کردار اور ان کے اقوال واعمال کو اگر دیکھا جائے تو ان میں کوئی بھی منصف اور عادل نہیں ۔سب کا دامن تار تار ہے کسی کا کم کسی کا زیادہ ۔قوم کے لٹیرے اور ڈاکو، بے ضمیر اور نفس پرست ،لوگ اپنے ایک ساتھی کو دیوار کے ساتھ لگا کر ملک کا مستقبل خطرے میں ڈال رہے ہیں ۔اور خود پارسا بن رہے ہیں ۔ حالانکہ سب غلط ہیں اور جو پکڑا جاتا ہے انگلی اُس طرف اُٹھ رہی ہوتی ہے ۔ یہ ملک کی تباہی کا الارم ہے ۔محاسبہ کیا جائے تو سبکا ۔مگر پھر جب ایسا نظر آنے لگا جب سب کی گردنوں تک قانون کا ہاتھ پہنچے گا ۔تو پھر یہی فوج ایک N.R.O لے آئے گی ۔اور سب کے قصور معاف ہوجائیں گے ۔اور سب پارسا بن جائیں گے ۔حمودالرحمن کمیشن کی رپورٹ کبھی نہیں آئے گی ۔آئی جے آئی کا کچا چٹھا کبھی بھی کھل نہ پائے گا ۔۔کس قسم کی بندر بانٹ شروع ہے ۔کون کھا گیا۔

OGRA PIA....WAPDA...STEEL MILLS....RAILWAYS,

ان اداروں کو کس نے لوٹا پتہ ہونے کے باوجود کوئی انگلی نہیں اُٹھا رہا۔ جنگلات کی لکڑی کون کھا گیا۔اسلام آباد اور باقی شہروں میں سرکاری پلاٹوں کی بندر بانٹ کس نے کی ۔گھی ملز اور شوگر ملز اور فلور ملز نے عوام کو کس طرح لوٹا ۔ان ڈاکوؤں کو کیوں نہیں پکڑتے ۔سب بیوروکریٹ ، وزراء ، چیف سیکرٹریز ، ریٹائرڈ ججز، آئی جی پولیس ، جرنیل ، اپنی وطن کی لوٹی ہوئی دولت روزانہ کروڑوں ڈالرز بیرون ملک کیوں لے جارہے ہیں ۔اُن کو کیوں نہیں پکڑتے ۔اُن کے نام ECL میں کیوں نہیں ڈالتے ۔ماڈل ٹاؤن کے واقعہ کے مجرمان کی بیرون ملک تقرریاں کون کر رہا ہے ۔برطانیہ کو

الطاف حسین کے متعلق راستہ دکھانے والوتم بااختیار ہوکربھی اپنے ملک میں کچھ نہیں کررہے۔(وزیر داخلہ کے جرائم کی کلی تواعتزاز احسن نے قومی اسمبلی کے فلور پر ہی کھول دی تھی) سُن لو یہ مکافات عمل ہے۔کاش میرے ملک کی نیب ہی اپنا قبلہ درست کرلے تو ساری ایلیٹ کلاس جیل میں ہو۔کوئی بھی مڈل کلاس کو قاتل نہ بنا سکے اصل میں یہی ایلیٹ کلاس ملک دشمن ہے۔

اس قوم کو خدا سزا دے رہا ہے۔اے باطنی طور پر یزیدی کردار ادا کرنے والو خدا دیکھ رہا ہے پہلے تم نے شیعوں کو قتل کروایا، پھر تم نے احمدیوں کو مروایا، اب تم لوگ عیسائیوں کو مروار ہے ہو۔اس کے بعد مہاجروں کے پیچھے پڑے ہو جن لوگوں نے یہ ملک بنایا۔تم سب اُن جماعتوں کے نمائندے اور چمچے ہو جو پاکستان کے قیام ہی کے خلاف تھیں اس لئے تمہارا ایجنڈا اس ملک کو ختم کرنے کا ہے۔اے این پی، جمیعت علمائے اسلام و پاکستان، جماعت اسلامی، سندھو دیش، بی این پی۔جمیعت احرار، دیوبندی علماء اور بریلوی پاکستان کے دشمن تھے اور اب بھی ہیں۔یہ بھی کہا جار ہا ہے کہ صرف سرکاری مسلمانوں کو بچاؤ باقی سب کو بچانے کی ضرورت نہیں۔شیعوں، احمدیوں۔ عیسائیوں کو مارنا تو ثواب کا کام ہے۔اسی لئے کہ سابقہ دو ماہ میں یہی لوگ ٹارگٹ بنے ہیں۔

*-*-*

## مجبوری

کسی گاؤں میں ایک لوہار رہتا تھا۔جو سنگین جرم کا مرتکب ہوا۔جو ثابت ہو گیا۔مگر مجبوری یہ آڑے آئی کہ سارے گاؤں میں ایک ہی لوہار تھا جبکہ درزی تین تھے۔چنانچہ خانہ پُری کرتے ہوئے لوہار کی بجائے ایک درزی کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

# پاکستان ڈوب رہا ہے

ہم نے اس وطن سے سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا ہے۔ ہمارے دینی لیڈروں نے شروع دن سے اسے تسلیم نہیں کیا۔ جس طرح بنگلہ دیش میں محکمہ تعلیم کے ہندو اساتذہ نے مشرقی پاکستان میں لوگوں کو دو نظریے کے مخالف تعلیم دے کر پچیس سال بعد ملک تڑوا دیا تھا اسی طرح میرے ملک کے ملاں نے اس قوم کی غلط تربیت کر کے حب الوطنی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ مذہب کی غلط تفسیر کر کے، پاکستان کی غلط تشریح کر کے قوم کو غلط پٹڑی پر چڑھا دیا ہے۔ پہلے حب الوطنی کو مذہب کے پیچھے کیا۔ پھر مذہب کی غلط تفسیر کی اور فرقہ پرستی کے عفریت کو کھلا چھوڑا۔ عمل صالح کو ترجیح نہ دی۔ اور عام مسلمان کو سب غلط کاریوں کی ترغیب دے کر معاشرے کا ایک بدکردار فرد بنانے کے فیشن کو رواج دیا۔ مدرسے اور مسجد کو کاروبار کی شکل دے دی۔ ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر بالادستی سے روشناس کرایا۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ سے عام انسان کو دور کیا۔ جمہوریت سے متنفر کیا۔ رحم، صبر، برداشت، صلہ رحمی کو بزدلی قرار دے کر ایک خونخوار معاشرے کی تشکیل دینے میں کامیاب وکامران ٹھہرا۔ عام مسلمان کو فرقہ پرستی کی بھی تعلیم دی۔ چھوٹے بڑے کے احترام سے بھی غافل رکھا۔ ٹیکس چھپانے کی تعلیم دی۔ اور قومی اثاثوں کو غصب کرنے کی تعلیم دی۔ غرضیکہ سب برائیوں کو کارِ خیر قرار دیا۔ دھاگہ تعویز کے کاروبار کو عام کیا۔ پیر پرستی، قبر پرستی، دربار پرستی، اقربا پروری کو عام کر کے عوام کی حوصلہ افزائی کی۔ اور قانون شکنی کی تعلیم دے کر عام انسان کو حکومت کا باغی بننے کی ترغیب دی۔ اَقرباء پروری نے ایسا کمال دکھایا کہ اب ملک اندر سے بری طرح کینسر کا مریض ہے۔ اور عنقریب اس کی موت ہونے والی ہے۔ ہم سب نے اپنے زورِ بازو سے لاقانونیت کر کے اپنے مادرِ وطن کو لوٹ لوٹ کر اَدھ موا کر دیا ہے۔ ہم من حیث القوم بے ضمیر اور بے غیرت، بے شرم اس حد تک ہو گئے ہیں کہ دنیا ساری ہم سب پر ہنس رہی ہے۔ اور ہم بے غیرتی کی ہنسی ہنس رہے ہیں۔ ہم گدھ کی طرح اپنا ہی گوشت نوچ رہے ہیں۔ ہم میں نہ تو انسان کے کوئی خواص رہے ہیں بلکہ

جانوروں کے معیار سے بھی گر گئے ہیں۔ ہمارا ہر محکمہ رُو بہ زوال ہے۔ ہر وزیر، لیڈر، بیوروکیٹ، وکیل، ڈاکٹر، جج، مولوی، افسر، رشوت خور، حرام خور، ایمان فروش، ضمیر فروش، وطن فروش، بن چکا ہے۔ رہی سہی کسر کرکٹ بورڈ اور کرکٹ کھلاڑیوں نے پوری کر دی ہے۔ ایک امریکی نے جب کہا تھا کہ پاکستانی اپنی ماں بیس ڈالرز میں فروخت کر دیتا ہے۔ اس وقت تو مجھے بھی غصہ لگا تھا مگر اب نظر آرہا تھا کہ اس کا تجزیہ قریب قریب ہی تھا۔

ہمارا قول اور ہے فعل اور ہے۔ ہمارا دین جو کہتا ہے ہم اس کو اپنے حق میں بڑے تفسیری طریقے سے اپنے حق میں ڈھال لیتے ہیں۔ ہمارا امیج تباہ ہو چکا ہے۔ نہ ہمارا کوئی دوست ہے نہ سجن۔ ہم درباری بن چکے ہیں اور فقیر و گدا کی طرح خوشامدی بن چکے ہیں۔ پاکستان کا مطلب کچھ اور تھا اور ہم نے اسے اکناف عالم میں ایک کرپٹ اور ناکام ریاست بنا کر دم لیا ہے۔ سارا مال اور روپیہ باہر نکال لیا ہے۔ اور غریب عوام کو کچھ بھی نہیں دیا۔ جو ایم این اے یا ایم پی اے منتخب ہوتا ہے۔ نہ جانے اس کے پاس راتوں رات پجارو کوٹھی بنگلے کہاں سے آجاتے ہیں۔ اس کے بھانجے بھتیجے تھانیدار ایس پی اور تحصیلدار کیسے بن جاتے ہیں۔ ہر کوئی ان کی بات سنتا ہے۔ کوئی شریف بندہ ہو یا گاؤں کا مولوی اس کی بات تو کوئی سنتا تک نہیں۔ ہمارے معاشرے کو کیا ہو گیا ہے۔ امیر کا کتا مرتا ہے تو اس کی بھی فاتحہ کا بھی انتظام ہو جاتا ہے۔ غریب کے کفن کا انتظام مشکل ہے۔ اب سنا ہے شریف برادران نے فوج سے اندر ہی اندر سودا بازی کر لی ہے۔ اور سارے محکموں کو ویران کرنے کا عہد کر لیا ہے اور سارا روپیہ ملک سے باہر لے جایا جا رہا ہے۔ آپس میں حکومت اور اپوزیشن نے جیو اور جینے دو کا رستہ اپنا لیا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف پرچے نہ کرانے کا آپس میں معاہدہ ہو گیا ہے۔ سارے ٹھیکے جو بجلی پیدا کرنے کے بھاری کمیشن پر اپنے پسندیدہ افراد اور کمپنیوں کو دیئے جا رہے ہیں۔ گوادر اور خنجراب کی روڈ میں بھی خفیہ تبدیلی کر کے راستہ مختصر کر کے گھپلہ کیا جا رہا ہے۔ پی آئی اے شجاعت عظیم کے حوالے کی جا رہی ہے۔ ہر محکمے کے لئے بھاری قرضے لے کر ملک کو صدیوں تک قرضوں کے بوجھ تلے دیا جا رہا ہے۔ ملک میں نہ پانی ہے صاف پینے کا، نہ صحت کے

لئے کوئی انتظام ہے۔نہ بجلی ہے، نہ تعلیم ہے،عوام کو آئندہ بیس سال اسی طرح قیدی رکھنے کا منصوبہ ہے۔اور پاکستانی طالبان کو کہا گیا ہے کہ شیعہ اور غیر مسلم اقلیتوں کے لئے قتال عام جائز ہے بس سنی اسٹیٹ کے دیو بندیوں، بریلویوں کو صرف بچانا ہے۔سارے ملک کو کھانا ہے۔ہے ورنہ دھرنا تیار تھا جب تک طاہر القادری بھی آجائے گا۔وہ بیرون ملک مال اکٹھا کر رہا ہے۔ملک سے سب نوجوان بے روزگار بھاگ رہے ہیں اور طالب علم تو پہلے ہی سٹڈی ویزے پر بیرون ملک روانہ ہیں اقلیتیں بھی ملک چھوڑ رہی ہیں۔سرمایہ دار بنگلہ دیش کو سدھارے۔کھلاڑی بھی بیرون ممالک میں اسائلم لینے والے ہیں۔سرمایہ دار اپنا سارا سرمایہ سوئٹزرلینڈ میں رکھوا رہے ہیں۔کیونکہ ملک ڈوب رہا ہے۔معدنیات بھی غیر ممالک کو دی جارہی ہیں۔اس طرح آبادی کم ہوجائے گی۔اور پھر صرف طالبان ہی یا تشدد پسند فرقے ملک کو سنبھال لیں گے۔وگرنہ ایسا نہ ہوا تو انڈیا کو رام کر کے رام رام کیا جائے گا کیونکہ ہمیں نہ ضمیر کی ضرورت ہے اور نہ عزت کی ہمیں تو صرف دولت چاہیئے۔باپ بڑا نہ بھیا سب سے بڑا روپیہ۔



## جواب

ایک دُبلا پتلا میاں اور اس کی بہت موٹی اور صحت مند بیوی کی لڑنے جھگڑنے کی آوازیں ہمسایوں تک بھی پہنچتی تھیں۔برابر والے گھر میں عورت نے سوچا۔مجھے ان دونوں کو سمجھانا چاہیئے کہ ہر وقت آپس میں لڑنا اچھی بات نہیں۔ایک دن جب ان کے آپس میں لڑنے کے آوازیں آئیں تو اس نے دونوں کو سمجھانا چاہا کہ ''تم دونوں آپس میں نہ لڑا کرو۔میاں بیوی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہوتے ہیں اپنی زندگی کی گاڑی خوشگوار انداز میں چلاؤ''۔میاں جو پہلے ہی جلا بھُنا بیٹھا تھا نے جواب دیا''وہ گاڑی کیا خاک چلے گی جس کا ایک پہیہ ٹریکٹر کا اور ایک سائیکل کا ہو''۔

*-*-*

# یہ سب امریکہ کی سازش ہے

## زوال شدہ قوموں کی عادت ہے کہ اپنا قصور دوسروں پر ڈال رہے ہوتے ہیں



بیٹا باپ کی عزت نہیں کرتا ۔ ہر دوکاندار جھوٹ بول رہا ہے ،ملاوٹ کررہا ہے۔ہم اپنی قوم کے سفینے کوڈبونے والے ہیں۔آج قتل وغارت کیوں ہورہی ہے۔کیا یہ سب امریکہ کی سازش ہے دنیا میں صرف دوریاستیں مذہب اسلام کے نام پر بنائی گئیں۔ایک قرونِ اولیٰ میں ریاست مدینہ۔ایک ریاستِ پاکستان ۔مگر عجیب بات ہے کہ پاکستان کے قیام کی مخالفت اسلام کے ٹھیکداروں نے ہی کی۔جس میں بڑے بڑے جغادری علمائے سُو، مدنی، دیوبندی، بریلوی، بخاری، چشتی، قادری، مودودی اور باچا خانوں نے ایڑی چوٹی تک زور لگایا۔مگر ایک کلین شیو انگریزی بیرسٹر مخلص مسلمان ( جس کے ساتھ محمد کی دعا اور علی کی طاقت تھی ) نے اس طوفانِ بدتمیزی میں چومکھی لڑائی لڑکر ایک ملک بنا کر دکھا دیا۔مگر وہ جو اس ملک کے ازلی دشمن ( کھوٹے سکّے ) تھے۔اُن کی خباثتوں نے اپنے کردار سے اس ملک وقوم کی اس رنگ میں تربیت کی کہ یہ قوم اپنی برائی میں دنیا کی بدترین قوم بن چکی ہے۔علمائے سُو کی تربیت نے اس خونخوار تصویر کو پیش کیا ہے کہ ساری دنیا اس سے نفرت کرنے لگی ہے خدا تعالیٰ نے اتنا بڑا ملک کس لئے دیا تھا۔ حکمران ظالم بن جائیں ،عوام مجبور ہوجائیں ۔قومیں اس وقت برباد ہوتی ہیں جب اُن میں انسانی اصول ختم ہوجائیں ۔اسلام سے نابلد یہ قوم یہود وہنود سے عمل میں بہت بدتر ہوچکی ہے ۔ یہ سب امریکہ کی سازش۔

یہ ملک کیسے بچ سکتا ہے۔ جہاں کا ڈاکٹر مریض کوگاہک سمجھتا ہے۔لیڈر جتنا جھوٹ بولے اتنا ہی اُسے زیادہ ووٹ ملے۔ جوجعلی ڈگری لے وہی افسر اور جج بنے۔ جو رشوت لے اور اوپر تک پہنچائے وہی سب کا پسندیدہ بنے ۔حرام جانوروں کا گوشت عام ملے ۔قوم کوٹیکس دینا گوارا نہ ہو۔ ہر چیز میں ملاوٹ ۔قول وزبان میں تضاد، بدکردار لیڈر، اور بدفطرت اور راشی جج اور منصف مقرر ہوں ۔

لاکھوں کروڑوں روپے رشوت دے کرعہدے اورنوکریاں لی جائیں۔اَقرباء پروری میں کمال ہو۔ شکم پری کے سب ناجائزاسباب پیدا کئے جائیں۔طالبان کے پردے میں ظالمان کےفتاویٰ غیر اسلامی چلائے جائیں۔جن کاتعلق دور دور تک اسلام سے نہ ہو۔الیکشن لڑنے کے لئے'' طالبان ہمارے بچے ہیں طالبان ہمارے بھائی ہیں'' کے بیان جاری کئے جائیں اوران کی مدد سے الیکشن جیتا جائے۔اُن فرقہ ورانہ دہشت گردوں سے مخصوص اقلیتوں پر حملے کرائے جائیں۔اس ملک میں عوام کوکوئی ترجیح نہیں دی گئی۔نہ صحت، نہ تعلیم،نہ روزگار،نہ بجلی نہ صاف پانی،نہ امن، نہ انصاف، نہ مفت قبر، نہ کفن، بلکہ بجلی کے پانی کے نرخ بڑھا کران سے زبردستی ٹیکس وصول کیاجاتا ہے۔غریب کوگرفتار کر کے جیل میں ڈالا جاتاہےاورامیر کی ضمانت جلدی منظور ہوجاتی ہے۔نیب کے اندر پی پی پی کے سب بڑے بڑے مچھندروں پر مقدمات ہیں اب وہ کسی خفیہ معاہدے کے سبب کھولے نہیں جارہے۔جب پی پی پی نے کوئی عدم تعاون کی بات کی تو وہ مقدمات بھی کھلتے نظرآئیں گے۔ ہرکام میں بدنیتی موجود ہے۔اپنے مفادات موجود ہیں۔سب ادارے تباہ حال ہیں پی آئی اے، اسٹیل ملز،ریلوے،واپڈا، پی ڈبلیوڈی،وغیرہ۔

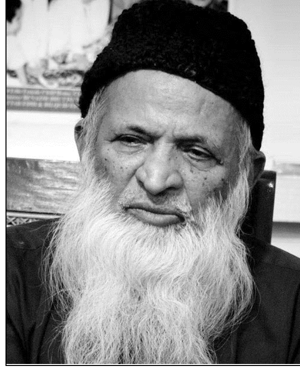
یہ بتا کہ قافلہ کیوں لُٹا مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں مجھے رہبروں سے سوال ہے۔یہ سب امریکہ کی سازش ہیجہاں کے وکیل دہشت گروں کی فائلیں تیار کرتے ہوں، اُن کے مقدمات جائز وناجائز طریقوں سے ججز سے ملکر مقدمات کے فیصلے سنانے تک سودے بازی میں ملوث ہوں۔پھر ہر تین میل کے فاصلے پر ہمارا اسلام مختلف ہو جاتا ہے۔ہم ایماندار اسقدر ہیں کہ کرپشن ساری قوم کا اوڑھنا بچھونا بن چکا ہے۔رشوت عام ہے۔ملاوٹ لازمی ہے،کسی کےحق پر ڈاکہ زنی ہمارا نصب العین بن چکا ہے۔ہمارے لیڈر اسقدر بے ایمان ہیں کہ فرعون ویزید بھی ان کودیکھ کر شرماتے ہیں۔ ہر محکمے کوہم نے کنگال کردیا ہے۔ہمارے سب ادارے اندر سے کھوکھلے ہوچکے ہیں۔ہم مسجد کے نام پر،حج کے نام پراللہ اوررسول کے نام پر مال،عشر زکواۃ تک کھانا جائز سمجھتے ہیں۔اب تو ایک ماہ ہوا جامعہ بنوریہ ٹاؤن کراچی نےفتویٰ دے کر شراب بھی حلال کردی ہے۔متعہ تو پہلے ہی عربوں

نے (رحیم یار خاں میں) جائز قرار دیا ہوا ہے اگر نہیں تو اسمبلی کے شراب خوروں (بقول جمشید دستی) سے قرارداد کسی بھی قسم کی پاس کروائی جاسکتی ہے۔ جسطرح ریکوڈک کمپنی کو اپنے ملک کا سونا فروخت کیا ہے۔

ہماری قوم کے سرکردہ لیڈر، تاجر، ملز مالکان، علمائے سُو، بیوروکریٹ، بڑے بڑے سرمایہ دار ملک کو کمزور کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں ۔ یہ لوگ خود طالبان سے اپنے دشمن لوگوں پر حملے کرانے میں ملوث ہیں ۔ یہ مرض سارے جسم میں کینسر کی طرح پھیل چکا ہے اس مرض کو پھیلانے میں ضیاء الحق سے لے کر اُس کی باقیات نے اس کی پرورش کی ہے۔ ملک کو غریب اور خود کو امیر کیا ہے۔ مذہب سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ مساجد اور مدرسہ جات میں دہشت گردوں کی خود پرورش کی ہے۔ خود لوگوں کو اغوار برائے تاوان کرایا جاتا ہے اور خود ہی اُن پر حملے کرائے جاتے ہیں ۔ پنجابی طالبان ان سب کی اپنی پیدائش ہے۔ اب یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ امریکہ کروا رہا ہے۔ گھبراؤمت ابھی تو چکی چلی ہے۔ پہلے دانہ چکی میں پڑتا ہے پھر دو پھاڑ ہوتا ہے پھر چار پھاڑ۔ تب کہیں جا کر آٹا بنتا ہے۔ اب اس قوم کا آٹا بننے کو ہے۔ چالیس سال سے اس دھرتی پر ہر مظلوم، بے کس وغریب، مزدور، ہاری، کسان، غیر مسلم، کمتر طبقے پر ظلم روا رکھا گیا ہے۔ اب حکمران طبقے کی باری قریب ہے۔ حکمرانی بھی جائے گی اور عزت بھی۔ خدا دیکھ رہا ہے کہ کس کا کیا کیا قصور ہے۔ یہ سب حکمران، پی پی پی ہو یا ن لیگ یا کوئی بھی لیگ یا پارٹی یا مولوی سب کا آٹا بن کر رہے گا۔ خدا اس مملکتِ خداداد کو ضرور قیامت تک قائم رکھے گا مگر فراعین، یزید، ہلاکو خان، چنگیز عبرت کا نشان بنادیئے جایا کرتے ہیں۔



# مسیحائے انسانیت کی مفارقت



کہنے تو ایک شخص کی وفات ہے۔مگر اس دور کا ایک یہ عظیم شخص قرونِ اولیٰ کے ولیوں کی مانند تھا۔ وہ ایک مثال تھا اُن لوگوں کے لئے جو کہتے ہیں کہ یہ دور بدل چکا ہے۔آج نیک کام یا حقوق العباد کا کام ناممکن ہے۔آج ولیوں کی طرح ،غرباء اور محتاج لوگوں کے درد کو اپنا درد سمجھ کر بانٹنا مشکل ہے۔عبدالستار ایدھی نے ان سب بہانہ بازوں کو شکستِ فاش دی ہے۔اور ثابت کر دکھایا ہے کہ اس دورِ بدتمیزی میں بھی خدمت خلق کی جاسکتی ہے۔اگر نیت صاف ہو تو مسلسل جدوجہد سے اسی دنیا کو جنت کا نشان بنایا جاسکتا ہے۔مگر اُن لوگوں کے لئے جو اپنی جان کو اپنی اولاد کو، اپنے مال کو ترجیح نہ دیں۔ترجیح دیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا کو۔رنگ ونسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر اُسوہ رسول ﷺ کو جادہ منزل بنا کر اس نے اللہ کی رضا کو بھی اور دنیا کی بھلائی کو بھی پالیا۔وہ باعمل صوفی ،اُن جبہ پوش علمائے سُو سے افضل و برتر ہے۔

جو اندرونی اور بیرونی آقاؤں کے درباری بنے بیٹھے ہیں۔اور زبان درازی میں ابلیس کے پیرو ہیں۔چاندی کی تھیلی پر نظر رکھ کر فیصلے کرتے ہیں۔قرآن و سنت سے بالا بالا فتاویٰ دیتے ہیں۔طالبان کو جنت کا جعلی تصور دے کر بمبار کُش تیار کرتے ہیں۔اور اللہ کے نام پر اللہ ہی کے بندوں کا خون کرواتے ہیں۔اللہ اور اس کے رسول کے نام پر حج سکینڈل،عمرہ پیکیج ، کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہیں۔ٹی وی پروگراموں میں اپنی دھونس جمانے کی خاطر عورتوں کی بے حرمتی کرنے کی دھمکی دیتے ہیں، اشرفی اور شرابی مست ہیں اور شیرانی عورتوں یا بیویوں کو مار پیٹ کرنے کا کھلے عام فتویٰ دیتے ہیں۔کیا ان کو عبدالستار ایدھی نظر نہیں آتے ہیں ان کو خدا اور اس کے رسول کا بھی خوف بھی نہیں۔باقی بھی اقلیتوں کا اس قوم سے اعتماد اُٹھ گیا ہے۔اگر نیت صاف کی جائے۔اور ایدھی کی زندگی کو پڑھا جائے ۔ اس کی 66 سالہ جدوجہد نے پانچ ہزار روپے کو اربوں تک

پہنچا دیا۔مگر ہمارے حکومتی خزانے کہاں گئے۔ ہماری اربوں روپے کی زکوٰۃ کیسے ہڑپ کی جاتی ہے ۔عشر کیسے گول کیا جاتا ہے۔اگرایک ہزار لوگ بھی ایدھی بن جائیں تو یہ معاشرہ جو اسلام کے نام پر تباہ کر دیا گیا ہے سُدھر سکتا ہے۔صرف قانون کی حکمرانی کی ضرورت ہے۔ یہ علمائے سُو ہرزہ سرائی کر رہے ہیں کہ اس کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ایدھی کا سارا کاروبار غیر اسلامی تھا۔وہ زندیق تھا۔نعوذ باللہ۔ساری قوم علمائے سُو کے ان فتاویٰ کو جوتے کی نوک پر نہیں لائی۔ پاک فوج نے، پولیس نے، بحریہ کے دستوں نے، فرنٹیئر کور نے سب نے سلامی دی۔اور قوم کے اس ہیرو کو تزک و احتشام سے روانہ کیا۔اور ان علمائے سُو کے فتاویٰ حسب سابق اپنا منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔ساری قوم کو اس مسیحائے انسانیت کے طرزِ عمل کو اپنا کر اس قوم کو مایوسی سے نکالنا چاہیئے۔ساری قوم کو انسانیت کی تعریف سے آگاہ کیا جائے۔حقوق العباد کے تقاضوں سے آگاہ کیا جائے۔

عبدالستار ایدھی نے جن چیلنجز کا مقابلہ کر کے درجنوں،عورتوں کے شیلٹر ہومز،فری نرسنگ ہومز، یتیم خانے،میڈیکل کلینکس،منشیات سے تباہ حال نوجوانوں کی بحالی کے مراکز،دماغی معذوروں کے لئے علاج گھر،نومولود بچوں کے لئے جھولا سروس،میتوں کی تدفین اور قبر کا انتظام مور چری سروس اور دنیا کی سب سے بڑی ایمولینس سروس بنائی،عبدالستار ایدھی کے چلے جانے کا نقصان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں اس باہمت انسان نے براعظم افریقہ، مڈل ایسٹ،کاکسس ریجن،مشرقی یورپ،اور امریکہ کے 2005ء میں طوفان میں مخلوق خدا کی مدد کی۔عبدالستار ایدھی نے نہ محل بنائے۔نہ یورپ و امریکہ جا کر عیاشی کی،نہ خوش پوشی،اور نہ ہی خوش خورا کی کو ترجیح دی۔ انہیں خالص پاکستانی دیہاتی حلیئے میں بھی عالمی پذیرائی میں اتنے ایوارڈ ملے۔ان میں سے چند ایوارڈ یہ ہیں۔رومن پبلک ایوارڈ،لینن امن ایوارڈ،پول ہیرس فیلو،روٹری انٹرنیشنل ایواڈ،امریکن ایوارڈ،گینز بک ایوارڈز سال 2000،انسانی میڈیکل سروسز،انٹرنیشنل بلزان پرائز،برادر ہڈز ایوارڈ اٹلی،گاندی پیس ایوارڈز،ساؤتھ کوریا ایوارڈز،یونیسکو ایوارڈز،کالج آف فزیشن اینڈ سرجن ایوارڈز، برصغیر سوشل ورکر ایوارڈز،نشانِ امتیاز،خدمت ایوارڈز،یورپ اور انسانی حقوق ایوارڈ۔احمدیہ مسلم

پیس ایوارڈ ز شامل ہیں۔اے قوم کے نابیناؤ، اے عقل کے اندھو! سوچو۔اور عبدالستار ایدھی بنو۔اورقوم کی خدمت کے لئے جاگ جاؤ۔ستر سال میں ہم نے کیا بنایا ،عبدالستار ایدھی سے سیکھو۔علمائے سُو سے بچ کر اپنی اصلاح کرو۔میرا وطن ستر سال سے ڈاکوؤں کے گھیرے میں ہے۔اے اللہ کوئی مصطفیٰ کمال پاشا بھیج جوان یزیدوں کی خبر لے۔قارونوں کی شکم دری کر کے قوم کا لوٹا ہوا مال نکالے۔



## زندگی کی گاڑی

زندگی کی گاڑی کو ارادے کے انجن اور وعدوں کے ڈبوں کے ساتھ، پیار کی پٹڑی پر رواں دواں رکھنے کے لئے کدورتوں سے پاک ایندھن سے ہی چلایا جا سکتا ہے اگرچہ زندگی کی گاڑی محبت کے اسٹیشن پر کچھ دیر کے لئے رک جاتی ہے مگر حسین مسافروں سے بچھڑ کر، نئے ہمسفروں کو ساتھ لے کر اور حسین مناظر کو پیچھے چھوڑ کر گرم گرم آہیں بھرتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔

## چہرے

دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں۔جنہیں خدا تعالیٰ نے خوبصورتی سے نوازا ہے۔ ایسے لوگ جو خوش شکل ہوتے ہیں۔ان میں زیادہ تر اپنی انا کے خول میں بند رہتے ہیں۔وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ کوئی برتر مخلوق ہیں بلکہ صحیح معنوں میں خوبصورت اسی شخص کو کہا جاتا ہے جو خوب سیرت ہو۔لیکن اس معاشرے میں خوب سیرت کی تو اتنی تعظیم نہیں کی جاتی جبکہ خوبصورت کی سب عزت کرتے ہیں، سب ان پر جان چھڑکتے ہیں۔میرے خیال میں خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو کس زاویئے سے دیکھتا ہے۔

# مجبور، بیوقوف، شریف عوام



یہ قوم بنیادی طور پر بے وقوف ہے۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو آپ کو سمجھ آئے گی کہ یہ قوم زیرو کو ہیرو اور ہیرو کو زیرو بنانے والی قوم ہے۔ جب پاکستان بنا تو اس قوم نے قیام کے بعد پاکستان کے مخالفین کو ہیرو کا درجہ دیا۔ جتنے بھی سید عطاء اللہ بخاری، احراری، مودودی، مدنی، خاکسار سرحدی گاندھی، وغیرہ پاکستان سر چھپانے کے لئے آدبکے اس قوم نے ان کو نام نہاد لیڈر بنایا جبکہ یہ قوم ان کی اصلیت سے واقف تھی۔ پھر لیاقت علی خان کے قتل کیس سے پردہ نہ اُٹھایا کیونکہ وہ مہاجر تھے جبکہ مہاجرین کی تعداد پاکستان میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ پھر ایوب خان آئے تو اس کے ترقیاتی کاموں کی وجہ سے ملک کو کچھ توانائی ملی۔ عوام خاموش رہی۔ مگر اس کی یہ غلطی تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ایک عظیم غلطی ایوب خان نے کی جب اس نے استعفیٰ دیتے وقت ملک کی باگ ڈور یحییٰ خان کو سنبھال دی۔ جسے جماعت اسلامی نے امیر المومنین بنا رکھا تھا۔ اس قوم نے کبھی بھی کوئی فیصلہ  بروقت اور دُرست نہیں کیا۔

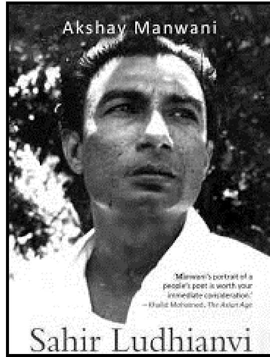
جنرل رانی، اور بہت سی وغیرہ وغیرہ، اس پر احتجاج کے لئے کوئی جماعت باہر نہیں نکلی۔ اور اسی طرح پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ 1971ء کی جنگ پاکستان بری طرح ہارا۔ اور وقت سے پہلے ہتھیار ڈال کر ایک لاکھ لوگ قیدی ہو گئے۔ پھر بھٹو کو قید کرنے پر نو ستارے جو پہلے ہی اپنی جہالت اور بے وقوفی میں مشہور تھے۔ انہوں نے ملکی مفاد کی بجائے اپنے ذاتی انتقام کو ملکی مفاد پر ترجیح دے کر ضیاء الحق کو امیر المومنین بنا کر افغانستان اور پاکستان کی تباہی کی بنیاد رکھی۔ بعد میں امریکہ اور سعودیہ نے بھی اس میں گھناؤنا کردار ادا کیا۔ جس کے نتائج آج ہم بھگت رہے ہیں۔ جب ضیاء الحق کا خاتمہ ہوا تو بزور عوام بے نظیر تو آئی مگر پھر کچھ ہی عرصے بعد فوج آئی جے آئی بنا کر نواز شریف کو برسر اقتدار لے آئی۔ یہ سارے کام عوام کی مرضی کے بغیر اور الیکشن کی دھاندلی کے ذریعے فرشتوں نے سرانجام دیئے۔ بات کرنے کی یہ ہے کہ ہماری عوام کوئی شریک اقتدار نہیں۔ نہ پہلے تھی نہ اب

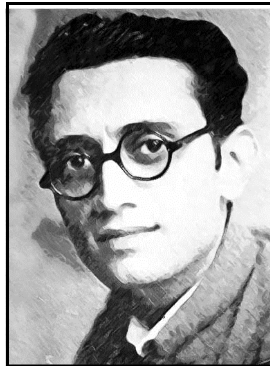
ہے۔ یہ سارا ڈھونگ ہے۔ میرا مادرِ وطن دراصل اغوا ہو چکا ہے۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں کے چنگل میں ہے۔ یہاں کوئی فیصلہ بر وقت نہیں ہوتا۔ پٹھان یا چوکیدار کی سوچ ہے۔ ایٹم بم تو بنا لیا مگر گھر میں روٹی کپڑا اور مکان بھی نہیں، نہ دنیا میں عزت ہے۔ نہ ہمارا قول ہے۔ نہ کردار ہے، آج ہمارے ملک میں عقلمند تو بہت ہیں مگر ملک کے لئے دردمند کوئی نہیں۔ دولتمند تو ہیں مگر دماغی طور پر صحتمند کوئی نہیں۔ قیامت کا سماں ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ اشرافیہ ضمیر فروش، علمائے سُو فتویٰ فروش، لیڈر وطن فروش، باقی ایمان فروش ہیں۔ یہاں اسلام کا نام ہے اور اسلام آباد کی حکومت ہے۔ جہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہے۔ امن کا حال یہ ہے کہ جسٹس کا بیٹا اغواء ہوا، پولیس کو اس کی خبر ہی نہیں۔ امجد صابری کا دن دیہاڑے قتل ہوا کسی کو پتہ ہی نہیں۔ یہ ملک ہے کہ جنگل۔ اصل میں ہم سوچتے نہیں۔ ہماری قوم نے لگتا ہے کہ خدا کو ناراض کر لیا ہے۔ ہم سارے کام عقل سے نہیں زور اور طاقت سے سرانجام ہوتے ہیں۔ حقوق العباد ادا نہیں کرتے، فرائض کی ادائیگی کو ہم بھول چکے ہیں، جانور کی طرح شکم پُری پر زور ہے۔ اور صراط مستقیم کی تلاش بھی نہیں۔ اور مطلوب بھی نہیں۔ ہم اصل راہ سے اپنی بے وقوفی کی بنا پر بھٹک گئے ہیں۔ ہمارے راہنماؤں کردار نام کو نہیں، بنیادی اخلاق سے عاری ہیں، عام شہری کے لئے کوئی بہتر تربیتی سکول نہیں۔ حتیٰ مولوی جو عام شہری کی تربیت کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اس کی ٹریننگ کے لئے حکومتی لیول پر کوئی ادارہ نہیں، صرف اُن مدرسوں پر انحصار ہے جو دہشت گرد پیدا کر رہے ہیں۔ صحت اور تعلیم کے لئے کوئی میگا پروجیکٹ نہیں ملک چیرٹی اور قرضوں پر چل رہا ہے۔ حکمران ڈاکو اور لٹیروں کی طرح کک بیکس اور کمیشن کھا رہے ہیں۔ ایان علی ڈالروں کے صندوق ان تک پہنچا رہی ہے۔ اگر ایک فیصد عوام جو دیانتداری سے وطن کی بے لوث خدمت کرنا چاہتے ہیں تو یہ کرپٹ اکثریت ان کے دست و پا باندھ دیتی ہے۔ اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ علمائے سُو سوائے اپنے کسی کو آگے آنے نہیں دیتے۔ ہر محکمہ زوال کا شکار ہے۔ ہر لیڈر کرپٹ ہے۔ ہر مکتبِ فکر زر پرست بن چکا ہے۔ فرقہ پرستی نے وطن کی گلیوں کو ناحق خونِ مسلم سے سرخ کر دیا ہے۔ ساری دنیا ہمارا تمسخر اُڑا رہی ہے۔ نہ ہمارا کوئی دوست ہے نہ بھائی۔ وطن دشمن طاقتیں میرے مادرِ وطن کو گھیرا ڈال رہی ہیں۔ ❁❁

# اردوادب موزوں شخصیات جنہیں پاکستان نے قبول نہ کیا

جمود کی مخالفت نہ کرو، اسے فروغ دو کیونکہ یہی کامیابی کی کنجی ہے





اردوادب کے عظیم ناول آگ کا دریا کی مصنفہ قرۃالعین حیدر 1949ء میں پاکستان آئیں اس وقت انہوں نے عالمی سطح کی ایک لکھاری کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے محکمہ اطلاعات میں ملازمت اختیار کی اور کچھ عرصہ تک خدمات سرانجام دیں۔ 1959ء میں ان کا عظیم ناول آگ کا دریا شائع ہوا جس میں تقسیم کے متعلق کئی اہم سوالات اٹھائے گئے اور دوقومی نظریہ کو مسترد کیا گیا تھا۔ کسی اور بات کے مقابلے میں یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے پاکستان میں مزید قیام امن ان کے لئے ناممکن ہوگیا، اس لئے وہ بھارت روانہ ہوگئیں اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اردو زبان کے نفیس ترین رومانی شاعر ساحر لدھیانوی 1943ء سے لاہور میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔ جہاں انہوں نے کئی ادبی جریدوں کے لئے کام کیا۔ تقسیم تک حالات بالکل ٹھیک ہی تھے کہ سویرا نامی میگزین میں ان کی شعلہ بیانی تحاریر (اشتراکی خیالات کی نظریات) شائع ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف حکومت پاکستان نے وارنٹ جاری کر دیا۔ 1949ء میں ساحر بھارت روانہ ہوگئے اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ معروف ترقی پسند نظریات کے حامی اور انقلابی شخصیت سجاد ظہیر تقسیم کے بعد پاکستان آئے لیکن انہیں راولپنڈی سازش کیس میں شامل کرلیا گیا اور 1954ء میں انہیں پاکستان بدر کر کے بھارت بھیج دیا گیا۔

اُستاد بڑے غلام علی خان پاکستانی شہری تھے۔انہیں برصغیر کا عظیم کلاسیکی گلوکار سمجھا جاتا تھا وہ اپنی جانب روا رکھی جانے والی لاتعلقی اور بے حسی سے اس قدر مایوس ہوئے کہ انہوں نے مستقل بھارتی شہریت کے لئے درخواست دے دی جون 1957ء میں منظور ہوئی اور بھارت ہجرت کر گئے اس کے بعد خوشحال رہے۔ یہ وہ تمام شخصیات ہیں جنہوں نے بھارت میں خوشحال اور پرسکون زندگی گذاری اور انہیں بھارتی حکومت کی جانب سے کئی قومی ایوارڈ سے نوازا گیا۔چلیں اب دیکھتے ہیں کہ سرحد پار پاکستان میں معاملات کیا رہے۔معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو 1947ء کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آئے۔ یہاں اُن پر تین مرتبہ اپنی تحریر میں فحش نگاری کی وجہ سے مقدمہ دائر کیا گیا۔ مایوس اور غربت کا شکار سعادت 42 سال کی عمر میں انتقال کر گئے 14 اگست 2012ء کو حکومت پاکستان نے منٹو کو اپنے اعلیٰ ترین سول اعزاز نشان امتیاز سے نوازا اور وہ بھی ان کی موت کے 57 سال بعد۔ مارکسی نظریات کے بانی اور فلم ڈائریکٹر ضیاء سرحدی جنہوں نے ہمیں فٹ پاتھ اور ہم لوگ جیسی یادگار فلموں کا تحفہ دیا جب پاکستان میں ہجرت کر گئے تو وہ ممبئی میں ایک بہت بڑی شخصیت بن کر اُبھرے۔ان کی پہلی فلم رہگزر پاکستان میں ان کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے دوران اُنہیں اٹھالیا گیا۔اور قید تنہائی میں سخت اذّیت میں رکھا گیا۔ان پر مارکسی نظریات کے پرچار اور بغاوت کے الزامات عائد کئے گئے۔ رہائی کے بعد انہوں نے ہمیشہ کے لئے ملک چھوڑ دیا اور برطانیہ ہجرت کر گئے اور کبھی واپس نہیں آئے۔ رفیق غزنوی برصغیر کے انتہائی پرکشش باصلاحیت اور ہمہ گیر فنکار تھے وہ اداکار کمپوزر اور گلوکار بھی تھے انہوں نے ممبئی میں پنہر ملن، لیلیٰ مجنوں اور سکندر جیسی فلموں کے لئے موسیقی دی۔تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی آئے جہاں انہیں ریڈیو پاکستان میں معمولی ملازمت کی پیشکش ہوئی انہوں نے بعد میں استعفیٰ دے دیا اور باقی ماندہ زندگی تنہائی میں گذاری۔اور 1974ء میں کراچی میں انتقال کیا۔

شیلا ارمانی 1950ء کی دہائی میں ریلیز ہونے والی دیو آنند کی فلموں ٹیکسی ڈرائیور اور نقوش کی ہیروئن تھیں۔ وہ سندھی تھیں اور وہ کراچی اپنے انکل لطیف کے پاس آئیں جو ایک پروڈیوسر تھے۔

انہوں نے پاکستانی فلم انوکھی میں مرکزی کرادار ادا کیا جس میں مقبول گیت'' گاڑی کو چلانا بابو' شامل تھا۔تاہم کراچی میں سنیما کے محدود امکانات کو دیکھ کر وہ واپس بھارت چلی گئیں۔سادہ لوح پنجابی شاعر اُستاد امن،جن کے لکھنے کا اپنا ہی ایک الگ اانداز تھا۔اپنے آزاد خیالات کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں بھارتی شہریت کی پیشکش کی لیکن انہوں نے مسترد کر دی۔اس جرم کی پاداش میں انہیں جس انعام سے نوازا گیا وہ یہ تھا کہ ان کے ٹوٹے پھوٹے گھر سے ایک بم برآمد کیا گیا جس کی وجہ سے انہیں جیل بھیج دیا گیا یہ کام کسی اور کا نہیں بلکہ عوامی مقبول لیڈر ذاولفقار علی بھٹو نے کیا۔برصغیر ہند کے ہمہ گیر گلوکاروں میں سے ایک محمد رفیع نے اگر پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا انتخاب کیا ہوتا تو سوچیں ان کی قسمت کیا ہوتی۔ شاید وہ لاہور کے علاقے بلال گنج میں نائی ہوتے اور اگر دلیپ کمار کے متعلق سوچیں تو پشاور کے قصہ خوانی میں خشک میوہ جات بیچ رہے ہوتے۔استاد سلامت علی کو موسیقی کی دنیا میں بھگوان سمجھا جاتا ہے۔اور اناڑی میں ان کا بہت نام تھا۔لیکن پاکستان ہجرت کے بعد انہوں نے واہگہ میں اپنی پوری زندگی ایک میراثی کے طور پر گزاری۔آخری مرتبہ جب اسلام آباد میں ایک کرائے کے مکان میں ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی حالت بہت خراب تھی۔ہمارے پاس استاد نصرت فتح علی خان بھی تھے اور جب وہ بھارت گئے تو انہیں زبردست پذیرائی ملی۔ بھارت میں ان کی ریکارڈ کی گئی موسیقی نے ایک ریکارڈ قائم کر دیا اور نہ صرف پاکستان اور بھارت بلکہ دنیا بھر میں ہٹ ثابت ہوئیں۔راحت فتح علی خان، فاخر علی ظفر، عاطف اسلم اکثر و بیشتر بھارت جاتے ہیں جہاں ایک ایسے معاشرے میں ان کے فن کو پذیرائی ملتی ہے جہاں فنون لطیفہ موسیقی روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہے۔عدنان سمیع نے بھی بھارتی شہریت لے لی ہے اور وہ مستقل وہیں رہتے ہیں۔

سلمیٰ آغا اور زیبا بختیار کو اُس وقت پذیرائی ملی جب انہوں نے بھارتی فلموں میں کام کیا اسی دوران وینا ملک کو جہاں یہاں جان سے مارنے کی دھمکیاں مل رہی ہیں اور وہ اُچھلتی پھر رہی ہیں موسیقار سہیل رعنا اس قدر مایوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے کینڈا میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔قبل

ازیں نامور گلوکار سلیم رضا بھی کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں ۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے کچھ لبرل طلبہ کے غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں طلبہ کے سامنے برہنہ پریڈ کرائی گئی۔ بھارت میں دُھوم مچانے کے بعد اسٹار پلس کے چھوٹے استاد پاکستان پہنچنے کے بعد غائب ہی ہو گئے ہیں ۔ جب کے سارے گاما پا نامی پروگرام سے شہرت حاصل کرنے والے امانت علی اور عائرہ رضا بھی نظر نہیں آ رہے ۔ نامور رقاصہ شیما۔ کرمانیاور صدیقی سے ہی پوچھ لیں کہ پاکستان میں پرفارمنگ آرٹس کے شعبے میں ان کے لئے ماحول کتنا محدودداور تنگ ہے۔کسی بھی ملک کوشہرت اس کی ذہین شخصیات اور فنکاروں سے نصیب ہوتی ہے کیونکہ یہ قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ایسے فنکاروں کے بغیر کسی بھی معاشرے کی ثقافتی افزائش نہیں ہو پاتی کیونکہ یہی شخصیات تبدیلی کی علمبردار ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری ریاست کو تخلیق نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی وہ اس طرح کی شخصیات کے لئے موزوں ہے۔ ہمارا ملک صرف لٹیروں اور منافقین کے لئے ہی بنا ہے جو بلاخوف و خطراپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔اسلامی جمہوریہ میں خوش رہنے کی واحد پالیسی یہی ہے کہ جمود کی مخالفت نہ کرو اس کا حصہ بن جاؤ اسے فروغ دو کیونکہ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔



**محبت اور شک::** محبت کی پہلی اور آخری بنیاد اعتماد ہے۔محبت میں صرف آغاز ہوتا ہے اختتام کبھی نہیں ہوتا۔شک ایک دیمک ہے، جومحبت کرنے والے کواندر ہی اندر کھا جاتی ہے۔آپس میں پیار رکھو کیونکہ پیار دلوں کوشک سے صاف رکھتا ہے۔محبت ایک دیوار ہے اگر اس میں شک کا سیمنٹ نہ ہوتو یہ کبھی نہیں گر سکتی۔

**سنگسار::** ایک صاحب کے جوش ملیح آبادی کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔کئی روز غیر حاضری کے بعد ملنے آئے تو جوش صاحب نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے ؛ کیا بتاؤں جوش صاحب، پہلے ایک گردے میں پتھری تھی اس کا اپریشن ہوا اب دوسرے گردے میں پتھری ہے۔ جوش صاحب: میں سمجھ گیا اللہ تعالیٰ آپ کواندر سے سنگسار کر رہا ہے

# آرٹیکل 6 کے مطابق امین وصادق صدور

حکومت پاکستان نے آرٹیکل 6 بنایا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ جو اس عہدے پر براجمان ہو۔ وہ قول اور فعل کا دیانت دار اور امین ہو، ملک کا وفادار ہو، کسی غیر ملکی ایجنسی کو ملکی راز سے آگاہ نہ کرے، یعنی کہ ایک بہترین کردار کا مالک ہو، ایک معقول اور سچا انسان ہو، یا ایک مثالی شہری ہو وغیرہ وغیرہ۔ اگر آج تک آنے والے صدور کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ سب قانون بنانے کی حد تک ہے۔اس مادرِوطن میں بہت سے ایسے ناجائز بند باندھنے کی ناکام کوششیں کی جاتی رہیں کہ اس ملک کا صدر کوئی غیر مسلم نہ آپائے۔کوئی ایسا صدر یا وزیر اعظم نہ آجائے جو ختم نبوت پر یقین نہ رکھتا ہو، مگر یہ کوئی کوشش نہ کی گئی کہ کوئی بندے دا پُتر صدر بنے۔اب تک ایسے ایسے صدور اس ملک خداداد کے بن چکے ہیں کہ اُن کے نام سے گھن آتی ہے۔ یہ کس کا کیا دھرا ہے۔کوئی صدر غیر مسلم اور احمدی نہ آئے سرکاری مسلمان بے شک خونخوار بھیڑیا ہی آجائے یقیناً یہ ساری قوم کا اکثر حصہ کرپٹ اور بے ایمان ہو چکا ہے۔اور ایمان دار اور صادق وامین لوگ کہاں سے آئیں گے جبکہ قوم کی تربیت ہی دونمبر ہوئی ہے۔ ہماری قوم کا امام بھی کرپٹ ہے اور مقتدی بھی، اب تو مساجد بھی بدنام ہو چکی ہیں۔

مکاتب فکر تو خوب بدنامی لے چکے، علمائے سُو بھی تو بُرے القاب سے پہچانے جاتے ہیں، ان کے فتاویٰ سے ان کی نیتوں سے اُن کی کور باطنی کا پتہ چلتا ہے، صدور پر تبصرے کے لئے مشتے از خر دارے ایک دو کا ہی ذکر کافی ہے۔صدر جنرل یحییٰ خان کا ذکر فضول ہے، وہ جنرل رانی کے بھی صدر تھے۔ پھر بھٹو صاحب کا ذکر اُس سے بھی فضول ہے، جو کہ محب وطن ہونے ساتھ ساتھ انا پرست، خود پسند اور احسان فراموش بلا کے تھے۔مردِ مومن جس کو کہتے ہوئے اب تو ساری قوم کو شرم آتی ہے۔ ضیاء الحق۔ایک ایسا بدطینت صدر جو اس قوم کو ایک سوسال پیچھے لے گیا، اور جو کوئی بھی ضابطہ اخلاق نہ رکھتا تھا، جو قرآن پڑھ کر بلکہ قرآن کو سامنے رکھ کر جھوٹ بکتا تھا، جس نے ایسے ایسے مکروہ کام کئے جو عام انسان کی شان کے بھی منافی تھے، بھٹو کی پھانسی ہی لے لیں جس کو عدلیہ پاکستان جوڈیشنل قتل

بھی کہہ چکی ہے۔شیعوں کا قتل عام ،سعودی خود ساختہ متقیان کے کہنے پر ،ملاؤں کے کہنے پر احمدیوں پر اذان کہنے یا اسلام وعلیکم کہنے پر تین سال یا عمر قید کی پابندی، طالبان اور MQM کی بھر پور حمایت ،سعودی اور امریکہ سے ڈالر لے کر جہادِ افغانستان کا ڈرامہ ،ہیروئن کا دھندا، کلاشنکوف، وغیرہ وغیرہ۔ پھر صدور میں دیانت وشرافت میں زرداری سب سے بازی لے گیا۔نواز شریف اُس کا بھی باپ نکلا۔ پانامہ لیکس پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ ملک کی ساری دولت باہر لے جائی جا رہی ہے۔قوم اور یہ درباری کیا کر رہے ہیں۔فوج کے جنرل کس ملک کے رکھوالے ہیں۔کیا یہ بھی صدر جنرل یحییٰ خان کی طرح بے ہوش ہیں۔

پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پر
جب مر گئے تو آئے ہمارے مزار پر

دنیا، اقوام متحدہ، انسانی حقوق کے ادارے یہ سب پاکستان کو کیا کہہ رہے ہیں، میرے مادر وطن میں اسلام سے مذاق اور اخلاق سے کیا کھلواڑ ہو رہا ہے، ہر ایم پی اے، ہر بیوروکریٹ اور ہر سیاسی اور بااختیار شہری کرپٹ اور ظالم ہو گیا ہے، سب اپنے حقوق وفرائض سے نابلد اور ہر قسم کی بد دیانتی میں ملوث نظر آتے ہیں، حکمران من مرضی سے اداروں کو اونے پونے فروخت کر رہے ہیں۔اب صدر اور وزیر اعظم کے علاوہ بھی سب لوگ آرٹیکل 6 کی خلاف ورزی کے مرتکب ہیں۔ قانون کی بالا دستی ہے، صدر یا وزیر اعظم کوئی بھی ہو، عدلیہ اور انتظامیہ مضبوط اور قانون نافذ کتنے والے ادارے مضبوط ہونے چاہییں۔ پاکستان کو مسلمان صدور نے ہی تباہ کیا ہے۔کون ہے جس کا منہ اس مادر وطن کے خون سے رنگا ہوا نہیں۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔



# باضمیر رہیے مطلبی مت بنئے

میری قوم ماشاءاللہ بزعمِ خود ایک بڑی قوم کہلانے کے لئے بڑے بڑے جعلی اقدام اُٹھا کر اپنا ہمیشہ قد بڑھانے کی کوشش میں رہی۔ مگر کسی قوم کا قد اور امیج، مسلسل عمل اور محنت سے بڑھتا ہے۔ ہماری سب کوتاہیوں اور نا اہلیوں، دو نمبریوں، کو ہمارے سیاست دانوں کی بدکردار روّیوں نے اب گلوبل ولیج کی اس دنیا کو پل پل کی خبر دے رہی ہے۔ جو ہم آنکھیں موندھ کر کئے جا رہے ہیں۔ مسٹر ٹن پرسنٹ جو اس بد نصیب قوم کے صدر بھی رہے۔ ان کے علاوہ ہماری پارلیمنٹس کے ممبران بھی بہت ہی بدنام زمانہ کردار رکھتے ہیں۔ میں اُن کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ مردِ مومن کے وقت کا وائٹ پیپرز پڑھ لیجیئے۔ مردِ مومن کے کردار کی تصویر اور اُسے مردِ مومن کہنے والوں کے مزموم ارادوں کا بھی پتہ لگ جائے گا۔ اور اب تک ان جعلی راہنماؤں نے جو ساری قوم کو خون اعتماد ہر سیاسی لیڈر سے اُٹھ چکا ہے۔ جیسے ہر سادہ مسلمان کا ایمان اپنے مولوی پر نہیں رہا۔ کیونکہ ہر دہشت گرد نے داڑھی رکھ لی ہے۔ ہر قسم کے افراد میں ہر قسم کی برائی پائی جاتی ہے، وہ اس لئے کہ ہماری عدالتیں اور انتظامیہ انصاف دینے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ہے۔ جسے بھی کوئی جائز و ناجائز کام کروانا ہو۔

وہ متعلقہ افسر کا حسب و نسب پوچھ کر، اُس کا ریٹ اور رویہ پوچھ کر اُس کے دفتری یا نائب سے بات کرتا ہے۔ ہر کوئی کذب بیانی، دھوکہ دہی کا علمبردار ہے۔ اور اب اس معاشرے میں اُسی کی عزت ہے۔ جس کے ساتھ چار بدمعاش ہوں، چار پیسے ہوں، ایم پی اے اور ایم این اے تک رسائی ہو، اور تھانے دار یا پٹواری سے کھلی بات چیت ہو۔ اچھی گاڑی یا پجارو ہو، کوٹھی ہو، وغیرہ وغیرہ، نظام درہم برہم ہے۔ وطن دشمن اگر ہمارے ملک میں اپنی دولت کے بل بوتے پر منافرت اور دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کے درپے ہے اسی لئے کوئی بھی مقتدر شخصیت اُس کا نام لینے سے خائف ہے۔ ہمارے موسیقار، کھلاڑی اور ایکٹرز سب غیر ملکی ہوتے جا رہے ہیں۔ ضمیر کو جھنجھوڑیئے ورنہ ایٹم بم بھی اس کا علاج نہیں کافی نہیں۔ مادرِ وطن کی املاک کو تباہ کیا جا رہا ہے، بلکہ اب تو فروخت کیا جا رہا ہے۔ سندھ میں تو املاک کا چائنہ کٹنگ کے ذریعہ پہلے ہی جنازہ نکل چکا ہے، روزگار ہے، نہ امن ہے، یہ کیا افراتفری مچا کر قوم کو حواس باختہ کیا جا رہا ہے۔ سارے لیڈر درباریوں کی طرح مختلف ممالک کی ایجنسیوں کی تقدیس میں رطب اللسان ہیں۔

# حالاتِ وطن

میرے وطن کا حال مت پوچھو
طوائف گھری ہو جیسے تماش بینوں میں

میرے وطن میں انسان اخلاق باختہ ہوتا جارہا ہے روز بروز معیار بدتر سے بدتر ہوتا نظر آتا ہے ایلیٹ کلاس کا پہلے تو بھٹہ بیٹھا۔حقوق اللہ کی پامالی تو تھی ہی مگر اب انسانی حقوق کی پامالی تو آخری حدود کو چھونے لگ گئی ہے۔اَقرباء پروری کی بیماری اسقدر گھر کرگئی ہے کہ سب ہی اپنے مطلب اور بچاؤ کی خاطر ایک دوسرے کا خیال رکھنے لگ گئے ہیں۔مثلاً مفاہمتی اپوزیشن نے کیسے کیسے بڑے سکینڈلز کی فائلوں کے گلے دبا دیئے۔بڑے بڑے رینٹل اور فراڈیئے وزراءاعظم اور صدور پر نیب کی نظر نہیں پڑ رہی ،سب ہی ایک دوسرے کے کانے جو ہوئے ،بیوروکریٹ تو ازل سے کرپٹ ٹھہرے۔اب یار لوگوں نے آنے والے جعلی ڈگری ہولڈرز وُزراء کی کھیپ کو ساتھ مل کھانے کے گُر سکھا کر کانے کر لیا ہے۔باقائدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔کیسے کیسے ترقیاتی فنڈز،الاؤنسز،گرانٹس، کے حصے لینے اور دینے ہوتے ہیں۔

یہ سب کرپشن ملاپ اور طریقے اور سلیقے سے ہوتی ہے۔چاندی کی چمک نے ان کے ایمانوں کو زنگ آلود کر دیا ہے،جس ملک کا صدر بہت بڑا ٹن پرسنٹ اور ڈاکو رہا ہواُس کی مسلم رعایا کیونکر سب کچھ نہ سیکھے گی۔جس ملک کے وفاقی وزیر حج ،حج سکینڈل میں کرپشن میں پکڑے گئے ہوں تو باقی مسٹر ڈیزل پر کیا افسوس۔یہ جبہ پوش، پارلیمنٹ کے ممبران،جن کی حرکات سے پردہ ہٹایا جائے تو ابلیس بھی توبہ کرنے لگ جائے۔اور مستزاد یہ کہ یہی لوگ،لوگوں کے ایمانوں کے فیصلے کریں تو کیا یہ بوالعجبی نہیں۔کبھی طالبان بن کر نجات دہندہ بن بیٹھیں تو کبھی دہشت گرد بنکر جنت کے ٹکٹ فروخت کریں،جب زورِ خطابت پر آئیں تو شریف شہریوں کو اپنی مقبوضہ مساجد سے ننگی گالیوں سے نوازیں،مولانا شیرانی اور مولانا شرابی کے لڑائی نے اسلامی نظریاتی کونسل کے تقدس کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا ہے۔یہ علماء ہیں کہ جن کو دیکھ کر شرمائیں یہود، یہ کیا ہے۔اور حکومتِ وقت اس

لئے چُپ سادھ لے کہ اُس کے ووٹرز ہیں۔بڑے بڑے گماشتے اغوا برائے تاوان کریں،سابق وزیراعظم کا بیٹا،اور سلمان تاثیر کا بیٹا مغوی ہو،اور کوئی بھی طاقت اُسے بازیاب کرانے کی جرأت نہ رکھتی ہو،کیا یہ ممکن نہیں،یا تو یہ ملی بھگت ہے یا کتی چوروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔جنگلہ بس سروس اور اورنج ٹرین کے ذریعے اپنوں کو نوازا جارہا ہے۔اور بے چارے شہری نڈھال تماشہ دیکھ رہے ہیں۔غریب شہریوں کی جائیدادیں اونے پونے خرید کر بڑے بڑے گماشتے اپنی جیبیں بھر رہیں ہیں۔اپنے دُشمنوں کو پولیس مقابلے میں راتوں رات قتل کروادیا جاتا ہے۔اور اگر رشوت،چور بازاری،لوٹ مار،ملاوٹ کی طرف دیکھا جائے تو انسان کی رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔لگتا ہے کہ شریف اور منصف افراد اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔نہ انصاف ہے،نہ رحم ہے،نہ قانون کی پاسداری ہے،نہ اسلام کا زور چلتا ہے اور نہ ہی اسلام آباد کا،باہمی بداعتمادی کا سانپ سبھی کو ڈس گیا ہے۔فرقہ پرستی اور مذہبی انتہاپسندی نے ہر انسان کا ہر لحاظ سے امن لوٹ لیا ہے۔

یہ سیاسی اور مذہبی جماعتیں بھی کوئی کردار ادا نہ کر پائیں۔ان کے دعوے اور منشور کہاں دفن ہو گئے۔ہر کوئی اپنی اپنی بنسری بجارہا ہے۔جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس ہے۔لگتا ہے ہم گدھوں کا گوشت کھا کھا کر گدھے ہوتے جارہے ہیں اور پھر الیکٹ بھی اپنے جیسے بھائی ہی کو کرتے ہیں۔کوئی بھی محکمہ ایسا نہیں جہاں گدھا پن نہ کیا جاتا ہو۔اگر یہ گدھا پن نہ کیا جاتا تو آج پاکستان دنیا میں چین اور کوریا سے آگے ہوتا اور ساری دنیا میں اپنا مقام بنا چکا ہوتا،سنا ہے کہ پاک و ہند میں ان نام نہاد مدرسوں نے بہت علماء پیدا کئے۔مگر پاکستان تو دوسو سال کی غلامی کے بعد انگریزوں سے آزاد کروانے والا محمد علی جناح ہی تھا جو کہ یقیناً ایک مولوی نہیں تھا اور یہ علمائے سُو تحریک پاکستان کے ازلی دُشمن تھے جو تب بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ان علمائے سُوء کو استعمال تو کیا جاسکتا ہے مگر کوئی لیڈر اپنے پیچھے نہیں لگا سکتا۔

اب چائنا کوریڈور کے خلاف بھی منافق طاقتیں اچانک اُٹھ کھڑی ہیں۔پی پی پی کی باسی کڑی میں اُبال آیا ہے۔تنقید تعمیری کرنی تو ٹھیک ہے مگر بغض معاویہ رکھ کر نہ کی جائے۔مگر ہمارے لیڈر

اتنے ذہین نہیں کہ وقت کو سنبھال لیں۔ یہی بنگلہ دیش بنانے والے اذہان اب بھی سرگرم ہیں۔ قائد اعظم نے اس قوم کو تنظیم، ایمان، اتحاد کا درس دیا ہے، مگر مخالف پاکستان قوتوں نے اس ملک کو پارہ پارہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ خصوصاً علمائے سونے۔ اقتدار مثبت سوچ رکھنے والے ہاتھوں میں نہیں، محب وطن طاقتوں کے ہاتھ میں نہیں، تنظیم، ایمان، اتحاد کو دولت کی چاندی نے اغوا کرلیا ہے، خودغرضی اور لادینیت نے اسے اندھا کر دیا ہے، ایوانِ عدل میں انصاف نہیں، ایونِ امن میں خودداری و امن نہیں، اب ہر چیز کی قیمت ڈالر اور ریال سے لگائی جاتی ہے، ضمیر اور عدل سے نہیں۔ ہم اپنے اسلاف کو بھول چکے ہیں، ہم اپنی اوقات بھول چکے ہیں، اپنا مقام، اپنا ایمان و دین بھول چکے ہیں، جو انسان اپنی شان اور مقام کو بھول جاتا ہے یقیناً خدا تعالیٰ بھی اُن کو بھول جاتا ہے، اللہ نہ کرے۔ آمین۔



**فرق::** فراق گورکھپوری سے کسی نے پوچھا: بحیثیت شاعر آپ اور جوش صاحب میں کیا فرق ہے؟ فراق: جوش موضوع سے متاثر ہوتا ہے اور میں موضوع کو متاثر کرتا ہوں۔

**سوزاک۔** سوز شاہجہانپوری ایک دن لکھنو کافی ہاؤس میں آ گئے اور مجاز صاحب کے میز پر آ بیٹھے۔ کہنے لگے: بھائی مجاز میں نے اپنا مجموعہ کلام مرتب کرلیا ہے اب اس کے لئے کسی موزوں نام کی تلاش ہے۔ کوئی ایسا نام ہو جو نیا بھی ہو اور جس میں میرے نام کی رعایت بھی ہو۔ مجاز نے بر جستہ کہا ''سوزاک رکھ لو''۔

**احمق::** مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب ان کی ساتھ والی کرسی پر آن بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دے کر گنگنانے لگے۔

احمقوں کی کمی نہیں غالب ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

مجاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ڈھونڈنے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے حضرت! خود بخود تشریف لے آتے ہیں۔

# روشن خیالی اور انتہا پسندی

انتہا پسندوں نے میرے مادرِ وطن کو گھیرے میں لے لیا ہے۔مذہب کا لبادہ اوڑھ کر کم فہم لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ پہلے قیام پاکستان کے وقت کچھ لوگ اس پاک وطن کی تعمیر کے خلاف تھے اب اس کی ترقی کے خلاف ہیں۔خود اختراعی گروہوں نے عام شہری کو دماغی طور پر اغوا کر لیا ہے۔اپنے اپنے مکاتب فکر کو پروموٹ کرنے کے لئے ناجائز ذرائع سے دولت کا حصول پا کر ان ملک دُشمن نرسریوں کو خوب پروان چڑھایا گیا ہے۔اب ہر قسم کی عسکری مدد یہ فراہم کرتے ہیں۔ ہر قسم کے اسلحہ کی ناجائز خرید وفروخت پر ان کی اجارہ داری ہے۔ بڑے بڑے اداروں میں یہ انتہا پسند گھس بیٹھے ہیں۔بعض غیر ممالک کے منصوبوں پر عملدرآمد کے لئے یہ رقوم حاصل کر کے اُن مزموم عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔مدرسوں سمیت ان کی پہنچ ہر محکمے تک ہے۔ ہر دیانت دار افسر کے گرد یہ لوگ گھیرا تنگ کرتے ہیں۔اگر کسی طرح بھی وہ قابو نہ آئے تو اغوا اور قتل اس کا آخری علاج ہے۔ہر دو نمبر کام والا، ملاوٹ والا، مردہ گوشت فروخت والا، پیری مریدی اور تعویذ گنڈا دینے والا، ڈبل شاہ جیسے کردار سب ان سے رابطے میں ہیں۔

ہر سیاسی مہرے تک ان کی رسائی ہوتی ہے۔احتجاج یا ہڑتال کا بزنس بھی یہ رقم لے کر کرواتے ہیں۔ ہر محلے میں ان کا ایک نمائندہ ہوتا ہے اور پھر یونین کونسل سے ڈسٹرکٹ کونسل تک ان کے نمائندے ہوتے ہیں۔ان منافق، دُشمن عناصر، یا سرکاری مسلم اور عام سادہ شہری میں یہ واضح فرق ہے۔

ہم روشن خیال شہداء کی عظمت کو سلام کرنے والے ہیں۔یہ انتہا پسند لوگوں کے گھر جلا کر ظالموں کو شہید کہتے ہیں۔ہم فوج پر جان نچھاور کرتے ہیں اور یہ اس کے شہداء کو شہید کہنے کو تیار نہیں۔بڑے بڑے جبہ پوش، اُن کی تائید میں چُپ ہیں شاید یہ مصلحت ہے یا بزدلی۔ہم سڑکوں کے کنارے کھڑے ہو کر احتجاج کرتے ہیں اور یہ سڑکوں پر ڈنڈے اُٹھا کر اور ٹریفک جام کر کے

احتجاج کرتے ہیں۔ہم خواتین کو باعزت احتجاج کا حق دیتے ہیں اور یہ خواتین کو گالیاں اور دھمکیاں دیتے ہیں۔ہم نماز پڑھتے ہیں اور یہ بارُود باندھ کر مساجد میں نمازیوں کو مار کر خود شہید کہلانے پر بضد ہیں۔ہم جن آنکھوں سے ظلم کے خلاف روتے ہیں اُن کو قادری جیسے قاتل کے لئے بھگو نہیں سکتے۔ہم نے جن کندھوں پر پشاور کے شہید بچوں کے جنازے اُٹھائے ہیں۔اب اُن کندھوں پر ممتاز قادری کی مصلوب میت نہیں اُٹھا سکتے۔اگر ایسا کرنا بغاوت ہے تو بلا شک ہم باغی ہیں۔70 سال کے بعد اگر عدالت نے انصاف کیا ہے تو ہم ان ججوں کو سلام پیش کرتے ہیں۔مگر اب بھی کئی کم فہم کالے کوٹوں والے ممتاز قادری کے جلوس میں شامل ہیں۔اُسے مصلوب ہونے کے بعد بھی شہید اور نجات دہندہ کہتے ہیں۔

اب یہ جہالت کا زہر میرے مادر وطن کے سارے جسم میں سرایت کر چکا ہے،انسان کو باخدا انسان بنانے میں یہ مدرسے،مساجد اور علمائے سُو بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ان اداروں کا اگر پوسٹ مارٹم کیا گیا تو ان میں سے تو مادّیت پرستی،جنس پرستی،شہوت پرستی،فرقہ پرستی کی بُو آئے گی۔ کاش ساری قوم بھی اپنے ماحول کا جائزہ لے۔اور سچ بولنا،سچ سکھانا،پورا تولنا،سب کے حقوق کا خیال رکھنا سکھا دے تو شاید میرے مادر وطن میں پھر سے امن وآشتی آجائے۔ورنہ 70 سال بعد تو صحت مند انسان بھی مر جاتا ہے اور یہ تو اب مرد بیمار کی طرح ہانپ رہا ہے۔ابھی تک اس کی مرض کی تشخیص نہیں ہو سکی۔اگر بیرونی ڈاکٹر سے مرض کی تشخیص کروائی گئی تو پھر وہ اپنی دوائیوں کو فروخت کے لالچ کی خاطر مرض کی تشخیص غلط کرے گا جیسا کہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔اس کے علاج کے لئے کسی ایک مردِ خدا کی ضرورت ہے۔جو اسی پاک دھرتی سے خدا تعالیٰ پیدا کرے۔خدا کرے کہ مرے پاک وطن کو ایک اور قائداعظم مل جائے۔آمین۔



# میرا وطن

پاکستانی معاشرے نے بہت سے ایسے ممتاز قادری پیدا کئے۔جنہوں نے اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ معاشرے اور عام لوگوں کی زندگیوں کو اجیرن کر دیا۔یہ کردار اسلام کو نہ سمجھنے اور جاہل ملاں کی پیروی میں پیدا ہوتے ہیں ۔قوم کی تربیت غلط انداز میں کی جاتی ہے ۔خود خیالی کے تصورات نے اسلام کی تصویر بھیانک جو کم فہم لوگوں کے دلوں میں بنائی ہے یہ سب اُسی کا نتیجہ ہے۔اسلام کا مکتب خیال ایک نہ ہونے کی وجہ سے یہ فرقے بنے اور ان فرقوں نے خود اصطلاحی تصورات سے اسلام کی شکل دھندلی کر دی ۔اب میرے مادر وطن میں اسی جاہل ملاں کا راج ہے۔قرآن وحدیث کو تراجم سے پڑھنے والوں کی تعداد دو چار فیصد سے زیادہ نہیں ۔اور جن لوگوں نے اس علم کو شکم پری کے لئے استعمال کیا ہے ۔اُن کا کردار زیادہ تر مشکوک ہے ۔ وہ لوگ ساتھ ساتھ ضعیف اقوال وحدیث کو بیان کر کر کے قوم کو ٹیڑھے راستے پر لگا رہے ہیں ۔اور پھر ضیاء الحق کے زمانے سے لے کر اب تک ریال اور ڈالر نے ان جمعراتیوں کی چاندی کر دی ہے ۔قوم کی تربیت کچھ اس رنگ میں ہوئی کہ قوم کافی حد تک کنفیوژ ہے ۔نوجوان کو سیدھا راستہ نہیں مل رہا،شیعہ مکتب اور وہابی مکتب نے اپنے اپنے ہتھکنڈے چلا رکھے ہیں ۔ بڑے بڑے نورانی چہروں والے ،خوبصورت باریش مداری اس میدان میں اُتر چکے ہیں،عام آدمی کے پاس نہ علم ہے نہ کتب ہیں اور نہ مناسب راہنمائی ۔کوئی مفت جنت کی راہ دکھاتا ہے،کوئی قتل پر اُکساتا ہے،کوئی غیر مسلم افراد کو زندہ جلانے ،اور اُن کے گھر جلانے کی کھلے عام ترغیب دیتا ہے،حکومت کی طرف سے کوئی گرفت نہیں بلکہ پنجاب حکومت تو ان کی سہولت کار بنی ہوئی ہے،دہشت گردوں کے مدرسے چل رہے ہیں اور ان کی غلط رنگ میں تربیت مسلسل ہو رہی ہے ۔اُن مدرسوں کے مدارالمہام کئی مذہبی لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی الیکشن لڑ کر میدان عمل میں سرگرداں ہیں ۔ان حالات میں میرے مادر وطن میں ایسے ہی شہری پیدا ہونگے ۔ جہاں کا وزیر،ایم این اے،ایم پی اے،چیئرمین،نمبردار،مسجد کا مولوی مل کر عشر وزکوۃ کھاتے ہیں تھانے میں سہولت کار ہیں،جعلی ڈگری ہولڈرز ہیں،مل کر سب

عورتوں سے ہر بڑے شہر میں دھندے کرواتے ہیں، ہر قاتل کو پناہ فراہم کرواتے ہیں، اسے قانونی اور ہر قسم کی امداد فراہم کرتے ہیں، معاشرے میں کسی بھی برائی کی روک تھام کی بجائے اس برائی کو منظم طریقے سے پھیلانے میں معاون ہیں تو حکومت کیا کر سکتی ہے۔ زیر زمین جب پانی نمکین ہو جاتا ہے تو پانی بارش کا یا دریا کا ہی استعمال ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرے کو یا عذاب الٰہی سدھارے گا یا قیامت۔ ہمارا معاشرہ برائے نام اسلامی ہے۔ ہم سب ملاوٹ شدہ ادویہ، کھانا، دودھ، کھاتے ہیں اور ملاوٹ شدہ انصاف، ایمان، علم، ہمیں ملتا ہے، نہ قوم کو اصل اسلام کا علم ہے اور نہ کسی چیز کی اصلیت کی خبر ہے۔ کسی بھی بڑے وڈیرے، عالم، پر قوم کو اعتبار نہیں رہا، سب جج، وڈیرے، وکیل، استاد، بیوروکریٹس، سب مشکوک کردار کے مالک ہیں۔ جعلی ڈگریوں کے مالک ہیں رزق حرام کھاتے اور کماتے ہیں۔ اگر کسی کو احترام حاصل تھا تو وہ گاؤں کے امام مسجد کو حاصل تھا مگر اب وہ بھی دنیاداری کے چکر میں، شکم پری کے لئے، سیاست کے لئے، طالبان کے لئے اپنا کردار کھو بیٹھا ہے، اور عوام کا اعتماد کھو بیٹھا ہے، اور روپے سے ہی کام چلاتا ہے، یا کفر کے فتوے سے لوگوں کو ڈراتا ہے مگر اپنا اعتماد گم کر بیٹھا ہے۔

اس معاشرے میں ایک صفائی لانے کے لئے ایک گرینڈ انقلاب کی ضرورت ہے۔ یہ معاشرہ یہود و ہنود سے بھی دو قدم آگے نکل گیا ہے میں سو قسم کی مثالیں دے سکتا ہوں مگر بے فائدہ۔ آپ خود ہی اپنے اردگرد نظر دوڑا کر دیکھیں کہ با کردار لوگ کتنے فیصد ہیں جو آپ کے آس پاس رہتے ہیں۔ نہ تو کسی کو دین کا پتہ ہے، نہ کوئی سچ بولتا ہے، اور نہ کوئی کسی کے سامنے سچ بول سکتا ہے، ہر کوئی دوسرے کے خوف میں مبتلا ہے، اسلام پر کوئی توجہ نہیں ساری اسلام آباد پر توجہ ہے، کسی استاد کو چیک کریں تو وہ اپنی ڈیوٹی دُرست نہیں دے رہا، کسی کو بھی سو فی صد چیک کر لیں کہیں نہ کہیں اس کے کردار میں نقص نظر آئے گا، گھوسٹ سکول عام ہیں، محکمہ تعلیم اکثر ایسا کرتا ہے، عشر اور زکوٰۃ کی وصولی میں انصاف تک نہیں اور پھر تقسیم میں بھی عدل نہیں، نماز سب پڑھتے ہیں مگر سیرت رسول اکرمؐ سے بے خبر یہ لوگ، چوری چکاری، ملاوٹ میں تاک، زنا، شراب کے مشاق، حقوق اللہ اور

حقوق العباد سے بے خبر لوگ، کیا ایک ریوڑ نہیں۔اس قوم کو ریوڑ کس نے بنایا، ہمارے علمائے سُو نے، جو خود بھی سیرت سے باخبر نہیں اور قوم کی تربیت بھی نہیں کی۔آج سارے ملک کی شکل دیکھو، ریال اور ڈالر کے زور پر دہشت گردی کی تعلیم تو عام دی گئی مگر سیرت و کردار حضور ﷺ کی تعلیم سے اس قوم کو دور رکھا گیا، ایک دوسرے کو تفرقہ بازی اور کفر کی تعلیم دی گئی، محبت کی بجائے نفرت کی تعلیم دے کر قوم کا بیڑہ غرق کر دیا، اور لگے ہیں پچھتانے۔اگر کوئی طالب علم آج کے جج حضرات، وزراءاعظم، بڑے بڑے بیوروکریٹس اور افسران، پالیمنٹ ممبران، ڈاکٹران، علاقے کے تھانیدار، امام مسجد، وڈیروں کا حال اخبارت میں مطالعہ کرے۔اور ان کی کرتوتیں اور کردار پڑھے تو کیا وہ ایک اچھا شہری بن سکتا ہے، مولانا لال مسجد، اور منور حسن سابق امیر جماعت اسلامی کا بیان کہ وہ فوجیوں کو جو سرحد پر جان قربان کرتے ہیں ہم ان کو شہید نہیں بلکہ طالبان کو شہید سمجھتے ہیں۔آج کا قاری ان کے اس کردار سے متنفر ہے بلکہ کنفیوژ ہے۔

وزیر داخلہ ان کے محافظ ہیں۔پنجاب حکومت ان کی سہولت کار ہے۔عام مسلمان کو سیرت رسول ﷺ کی بجائے فرقہ پرستی پڑھائی جاتی ہے۔محبت کی بجائے نفرت سکھائی جاتی ہے۔تشدد اور جہاد کی تربیت دے کر اسے جنت کا راستہ بتایا جاتا ہے۔اور خود یہ سب سہولت کار منہ مانگی قیمت وصول کر کے مزے کرتے ہیں۔یہ ہے ان کا اسلام۔ہر جگہ کرپشن نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ان جماعتوں کو تو پہلے سے ہی پاکستان سے دشمنی ہے۔ان کی تاریخ پڑھیں اور اب ان کے کرتوت بھی دیکھیں۔کاش کوئی ایک اور قائد اعظم پیدا ہو اور اس قوم کو اس دلدل سے نکال کر شاہین کا جینا سکھائے۔



# نیشنل ایکشن پلان اور سیاسی لیڈران

نیشنل ایکشن پلان جب سے وجود میں آیا ہے سوائے فوج کے اسے کسی نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اُس وقت تو سب پارٹیوں نے اس کی تائید میں ہی اپنی بھلائی چاہی تھی۔ مگر اب ان سیاسی لیڈروں کی منافقت عیاں ہو چکی ہے۔ دراصل کالعدم تنظیموں کے بنانے والے، اُن کو گائیڈ کرنے والے یہی سیاسی لیڈر رہیں۔ جیسے ضیاء الحق کے دور میں جب جہادیوں کے لیے بے انتہا ڈالرز اور ریال آیا مدرسے کھولے گئے۔ جمعراتی مُلاں نے وہاویت کے نام پر دولت کو پوجا، اسلحے کی فیکٹریاں لگیں، مذہبی انتہا پسندی کی آڑ میں جاہل ملاں کو سیاسی اشیر باد ملی، جہاد افغانستان کے بعد پھر فوج کی منصوبہ بندی سے طالبان وجود میں آئے، جسے بے نظیر مرحومہ بھی کہتی تھیں کہ ''طالبان ہمارے بچے ہیں۔''

اُسی وقت یہ عام لوگ سیاستدان بنے اور یہ جمعراتی ملاں نے جبہ پوش علمائے سو کا روپ دھار لیا۔ اب دہشتگرد اور انتہا پسندی کو 35 سال بڑھاوا دیا گیا۔ اب اسے جو بھی ختم کرنے کوشش کرے گا۔ اس کی روزی روٹی بھی جائے گی اور عزت بھی۔ جب سے نیشنل ایکشن پلان کا اعلان ہوا ہے۔ پھر NECTA وجود میں آئی۔ جس کے سربراہ کی تقرری میں لیت ولعل ہوتا رہا، سیاست دان نیشنل ایکشن پلان کے معاملہ میں بالکل سنجیدہ نہیں، فوج نے تو بولڈ ایکشن لئے مگر سیاستدان اپنے اقتدار کو طول دینے کی خاطر ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے، کیونکہ اسے کل کلاں پھر ان انتہا پسندوں کی ضرورت رہے گی، کوئی نہ کوئی بندہ مروانا ہوتا ہے، کسی دشمن کو اغوا کرانا ہوتا ہے، کل کلاں ضرورت پڑ جائے تو انتہا پسندی کا بیج بالکل ختم کر کے ہم کہاں جائیں گے۔ NECTA کی پرفارمینس تشویشناک حد تک مایوس کُن ہے۔ جب بھی دیکھو اس کی website under constrution رہتی ہے۔ اس پر کالعدم تنظیموں کی فہرست تک دکھائی نہیں جا سکی۔ جبکہ جہادیوں کی، انتہا پسندوں کی website مسلسل کام کر رہی ہیں۔ اُن کا لٹریچر موجود ہے بلکہ نفرت انگیز لٹریچر دھڑا دھڑ شائع ہو رہا ہے۔ کسی صوبے میں اس پر کوئی کام نہیں ہو رہا، ابھی سانحہ جہلم

فیکٹری تازہ مثال آپ کے سامنے ہے۔مگر جو کالعدم تنظیمیں ہیں کراچی میں اُن سے ٹیبل ٹاک بھی ہورہی ہے،حکومت بالکل اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں ،جس نے اپنے وزارت خارجہ اور دفاع کو عارضی بنیادوں پر چلا رکھا ہے۔وزیراعظم اپنی مرضی کے معاملات کوزیر بحث لاتا ہے،ابھی تک افغان پالیسی Discuss نہیں ہوا کیونکہ امریکہ افغانستان، پاکستان ایک پیج پر نہیں تھے۔نیشنل ایکشن پلان کی طرف کسی کی کوئی توجہ نہیں سوائے فوج کے۔نفرت پھیلانے،اور مساجد میں نفرت انگیز خطبات دینے، لائڈ اسپیکرز کا غلط استعمال پر 3600 تین ہزار چھ صد مقدمات درج ہو چکے ہیں، درجنوں نام نہاد آئمہ مساجد کو نفرت پھیلاتے پایا گیا ہے۔وزیر داخلہ چوہدری لال مسجد کے دہشت گرد ملاں عبدالعزیز داعش کا محافظ ہے۔(اُدھر اسلامی نظریاتی کونسل کے شیرانی اور شرابی گتھم گتھا ہورہے ہیں)

پولیس کو ان کے خلاف کچھ کرنے نہیں دیا جارہا، کیونکہ اُن گماشتوں کا بھی کوئی نہ کوئی رانا ثناء اللہ جیسا پروردہ ہے۔کوئی خرم دستگیر ہے جو ان انتہا پسندوں کی دستگیری کرتا ہے ۔جسے اُن انتہا پسندوں کی الیکشن،اور دنگا فساد میں گاہے گاہے ضرورت پڑتی ہے۔اگر اپنے اپنے گماشتوں کا خیال یہ سیاسی لیڈرز نہ رکھیں تو وہ انتہا پسند یا دہشت گرد بھی زائد رقم لے کر اپنے گروہ یا پارٹی بدلنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔یہ منافقت ہماری اس رُوبہ زوال قوم کا طرہ امتیاز ہے،فوج سے یہ سیاسی لیڈر خوفزدہ ہیں۔اور ذہنی طور پر یہ فوج سے متفق نہیں بلکہ اعلیٰ قسم کے منافق ہیں۔غدارِ وطن ہیں، ملک کی دولت کو بیرون ملک لے جانے والے ہیں۔یہ انتہا پسندی،اور شکم پروری،حرام خوری،ان کی نس نس میں گھر کر چکی ہے۔جب تک یہ مائنڈ سیٹ تبدیل نہ کیا گیا، مدرسوں میں مسلک،فرقہ پرستی،کی بجائے قرآن یا اور دنیاوی تعلیم دینے کا نظام نہ متعارف کرایا گیا تو یہ مدرسے کافر فیکٹریوں کا کردار ادا کرتے رہیں گے۔جاہل مُلاں اس قوم کے سر پر سوار ہو چکا ہے اس جاہل مُلاں کو اس قوم نے اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔کبھی اس جاہل کو کشمیر،افغانستان،کبھی لال مسجد، کبھی فرقہ پرستی،کبھی فلسطین، کے نام پر جہاد کی ترغیب دے کر جنت کا جھانسہ دیا گیا ہے اور پھر کبھی جہاد کو محدود کر کے جہاد بالنفس کا چکر دے کر جنگ سے منع کیا جاتا رہا ہے۔ہماری اس دوغلی پالیسی

نے قوم کو بھی اور ملک کو بھی بلکہ عوام کو بھی کہیں کا نہ چھوڑا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک لیڈر کی تلاش ہے، گیدڑ تو بہت ہیں مگر لیڈر نہیں آج تک نہ ملا۔ جناح صاحب کے بعد اور جناح نہیں پیدا ہوا۔ ہمارے لیڈر مغرب کے اور سعودیہ کے غلام ہیں۔ ازل سے غلام ذہنیت کا شکار رہے ہیں۔ ایٹم بم تو بنالیا مگر اندر کے انسان کو حقیقی انسان بلکہ باخدا انسان بنانے میں آج تک ناکام رہے۔ اس قوم کی اندوہ ناک بلکہ شرمناک ناکامیاں اس کی تاریخ میں ایک سیاہ دھبے سے کم نہیں۔ اب بھی یہ سیاسی لیڈر اپنے سیاہ کرتوتوں کو چھپانے کے چکر میں فوج سے خائف ہیں۔

ہمارے عام درمیانے درجے کے سیاسی لیڈر کی خواہش یہ ہے دو پجارو، دو کوٹھیاں، بیس کتے، دو گھوڑے، کار پر جھنڈا، ہاتھ میں کلاشنکوف، ہاتھ اُٹھا کر ہر کوئی سلام کرے، پٹواری اور تھانیدار گھر آ کر انتقال اور مقدمات درج کریں۔ قرآن و اسلام، نماز سے یہ سرکاری مسلمان نابلد ہیں، ایسی عزت کے خواہاں ہیں۔ قومی مستقبل کی نیشنل ایکشن پلان کی ان کو کوئی ضرورت نہیں یہ سب کام پاک فوج کے کرنے کے ہیں کیونکہ اُسے نہ ووٹ کی ضرورت ہے نہ نوٹ کی۔ اب بھی ایسا ممکن ہے کیونکہ ہم اور ہمارے لیڈر پٹڑی سے اُتر چکے ہیں ملک کی باگ ڈور نادان بچوں کے ہاتھ میں مثل قینچی کے آ چکی ہے۔ ملک کے مردہ جسم کو گدھوں کی طرح نوچا جا رہا ہے۔ اور حکمران بڑے بڑے پی آئی اے جیسے اداروں کو اپنی اقرباء پروری کی بھینٹ چڑھانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور نیشنل ایکشن پلان کو پسِ پشت ڈال کر اپنی حکومتی اقتدار کو طول دینے کے چکر میں ہیں۔ سندھ میں تو حکومت بھی نیشنل ایکشن پلان کی صف لپیٹنے کے چکر میں ہے۔

یہ کینسر سارے خون میں سرایت کر چکا ہے حکومت پنجاب تو اس دہشت گردی کو ایمان کا درجہ دے بیٹھی ہے۔ اور آئندہ الیکشن کی منصوبہ بندی ان انتہا پسند ملاں سے کروا رہی ہے۔ ادھر بلاول کو بھی اب یاد آیا ہے جب حکومت نے ڈاکٹر عاصم پر ہاتھ ڈالا ہے۔ بلاول کہتا ہے کہ پانچ سال قبل جن تنظیموں پر پابندی لگائی گئی تھی۔ اب ان کے مدرسوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ پنجاب حکومت ہے ہی انتہا پسندوں کی۔ جسے رائے ونڈ مدرسوں سے ہی مشورے آتے ہیں۔ مولوی نواز شریف کا خطاب زرداری نے کیوں دیا تھا۔ پنجاب حکومت کے پیٹ میں داڑھی ہے

۔سارے پنجاب میں ان ہی کے کارندے دہشت گردی کے مدرسے چلا رہے ہیں۔پیپلز پارٹی کو ان ملاؤں نے ہی ناکام کیا ہے۔کچھ اس کی اپنی پالیسیوں نے بھی۔سینکڑوں مدرسوں کا ابھی تک وزیرداخلہ آڈٹ تک نہ کرواسکے۔

خدا ہماری قوم پر رحم کرے۔یہ جتنی مدت میں بویا گیا ہے اب اُس سے دوگنی مدت اسے تلف کرنے کے لئے درکار ہے۔خدا تعالی اس ملک پر رحم کرے۔آمین۔❁❁

# بچوں کا نام رکھنا ایک معمہ ہے

بچہ پیدا ہوتو سب سے پہلے یہ استفسار کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کس پر گیا ہے۔ننھیال پر یا ددھیال پر۔اس کے خدوخال چچیرے ہیں،ممیرے ہیں یا خلیرے۔کوئی ناک بالکل باپ کی بتائے گا۔کوئی ہو بہو ماں کی۔اور کوئی اسے خالہ کے بھائی کے باپ کے چچا کے دادا کی ناک سے جا ملائے گا۔پھر جب اس کے نام رکھنے کا مرحلہ آتا ہے۔تو اس بچے کے دادا،نانا،چچا اور دیگر قریبی رشتہ دار اس میں اکثر مخل ہوتے ہیں۔

اولاد کا نام مقرر کرنے میں بعض اقات اس گھبراہٹ،عجلت اور اُلجھن کے علاوہ توہم پرستی کا بھی دخل ہوتا ہے۔اگر لڑکا یا لڑکی بہت دیر کے بعد اور بڑی منتیں ماننے کے بعد پیدا ہوئے ہیں تو اس کا نام بھی اُسی مناسبت سے رکھا جاتا ہے۔مثلاً اگر لڑکا ہے تو اللہ دتہ،پیراں دتہ،اللہ ودھایا،اللہ وسایا،خدا بخش،نبی بخش،غوث بخش،میراں بخش،لڑکی ہو تو اللہ رکھی،پیراں دتی،خیراتن،حیاتن وغیرہ۔اگر بہت سے بچے مرنے کے بعد اللہ نے لڑکی یا لڑکا دیا ہے تو اس کا نام اللہ جوایا،رُلدو،گھسیٹا،مہنگا،کلن،کلوا،کلب علی وغیر رکھتے ہیں۔نام چننے کے سلسلے میں والدین بہت دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔قرآن سے فالیں تیار کی جاتی ہیں۔زائچے تیار کرائے جاتے ہیں۔نجومیوں اور جفاروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔پیروں فقیروں سے رائے طلب کی جاتی ہے پھر کہیں جا کے مناسب نام ملتا ہے۔

# پاکستان انتہا پسندی کو ختم کرے

اگر پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو انسانی رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ پہلے تو اس کی تعمیر کے ہی وقت اتنے انسان مذہب کے نام پر مارے گئے کہ دنیا میں کسی بھی ملک کے قیام پر اتنا کشت وخون نہیں ہوا۔ پھر اس ملک کے قیام کے خلاف سب نام نہاد اسلامی جماعتیں جو تھیں سبھی نے پاکستان بنتے ہی مجبوراً اسی ملک میں آ کر پناہ لی اور پھر بڑی بڑی جائیدادیں الاٹ کروا کر اس کے کرتے دھرتے بن بیٹھے۔ پھر لگے اپنی دوکانداری چمکانے۔ پہلی ناکام کوشش تو 1953ء میں کی۔ جس میں انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ اور پھر دوسری کوشش میں یعنی بنگلہ دیش کے قیام میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح مذہبی تعصب، لسانی تعصب، کی بنا پر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ الشمس اور البدر کے لیڈران کو پھانسی کی گونج آج بھی کل عالم میں سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد انہی نام نہاد اسلامی جماعتوں نے بھٹو سے مل کر 1974ء میں کلمہ گو احمدیوں کو ناٹ مسلم قرار دینے کا جواز بنانے کے لئے اُن کے ہزاروں گھر، کاروبار، انسان جلوائے، اور وہ بھی اسلام کے نام پر، پھر جب 5 جولائی 1977ء میں نام نہاد مردِ مومن کو یہ نوستاروں نے کرسی اقتدار پر قبضہ کی ترغیب دی۔ تو اس نام نہاد مرد، مومن نے عدلیہ کو استعمال کر کے بھٹو کو پھانسی دی اور پھر سعودیہ کی خواہش پر شیعوں کو مروانا شروع کر دیا۔ چونکہ آنجہانی ضیاء الحق سعودیہ کا غلام تھا۔ اُس نے اپریل 1984ء میں احمدیوں کی نمازیں، مساجد، اذان، کلمہ بھی بند کر دیا، اور جو بسم اللہ بھی لکھے یا پڑھے تو اُسے تین سال قید بامشقت کی سزا ہونے لگی۔ اور توہین رسالت کا مقدمہ تو ہر غیر مسلم کا مقدر بن گئی۔ جس سے سزائے موت ہوتی ہے۔

جہاد افغانستان کے بہانے ضیاء الحق نے سعودیہ اور امریکہ سے دولت خوب بٹوری اور جمعراتی ملاں کو اقتدار کی راہ دکھائی، اب یہ نابکار ملاں سر پر ایسا چڑھا کہ پنجابی طالبان بن کر ہر کام میں مداخلت کرنے لگا ہے۔ غیر مسلموں کو برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ باقی اقلیتوں کو جدھر جگہ ملتی ہے اُدھر فرار ہو رہی ہیں۔ اور ملاں اسقدر بااثر ہے کہ حکومت کے نیشنل ایکشن پلان کے باوجود 20 نومبر 2015ء کو جہلم میں ایک مسجد اور ایک فیکٹری جو احمدیوں کی ملکیت تھی۔ اسے دن دیہاڑے مولویوں نے جلا کر راکھ کر دیا۔ اور حکومت بے بس ہے۔

اب ہم جو کہہ رہے ہیں کہ فلاں وزیراعظم بہت متعصب ہے تو میرے بھائیو! ذرا گریبان میں جھانکو کہ ہمارا اپنا کیا حال ہے۔ کسی پارلیمنٹ نے بھی کبھی کسی کے دین کا فیصلہ کیا ہے۔ اور پارلیمنٹ بھی پاکستان کی۔ جسے نام نہاد مردِ مومن نے وائٹ پیپر شائع کر کے ہر لحاظ سے کرپٹ قرار دیا تھا، موجودہ پارلیمنٹ تو اب سابقہ پارلیمنٹوں سے دس گنا کرپٹ ہے، جس میں صدر، اور وزیراعظم بھی کرپشن میں اول نمبر پر ہیں۔ پاکستان میں پچھلے پندرہ سالوں میں حکومتی اعداد و شمار کے مطابق پچاس ہزار بے گناہ و معصوم شہری ہلاک یا شہید ہو چکے ہیں۔ جسے ملاں عبدالعزیز آف لال مسجد شہید بھی کہنے کو تیار نہیں۔ ملاں عبدالعزیز آف لال مسجد کے ڈانڈے اب تو تاشقین ملک نے امریکہ میں دہشت گردی کر کے اُس متشدد واقعہ سے بھی ملا دیئے ہیں۔

کراچی کے گلی کوچے بے گناہوں کے خون سے سُرخ ہو چکے ہیں، ہر وڈیرا قاتل اور کرپٹ ہے، صدر ڈاکو اور وزیراعظم چور ہے۔ ان کے ایوان قیصرِ روم اور کسریٰ ایران سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ بلکہ زارِ روس ہیں اب بتائیں کہ پاکستان انتہا پسندی میں نمبر اوّل پر ہے۔ ہمیں اپنا قبلہ درست کرنا چاہیئے۔ ہم اسلام کے بھی دعوے دار ہیں۔ جبکہ ہم سود بھی کھاتے ہیں اور سور بھی (کرپشن)۔ کیا ہمارا کردار کسی پر اُنگلی اُٹھانے کے قابل ہے۔ مگر ہمیں بھی اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ کرپشن، اغوا برائے تاوان، لوٹ کھسوٹ، یہ سب عدلیہ کی نااہلی اور حکمران طبقے کی بدنیتی کی وجہ سے ہے، ہر کوئی مادر پدر آزاد ہے، قانون کی کوئی حکمرانی نہیں، آج تک کسی سزاوار کو سزا نہیں ملی، قانون پر عملدرآمد تب ہوگا جب سزا جزا کا نظام ہوگا، سفارش، رشوت ستانی، اقرباء پروری نے ہمیں دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے، ہم جو کہتے ہیں کرتے نہیں۔ حب الوطنی باتوں میں ہے عملاً نہیں۔ ہم قومی طور پر ساری دنیا میں بدنام ہو چکے ہیں، دو نمبری میں سب سے آگے، تشدد کے شاہکار، اسلامی دنیا کے ٹھیکیدار، سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے، ہمارے سبز پاسپورٹ کو کوئی بھی امیگریشن دیکھتے ہی سرخ لائٹیں جلا ڈالتی ہے۔ ہماری تلاشی شروع ہو جاتی ہے، ہر کوئی ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے، ہمارا ہر لیڈر دشمن کے سامنے میاؤں کرنے لگ جاتا ہے۔ ہم قرآن کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے، قائداعظم کی تصویر نوٹوں کے علاوہ ہر دفتر میں، ہر تقریب میں آویزاں ہوتی ہے مگر اس کے

احکامات کو پسِ پشت ڈال کر اپنی من مرضی کرتے ہیں، ہم نے اپنے وطن کو اپنے راہنما کی تعلیمات سے پرے کر دیا ہے، ہمارے نوجوان، القائدہ کے، طالبان کے، سی آئی اے، سعودیہ، امریکہ کے، نہ جانے کس کس کے ایجنٹ بن کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ ہمارے لیڈر قومی ایکشن پلان پر عمل درآمد کروانے کی بجائے اپنی جیبیں بھرنے کے چکر میں ہیں جبکہ سارے ملک میں دہشت گرد دندناتا پھر رہا ہے کیونکہ اس کی اپنے ملک کو بھی اشد ضرورت ہے۔ باقی سارے ملک میں دہشت پھیلا کر بیرونی ممالک سے ڈالر اور ریال کیسے حاصل کرے گا، اور ان دہشت گردوں کو پال کر رانا ثناءاللہ پنجاب میں مسلم لیگ ن کو عام انتخابات کیسے جتوائے گا۔ اور باقی اقلیتوں میں خوف و ہراس کیسے پھیلا کر اپنے مقاصد حکومت نے کیسے پورے کرنے ہیں۔

ان مولوی دہشت گردوں کے سہارے تو حکومت چل رہی ہے۔ اسی لئے تو ابھی کسی کو پھانسی پر لٹکایا نہیں جا سکا۔ ہماری قوم ہر لحاظ سے کرپٹ، منافق، حرام خوری میں یہود سے آگے نکل چکی ہے۔ خدا اس قوم پر رحم کرے آمین۔ پاکستان بنتے ہی حضرت قائد اعظمؒ نے اس کے خدوخال واضح کر دیئے تھے۔ مگر بعد میں آنے والوں نے اُس کی رُوح کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ علم میں کمی کے باوجود مذہب پرستی کا عنصر شامل ہو گیا۔ میثاقِ مدینہ کی رُوح کو نہ جاننے والے کم علم اپنی عقلی برتری کو ثابت کرنے کے لئے منفی کوششوں میں شامل رہے۔ کیونکہ باقی عوام، اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ اور علمائے سُو جو گاندھی جی کو رسول کا درجہ دیتے تھے وہ اس ملک کے ازلی دشمن بن گئے۔ کچھ انگریز کے وفادار نکلے کیونکہ ان کے اباؤ اور خود انہوں سے جو جاگیریں لی تھیں اس کا حق نمک ادا کرنے کے لئے آزادی کے خلاف بہت وفاداری دکھائی۔ جمیعت علمائے ہند، جماعت اسلامی، جماعت احرار، خاکسار بلکہ سب مدنی، آزاد، مودودی، سرحدی گاندھی، اس وطن پاک کے دشمن تھے۔ اُن لوگوں نے اس ملک کے خلاف ایڑی چوٹی تک زور لگایا۔ ذرا تاریخ تحریک پاکستان پڑھیئے تو آپ کو ان علمائے سُو کے کردار اور کرتوتوں کا پتہ چلے (میرا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں) پاکستان میں داخل ہوتے ہی ان علمائے سُو نے اپنے منفی ارادے پورے کرنے کے لئے اسلام اسلام کی رٹ لگا کر 1953ء میں مارشل لاء لگانے کی ناکام کوشش کی، درجنوں لوگ مر گئے، اور ملک کا امن برباد ہوا۔ پھر ایوب خان

کے مداح بن کر دربار تک رسائی حاصل کرنے کے ناکام کوشش کی۔

اس کے بعد عورت کی حکمرانی کے خلاف فتویٰ دینے والی جماعتوں نے بھی فاطمہ جناح کو ایوب خان کے خلاف الیکشن لڑوایا، اور منہ کی کھائی۔ جب کچھ نہ بن سکا تو یحییٰ خان کو نجات دہندہ مان کر ان علمائے سُو نے اسے اشیر باد دے کر بنگلہ دیش کے منصوبے کو مکمل کیا۔ اور ڈھاکہ میں اسلامی تنظیموں کے نام سے بنگالیوں کا قتل عام کروایا 1970ء میں بھٹو کے خلاف الیکشن لڑا۔ اور اس کے خلاف جب فتاویٰ کی گولہ باری بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تو سب اسلامی حلقوں نے شکستِ فاش کھائی جب بھٹو جیت گیا بھاری اکثریت کے ساتھ تو علمائے سُو نے اس کو رام کرنے کے لئے براستہ سعودیہ راہ اختیار کیا۔ 1974ء میں ایک کلمہ گو اور محب وطن فرقے کے خلاف سازش تیار کر کے اسے ناٹ مسلم قرار دلوایا۔ جب یہ کام ہو گیا تو پھر بھٹو کو ناکام کرنے کے لئے انتخابات میں دھاندلی کا شور مچا کر ضیاء الحق سے مارشل لاء لگوایا۔ قومی اتحاد اور نو ستاروں کی شکل میں علمائے سُو کی نیتیں کھل کر قوم کے سامنے آئیں۔ ضیاء الحق کی حکومت دراصل جماعت اسلامی اور علمائے سُو ہی کی حکومت تھی۔ اپریل 1985ء میں ان علمائے سُو ہی نے جماعت احمدیہ مسلمہ کے خلاف یزیدی قوانین بنوائے۔ جس سے اُن پر نماز، قرآن، اذان پڑھنے پر پابندی لگ گئی حتیٰ کہ مسجد کو مسجد کہنے پر تین سال قید بامشقت تھی۔ جوان علمائے سُو کی سب سے بڑی خدمت اسلام تھی۔ پھر ان علمائے سُو نے ضیاء الحق کا درباری بن کر اور سعودیہ کا گماشتہ بن کر شیعہ کمیونٹی کو قتل عام کروایا، مدرسے، اور سکول خون میں نہلا دیئے گئے۔ طلباء تنظیموں کو اسلحہ بردار اور خدائی فوجدار بنا دیا گیا، کالج اور یونیورسٹیاں اسلحہ خانہ بن گئیں۔ اور وہاں سے کئی متشدد لیڈر مثلاً جاوید ہاشمی، فرید پراچہ، بلوچ، ریاض بسرا وغیرہ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تشدد کی سیاست کی۔ اور قوم کو تشدد کی تربیت دی، اور فوج سے مل کر جہادی پیدا کرنے کے لئے جہاد افغانستان کو پروموٹ کیا۔ بذریعہ حکومت ساری دنیا سے مجاہدین کو بلا کر جہاد افغانستان کی جنگ میں جھونک دیا۔ اور ضیاء الحق کو مجاہد کے لقب سے نواز کر سعودیہ اور امریکہ کی اشیر باد سے روپیہ بھی کمایا اور اپنی نوکری بھی ان علمائے سُو نے پکی کر لی۔ پھر خدا نے ضیاء الحق کی صف لپیٹ کر اسے فی النار کر دیا۔ تو پھر عورت کی حکمرانی کا پراپیگنڈہ

ہونے لگا۔عوام کے پرزور دباؤ پراقتدار پر بےنظیر آ تو گئی مگر پھر جنرل گل نے آئی جے آئی بنا کر منظور نظر نواز شریف کووزیراعظم بناڈالا۔ان علمائے سُو جو ہمیشہ ابن الوقت کا کردارادا کرتے رہے ہیں،اسی طرح سارے ادوار میں آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہیں۔پھران علمائے سُو نے افغانستان کے جاہل اور سادہ لوح مسلمانوں کوایساورغلایا کہ اسلام کاتصور بدل کے رکھ دیا۔اور طالبان کی حمایت میں ان علمائے سُو کیا کیا گل کھلائے۔سعودیہ اوراسلامی ممالک کی مدد سے ان علمائے سُو نے ہزاروں مدرسے بنا کرقوم کےنوجوانوں کوورغلایا،اورسب کوخودکُش بمبار بنا کررکھ دیا،اب تو پنجاب اور سارے دیگر صوبوں میں بھی یہ وبا پھیل چکی ہے،جس کا علاج مشکل تر ہے،اسلام کے یہ ٹھیکیدار ہیں،ساری قوم کواسی گروہ نے ورغلا کراغوا کرلیا ہے،قوم کو چاہیئے کہ کوئی مصطفیٰ کمال پاشا پیدا کرے،ترکی کی طرح اس گند سے ملک پاک کو پاک کرے۔ہم مسلمان ہیں مگرانتہاپسندنہیں،ہم مسلمان ہیں مگر قاتل نہیں،ہم مسلمان ہیں مگر منافق نہیں،اسلام میں داڑھی ہے مگرداڑھی میں اسلام نہیں۔جوداڑھی رکھ لیتا ہے وہ مولانا بن جاتا ہے مگر ہوتا ہے دہشت گرد۔ہم نیک علمائے کرام کااحترام کرتے ہیں ہم صرف بات اُن کی کرتے ہیں جن کاقول وعمل ایک نہیں۔جواسلام کواستعمال کرتے ہیں جوعجیب عجیب فتاویٰ دیتے ہیں ظالمان کوشہیداور فوج کے جوانوں کوشہیدنہیں کہتے۔جن لوگوں نے خودکواسلام کا اجارہ دار بنا رکھا ہے۔جب تک ہم سب نے سنجیدگی سے اپنے مادروطن کا نہ سوچا تو ہم اسی طرح بدنام ہوتے رہیں گےاورساری دنیاہمارا مذاق اُڑاتی رہے گی۔ہم مسلم کوانسان سمجھتے ہیں اورغیرمسلم کوانسان بھی نہیں سمجھتے۔کافروں کونامعلوم کن کن القابات سے پکارتے ہیں جب خودآئینہ دیکھتے ہیں تو ساری قوم کوایک دوسرے سے گھن آتی ہے ۔کون سی اچھائی ہم میں ہے۔کچھ بھی تونہیں ہے ہم میں۔ہم جو ملے بغیر سوچے سمجھے کھا جاتے ہیں ،گدھا ہو،کسی کا مال ہو،ملاوٹ والی کوئی چیز ہو،حرام مال ہو،رشوت ہو،یتیم کا مال ہو،نہ جانے ہم کیا ہیں ۔ہمارے پاس کوئی مستند قوائدنہیں قرآن ہے تو اسے ہم پڑھتے نہیں۔خدا کو ہم مانتے ہیں مگر خدا کی ایک نہیں مانتے۔انااللہ وانا الیہ راجعون۔



# پاکستان کا مطلب کیا ( کھا پی تے جان بنا )

پاکستان بنتے ہی قائداعظم نے اس کے خدوخال واضح کر دیئے تھے۔مگر بعد میں آنے والوں نے اُس کی رُوح کونہیں سمجھا۔کیونکہ علم میں کمی کے باوجود مذہب پرستی کا عنصر شامل ہوگیا۔میثاقِ مدینہ کی رُوح کو نہ جاننے والے کم علم اپنی عقلی برتری کو ثابت کرنے کے لئے منفی کوششوں میں شامل رہے۔کیونکہ باقی عوام ،اَن پڑھ اور جاہل تھے۔اور علمائے سُو جو گاندھی جی کو رسول کا درجہ دیتے تھے وہ اس ملک کے ازلی دشمن بن گئے۔کچھ انگریز کے وفادار نکلے کیونکہ ان کے آبا نے اور خود اُن انگریزوں سے سے جو جاگیریں لی تھیں اس کا حق نمک ادا کرنے کے لئے آزادی کے خلاف بہت وفاداری دکھائی ۔جمیعت علمائے ہند، جماعت اسلامی، جماعت احرار، خاکسار، بلکہ سب مدنی ، آزاد، مودودی اس وطن پاک کے دشمن تھے۔اُن لوگوں نے اس ملک کے خلاف ایڑی چوٹی تک زور لگایا، ذرا تاریخ پڑھیئے تو آپ کو ان علمائے سُو کے کردار اور کرتوتوں کا پتہ چلے ( میرا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں ) ، پاکستان میں داخل ہوتے ہی ان علمائے سُو نے اپنے منفی ارادے پورے کرنے کے لئے اسلام اسلام کی رٹ لگا کر 1953ء میں مارشل لاء لگانے کی ناکام کوشش کی ، درجنوں لوگ مر گئے ،اور ملک کا امن برباد ہوا۔پھر ایوب خان کے مداح بن کر دربار تک رسائی حاصل کرنے کے ناکام کوشش کی۔

اس کے بعد عورت کی حکمرانی کے خلاف فتویٰ دینے والی جماعتوں نے بھی فاطمہ جناح کو ووٹ دیا اور ایوب خان کے خلاف الیکشن لڑوایا، اور منہ کی کھائی۔جب کچھ نہ بن سکا تو یحییٰ خان کو نجات دہندہ مان کر ان علمائے سُو نے اسے اشیر باد دے کر بنگلہ دیش کے منصوبے کو مکمل کیا۔اور ڈھاکہ میں اسلامی تنظیموں کے نام سے بنگالیوں کا قتل عام کروایا، 1970ء میں بھٹو کے خلاف الیکشن لڑا۔اور اس کے خلاف جب فتاویٰ کی گولہ باری بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تو سب اسلامی حلقوں نے شکستِ فاش کھائی۔جب بھٹو جیت گیا بھاری اکثریت کے ساتھ تو علمائے سُو نے اس کو رام کرنے کے لئے براستہ سعودیہ راہ اختیار کی۔1974ء میں ایک کلمہ گو اور محب وطن فرقے کے خلاف سازش تیار کر کے

اسے ناٹ مسلم قرار دلوایا۔ جب یہ کام ہو گیا تو پھر بھٹو کو نا کام کرنے کے لئے انتخابات میں دھاندلی کا شور مچا کر ضیاء الحق سے مارشل لاء لگوایا۔ قومی اتحاد اور نوستاروں کی شکل میں علمائے سُو کی نیتیں کھل کر قوم کے سامنے آئیں۔ ضیاء الحق کی حکومت دراصل جماعت اسلامی اور علمائے سُو ہی کی حکومت تھی۔ اپریل 1985ء میں ان علمائے سُو ہی نے جماعت احمدیہ مسلمہ کے خلاف یزیدی قوانین بنوائے۔ جس سے اُن پر نماز، قرآن، اذان پڑھنے پر پابندی لگ گئی حتیٰ کہ مسجد کو مسجد کہنے پر تین سال قید بامشقت ہے۔

جو ان علمائے سُو کی سب سے بڑی خدمت اسلام تھی۔ پھر ان علمائے سُو نے ضیاء الحق کا درباری بن کر، اور سعودیہ کا گماشتہ بن کر شیعہ کمیونٹی کو قتل عام کروایا، مدرسے، اور سکول خون میں نہلا دیئے گئے۔ طلباء تنظیموں کو اسلحہ بردار اور خدائی فوجدار بنا دیا گیا، کالج اور یونیورسٹیاں اسلحہ خانہ بن گئیں۔ اور وہاں سے کئی متشدد لیڈر مثلاً جاوید ہاشمی، فرید پراچہ، بلوچ، ریاض بسرا وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے تشدد کی سیاست کی۔ اور قوم کو تشدد کی تربیت دی، اور فوج سے مل کر جہادی پیدا کرنے کے لئے جہاد افغانستان کو پروموٹ کیا۔ بذریعہ حکومت ساری دنیا سے مجاہدین کو بلا کر جہاد افغانستان کی جنگ میں جھونک دیا۔ اور ضیاء الحق کو مجاہد کے لقب سے نواز کر سعودیہ اور امریکہ کی اشیر باد سے روپیہ بھی کمایا اور اپنی نوکری بھی ان علمائے سُو نے پکی کر لی۔ پھر خدا نے ضیاء الحق کی صف لپیٹ کر اسے فی النار کر دیا۔ تو پھر عورت کی حکمرانی کا پراپیگنڈہ ہونے لگا۔ عوام کے پرزور دباؤ پر اقتدار پر بے نظیر آ تو گئی مگر اسحاق خان نے اسے تسلیم نہ کیا۔ اسے سیکیورٹی رسک قرار دے کر حکومت سے چلتا کیا۔ پھر جنرل گل نے آئی جے آئی بنا کر منظور نظر نواز شریف کو وزیر اعظم بنا ڈالا۔ ان علمائے سُو جو ہمیشہ ابن الوقت کا کردار ادا کرتے رہے ہیں، اسی طرح سارے ادوار میں آنکھ مچولی کھیلی۔ پھر ان علمائے سُو نے افغانستان کے جاہل اور سادہ لوح مسلمانوں کو ایسا ورغلایا کہ اسلام کا تصور بدل کے رکھ دیا۔ اور طالبان کی حمایت میں ان علمائے سُو نے کیا کیا گل کھلائے۔ سعودیہ اور اسلامی ممالک کی مدد سے ان علمائے سُو نے ہزاروں مدرسے بنا کر قوم کے نوجوانوں کو ورغلایا، اور سب کو خودکش بمبار بنا کر رکھ

دیا،اب تو پنجاب اور سارے دیگر صوبوں میں بھی یہ وبا پھیل چکی ہے ،جس کا علاج مشکل تر ہے،اسلام کے یہ ٹھیکیدار ہیں،ساری قوم کواسی گروہ نے ورغلا کر اغوا کرلیا ہے،قوم کو چاہیئے کہ کوئی مصطفیٰ کمال پاشا پیدا کرے،ترکی کی طرح اس گند سے ملک کو پاک کرے۔ہم مسلمان ہیں مگر انتہا پسند نہیں ، ہم مسلمان ہیں مگر قاتل نہیں ، ہم مسلمان ہیں مگر منافق نہیں ، اسلام میں داڑھی ہے مگر داڑھی میں اسلام نہیں ۔ جو داڑھی رکھ لیتا ہے وہ مولانا بن جاتا ہے مگر ہوتا ہے دہشت گرد۔ہم نیک علمائے کرام کا احترام کرتے ہیں ہم صرف بات اُن کی کرتے ہیں جن کا قول وعمل ایک نہیں ۔ جو اسلام کو استعمال کرتے ہیں جو عجیب عجیب فتاویٰ دیتے ہیں ظالمان کو شہید اور فوج کے جوانوں کو شہید نہیں کہتے ۔

جن لوگوں نے خود کو اسلام کا اجارہ دار بنا رکھا ہے۔اُن کو نہ پہچانا، جب تک ہم سب نے سنجیدگی سے اپنے مادر وطن کا نہ سوچا تو ہم اسی طرح بدنام ہوتے رہیں گے اور ساری دنیا ہمارا مذاق اُڑاتی رہے گی ۔ہم مسلم کو انسان سمجھتے ہیں اور غیر مسلم کو انسان بھی نہیں سمجھتے ۔کافروں کو نامعلوم کن کن القابات سے پکارتے ہیں جب خود آئینہ دیکھتے ہیں تو ساری قوم کے افراد کو ایک دوسرے سے گھن آتی ہے۔کون سی اچھائی ہم میں ہے۔کچھ بھی تو نہیں ہے ہم میں ۔ہم جو ملے بغیر سوچے سمجھے کھا جاتے ہیں، گدھا ہو، کسی کا مال ہو، ملاوٹ والی کوئی چیز ہو،حرام مال ہو، رشوت ہو، یتیم کا مال ہو، نہ جانے ہم کیا ہیں ۔ ہمارے پاس کوئی مستند قوائد نہیں قرآن ہے تو اسے ہم پڑھتے نہیں ، خدا کو ہم مانتے ہیں مگر خدا کی ایک نہیں مانتے ۔ہمیں آج تک کوئی اچھا راہنما نہیں ملا ،قحط الرجالی ہے۔حب الوطنی نام کو نہیں ۔اے خدا اس قوم پر رحم کر۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔



# چھوٹے لوگ اور چھوٹے کام

وقت بدل چکا ہے۔اصل میں اخلاقیات کا معیار بدل چکا ہے۔ایک وقت تھا کہ منصف اور متقی انسان کی قدر کی جاتی تھی۔ یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ اُس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں، کیسا اُس کا مکان ورہائش ہے۔کیسی اُس کے پاس گاڑی یا سواری ہے۔وغیرہ وغیرہ۔مگر اب تو پیمانہ ہی بدل چکا ہے۔ ہر کوئی چاندی کی چمک کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔نہ اُن سے سچی بات نکلتی ہے اور نہ ظلم کے خلاف ایک لفظ نکلتا ہے کیونکہ اپنے اسلاف کو بھول چکے ہیں، اپنے دین کو، اپنے ایمان کو اپنی اقدار کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں۔اقوام افراد سے تعمیر ہوتی ہیں۔اخلاق صرف اعمال ہی سے اپنی جگہ بناتے ہیں۔عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

اب تو رنگا رنگ کے فلسفی اپنے فلسفے بگھار رہے ہیں، ہر کسی نے اپنی الگ دکان بنا رکھی ہے۔ اور ساری دنیا کو ورغلانے کی سرتوڑ کوشش جاری ہے۔ہوسِ زر پرستی نے انسان کو مغلوب کر لیا ہے، کہیں حسن پرستی سے انسان مرعوب نظر آتا ہے، انسان اپنی پیدائش کے مقاصد سے یکسر نابلد ہو چکا ہے۔نہ اسے انسانیت اور نہ آدمیت کے مقام کا پتہ ہے۔اس لئے انسان بھٹک چکا ہے۔اس کو راہِ راست پر لانے کی ضرورت ہے۔تاریخ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے لوگوں نے بہت بہت بڑے کام کئے۔مگر اب اکیسویں صدی میں تو یہ سب کچھ اُلٹا ہو چکا ہے۔کسی کو بھی اپنے حسب و نسب یا خاندان کی بھی شرم نہیں۔قوائد وضوابط اور اخلاقی اقدار کی کوئی پرواہ نہیں۔میں کسی محنت کش، کمی، کمین، لوہار ترکھان، موچی نائی، جولاہے کا مخالف نہیں اگر ان محنت کش طبقے کو معاشرے سے الگ کر دیا جائے۔تو باقی کچھ نہیں رہتا۔یہ لوگ تو کسی بھی قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔اور یہ تکنیکی اور ہنرمند افراد ملک و معاشرے کے لئے خوشحالی وترقی کی ضمانت ہوتے ہیں۔کیا پاکستان کے ناکام سسٹم نے ایک لوہار کے بیٹے کو تین بار ملک کا وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ نہیں بنایا۔کیا اسی سسٹم نے ایک نائی کے بیٹے کو پانچ سال تک وزیر داخلہ نہیں بنائے رکھا، اور ایک سینما میں ٹکٹ بلیک کرنے والے کو صدر مملکت نہیں بنائے رکھا، کیا پاکستان کے سیاسی سسٹم نے نائن زیرو پر جھاڑو

دینے والے کو کراچی کا میئرنہیں بنایا۔کیا پاکستان کے اسی جمہوری سسٹم نے سائیکل کو پنکچر لگانے والے چنن دین عرف بودی اُستاد کے بیٹے کو وزیرخزانہ نہیں بنایا،کیا پاکستان کے اسی جمہوری سسٹم نے اینٹوں کے بھٹے کے مالک، ملک عاشق اعوان کی بیٹی کو وزیر اطلاعات ونشریات نہیں بنائے رکھا،بات یہ ہے جب تاریخ کسی کو چھت پھاڑ کر کوئی منصب دیتی ہے تو اس انسان کے اندر کی قابلیت،سوچ،تربیت،سوچ،سامنے آتی ہے۔اُن کی باطنی سوچ،خوف خدا،مذہبی اقدار،اکابرین کا طرزِعمل،اردگرد کا ماحول،اسے اپنے منصب سے عہدہ برآ ہونے کا سلیقہ بتاتا ہے۔

مگر یہ ہوسِ زر ہمارے غریب ممالک میں کچھ زیادہ ہی ہے۔یہاں برطانیہ یا مغرب میں کیا غرباء کے،محنت کشوں کے بچے اقتدار میں نہیں آتے۔مگر میں ان کے عدل اور قانون کی عملداری کو دیکھ کر انگشتِ بدنداں ہوں کہ یہ لوگ شراب اور زنا جیسی لعنت میں توغرق ہیں،عریانی،فیشن اور دوسری برائیوں میں تو ملوث ہیں۔مگر ان کی اکثریت جھوٹ،چوری،جیسی لعنت سے نابلد ہے۔کسی پر بدظنی نہیں کرتے کسی کے حقوق کو غصب کرنے کی عادت نہیں،جانوروں کے حقوق کی بھی نگہداشت ہے۔انسانی ہمدردی اور اس کے حقوق کی ادائیگی کے پُتلے ہیں۔بس اور ریل میں سوار ہوں تو بوڑھوں،اپاہج اور عورتوں کے لئے سیٹ خالی کرنا ساری قوم اپنا اخلاقی حق سمجھتی ہے۔صفائی کا خیال رکھنا ان کی عادت ہے۔ظلم اور بے انصافی سے ساری قوم باز رہتی ہے۔ایک دوسرے کے درد میں بخوشی شریک ہوتے ہیں۔ٹریفک قوانین کی پوری پابندی کرتے ہیں،کم وزن نہیں تولتے۔جو پیکٹ پرلکھا ہو وہ درست ہوتا ہے،بوڑھوں اور معذوروں کے لئے سب سہولیات حکومت فراہم کرتی ہے۔بے روزگار کو ماہانہ مشاہرہ ملتا ہے۔اور پھر اسے جاب سنٹرز کام تلاش کر کے دیتے ہیں۔صحت اور تعلیم میٹرک تک بلکہ ایف اے تک مفت ہے۔یونیورسٹی میں پڑھنے کے لئے معمولی سود پر قرضہ طلباء کا حق ہے۔اس قدر نظام امن سے چل رہا ہے کہ رات کے بارہ بجے بھی کوئی جوان لڑکی بھی مختصر لباس میں اکیلی پیدل جارہی ہو تو اسے کوئی ڈر نہیں ہوتا،کیونکہ تین منٹ میں (فون کال پر) پولیس ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ہر کمانے والا ٹیکس دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔یہاں کی سڑکیں باغات، پل،گیس،بجلی پانی سب کچھ ٹھیک ہے۔یہاں کبھی بھی کسی الیکشن میں دھاندلی کا الزام نہیں سنا

گیا، کسی گورے کو کسی کالے پر برتری نہیں، قانون سب کے لئے ایک جیسا ہے۔اس کے برعکس ہمارے نام نہاد اسلامی ممالک کا ہی جائزہ لیں۔بشمول پاکستان۔استغفار منہ سے نکلتا ہے۔اشرافیہ ڈاکو بن چکی ہے، غریب پس رہا ہے، ظالم کا ظلم بڑھ رہا ہے۔عدل فاروقی کے دعوے کرنے والے باریش غاصبوں نے کس طرح اسلام کو بدنام کر دیا ہے۔ان کے کالے کرتوتوں نے سارے عالم میں اسلام کو اور انسانیت کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔

ہمارے ملک میں کیا کچھ خالص ہے، کیسا عدل وانصاف ہے، غیرت کے نام پر قاروقاری، قتل وغارت وہ بے غیرت بھی کر رہے ہیں جو خود زنخے ہیں۔الف سے لے کری تک خود فرضی دین بنا رکھے ہیں۔قبر پرستی، پیر پرستی، شہوت پرستی، زر پرستی، شاہ پرستی، نے ایمان سلب کر لئے ہیں۔علمائے سو، اکابرین، اشرافیہ، مڈل کلاس ملک کا جنازہ نکلتے ہوئے خاموشی سے دیکھ رہے ہیں۔فوج میں کونسے فرشتے ہیں۔اسی شکست خوردہ قوم کے افراد ہیں۔اب تو پانامہ لیکس نے ساری قوم کے ڈاکوؤں کا کچا چٹھا کھول دیا ہے۔ان سب کو ایک قطار میں کھڑے کر کے امام خمینی کی طرح گولی مار دینی چاہیئے۔میرے وطن میں تطہیر کی ضرورت ہے بے غیرتی بڑھ رہی ہے۔انسانیت ختم ہو رہی ہے۔تربیت اور سختی کی ضرورت ہے۔قانون کی بالا دستی کی ضرورت ہے۔ستر سال سے ملک لوٹا جا رہا ہے۔کوئی مردِ مجاہد نہیں جاگ رہا، جب بھی خبریں ٹی وی پر سنتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔اے اللہ تو میرے ملک کو ان غاصبوں سے بچا۔آمین۔ ❀❀

## پٹاخے

نفسیات کے ماہرین بڑی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خوشی کا پُر جوش مظاہرہ کرنے کے لئے پٹاخے چھوڑنا اور آتشبازی چلانا انسان کی جبّلت ہے۔شروع شروع میں درندوں کو ڈرانے کے لئے پٹاخے اور آتشبازی ایجاد ہوئی۔لیکن بعد میں جب انسان درندوں کا بھیس بدلنے لگے تو یہ پٹاخے اور آتشبازی گولوں، بموں، جدید اسلحہ کی شکل اختیار کر گئیں۔

*—*—*

# ڈیموکریسی

ڈیمو پنجابی میں بھڑ کو کہتے ہیں جو انسان کو بُری طرح کاٹتی ہے۔ اور اس سے بہت درد ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت کچھ اس طرح کی ہی آئی ہے۔ یہ غریب عوام کو روزانہ کاٹتی ہے بلکہ عوام اور مادر وطن کے جسم کو نوچ رہی ہے۔

کچھ لوگ کم علمی کے سبب اسے سمجھ ہی نہ پائے ہیں اور بعض ڈھٹائی کی وجہ سے اس کو سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرنا چاہتے۔ سرمایہ دار اور تاجر طبقہ اپنے مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔ اخلاقیات سے بالکل عاری ہے۔ جاگیردار طبقہ کبر میں مبتلا ہے۔ درمیانہ طبقے کا ایک حصہ مجبوری کی وجہ سے یرغمال ہو چکا ہے۔ نصف اپر کلاس سے مل چکا ہے اور نصف غریب عوام کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہمیں نہ خدا ہی پسند ہے اور نہ رسول۔ نعوذ باللہ۔ ہم نے جب پاکستان بنانا چاہتے تھے مگر اب اپنے مفادات کو ترجیح دے رہے ہیں۔ لیڈروں نے ہمیں کوئی واضح لائحہ عمل نہیں دیا۔ علمائے کرام جو وجود پاکستان ہی کے مخالف تھے۔ انہوں نے اپنے کردار و عمل سے قوم کی ایسی منفی تربیت کی کہ قوم کو دہشت گرد بنا ڈالا۔ قوم کو شکم پُری کے علاوہ کچھ یاد نہیں۔ کوئی آمر آتا ہے تو ہر کوئی مطلب براری کی خاطر اس کی کفش برداری میں عزت محسوس کرتا ہے۔ اگر کوئی جعلی ڈگری والا برسر اقتدار ہوتا ہے تو ہر قسم کا پرمٹ لینے کی خاطر سب لوگ سگِ دربن جاتے ہیں۔ این چہ بوالعجبی است۔ آج تک تو اس ڈھیمو کریسی نے بے چارے عوام کو کچھ نہیں دیا۔ اسی عوام کی خیرات سے ملک میں ہزاروں خیراتی ادارے چل رہے ہیں مگر ان عوام کو صحت و تعلیم کی خیرات اب تک نہیں مل سکی۔ سفری سہولیات پرائیویٹ ادارے بہم پہنچا رہے ہیں۔ سرکاری ادارے اپنے فرائض منصبی سے غافل سارے فنڈز کو نگل رہے ہیں۔ اس قوم کے بڑے بڑے مگر مچھ اور عفریت قومی دولت کو اس ڈھیمو کریسی کی آڑ میں قوم کا خون چوس رہے ہیں۔ چور مچائے شور۔

بیرون ممالک سے قرض اتنا لیا جا رہا ہے اور ٹکس بیک کے ذریعے اپنی جھولیاں بھری جا رہی ہیں۔ قوم کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں، تعلیم و صحت، بجلی و پانی، ملازمت وغیرہ ناپید ہے اور ادھر

لاہور کولندن بنانے کی آڑ میں اور نج ٹرین ،میٹرو کے لئے قرضے لے کر اپنی تجوریاں بھی بھری جارہی ہیں ۔ پہلے زرداری نے چائنہ کٹنگ کے ذریعہ سندھ کو کنگال کیا اب لوہار دونوں ہاتھوں سے مادر وطن کولوٹ رہا ہے ۔مولانا فضل الرحمن کا پیٹ بھی بہت بڑا ہے ۔ڈیزل کی ٹینکی کی طرح ۔ سارے بھائیوں اور رشتہ داروں کو ماہرانہ تربیت دے کر قوم کو لوٹنے پر لگایا ہوا ہے۔مدرسوں کی دولت سے پیٹ نہیں بھرا، حج کرپشن سے بھی وافر حصہ ملا تھا۔مگر کیا کریں پیٹ ہی بہت بڑا ہے ۔ یہ بھی دشمن پاکستان پارٹی ہے۔قوم لوط سے ملتی جلتی ہے۔

منکر پاکستان ۔اے این پی نے تو خوب مال بنایا ہے تبھی تو گھر میں گوشہ نشین ہو کر رہ گئی ہے۔ نواز لیگ نے سب گروپوں سے مل کر خوب بندر بانٹ کی ہے ۔ پہلے پہل تو عدلیہ، جیو، وکلاء اور اعتزاز احسن کو گلے لگایا تھا مگر اب ساؤتھ ریجن پنجاب کے علمائے سُوا اور فیصل آباد کے لشا کر کو رانا ثناءاللہ کے ذریعہ گھاس ڈالا ہوا ہے۔یہ قوم صدیوں سے غلامی، چمچہ گیری، مخبر، درباری، غداری، قسم کے آبائی پیشوں سے منسلک رہی ہے۔جب تک اس کے اندر کا غیور انسان نہیں جاگتا یہ مداریوں کے چکر میں آتی رہے گی۔تعلیم کی کمی نے اسے پاگل کر دیا ہے۔کلمہ گو کو یہ قوم کھلم کھلا علمائے سُو کے زور پر کافر کہہ دیتی ہے۔جبکہ خود ان علمائے سُو کے کردار کا صبح وشام رونا روتی ہے۔سب لیڈروں کو غاصب اور ظالم کہتی ہے اور پھر ووٹ بھی انہی کو دیتی ہے۔یہ ہے المیہ میری قوم بنی اسرائیل کا۔جس کے عمل اسی قوم جیسے یقیناً ہو چکے ہیں۔خدا تعالیٰ اس پر اپنا رحم فرمائے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا



# یقیں محکم عمل پیہم

## روم کے بادشاہ ہرقل اور ایک مسلمان قیدی کے درمیان مکالمہ

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے روم سے لڑنے کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ کیا، اس دستے میں ایک نوجوان صحابی عبداللہ بن حذافہ بن قیس السہمی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مسلمانوں اور قیصر کی فوج کے درمیان لڑائی نے طول پکڑ لی، قیصر مسلمانوں کی بہادر اور ثابت قدمی پر حیران ہوا اور حکم دیا کہ مسلمانوں کا کوئی جنگی قیدی ہو تو حاضر کیا جائے۔ عبداللہ بن حذافہ کو گھسیٹ کر حاضر کیا گیا جن کے ہاتھوں اور پاؤں میں ہتھکڑیاں تھی، قیصر نے ان سے بات چیت شروع کی تو ان کی ذہانت سے حیران رہ گئے، دونوں کے درمیان یہ مکالمہ ہوا۔

قیصر: نصرانیت قبول کر لے تمہیں رہا کر دوگا۔ عبداللہ: نہیں۔ قیصر: نصرانیت قبول کر لے آدھی سلطنت تمہیں دے دوں گا۔ عبداللہ: نہیں۔ قیصر: نصرانیت قبول کر لے آدھی سلطنت دوں گا اور تمہیں حکمرانی میں شریک کروں گا۔ عبداللہ: نہیں، اللہ کی قسم اگر تم مجھے اپنی پوری مملکت، اپنے آباؤ اجداد کی مملکت، عرب و عجم کی حکومتیں بھی دے دو میں پلک جھپکنے کے لیے بھی اپنے دین سے منہ نہیں موڑوں گا۔ قیصر غضبناک ہوا اور کہا: تجھے قتل کر دوں گا، عبداللہ: مجھے قتل کر دے۔ قیصر نے حکم دیا کہ ان کو ایک ستون پر لٹکا کر ان کے آس پاس تیروں کی بارش کی جائے (ڈرانے کے لیے) پھر اس کو عیسائیت قبول کرنے یا موت کو گلے لگانے میں سے ایک بات کا اختیار دیا جائے۔ جب قیصر نے دیکھا کہ اس سے بھی بات نہیں بنی وہ کسی حال میں اسلام چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو حکم دیا کہ قید میں ڈال دو اور کھانا پینا بند کر دو... عبداللہ کو کھانا پینا نہیں دیا گیا یہاں تک کہ پیاس اور بھوک سے موت کے قریب ہو گئے تو قیصر کے حکم سے شراب اور خنزیر کا گوشت ان کے سامنے پیش کیا گیا... جب عبداللہ نے یہ دیکھا تو کہا: اللہ کی قسم مجھے معلوم ہے کہ میں وہ مضطر (پریشان حال) ہوں جس کے لیے یہ حلال ہے، مگر میں کفار کو خوش کرنا نہیں چاہتا، یہ کہہ کر کھانے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔

یہ بات قیصر کو بتائی گئی تو اس نے عبداللہ کے لیے بہترین کھانا لانے کا حکم دیا، اس کے بعد ایک حسین وجمیل لڑکی کو ان کے پاس بھیجا گیا کہ ان کو چھیڑے اور فحاشی کا مظاہرہ کرے... اس لڑکی نے بہت کوشش کی مگر عبداللہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہے... جب لڑکی نے یہ دیکھا تو غصے سے باہر چلی آئی اور کہا: تم نے مجھے کیسے آدمی کے پاس بھیجا میں سمجھ نہ سکی کہ وہ انسان ہے یا پتھر... اللہ کی قسم اس کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ میں مذکر ہوں یا مونث!! جب قیصر کا ہر حربہ ناکام ہوا اور وہ عبداللہ کے بارے میں مایوس ہوا تو ایک پیتل کی دیگ منگوائی اور اس میں تیل ڈال کر خوب گرم کیا اور عبداللہ کو اس دیگ کے سامنے لایا اور ایک اور مسلمان قیدی کو زنجیروں سے باندھ کر لایا گیا اور ان کو اُٹھا کر اس اُبلتے تیل میں ڈالا گیا جن کی ایک چیخ نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی ہڈیاں الگ ہوگئیں اور تیل کے اوپر تیرنے لگی، عبداللہ یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے، اب ایک بار پھر قیصر عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا اور نصرانیت قبول کرنے اور اسلام چھوڑنے کی پیش کش کر دی مگر عبدللہ نے انکار کر دیا۔

قیصر غصے سے پاگل ہونے لگا اور حکم دیا کہ یہ دیگ میں موجود تیل اٹھا کر عبداللہ کے سر پر ڈال دی جائے، جب قیصر کے کارندوں نے دیگ کھینچ کر عبداللہ کے قریب کیا اور اس کی تپش کو محسوس کیا تو عبداللہ رونے لگے!! آپ کی ان خوش نصیب آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے جن آنکھوں نے رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور دیکھا تھا!! یہ دیکھ کر قیصر خوشی سے جھومنے لگا اور کہا: عیسائی بن جاؤ معاف کر دوں گا، عبداللہ نے کہا: نہیں قیصر: پھر رویا کیوں؟ عبداللہ: اللہ کی قسم میں اس لیئے رو رہا ہوں کہ میری ایک ہی جان ہے جو اس دیگ میں ڈالی جائے گی... میری یہ تمنا ہے کہ میری میرے سر کے بالوں کے برابر جان ہوں اور وہ ایک ایک کر کے اللہ کی راہ میں نکلیں... یہ سن کر قیصر نے مایوسی کے عالم میں عبداللہ سے کہا: کیا یہ ممکن ہے کہ تم میرے سر کو بوسہ دو اور میں تمہیں رہا کروں؟ عبداللہ: اگر میرے ساتھ تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کرتے ہو تو میں تیرے سر کو بوسہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ قیصر: ٹھیک ہے عبداللہ نے اپنے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو رہا کرنے کے لیے اس کافر کے

سرکو بوسہ دیا اور سارے مسلمان رہا کیے گئے۔جب واپس عمر بن الخطاب کے پاس پہنچ گئے اور آپ کو واقعہ بتا دیا گیا تو عمر نے کہا: عبداللہ بن حذافہ کے سر کو بوسہ دینا ہر مسلمان پر ان کا حق ہے اور خود اٹھے اور عبداللہ کے سر کو بوسہ دیا۔رضی اللہ عنھم کیسی سیرت تھی صحابہؓ کی! کیسی قربانیاں تھیں ان کی! کیا یہ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیے!! بلکہ یہی اصل ہیرو ہیں زندگیوں کے اور آج کل ہمارے پاس اپنی اولادوں کو اسلام کے ہیروؤں کے بارے میں بتانے کا وقت نہیں ہے ہماری اولادیں یہ تو جانتی ہیں کہ سپر مین' 'آئرن مین' بیٹ مین۔یہ ہیرو ہیں جو ایک خیالی ہیں اور اصل ہیرو کون اور کیسے ہوتے ہیں یہ ہی نہیں علم۔اللہ سب کو علم دین سیکھنے اور سکھانے کی توفیق عطا کرے۔آمین۔(ماخوذ)



## حیرت انگریز سچائی

زندگی کی حیرت انگیز سچائی یہ ہے کہ زیادہ تر فرسٹ ڈویژن کامیاب طالب علم ٹیکنیکل سائیڈ اختیار کرتے ہیں یعنی کوئی انجینئر بنا کوئی ڈاکٹر تو کوئی کسی مشینی ادارے کی ٹیم کا لازمی ممبر سیکنڈ ڈویژن طالبعلم CSS اور PCS کر کے ایڈمنسٹریٹر بن جاتے ہیں اور فرسٹ ڈویژن والوں پر حکم چلاتے ہیں۔تھرڈ ڈویژن کامیاب طالب علم سیاست میں داخل ہونے اور اور وزیر اور ایم ایل اے اور ایم پی بن جاتے ہیں اور دونوں افراد پر راج کرتے ہیں اور مذکورہ دونوں افراد پر راج کرتے ہیں۔فیل ہونے والے طالب علم انڈرورلڈ'' کو جوائن کر کے تمام فرسٹ سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژن کامیاب طالب علموں پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں۔

# احتساب

ہمارے ملک میں یہ نعرہ بہت ہی مقبول رہا ہے۔

''قوم کو حساب دو خون کا حساب دو'' جب بھی کوئی سابقہ حکومت کو پچھاڑ کر یا لتاڑ کر تخت طاؤس پر براجمان ہوتا ہے تو اس کی زبان پر احتساب کا نعرہ ضرور ہوتا ہے۔ مادرِ وطن کے قیام کے وقت جن سیاسی اور دینی پارٹیوں نے اس کی پُرزور مخالفت کر کے غیر قوم کا ساتھ دیا تھا اُن کا بھی احتساب آج تک نہ ہوسکا، لیاقت علی خان کے قاتلوں کا بھی حساب نہ لیا گیا۔

پھر 1953ء کا مارشل لاء لگوانے والے دولتانہ کا بھی احتساب نہ ہوسکا اور شکست خوردہ علمائے سُو نے یہ جو ڈرامہ رچایا تھا ان کو بھی آج تک کسی نے نہ پوچھا، ایوب خان سے لے کر آج تک یہ نعرہ بھی عام لگا اور آج تک کسی بڑے کا احتساب بھی نہ ہوسکا۔ ہر کسی نے اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑی اور انصاف اور عدل کا خون کیا۔ مفاد پرستوں نے ہر دور میں جنگ جیتی۔ معاہدہ تاشقند کا راز آج تک نہ کھل سکا، پھر بنگلہ دیش بنوانے والوں کا بھی آج تک احتساب نہ ہوسکا، حمود الرحمن کمیشن کی صدائے بازگشت میرے وطن کے سیاسی لیڈروں کے محلوں میں کھوگئی 1965 اور 1971ء کی جنگیں لڑ کر قوم کو مزید پچاس سال پیچھے دھکیلنے والوں کا احتساب کون کر سکا، نوستاروں نے ایک ملٹری ڈکٹیٹر سے مل کر بھٹو کا نام نہاد احتساب کیا یا عدالتی قتل، یہ بھی علمائے سُو کی کارستانی تھی، جو کہ ضیاء الحق کے اقتدار کو طول دینے کی چال تھی، سعودیہ اور امریکی اشیر باد سے جہادِ افغانستان کا ڈھونگ رچا کر بھوکے ننگے افغانیوں کو ایک سفاق اور ظالم انسان بنانے میں اسی گروہ کا ہاتھ ہے، فوج کی منصوبہ بندی سے جا بجا اسلحہ فیکٹریاں بنا کر پشتون قوم کو جدید اسلحہ بردار بنا کر ان کو خدائی فوجدار بنا کر پاک وطن کی طاقت کو زیر نگیں کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی، اسلام کی ایسی تصویر پیش کی گئی کہ آج ساری دنیا انکے اسلام کے خلاف ہو چکی ہے، باقی مما لک کے مسائل کو خواہ مخواہ اپنے گلے کا ہار بنا کر مادر وطن کے عوام کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ مگر یہ سب مکاریاں ضیاء الحق کے اقتدار کو طول نہ دے سکیں، مگر خدا تعالیٰ ہی اصل محتسب ہے۔ پھر ماشل لاء کی نرسری سے پودے نکل آئے، اتفاق

فونڈری کے کالے ظالم اندھیروں سے نکل کرقوم کوایساروشن کرنے آئے کہ آج تک قوم ان ہی کے رحم وکرم پرصحت وتعلیم، بیروزگاری، بھوک اورننگ کی تاریکی میں مبتلا ہے، وہ توسرے محل اوررائے ونڈ کے حصول میں کامیاب رہے مگرعوام بےمحل بلکہ بےسروپا ہوگئے، احتساب کانعرہ بدستورلگتارہا، مگرکوئی بڑانہ جیل میں گیااورنہ پکڑا گیا، جب ایک خاندان غرباءکی آہوں سے آخرپکڑا گیاتوسیدھا سعودی عرب جاپناہ گزیں ٹھہرا۔ باقی بیرون ملک بدرہوگئے، پھران چوروں اورڈاکوؤں نے NRO کیااورملک کولوٹنے کی خاطرآ نکلے۔

بےنظیرتوقربانی دے گئی مگر باقی بکروں کی عیش ہوگئی، جنہوں نے پانچ سال تک دن رات لوٹ مارکی اور چائنہ کٹنگ میں مصروف رہ کراپنی جیبیں بھریں، میثاق جمہوریت تو تھا ہی، جس کے سائے میں دونوں نے مادرِوطن کا گوشت نوچا، پہلے رینٹل پاوراور بےنظیرانکم سپورٹ پروگرام کے تحت لوٹا گیا، اب میٹرو، اورنج ٹرین، سستی روٹی، آشیانہ، سبزانقلاب، دانش سکول، نہ جانے کیا کیا مہرے استعمال کئے گئے۔ مگراحتساب کسی کانہ ہوسکا، نعرہ بدستورلگتارہا، اب پھراحتساب کانعرہ لگ چکا ہے، دیکھیئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، محتسب بھی اسی مٹی سے ہےاور مادروطن کولوٹنے والے بھی۔ آج تک تومحتسب کی نہیں چلی۔ کیونکہ محتسب آج تک مردِجری نہ بن سکا، مردِجری بننے کے لئے ایمان کی ضرورت ہوتی ہے مگرایمان توثریا ستارے پرپہنچ چکا ہے۔ اس لئے بےفکررہیئے کوئی احتساب نہ ہوگا۔ اگرمیرے اللہ نے چاہا توکوئی جلوہ دکھادے گاعنقریب، انشاءاللہ۔ اگرانسان، مومن، یاباخداانسان کوخدا کے احتساب کا پاس ہوتوتب انسان انسانیت کی لاج رکھتا ہے۔ ورنہ (پاکستان کامطلب کیا کھاپی تے جان بنا)۔



# بیوروکریٹس کی عیاشیاں اور قوم کی حالت

یہ اس ملک کے سینکڑوں المیوں میں سے ایک المیہ ہے۔ آپ پاکستان کے اندر سروے کر لیں ملک کے 80 سرکاری افسروں کے دولت خانوں کا رقبہ 2000 کنال پر مشتمل ہے۔ کمشنر سرگودھا کی رہائش گاہ ایک سو 4 کنال پر مشتمل ہے۔ پاکستان میں کسی سرکاری ملازم کی سب سے بڑی رہائش گاہ ہے۔ اس کی نگہداشت مرمت اور حفاظت کے لئے 33 ملازم ہیں۔ دوسرے نمبر پر SSP ساہیوال کی کوٹھی ہے۔ اس کا رقبہ 98 کنال ہے۔ DCO میانوالی کی کوٹھی کا سائز 95 کنال اور DCO فیصل آباد کی رہائس گاہ 92 کنال پر تعمیر شدہ ہے۔ صرف پنجاب پولیس کے سات DIG اور 32 SSP رہائش گاہیں 860 کنال پر مشتمل ہیں۔ DIG گجرانوالہ 70 کنال، ڈDIG سرگودھا 40 کنال، DIG راولپنڈی 20 کنال، DIG فیصل آباد 20 کنال، DIG ڈیرہ غازی خاں 20 کنال، DIG ملتان 18 کنال اور DIG لاہور 15 کنال کے محلات ہیں۔ SSP میانوالی کا گھر 70 کنال، SSP قصور 20 کنال، SSP شیخوپورہ 32 کنال، SSP گجرانوالہ 25 کنال، SSP گجرات 8 کنال، SSP حافظ آباد 10 کنال، SSP سیالکوٹ 9 کنال، SSP جھنگ 18 کنال، SSP ٹوبہ ٹیک سنگھ 5 کنال، SSP ملتان 13 کنال، SSP وہاڑی 20 کنال، SPP خانیوال 15 کنال، SSP پاک پتن 14 کنال، SSP بہاولپور 32 کنال، SSP رحیم یار خان 22 کنال، SSP لیہ 6 کنال، SSP راولپنڈی 5 کنال، SSP چکوال 10 کنال، SSP جہلم 6 کنال، SSP اٹک 29 کنال، SSP خوشاب 6 کنال، SSP بھکر 8 کنال، SSP راجن پور 37 کنال، اور SSP نارووال 10 کی سرکاری عمارت میں رہائش پذیر ہیں۔

صرف پولیس کے ان سرکاری محلات کی حفاظت مرمت اور تزئین و آرائش میں ہر سال 80 کروڑ روپے سے کچھ اوپر خرچ ہوتے ہیں۔ پنجاب پولیس کی کارکردگی آپ کے سامنے ہے جو لاہور کے تین بڑے ہسپتالوں کے سالانہ بجٹ کے برابر ہے۔ 6 ہزار 600 کنالوں پر مشتمل ان رہائش گاہوں کی 2 نگہداشت کے لئے 30 ہزار ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ ملازمین ہیں۔ صرف ان کے لانوں پر 18 سے 20 کروڑ روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ ایک سرکاری اندازے کے مطابق یہ تمام رہائش

گاہیں شہر کے ان مرکزی علاقوں میں ہیں جہاں زمین کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔لہٰذا اگر یہ تمام رہائش گاہیں بیچ دی جائیں۔تو 70 سے 80 ارب روپیہ حاصل ہوسکتا ہے۔یہ رقم واپڈا کے مجموعی خسارہ سے دُگنی ہے گویا اگر یہ رہائش بیچ کر واپڈا کو دی جائے تو وپڈا کو چار سال تک بجلی کی قیمت بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔اگر یہ رقم ہائی وے کو دے دی جائے

وہ موٹر وے جیسی دو سڑکیں کراچی اور پشاور تک نیشنل ہائی ویز جیسی مزید ایک سڑک بنا سکتی ہے۔ اگر یہ رقم محکمہ صحت کے حوالہ کر دی جائے تو یہ محکمہ پاکستان میں'' پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس جیسے 70 ہسپتال بنا سکتا ہے۔اگر یہ رقم وارسا کے حوالہ کر دی جائے تو وہ اس رقم سے سمندر کا پانی صاف کرنے کے 12 پلانٹ لگا سکتا ہے جس سے ملک کے 45 فیصد لوگوں کو پینے کا پانی مل سکتا ہے۔دنیا بھر میں سرکاری رہائش گاہیں سکڑ رہی ہیں۔آپ برطانیہ چلیں جائیں جس کو ڈاوننگ اسٹریٹ وزیر اعظم سے لے کر چیف کمیشنرز تک اور ڈپٹی سکریٹری سے ڈپٹی وزیر اعظم تک سب افسر اور عہدے دار دو دو تین تین کمروں کے فلیٹ میں رہتے دکھائی دیں گے۔آپ امریکہ چلیں جائیں وائٹ ہاؤس دیکھیں دنیا کو صدارتی محل پنجاب کے گورنر ہاؤس سے بھی چھوٹا ہے۔یہ بڑی بڑی مملک کے سر براہان کی صورت حال ہے۔رہے سرکاری ملازم بیرو کریٹس اعلی افسر اور عہدے داران تو آپ پورا یورپ پھریں آپ کو یہ لوگ عام بستیوں کے عام فلیٹوں میں عام شہریوں کی طرح رہتے نظر آئیں گے۔ان کے گھروں میں نہ لان ہوں گے نہ ڈرائیور اور نہ ہی لمبے چوڑے نوکر یہاں آپ ایک ضلع سے دوسرے ضلع کا دورہ کر لیں آپ کو تمام بڑی عمارتوں اور تمام بڑے محلات میں ضلع کے خادمین فروکش نظر آئیں گے۔مجھے خود ایک بار پنجاب کے ڈپٹی کمیشنر کے گھر رہنے کا اتفاق ہوا ہے یقین کیجئے اس گھر میں کماد گنا کی فصل لہلا رہی تھی۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کے بیگم صاحبہ کو تازہ گنا چوسنے کا شوق ہے لہذا دس کنال کا رقبہ بیگم صاحبہ کے شوق کی نظر کر دیا گیا ہے۔کیا پاکستان جیسا ملک ایسی عیاشی ایسے اسراف کا متحمل ہو سکتا ہے شاید اس ملک میں سوچنے والے لوگ ختم ہو چکے ہیں۔ہم تو اس نبی ﷺ کی اُمت ہیں جن کے گھر میں ہفتہ ہفتہ فاقہ رہتا تھا۔جب وصال مبارک ہوا تو حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حجرہ میں ایک کھجور تک نہ تھی لیکن ان کے اُمت کے اللّے تللّے ملاحظہ کیجئے۔خلقتِ خدا مر رہی ہے اور ان کے افسر ٹیکسوں کی کمائی پر پلنے والے باغوں میں جھولے ڈال کر بیٹھے ہیں۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔ماخوذ۔

# اکنامک راہداری،خوشحالی،ترقی، پرامن، پاکستان

اقتصادی راہداری کا منصوبہ دنیا کا سب سے بڑا معاشی پراجیکٹ ہے۔ یہ ہزاروں کلومیٹر ریلویز،موٹرویز، لاجسٹک سائٹس اور بندرگاہوں کا ایک مربوط نظام ہے۔ چین ہر روز 60لاکھ بیرل تیل باہر سے منگواتا ہے جس کا سفر 12000 کلومیٹر بنتا ہے جبکہ یہی سفر گوادر سے صرف3000 کلومیٹر رہ جائیگا۔ گوادر پورٹ آبنائے ہرمز پر دنیا کی سب سے گہری بندرگاہ ہے۔ مصر کی نہر سویز سے پورے یورپ کے لیے روزانہ 40 لاکھ بیرل تیل جاتا ہے جبکہ گوادر سے صرف چین کے لیے روزانہ 60لاکھ بیرل تیل جائیگا۔ چائنہ کو سالانہ 20ارب ڈالر بچت صرف تیل کی درآمد میں ہوگی جبکہ پاکستان کو تیل کی راہداری کی مد میں 5ارب ڈالر یعنی پانچ کھرب یا پانچ سوارب روپے سالانہ ملیں گے۔ جو پورے پختون خواہ کے سالانہ بجٹ کے برابر ہونگے اور وہ بھی صرف تیل کی مد میں،اس کے علاوہ سب سے بڑھ کر چین امریکہ کی محتاجی سے نکل آئیگا جو اس وقت چین جانے والے سمندری راستوں کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ دنیا کی سب سے بڑی مارکیٹ ہیں جبکہ یورپ صرف 13 فیصد بنتا ہے دنیا کی کل آبادی کا۔ روس اپنی تجارت اس خطے میں کرنا چاہتا ہے اس کے لیے روس کے پاس صرف دو ہی راستے ہیں ایران کی چاہ بہار بندرگاہ جس کی گہرائی 11 میٹر سے زیادہ نہیں جبکہ دوسرا راستہ گوادر کا ہے جو دنیا کی تیسری سب سے گہری بندرگاہ ہے۔ سنٹرل ایشیاء کی ریاستیں دنیا کا دوسرا سب سے بڑا تیل اور گیس کا ذخیرہ رکھتی ہیں۔ جن کو وہ ان ممالک تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ روس اور وسطی ایشائی ممالک گوادر کی بدولت بہت جلد پاکستان پر انحصار کریں گے۔ ایک اندازے کے مطابق 80 ہزار ٹرک روزانہ چین، روس اور سنٹرل ایشیاء کے ممالک سے گوادر کی طرف آمدورفت کریں گے۔ پاکستان کو صرف ٹول پلازے کی مد میں ہی 20 سے 25ارب کی بچت ہوگی۔ معاشی راہداری کے قریب بہت بڑے انرجی زون بنیں اور وہاں کام کرنے کے لیے چین سے زیادہ سستی افرادی قوت میسر ہوگی۔ اور تو اور اتنے لمبے روٹس پر صرف کینٹین، ٹائر پنکچر اور ڈسپنسری وغیرہ کی مد میں ہی ہزاروں پاکستانیوں کو روزگار مل جائیگا۔ اللہ نے پاکستان کو جو

سٹریٹیجک پوزیشن دی ہے وہ اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ پاکستان پوری دنیا کی تیل، گیس اور ایگریکلچرل، صنعتی ومعدنی پیدوار اور منڈیوں کے درمیان پل بن چکا ہے۔ جولوکیشن پاکستان کو میسر ہے قومیں اسکا خواب دیکھتی ہیں۔ ہمارے دشمن اس منصوبے کو روکنے کے لیے سب کچھ کریں گے۔ دہشت گردوں اور قسم قسم کی منصوبوں سے سبوتاژ کرنے کے لیے استعمال کیا جائیگا۔ یاد کیجیے 2004ء میں عبداللہ محسود نے امریکہ سے ''رہا'' ہوتے ہی سب سے پہلے گوادر پراجیکٹ پر حملہ کر دیا تھا اور اس کو بند کروانے کی کوشش کی تھی۔ اکنامک راہداری پر جہاں جہاں مزدور کام کر رہے ہیں اور پاک فوج کے جوان پروٹیکشن دے رہے ہے ان کے ساتھ مکمل تعاون کرنے اور حکومت، فوج، اور مزدوروں اور انجنیئر ز کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوکر پاکستان کو انشاء اللہ دنیا کے ترقی یافتہ مما لک کے صف میں کھڑا کرانے میں اپنا حصہ ڈالیں۔ ❁❁

فرق صرف اتنا تھا۔

اس کی ڈولی تھی میرا جنازہ تھا۔ پھول مجھ پر بھی تھے پھول اس پر بھی تھے۔ سہیلیاں اس کی بھی تھیں، دوست میرے بھی تھے۔ اُن کا ہنسنا تھا وہاں، اِن کا رونا تھا یہاں۔

فرق صرف اتنا تھا۔

قاضی اُدھر بھی تھا، مولوی ادھر بھی تھا، دو لفظ اسکے پڑھے گئے، دو لفظ میرے بھی پڑھے گئے۔ اس کو اپنایا گیا، مجھے کو دفنایا گیا۔

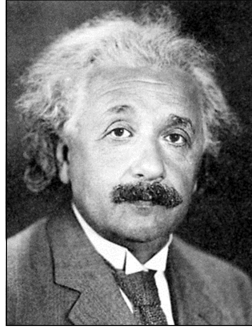
فرق صرف اتنا تھا۔

وہ گھر کو چلی، میں بھی گھر کو چلا، اس کا گھر تھا بڑا، میرا گھر تھا چھوٹا، وہ سج کر گئی، مجھے سجایا گیا، وہ اُٹھ کر گئی، مجھے اُٹھایا گیا

فرق صرف اتنا تھا۔

اس کے ماں باپ ہنس رہے تھے، میرے ماں باپ رو رہے تھے، وہ چین کی زندگی جی رہی تھی، اور میں سو رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا اور اتنا ہی رہے گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔

# کامیاب لوگ



Albert Aynstynاسکول کی باسکٹ بال ٹیم سے نکالا گیا، گھر آ کر خود کو کمرے میں لاک کیا اور گھنٹوں روتا رہا بعد میں وہی لڑکا چھے بار کا باسکٹ بال چیمپئین ''مائیکل جارڈن'' بنا۔ چار سال کی عمر تک اس کے والدین یہی سوچتے رہے وہ گونگا ہے چار سال کی عمر میں وہ پہلی بار بولا۔ اس کے والدین کو ہمیشہ اس کی فکر ہوتی تھی کہ یہ اس دنیا میں کیسے سروائیو کرے گا وہی بچہ ''البرٹ آئن اسٹائن'' بنا۔

Operanafray۔ بطور نیوز اینکر جاب سے نکال دیا گیا کیوں کہ بقول مالکان کے، وہ ٹیلی ویژن پر اچھی نہیں لگتی فٹ نہیں بیٹھتی... بعد میں وہی عورت ''اوپرا ونفرے'' بنی جس پچھی صدی کی طاقتور ترین خاتون کہا جاتا تھا۔۔ جو کہ متعدد ایوارڈ ونر ٹاک شو کی اینکر رہی ہیں۔

Woltdizney۔ اخباری نوکری سے یہ کہہ کر نکال دیا گیا کہ آپ کے پاس کوئی تخلیقی صلاحیت نہیں ہے کوئی اوریجنل آئیڈیاز نہیں ہیں وہی شخص بعد میں ''والٹ ڈزنی'' بنا جو کہ مکی ماوس نامی کرداروں کا بنانے والا ہے۔

Liunalmessy۔ گیارہ سال کی عمر میں ٹیم سے نکال دیا گیا کیوں کہ وہ ایک ایسی بیماری کا شکار تھا جس کے تحت انسان کا قد بڑھنا رک جاتا ہے وہ اپنی عمر کے بچوں سے بہت چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ معاشرے بھر میں اس کا مذاق بنایا جاتا تھا وہی لڑکا آج مشہور فٹ بالر ''لیونل میسی'' ہے۔

astewsjabz تیس سال کی عمر میں اسے تباہ شدہ حال میں تنہاہ چھوڑ دیا گیا۔...اسی اس کے شیئر ہولڈرز نے اسی کمپنی سے نکال دیا جسے اس نے خود بنایا تھا...وہی شخص بعد میں دنیا کو ٹچ اسکرین ٹیکنالوجی سے آشنا کر گیا اور دنیا اسے ایپل کے بانی 'اسٹیو جابز' کے نام سے جانتی ہے۔

Repera amaniumہائی اسکول سے نکالا گیا۔ نشے نے اتنا برباد کر دیا تھا کہ کئی بار خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ آج وہی لڑکا دنیا کا مشہور ترین سنگر اور ریپر 'ایمینم' کہلاتا ہے۔

Thomas adison۔استاد نے اسے یہ کہہ کر اسکول سے نکال دیا کہ تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تم ایک نہایت کند ذہن بچے ہو۔وہی کند ذہن بچہ بعد میں الیکٹرک بلب سمیت ایک ہزار سے زیادہ ایجادات کا مالک بنا جسے ہم ''تھامس ایڈیسن'' کہتے ہیں۔

Dabetlz۔ڈیکا ریکارڈنگ اسٹوڈیو نے یہ کہہ کر نکال دیا کہ ہمیں آپ کے گانے پسند نہیں آئے اس فیلڈ میں آپ کا کوئی فیوچر نہیں جاؤ کوئی اور کام کرو بعد میں وہی بینڈ میوزک کی تاریخ کا سب سے مشہور بینڈ 'دا بیٹلز' کہلایا۔

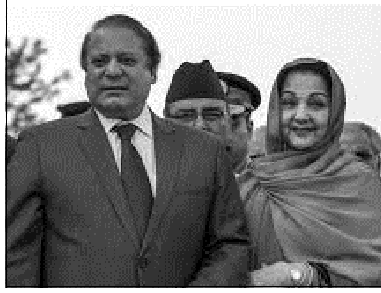
Dr.SES۔ان کی پہلی کتاب ستائیس پبلشرز نے مسترد کردی اور چھاپنے سے انکار کردیا۔بعد میں ''ڈاکٹر سیس'' انگلش ادب کی تاریخ میں بچوں کے پڑھے جانے والے سب سے کامیاب مصنف بنے۔

Ibraham linkolin۔منگیتر کی موت ہوگئی، بزنس ناکام ہوگیا، نروس بریک ڈاون ہوگیا اس کے علاوہ آٹھ الیکشن میں شکست ہوئی لیکن وہی شخص بعد میں امریکہ کا سولھواں صدر بنا جسے دنیا 'ابراہم لنکن' کے نام سے جانتی ہے۔

Owner Honda car۔ٹویوٹا کمپنی میں بطور آٹو موبائل انجینئر کی جانب کے لیے انٹرویو دینے گیا اور ناکام رہا۔۔جسے ٹویوٹا کمپنی نے جاب دینے سے انکار کردیا آج وہی شخص ہنڈا کمپنی کا مالک ہے۔یاد رکھیں اگر آپ کبھی ناکام نہیں ہوئے تو اس کا مطلب ہے آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی...



# شریف فیملی



یہ فیملی باقیاتِ ضیاء ہے۔یہ لازمی ضیاءالحقی کرے گی۔فقیر سے امیر ہوئی ہے۔ارائیں ہے۔جس کے لئے بلھے شاہ نے بھی فرمایا ہے۔یہ ابن الوقت ہیں۔یہ امیر المومنین بننے کے چکر میں بھی تھے۔یہ اندر سے نیم ملاں ہیں۔ساؤتھ پنجاب کے سب جمعراتیئے ان کے مرید ہیں۔فیصل آباد اور اس سارے علاقے کے مدرسے باز ان کے گماشتے ہیں۔پینتیس سالوں میں ان کو حکمرانی،اور کرپشن کا سلیقہ وطریقہ آگیا ہے۔یہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے مقتدر طبقے کے دو نمبر افراد کو خریدنے کا ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ہر جگہ کا سروے ان کے پاس ہے۔پولیس مقابلے میں ان لوگوں نے اپنے نامزد دشمن ہلاک کئے ہیں۔یہ وطن پاک کو داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ان کے منہ میں رام رام اور بغل میں چھری ہوتی ہے۔

سارے پاکستان میں شوگر ملز لگوا کر ان لوگوں نے اپنے تجارتی تعلقات بنا کر مشٹنڈے پیدا کئے۔ان کی پیٹھ ٹھونکی۔وہی لوگ ان کے کل پرزے ہیں۔عمران تو ان کے لئے پیدا بھی نہیں ہوا۔ان کو نہ ایمان کی ضرورت ہے نہ کعبے کی اور نہ اسلام کی۔بس ضرورت ہے تو اسلام آباد کی۔نواز شریف چند ہفتے پہلے''ڈان لیکس'' کے بعد فوج کو بہت انڈر پریشر لے آیا تھا،جس سے پوری ملٹری اسٹیبلشمنٹ بیک فٹ پر چلی گئی،وہی نواز شریف سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے بعد اس وقت خود کو 1997ء کے دور میں واپس جاتا محسوس کر رہا ہے۔جب اس وقت کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے''ججز کیس'' کے نام پر نواز شریف کی بھاری اکثریت والی حکومت ہلا کر رکھ دی تھی۔۔!اس وقت شہباز شریف نوٹوں سے بھرے بریف کیس اور سپریم کورٹ کا ریٹائرڈ بارلیش جج رفیق تارڑ کو اپنے ساتھ جہاز میں بٹھا کر کوئٹہ پہنچا۔اور وہاں سپریم کورٹ کے کوئٹہ بنچ کے ججوں کو''خرید'' کر ان سے ان کے اپنے چیف جسٹس کے خلاف فیصلہ لیا اور ساتھ ہی سپریم کورٹ اسلام آباد پر چڑھائی کرا

دی۔سجادعلی شاہ نے اس وقت کے آرمی چیف جہانگیر کرامت کوعدالت عظمی کی حفاظت کیلئے''فوجی دستے'' بھجوانے کی درخواست کی اور آرمی چیف نے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس درخواست کو ماننے سے''انکار'' کردیا۔نتیجتاً سجادعلی شاہ کو جبراً جانا پڑااوراس کے بعد سپریم کورٹ میں تمام پٹواری جج بھرتی ہوگئے۔وقت لیکن اتنا بے رحم تھا کہ جہانگیر کرامت کو چند ماہ بعد نوازشریف نے استعفیٰ دینے پرمجبورکردیا۔اورپھراس کے چندماہ بعد پرویزمشرف نے نوازحکومت گراکر مارشل لانافذ کردیا۔آج تقریباً20سال بعدنوازشریف ایک دفعہ پھر" سپریم کورٹ کے ہتھے چڑھنے جارہاہے۔

1997 میں تومحض...''توہین عدالت'' کا کیس تھا،آج ''پانامہ لیکس'' کی شکل میں انتہائی مضبوط فرد جرم تیار ہے۔آج اگرنوازشریف سپریم کورٹ پر چڑھائی کا ارادہ بھی کرتا ہےتو اس کا راستہ روکنے کیلئے''عمران خان'' کھڑا ہوگا۔تاریخ کا وہ انتقام جوپچھلے20سال سےادُھورا تھا،اب پورا ہونے جارہا ہے۔اس وقت صرف توہین عدالت کا جرم تھا،۔آج منی لانڈرنگ،حلف سے رُوگردانی،آرٹیکل 62 کی خلاف ورزی،ٹیکس چور یاپھراس کے بعد ماڈل ٹاؤن میں 17افراد کےقتل کا کیس تیار ہے۔بعض اوقات تاریخ اپناانتقام ٹھنڈا کر کے لیتی ہے،لیکن یہ انتقام بہت بھیانک اورخوفناک ہوتا ہے۔نوازشریف کے ساتھ بھی تاریخ ایک ایسا ہی ٹھنڈا لیکن بھیانک انتقام لینے جارہی ہے......!!!!

سیانے لوگ سچ کہتے ہیں خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔



# دنیا میں سب سے بڑا کاروبار

تیل کا ہے اور جو لوگ تیل کو کنٹرول کرتے ہیں وہ دنیا کی معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں۔ دنیا میں دوسرا سب سے بڑا کاروبار اسلحے کا ہے۔ اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی معیشت امریکہ کی کل آمدن کا پچاس فیصد اسلحے کی فروخت سے حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ بات اس کے مفاد میں ہے کہ دنیا میں مسلسل جنگیں جاری رہیں۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ دنیا میں تیسرا سب سے بڑا کاروبار ڈرگز (Drugs) کا ہے۔ لوگ اسکے متعلق بہت زیادہ اسلئے نہیں جانتے کہ یہ غیر قانونی طور پر ہوتا ہے اور اسکی ڈاکومینٹیشن نہیں کی جاتی۔ امریکن سی آئی اے (CIA) دنیا کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی ہے جسکے آپریشنز دنیا بھر میں جاری رہتے ہیں جن پر بے پناہ اخراجات آتے ہیں۔

یہ اخرجات اس بجٹ سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں جو اس کے لیئے منظور کیا جاتا ہے۔ یاد رکھئے کہ امریکی سی آئی اے (CIA) اپنے 90 اخراجات ڈرگز کے کاروبار سے پوری کرتی ہے۔" دنیا میں دو خطے ایسے ہیں جہاں سب سے زیادہ ڈرگز پیدا ہوتی ہیں۔ ایک چین کے قریب میانمار اور تھائی لینڈ وغیرہ کا علاقہ ہے جس کو گولڈن ٹرائی اینگل کہا جاتا ہے اور کسی دور میں دنیا میں سب سے زیادہ افیون پیدا کرنے والا خطہ تھا۔ دوسرا خطہ جس کو آجکل گولڈن کریسنٹ کہا جاتا ہے وہ افغانستان کا علاقہ ہے جہاں دنیا کی تقریباً 90 فی صد سے زیادہ افیون اور ہیروئین پیدا کی جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر ان علاقوں میں پیدا کی جاتی ہے جہاں امریکنز کا کنٹرول ہے اور امریکن آرمی کے لوگ کھلے عام یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ ہم افیون کی کاشت کو محفوظ بنانے آئے ہیں۔ طالبان نے جب افغانستان پر کنٹرول حاصل کر لیا تو ملا عمر نے جولائی سنہ 2000ء میں افیون کی کاشت پر مکمل پابندی لگا دی تھی اور دنیا بھر میں پہلی بار افیون یا ہیروئن کی شدید قلت پیدا ہو گئی تھی۔ امریکن حملے کے بعد افغانستان میں افیون کی کاشت میں ریکارڈ اضافہ ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اس عرصے میں سی آئی اے (CIA) نے اتنے کمائے کہ جب امریکہ میں بینک دیوالیہ ہونے لگے تھے تو سی آئی

اے نے ڈرگز کے ذریعے کمائے گئے پیسوں سے ان بینکوں کو سہارا دیا۔

بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ نیٹو کے کنٹینرز میں ٹنوں کے حساب سے ایسیٹک این ہائڈ رائیڈ نامی کیمیکل افغانستان جاتا ہے اور آج تک کسی نے یہ سوال کرنے کی جرات نہیں کی کہ آخر اس کیمیکل کو افغانستان میں کس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسیٹک این ہائیڈ رائڈ وہ کیمیکل ہے جو افیوں کو ہیروئین بناتا ھے۔

کہا جاتا ہے کہ سی آئی اے (CIA) نے کچھ لوگوں کو اس کام کے لیے اپنا فرنٹ مین بنا رکھا ہے۔ حامد کرزئی کے بھائی ولی کرزئی ان میں سے ایک ہے جنکے بارے میں اندازہ ہے کہ اگر غیر قانونی دولت کی کوئی رینکنگ ہو تو شائد وہ دنیا کے امیر ترین شخص ہو۔ امریکہ کے افغانستان پر حملے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ ہیروئین کے اس کاروبار کا کنٹرول دوبارہ حاصل کرنا تھا جس پر سی آئی اے (CIA) چلتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس ہیروئین کی سب سے زیادہ کھپت یورپ اور امریکہ میں ہی ہوتی ہے۔ چونکہ سی آئی اے (CIA) کو کنٹرول کرنے والے امریکن عیسائی نہیں بلکہ وہ یہودی ہیں جنہوں نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے اسلئے انکو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس ہیروئین سے مرنے والے کون ہیں، عیسائی یا مسلمان۔



## بوتل کا رواج

خواتین کی ایک محفل میں ذکر یہ چل نکلا کہ رات کے وقت بچے کو دوبارہ دودھ دینا ہوتا ہے تو بیوی اور شوہر میں سےکون دودھ دے... ایک خاتون نے اپنی دادی اماں سے پوچھا۔ ''دادی اماں آپ بتائیں کہ آپ کے زمانے میں اس وقت کیا ہوتا تھا'

''' دادی اماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔'' بھئی میرا میاں تو دودھ دے ہی نہیں سکتے تھے... کیونکہ ہمارے وقت میں تو بوتل کا رواج ہی شروع نہیں ہوا تھا۔''

# پیمرا کی بندش

پیمرا آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ اپنی رائے کو کسی سے بیان کر سکیں۔ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ آپ کسی قانون کے متعلق سوال اُٹھائیں، کسی قانون پر بحث کریں۔ یہ ظالم سماج اور اسلام کا ٹھیکیدار کسی کو جائز سوال کرنے سے بھی باز رکھنا چاہتا ہے۔ حمزہ علی عباسی نے کوئی غیر مناسب سوال نہیں کیا تھا اس نے پارلیمنٹ کے اختیارات کی بات کی تھی۔ مگر حسینی سوالوں کا جواب یزید کب دے سکتا ہے۔ جیسے موسیٰ کے سوالوں کا جواب فرعون کے پاس نہ تھا اور ابراہیم کے سوالوں کا جواب آذر کے پاس بھی نہیں تھا۔ یزیدِ وقت بھی اسی پر مصر ہے کہ کوئی سوال نہ کرے۔ سوال اس لئے نہیں ہوسکتا کہ پاکستان میں ایک ایسے گروہ کی گرفت مضبوط سے مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ جو ظالم اور مدہوش ہے۔ جو قیامِ پاکستان سے ہی اس مادرِ وطن کا مخالف ہے۔ جو قائداعظم کو بھی کافرِ اعظم کہتا رہا۔

پاکستان کا ازلی دشمن تھا اور ہے جو پاکستان کے قیام کو ایک گناہ سے تشبیہ دیتا رہا اب وہ تو جانبداری میں یک چشم ہو گیا ہے۔ جو رشوت، ملاوٹ، اَقربا پروری کا حامی ہے، جو اُمت میں انتشار کا بانی ہے۔ جو بزعم خود مسلمان ہے اور باقی کمزور شہریوں کو کافر اور غیر مسلم گردانتا ہے، جو اس گروہ کی بات نہ مانے اس پر فتویٰ صادر کرتا ہے بلکہ اس کا نکاح بھی توڑ دیتا ہے۔ اتنا بے عدل اور بے ایمان ہے کہ اس کے سب مدرسے اور مساجد غیر رجسٹرڈ اور ناجائز مقبوضہ املاک پر تعمیر ہیں۔ بیرونی ممالک کی امداد سے ان مدرسوں میں دہشت گرد کی پرورش سرِ عام ہو رہی ہے۔ لوگوں کی تربیت غلط رنگ میں کرتا ہے، جو رشوت، ملاوٹ، اقربا پروری، زنا، قتل، شراب نوشی، کم تولنا، اور برا بولنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو فوجی جوانوں کو نہیں بلکہ طالبان کو شہید کا درجہ دیتا ہے، نام نہاد مجاہدین کو جنت الاٹ کرتا ہے، ڈیزل بطور رشوت تقسیم کرتا ہے عورت یا بیوی کو مارنا جائز قرار دیتا ہے۔ جوان بچیوں کو زندہ جلانے کی ترغیب دیتا ہے، قار و قاری، کو جائز قرار دیتا ہے، اقلیتی فرقے

کے افراد کو نذر آتش کرتا ہے، اور عدلیہ اور انتظامیہ کو خاموش رہنے پر مجبور کرتا ہے، یہ سب کچھ ان سیاسی پارٹیوں کا کیا دھرا ہے۔کل کی خبر ہے کہ خیبر پختونخواہ صوبے نے حقانی نیٹ ورک کے مدرسوں کے لئے تیس کروڑ روپے کی رقم مختص کی ہے۔جن مدرسوں میں تیس لاکھ بچے پڑھ کر دہشت گرد بننے کو ہیں۔سیاسی پارٹیوں کی کارکردگی بھی ملاحظہ ہو۔تھر کے علاقے میں معصوم بچے خوراک کی رسد نہ ہونے کی وجہ سے مر رہے ہیں۔کراچی کے گٹر اُبل رہے ہیں اور پینے کا پانی دستیاب نہیں۔لاہور میں معصوم شہریوں کی لاشوں کے اُوپر سے اورنج ٹرین گزاری جارہی ہے۔جنگلہ بس تو پہلے گزر چکی، رمضان میں مہنگائی کا جن آوارہ گھوم رہا ہے، ہسپتالوں میں دوائی تو کیا ڈاکٹرز اور نرسز تک موجود نہیں ۔بجلی نہیں پانی نہیں اب تو گیس بھی نہیں۔کسانوں سے پہلے گنا سستے داموں بٹورا گیا اب گندم سستی خریدی گئی۔بھتہ عام وصول کیا جارہا ہے۔

عید آنے کو ہے، پٹواری، تحصیلدار، تھانیدار، ساری انتظامیہ اپنی عیدی بٹورنے میں مصروف عمل ہیں۔سرے محل اور رائے ونڈ محل والے قارون بن چکے ہیں۔خادم اعلیٰ اب ظالم اعلیٰ بن چکے ہیں۔ماڈل ٹاؤن کے چودہ مقتولوں کے وارثان قادری کے ساتھ انصاف مانگ رہے ہیں۔انڈیا میرے مادرِوطن کے سر پر چڑھ آیا ہے۔اسی لئے چیونٹی کو پر نکل آئے ہیں تورخم بارڈر پر افغانستان فائرنگ کر رہا ہے، اس سانپ کو ہم برسوں سے بھائی سمجھ کر دودھ پلا رہے تھے۔سعودیہ کو فوج نہ دے کر ہم ناراض کر بیٹھے ہیں اُدھر امریکہ سرکار پاکستان کی دوستی سے منحرف نظر آتا ہے۔بلکہ اب تو امریکہ سرکار سعودیہ سے دور ہو کر ایران کا دوست بن رہا ہے۔حکومتی اور اقتداری خاندان اربوں کے مالک بن کر بیرون ممالک میں آرام کر رہے ہیں۔عدلیہ کسی بھی مقدمے کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔انصاف قابل فروخت ہے، کوئٹہ کا وزیر خزانہ کراچی میں بارہ بنگلوں کا مالک نکلا اور اس کے گھر سے اربوں روپے کا سونا اور کرنسی نکلی، حکومت خاموش ہے۔انتظامیہ اور عدلیہ کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ہر وزیر پر کوئی نہ کوئی ایف آئی آر درج ہے اور وہ پھر بھی وزیر ہے۔قوم کے افراد 99 فیصدی کرپٹ ہو چکے ہیں۔سارے محکمہ جات کا دیوالیہ نکل چکا ہے، پی آئی اے، اسٹیل ملز، واپڈا، سب خسارے

میں جارہے ہیں۔ پانامہ لیکس کا کوئی حل نہیں ہورہا، قارون کو فرعون کی حمایت حاصل ہے، یزید کو شمر پلید کی حمایت حاصل ہے۔ ہمارے ملک کا کوئی بھی مخلص دوست نہیں۔سارا ملک کنگال ہو چکا، ہزاروں کھرب ڈالر قرضے کے نیچے اب میرا مادرِوطن دب چکا ہے۔ ہر کوئی اس ملک کے زخمی جسم کو نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔قانون اتنا بے بس ہے کہ پہلے وزیراعظم گیلانی کا بیٹا، پھر گورنر سلمان تاثیر کا، اب کل سے جسٹس ہائی کورٹس کراچی کا بیٹا اغوا ہو چکا ہے۔یہ انتظامیہ، بیوروکریٹس، دائش، طالبان، دہشت گرد ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔سارا معاشرہ کرپٹ ہو چکا ہے۔قوم کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔فحاشی، اور یہود یانہ روپے بڑھ چکے ہیں۔یوں ہم سب سرکاری طور پر مسلمان کہلاتے ہیں مگر مسلمانوں والی ایک بھی نشانی ہماری قوم میں نہیں۔ ؎

تم مسلماں ہو کہ جن کو دیکھ کر شرمائیں یہود

انا للہ وانا الیہ راجعون۔



# ہمارا گھناؤنا کردار

14 دسمبر ہفت روزہ جنگ کینیڈا کی خبر پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ پاکستان کا میڈیا ویسے جس کی چاہے پگڑی اُچھالنے میں دیر نہیں کرتا۔ اور اس تلور کے شکار کی کہانی کیوں ان سے اوجھل ہو گئی۔ کیا اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور پھر اسلامی نظریاتی کونسل کہاں سو گئی۔ جن کو فرقہ پرستی، اور فتاویٰ گھڑنے سے فرصت نہیں اور وہ علمائے اسلام جن کا اسلام ہر وقت خطرے میں رہتا ہے اور سرکاری مکمل مسلمان حکمران اور میزبانوں سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ بعض سرپھرے نام نہاد محب الوطن یہ ہرزہ سرائی کرتے ہیں کہ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے غیر مسلم یہاں سے دفعہ ہو جائیں۔ ایسا برتاؤ یا وحشیانہ سلوک تو کسی غیر اسلامی ملک میں کسی جانور سے بھی ممکن نہیں۔ جو اس برائے نام اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ان معصوم بچیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ دلالوں اور میزبانوں کی جیبیں بھری جاتی ہیں اور عربی بدوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی بہنیں بیٹیاں پیش کی جاتی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

## تلور کی کہانی ویکلی جنگ کینیڈا کی زبانی

(ایک دن ایک C5 گلیکسی طیارہ اونٹ، خادموں، شکروں، گاڑیوں اور دستی ہتھیاروں سے بھرا ہوا رحیم یار خان ایئرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے تو شاہی محل سے لے کر ایئرپورٹ تک کا سارا علاقہ وہاں کے مقامی لوگوں کے لئے سختی سے ممنوع کر دیا جاتا ہے۔ سامان آرائش اور دیگر سامان ضرورت جب ترتیب پا جاتا ہے تو Gulf Stream پرائیویٹ بزنس جیٹ طیاروں کا ایک غول آتا ہے جن میں سے شاہی شہزادے نمودار ہو کر مہنگی ترین گاڑیوں میں بیٹھ کر ہتھیاروں سے لیس محافظوں کے ساتھ اپنے محل میں روانہ ہو جاتے ہیں۔ ایک سے ڈیڑھ ہفتہ کے اس دورانیہ میں مشائخ کا بنیادی مشغلہ تلور کا شکار ہوتا ہے۔ یہ کھیل عام طور پر بعد از دوپہر شروع ہوتا ہے۔ اس میں شکرے، کتے، اونٹ، گھوڑے اور 4x4 گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ آذان مغرب کے قریب شکار ختم ہو جاتا ہے۔ پھر مغرب کی با جماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد تلور کی پکوائی شروع ہوتی

ہےجس میں روسٹ، بار بی کیو، ہانڈی اور دیگر انداز شامل ہیں.ضیافت میں خشک میواجات سے بنا سبز ہریرہ، ٹھنڈا چھاچھ، تازہ پھل اور دیگر مشروبات دے جاتے ہیں۔

انواع واقسام کا میٹھا دیا جاتا ہےاور پھرعشاء کی نماز با جماعت ادا ہوتی ہے۔آخر میں مشائخ اپنے اپنے حجروں میں چلے جاتے ہیں۔حجروں میں کم سن غیر تجربہ کار دوشیزائیں موجود ہوتی ہیں جن کو تجربہ کار خادماؤں نے پہلے سے اچھی طرح اُبٹن لگا کر عنبر اور مشک سے معطر پانی سے نہلایا دھلایا ہوتا ہےاور بالوں کی شیمپو سےصفائی کے بعد کنڈیشنز کر کےسکھایا ہوتا ہے۔ان کوعلاقائی انداز میں ملبوس کر کےسونے کے زیورات سے مزین کیا جاتا ہے۔سختی سے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ شیخ کو ناراض بلکل نہیں کرنا ورنہ وہ تمہارے ماں باپ کو مروادے گا. بیچاری نوعمر بچیاں کم علمی کی بنا پر کچھ بھی پیشین گوئی کرنے سے قاصر جب کسی اچھے خاصے مسٹنڈے شہزادہ کے سامنے پیش ہوتی ہےتو مجھےنہیں معلوم اس بچی کے کیا جذبات ہوتے ہوں گے۔لیکن سیکورٹی پر مامور ایک شخص کے مطابق حجروں سے جوچیخنے اور چلانے کی آوازیں آتی تھیں وہ کسی عقوبت خانہ سے کم نہیں ہوتیں۔اسکو اگر ایک خونخوار باز کا کسی چوٹی سی فاختہ پرجھپٹنا کہئےتو غلط نہیں ہوگا۔کئی بار بچیاں بیہوش ہوجاتی ہیں،لہو لہان ہوجاتی ہیں لیکن مشائخ اتنے بھی بےرحم یا سنگدل نہیں ہیں،حاضر سروس ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم ہمہ وقت وہاں موجود ہوتی ہےاور ضرورت پڑنے پر ایمبولینس ان کو شہر میں واقع شیخ زائد بن سلطان ہسپتال بھی لے جاتی ہے۔شائداسی غرض سے یہ ہسپتال وہاں بنوایا تھاورنہ بلوچستان اور سرحد میں بھی غربت ہے۔

اللہ کا شکر ہےمشائخ کا دھیان وہاں نہیں پڑا۔ہسپتال میں یہ مضروب بچیاں اندرونی زخموں کی وجہ سے بعض اوقات کئی دن تک زیر علاج رہتی ہیں مگر ان میں سے اِکا دُکا نحیف الصحت بچیوں کی فوتگی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ان معصوم لڑکیوں کے والدین غربت کی سطح سے نیچے رہتے ہیں اس لئے ہمت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی مقدمہ کریں۔میں نے جب سیکورٹی والے اہلکار سے دریافت کیا کہ تم کسی بین الاقوامی NGO کو کیوں نہیں بتاتے؟ تو بولا ٗصاحب میں مسنگ پرسن نہیں

بنا چاہتا۔''تلور کے شکار پر جو پابندی عائد تھی اس کو اُٹھا لیا گیا اور کوئی NGO بھی نہیں بولی تو آج مجھے اس سیکورٹی اہلکار کی بات میں صداقت محسوس ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک تلور کے شکار کی اجازت درحقیقت کم سن لڑکیوں کی معصومیت کے شکار کا پروانہ تھا۔❁❁

## اُداسی

جب دل اداس ہوتو دوسروں پر اسے مت ظاہر کرو۔ بلکہ اداسی کو دل کی گہرائیوں میں چھپا کر دوسروں کے ساتھ ہنسی خوشی وقت گزارو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اداسی سے کسی کا دل دُکھے۔ اپنی اداسی کے آنسوؤں کو دل میں چھپا کر دوسروں کو خوشیاں بانٹنے کی کوشش کرو۔ دل رورہا ہوتو پھر بھی آپ کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں ہو۔ کیونکہ یہ خودغرض دنیا ہنسنے میں تو آپ کے ساتھ ہے مگر رونے میں ساتھ نہیں۔ زندگی۔ ہماری زندگی پانی کے ایک بُلبلے کی مانند ہے۔خوشی، راحت، چین اور سکون کا حصول امیری اور غریبی پر نہیں بلکہ یہ سب انسان کے دل ودماغ پر منحصر ہوتا ہے۔ایک شخص کو فکر ہے کہ وہ نئے ماڈل کی کار نہیں خرید سکتا۔تو دوسرا شخص اس بات پر پھولا نہیں سماتا کہ اس کم پاؤں کا درد دور ہو گیا ہے۔اسی طرح جہاں ایک طرف انسان چکن روسٹ اور ہزار قسم کے اعلیٰ اعلیٰ کھانے کھا کر خوشی محسوس نہیں کرتا تو دوسری طرف ایک انسان روکھی سوکھی باسی روٹی پانی میں بھگو کر کھانے کے بعد خوشی سے اچھلتا کودتا ہے۔ کسی گھر میں خوشیوں کے شادیانے بجتے ہیں تو ساتھ والے گھر میں اپنے پیارے کے بچھڑنے پر صف ماتم بچھی ہوتی ہے کوئی شخص موت کو قہقے لگا کر گلے لگاتا ہے تو کوئی پھولوں کی سیج پر بھی بے چین سوتا ہے۔اب یہ دیوانگی، پاگل پن، اور زندگی سے بیزاری نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم اس مختصر زندگی کو خوشیوں کا گلدستہ بنانے کی بجائے غم،،دکھ، رنج والم کا گھروندہ بنا لیتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم زندگی کو تاریکی اور خوف کا غار نہ بنائیں بلکہ خوشیوں اور خوشبوؤں کی پھلجھڑیاں بنائیں کہ قوس وقزح کی مانند اپنے رنگ بکھیرتی جائیں۔ کیونکہ زندگی ہر رنگ میں خوب صورت ہے۔ہم نہ خود روئیں اور نہ اوروں کو رلائیں بلکہ اس مختصر سی زندگی میں صرف اور صرف مسکراہٹیں بکھیریں۔ کیونکہ زندگی کا اصل مزا روتے ہوؤں کو ہنسانے میں ہے۔آؤ ہم سب زندگی کے ہر لمحے سے پیار کریں۔

# کمانڈرانچیف کا انتخاب

الحمدللہ پاکستان کی آرمی کے کمانڈرانچیف کا انتخاب بخیروخوبی ہو چکا۔قواعداورقانون اوروزیر اعظم کی صوابدید کے مطابق ہوا۔بہت ہی پیشہ ورجنرل کا انتخاب ہوا۔جو کہ ایک کہنہ مشق ہیں۔جنگی حکمت عملی کو سمجھنے والے دانااورعقلمند ہیں۔اب سب قیاس آرائیاں دم توڑگئیں ہیں۔

یہ نام نہادعلامہ(اُلامہ) ساجد میر جس کو اسلام کے قوائد کی طرح'یہ بھی معلوم نہیں کہ جنرلوں کے لئے کوئی حلف ختم نبوت کا نہیں ہوتا۔صرف صدراوروزیراعظم کے لئے ہے کہ وہ قادیانی نہ ہو بے شک بھلے چورڈاکو،شرابی،زانی،بے غیرت ، بے ضمیر ہو۔(زرداری،نوازشریف،بھٹو،یحییٰ خان،جنرل رانی وغیرہ وغیرہ)

اس نام نہادخودساختہ عالم کوکس نے حق دیا ہے کہ آئی ایس پی آرکو گائیڈ کرے۔اورآئی ایس پی آرکوایسے جمعراتیوں کے آگے جواب دہ بھی نہیں ہونا چاہیئےاور پھراس خبطی (ساجد میر) عالم کا جھوٹ کس طرح عیاں ہوا۔لعنت اللہ علی الکاذِبین۔اب اسے شرم سے ڈوب کرمرجانا چاہیئے۔کہ وہی جنرل سی این سی بنا۔جس کے خلاف کذب صریح بولا گیا۔ویسے دیکھا جائے جب سے حلف میں یہ یامناسب الفاظ آئے ہیں اس کے بعد ہمارے لیڈروں نے کیسی مومنانہ performance دی ہے۔کوئی مسٹرٹن پرسینٹ سرے محل لے اُڑاتوکوئی رائیونڈمحل،پانامہ لیکس وغیرہ وغیرہ۔احمدیوں کے بغیر آپ کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ذرا گریبان میں جھانک کر دیکھو،اپنے معاشرہ کی طرف۔ جس کوتم نے ہرطرح سے کنگال کرکےفقیر بنادیا ہے۔پاکستان میں اگرکوئی افسرنیک شہرت والانظر آئےتوخلقِ خدا آج بھی اُسے قادیانی یااحمدی سمجھنے لگ جاتی ہے۔احمدی اپنے عقیدے کے لئے نہ ہی جھوٹ بولتے ہیں اورنہ ہی اپنے ایمان کو چھپاتے ہیں۔وہ خدا کو حاضرناظر جان کراس منافق اور کرپٹ معاشرے میں امن سے زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تمہارے یہ نام نہادمسلمان،باریش لونچڑےاور بازاری گماشتے توہین رسالت کے چکر میں سب اقلیتوں کوڈراکراپنے پیٹ کے دوزخ کو بھرتے ہیں۔احمدی توان مکروہ اورکافرانہ دھندوں

سے گریز اس رزقِ حلال کمانے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔اخباروں کو پڑھیئے اور دیکھیئے یہ روزانہ جرائم کرنے والے لوگ کون ہیں۔قحط الرجالی کا سارے وطن کو چیلنج ہے۔ایک لمبی فہرست ہے سرکاری بزعم خود مسلمان کہلانے والوں کی کہ جو بدترین لوگ ہیں اور گدھ کی طرح میرے وطن کے پاک جسم کونوچ رہے ہیں۔کوئی لیڈر نہیں،جو دیانت دار ہو۔کوئی ڈیزل ہے۔کوئی اسلام آبادی ہے، کوئی لال مسجد کا بھگوڑا ہے۔تو اکوڑہ خٹک کا خودکُش بمبار یا ڈاکو یا لٹیرا۔

ادھر احمدیوں کے خلیفہ کی شان دیکھو! جرمنی، یورپی پارلیمنٹ، برٹش، کنیڈا، امریکہ کی پارلیمنٹس اور سربراہ مملکت اُن کوخوش آمدید کہتے ہیں اور جب پاکستان کا کوئی نمائندہ ان ممالک میں جاتا ہے تو اس کے کپڑے اُتار کر اس کی اور سارے عملے کی بھرپور تلاشی لے جاتی ہے۔شرم تم کو مگر نہیں آتی۔بنے پھرتے ہیں سرکاری مسلمان بزعم خود۔نماز قرآن سے تمہیں شرم آتی ہے حرام کے عمرے سے دس دس حج عمرے کر کے خلقِ خدا کے سامنے اپنی پارسائی کے اشتہارات لگاتے ہو۔ سنو! علمائے سُو اور ان کے مطیع مسلم نما منافقین کا گروہ! تم نے پاکستان کا صرف چالیس سال میں منہ کالا کر دیا ہے۔تعمیر پاکستان میں اپنی بدنیتوں کی بدولت یکسر ناکام و نامراد رہے ہو۔آپ کو چور، ڈاکو،شرابی،زانی،بے غیرت ، بےضمیر صدران اور وزرااعظم تو قبول رہے مگر اپنے باپ سعودی عرب (باغی خلافتِ عثمانیہ) اطاعت میں پاکستان بنانے والے احمدی قبول نہ رہے۔اور تم نے ساری دنیا میں اپنا نام وکردار بدنام کر لیا۔آج جو بھی سبز پاسپورٹ دیکھتا ہے۔نفرت اور شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ساری قوم کی تربیت یہ ملاں نہ کرسکا۔جو اس سارے کرپٹ نظام کی جڑ ہے۔اسلام کے نام پر اسلام آباد پر قابض ہے۔مسلم کو مسلم سے قتل لڑواتا ہے۔مدرسے بنا کر دہشت گرد پیدا کرتا ہے۔اغلام بازی کے اڈے مکہ کے ریال سے چلاتا ہے۔

جو یحییٰ خان کو اور ضیاءالحق کو امیر المومنین تک بنا کر سارے وطن کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔جو پاکستان کو پلیدستان کہتا رہا۔اور اہل پاکستان کو جہلاء کا اک انبوہِ کثیر کہتا رہا۔قائداعظم کو کافر اعظم کہتا رہا۔فوج کے مقابل طالبان کو شہید کہہ رہا ہے۔لال مسجد کو اسلحہ کا ڈپو بنا کر دیوبندی

برقع پوش مجاہد بنا۔ساری عمر قیامِ پاکستان کا مخالف رہا جب پاکستان وجود میں آ گیا تو اسی ملک میں آن دھمکا۔تم ان شیاطین کے پیرو ہو۔تم لوگ بےعمل ہو۔مومن نہیں منافقین ہو۔سنو! پاکستان کو احمدیوں نے ہی بنایا تھا انہوں نے ہی بچانا ہے۔تم لوگوں نے ملاوٹ، رشوت، کرپشن سے اس مادرِوطن کو کھانا ہے۔احمدی، وزیرخزانہ، وزیرخارجہ، جرنیل، ایئر مارشل، سائنسدان، ماہر معاشیات، ڈاکٹرز، انجنیئر ز ہی اس مملکت خداداد کو اپنے اللہ کی مدد سے بچائیں گے۔جب یہ لوگ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، تو اُس وقت پاکستان کہاں تھا اور اب کہاں ہے۔تم اپنے علمائے سُو کی اطاعت میں مُردوں سے خیرات مانگو یا اُن کی پوجا کرو یا شکم پُری کی خاطر درِفرنگی سے بھیک مانگو، فرقہ واریت، اقربا پروری، کرپشن، لوٹ مار کو فروغ دو۔مسلم لیڈروں کو ووٹ دے کر ساری دنیا میں بدنام ہو کر اسلام کا نام بھی بدنام کرو کہ آپ کا یہی اصل مدعا ہے۔**انا للہ و انا الیہ راجعون**۔



## دوستی ایک انمول رشتہ

لوگ کہتے ہیں۔کہ کوئی بھی رشتہ بدن پر پہنے ہوئے کپڑے کی مانند ہوتا ہے، جسے کسی بھی وقت تبدیل کیا جا سکتا ہے۔لیکن کئی رشتے شریانوں میں بہنے والے خون کی طرح ہوتے ہیں۔جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔جان سے وابستہ انہی رشتوں میں سے ایک رشتہ ہے دوستی کا۔میری اور تمہاری دوستی کا۔دوستی ایک پھول کی مانند ہے جو اپنی خوشبو چاروں طرف بکھیر دیتا ہے۔ایک مددگار کی طرح ہے جب بھی ضرورت پڑے کام آئے۔دوستی ایک مکمل دنیا ہے۔سال کے سال گزر جاتے ہیں مگر دوستی قائم و دائم رہتی ہے۔دوستی سمندر ہے، کنارا ہے، دنیا میں جینے کا سہارا ہے، دوستی ایک ایسے بلند پہاڑ کی مانند ہے۔جسے بڑے سے بڑا طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔بلکہ اس سے ٹکرانے سے خود ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔لیکن اگر دوستی کے اس بلند پہاڑ کو کہیں سے شک کا معمولی کنکر لگ جائے تو یہ پہاڑ، ریت کے اس ٹیلے کی مانند ہو جاتا ہے۔جس میں ہوا کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہتی۔اور وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔کیونکہ شک کا کنکر اعتماد کی جگہ لے لیتا ہے۔

# ریاست کا مقام

ریاست کسی بھی شہری کے حقوق کی محافظ ہوتی ہے۔اس سے شہری کے حقوق میں کوئی فرق نہیں پڑتا بے شک اس کا رنگ، نسل زبان، مذہب کوئی بھی ہو۔ ریاست اس کے روٹی، کپڑے مکان، تعلیم، صحت، ملازمت، اس کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔موسمی تبدیلی یا طوفان یا کسی شکل میں بھی اس کی حفاظت کرتی ہے۔کسی فرد کے پرورش کرنے والے اس دنیا سے اُٹھ جائیں تو بھی ان کی پرورش کی ذمہ دار ریاست پر ہوتی ہے۔حتیٰ کہ جانوروں میں بھی کوئی بیماری آجائے تو ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سٹیٹ پر ہوتی ہے۔آمدورفت کیلئے گزرگاہیں بنانا راستے اور نہروں اور دریاؤں پر پل بنایا، ٹرانسو پرٹ کی سہولیات فراہم کرنا بھی سٹیٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔صحت، پانی اور خوراک کی کمی کی صورت میں سٹیٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہر شہری کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ قانون کی پاسداری کرے اور اپنی آمدنی میں سے مروجہ ٹیکس کا حصہ حکومت کو ادا کرے۔

ریاست ایک آئینی بندوبست ہوتا ہے۔عقیدہ تو فرد کے ضمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید ریاست عقیدے کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتی۔ ریاست میں رہنے والے تمام شہری عقیدے کی آزادی کا حق رکھتے ہیں۔کسی ریاست کو مسلم، مسیحی، ریاست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح پاکستان بھی اس کے باشندوں کا ملک ہے کسی بھی اکثریتی اہل مذہب کا نہیں۔ وزیر اعظم نواز شریف نے چکوال کے جلسہ عام میں ایک معقول بات کر کے انتہا پسندوں کا منہ بند کر دیا ہے کہ میں سب پاکستانیوں کا وزیر اعظم ہوں۔

امریکہ کی ریاست امریکیوں کی ہے۔ وہاں ڈونلڈ ٹرمپ رہتے ہیں۔ ہمایوں خان بھی رہتے ہیں، وہاں ہلیری اور شانتا رام بھی رہتے ہیں۔ ذاکر حسین اور عبدالکلام بھی ہوسکتے ہیں اور لنڈن کا میئر صادق خان بھی ہوسکتا ہے۔ہمیں ریاست اور شہری میں واضح فرق کرنا چاہئے۔سیکولر ریاست مذہب کی بنیاد پر امتیاز نہیں کرتی۔سیکولر ریاست کو ملحد ریاست سمجھنا درست نہیں۔ اگر ریاست شہریوں کے عقیدے میں مداخلت کرتی ہے تو وہ نان سیکولر ریاست ہے۔اگر کوئی ریاست شہریوں

کے عقیدے کی حفاظت کرتی ہے تو اسے سیکولر ریاست کہا جاسکتا ہے۔ دنیا میں نہ کوئی ریاست ملحد ہے اور نہ کسی ریاست کو ملحد کہنا چاہیئے۔ ریاست کو ملحد قرار دینا بذات خود سیکولرازم کے اصولوں کے خلاف ہے۔عقیدے کی آزادی کا احترام ایک بنیادی انسانی حق ہے۔ یہ عمل قابل اطمینان نہیں کہ ہمارے ملک میں بہت سے لوگ سیکولرازم کو الحاد کے مترادف سمجھتے ہیں۔ سیکولر ہونے کیلئے ملحد ہونا ضروری نہیں۔ یہ دو الگ الگ تصورات ہیں۔ ایک سیاسی بندوبست ہے اور دوسرا انفرادی فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک پاکستان میں اسلامی ریاست کے تصور کے شوق میں بعض لوگ ہرزہ سرائی کرتے ہیں۔تو واضح رہے ۔آج کی جدید ریاست سے بھی بہتر اور زیادہ حقوق اسلامی ریاست غیر مسلموں کو دیتی ہے۔مگر اب جبکہ اسلام مختلف اختلافات کا شکار ہے۔علم وعمل سے مفرورہ آپس کے فقہی اختلافات میں مبتلا یہ اُمت مسلمہ اپنی ریاستوں کو اسلامی ریاست بنانے میں کلی ناکام رہی ہے۔افغانستان میں اور سعودی عرب میں یا اور کسی اسلامی مما لک میں کوئی مثالی اسلامی نظام نہیں۔ابھی کچھ ماہ پہلے یمن میں لاکھوں شیعہ مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔ان نام نہاد مسلم مما لک میں کوئی فریقین کی نہیں سنتا اور ملک میں مروجہ جبری قوانین (نام نہاد اسلامی قوانین) کے ذریعہ فیصلے سنائے جاتے ہیں جو باقی ساری دنیا کے اسلامی مما لک کے فقہ کے خلاف ہوتے ہیں۔اسی طرح پاکستان میں نام نہاد اسلامی عدل کی آڑ میں اقلیتوں پر ظلم روا رکھا ہوا ہے کہ لوگ ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہیں یہی حال شام وعراق کا ہے۔ نیپال اور بھوٹان میں مسلمانوں پر ظلم روا رکھا جارہا ہے۔کئی مما لک میں اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے۔ایران میں بھی غیر شیعہ کو کوئی رسائی نہیں یہ سب تعلیم کی کمی جہالت اور کم علمی کی بھی ایک وجہ ہے۔ان مظالم کی کوئی بھی وجہ ہومگر ہمیں سب کو ملکر اسے روکنا چاہیئے کسی کو بھی اس کے عقیدے کی بنیاد پر خصوصی برتاؤ نہیں کرنا چاہیئے ۔اللہ بنی آدمی کو بہترین انسان بننے کی توفیق دے۔آمین۔



# ہمارے تاریخی فیصلے یا احسان فراموش

پاکستان کے بنتے ہی مسلم لیگیوں کی سادگی اور شرافت کی وجہ سے بہت سے عیار اور مکار عناصر اُن کے اردگرد آ گئے۔ مسلم لیگیوں کے سب اکابرین ومتاثرین کی اشک شوئی کیلئے اخلاص سے کام کیا۔ اس دوران کلیم الاٹمنٹس کے چکر میں مقامی ابن الوقت لوگوں نے اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سارے سادہ اکابرین مسلم لیگیوں کو بے وقوف بنایا۔ بہت سے مقامی اور مہاجرین جو پاکستان کے نظریے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان سب لوگوں کو علمائے سُو جو احرار جماعت اسلامی جمیعت، خاکسار سرحدی گاندھی کے حامی تھے نے مذہب کے نام پر اپنی دکان چمکانے کا موقع 1953ء میں ملا جب باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ ان چھ سال میں ان علمائے سُو کا مقام عوام کی نظروں میں گر چکا تھا۔ مگر فسادات 1953ء میں عدالت اور حکومت میں دم تھا۔ مسلم لیگی اذہان کام کررہے تھے اور مخالف پاکستان عناصر کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے ان سب غداروں کا ملکوٹھپ دیا۔

اس کے بعد کئی لوگ جیلوں میں ڈال دیئے گئے اور کئی کو پھانسی کا بھی حکم ہوا تھا۔ جن میں جماعت اسلامی کے مودودی صاحب بھی شامل تھے۔ جن کو بعد معافی مانگنے پر معافی دے دی گئی۔ ایوب خان کے دور میں تو یہ علمائے سُو بالکل کارنز کر دیئے گئے تھے۔ ایوب خان کے جاتے ہی پھر ان عناصر نے اپنی کھوئی ہوئی عزت کو واپس لانے کی ناکام کوشش کی مگر 1970ء کے الیکشنز میں پھر منہ کی کھائی۔ بھٹو صاحب نے ان سب کو مغربی پاکستان میں چت کر دیا۔ صرف چند سیٹیں جمیعت اور جماعت اسلامی کے پاس تھیں۔ ہماری اشرافیہ یا عقیل لوگ قوم پرست نہیں ہیں۔ کبھی یہ مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انسانیت کا کوئی بھی وصف ان پاکستانیوں کی سرشت میں نہیں۔ یہ کسی کے دوست ہیں نہ کسی کے دُشمن۔ بعد ازاں یہ شکست خوردہ عناصر ضیاء الحق کے کندھوں پر بیٹھ کر جہاد افغانستان کے چکر میں نقب زن ہوئے۔ ہمارے مسلم جوانوں کا تو یہ حال تھا کہ انڈیا کی پاکیزہ فلم امرتسر ٹی وی پر لگتی ہے تو اپنے ٹی وی سیٹ لیکر لاہور کے قریب وجوار میں رات گزارنے سارا جوان طبقہ آجاتا ہے۔

یہ پنجابی حکمران لڑائی میں پٹھانوں کو اسلام کے نام پر استعمال کرتا ہے۔ پھر ان ہی کی پشت

میں خنجر اعتزاز حسن گھونپ دیتا ہے۔ پنجابی سب کا بڑا بھائی ہے مگر عیار اور مکار ہے۔ ظالم ہے سفاک ہے۔ فوج اسی کی ہے حکومت اسی کی ہے بلکہ سب کچھ اسی کا ہے۔ یہ ظلم کرتا ہے تو اس کے جواب میں پھر جب ری ایکشن آتا ہے تو پھر یہ اور ظلم کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل فیصلے اس حکومت نے مختلف ادوار میں کئے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی دشمنی اور انانیت کا مظہر ہیں۔ سائیکل پر مسلم لیگ کی کمپین کرنے والا مجیب الرحمن غدار پاکستان کے حق میں پہلی قرارداد منظور کرانے والا جی ایم سید غدار، بلوچستان اور گوادر کو پاکستان کے ساتھ ملانے والا اکبر بگتی غدار، قائداعظم کی بہن مادر ملت فاطمہ جناح غدار، پاکستان کے لئے صرف ایک جماعت نے قربانیاں دیں اسے بھی ان جاہلوں کی بے عمل پارلیمنٹ نے غیر مسلم قرار دیا۔ قائد اعظم کو سونے میں تولنے والے خان آف قلات کا بیٹا غدار، پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ اور عالمی عدالت کا جج ظفر اللہ خان غدار، اور غیر مسلم پاکستان کے صدر کا پندرہ سال مسلسل مشیر سائنس ایٹمی پروگرام کا بانی ڈاکٹر عبدالسلام غدار اور غیر مسلم ایم ایم احمد جس نے تین پانچ سالے بجٹ پیش کئے وہ غدار اور کافر، ایئر مارشل ظفر چودھری غدار اور غیر مسلم جنرل ڈائر کے خلاف جہاد کرنے والے نواب خیر بخش مری اول کا پوتا غدار۔ جس کو سب سے زیادہ مینڈیٹ ملا اُسے عدالت عالیہ کے ذریعہ مصلوب کرایا گیا۔ بے نظیر بھٹو کو قتل کرایا گیا۔ ڈاکو کو صدر بنایا گیا۔ ڈیزل کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنایا گیا جو کہ ابن دشمن پاکستان ہے۔ لال مسجد برقع پوش جہادی کو اپنا والد بنا کر رکھا ہے حکومت نے۔

انگریزوں کے خلاف سیاسی جدوجہد شروع کرنے والی مسلم لیگ بنانے والی بنگالی قوم غدار، انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کرنے والی برٹش آرمی کو شکست دینے والی پٹھان قوم غدار، مسلم لیگ کو سب سے زیادہ چندے دینے والی بلوچ قوم غدار، اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنے والی مہاجر قوم غدار، انگریزوں کے ہاتھوں پھانسی کھانے والے پیر پگارا کی آل اولاد ظالم، انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے سندھ کے ہر مجاہد جاہل، پاکستان کے ہر بارڈر پر خون کا نذرانہ دینے والے محسود قوم خارجی غدار، محب وطن پاکستانی ہے۔ باقی... بلوچ پشتون سندھی مہاجر غدار اور کافر ہے۔ یہ پاکستان کا اصلی چہرہ پاکستان کی مخالفت کرنے والے مکفر و بے عمل اسلامی نظریاتی کونسل کے شیرانی اور اشرفی شرابی اس ملک کے وفادار۔ ہماری قوم کا قومی نشان احسان فراموش ہونا چاہئے۔ پاکستان زندہ باد۔ ❁❁❁

# شہید مشعال خان کا بہیمانہ قتل

دستِ ستم نے جیسے کیا تجھ کو پائمال
آنکھیں بھی اشک بار تو دل غم سے نڈھال
روکا گیا نہ ہم سے جو قاتل کے ہاتھ کو
شرمندہ تیری ماں سے ہے یہ قوم اے مشعال

مشعال خان کا قتل حکومت کے اور پاکستان کے لبرل اور سیکولر طبقے کے منہ پر زوردار تھپڑ سے کم نہیں۔ انتہا پسندوں کی کامیابی ہے۔ اسلام اور پاکستان کے متعلق سازش ہے۔ دینی اداروں کی ناکامی ہے جو مشعال خان کو قتل کروا کر اب اس عمل کے خلاف بیان دیتے چلے جا رہے ہیں۔ ولی خان جیسے عدم تشدد انسان کے نام پر یونیورسٹی میں یہ بہیمانہ قتل اس کی پارٹی کے منشور کو منہ چڑا رہا ہے۔ اسلام کی اصل تعلیم کا یہ جنازہ ہے۔ علامہ اقبال اور قائداعظم کی روشن خیالی کی یہ میت ہے۔ اصل میں یہ علمائے سُو کی نیتوں کا پھل ہے۔ ضیاء الحق اور جنرل حمید گل کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ جماعت اسلامی، جمیعت طلباء، جماعت احرار، ختم نبوت، جمیعت علمائے اسلام، دیوبندی، بریلوی، انتہا پسندوں کا یہ خواب ہے۔ یہ وہ عناصر کی کاوشوں یا سازشوں کا کیا دھرا ہے جو پاکستان کے وجود کے منکر اور میثاق مدینہ سے نابلد اسلامی نظام کے حامی ہیں۔ جو روشن خیالی کو کفر اور تشدد کو اسلام سمجھ بیٹھے ہیں۔ جو اسلام کی تعلیم سے نابلد، قرآن کو سمجھنے سے عاری ہیں۔ جو اُسوۂ رسول ﷺ کو اپنانے سے گریزاں ہیں۔ یہ شکست خوردہ عناصر کا ٹولہ ہے۔ پہلے کانگرس کے ایجنٹ تھے اب RAW کے ایجنٹ ہیں۔ اس طبقے کے ساتھ ن لیگ کے گہرے مراسم ہیں۔ یہ انتہا پسند طبقہ ضیاء الحق کے زمانے سے اقتدار میں آیا اور فسادِ افغانستان کے وقت بیرونی طاقتوں سے روابط قائم ہوئے۔ اب یہ جماعتیں اس قدر اثر انداز ہو چکی ہیں کہ ہر ڈیپارٹمنٹ میں ان کے بااثر نمائندے ملازم ہیں۔ حتیٰ کہ کافی بیوروکریٹ بھی ان میں سے ہیں۔ میڈیا کے اینکر ان میں سے ہیں۔ اگر کہیں ان انتہا پسند جماعتوں کو رسائی نہیں ملتی تو مذہب کے نام پر یہ لوگوں کو خرید کر اپنی خواہشات کے مطابق فیصلوں اثر

انداز ہوتے ہیں۔میں حیران ہوں قتل کروانے والے مذمت کررہے ہیں۔حالانکہ اس قتل کی وجوہات کچھ اور ہیں۔

یونیورسٹی انتظامیہ کے خلاف ایک مقدمہ چلا رکھا تھا۔پی،ایس، ایف ۔ نے۔جس میں مشعال خان پیش پیش تھے۔جس میں یہ انتظامیہ کی کرپشن کا بھانڈا پھوڑنا چاہتے تھے اور انتظامیہ مشعال خان کو اپنی راہ سے ہٹانا چاہتی تھی۔باقی وفاق بھی اس میں ملوث ہے۔ہمارا مذہبی امور پیر حسنات شاہ جون لیگ کا وزیر ہے۔ممتاز قادری کا جنازہ پڑھتا ہے اور اس کو سلام کرتا ہے۔اسے ایک خط میں شہید لکھتا ہے۔کیپٹن صفدر مسلم لیگ کی یوتھ ونگ کا ھیڈ ہے۔ممتاز قادری کا پروموٹرز ہے۔ہمارے عالم توہین رسالت کے حق میں بولتے ہیں اور جب کوئی قتل کردیا جاتا ہے ہے۔تو مذمت کرنے لگ جاتے ہیں۔یہ منافقین ہیں کہ متقی۔ انہوں نے طالبان اور انتہا پسند پہلے افغانستان میں بنائے۔پھر پاکستان میں بنائے۔اب یونیورسٹیز میں بنانے شروع کردیئے۔یہ کون سی جمہوریت ہے،کونسی رٹ ہے۔سی ایم کا نمائندہ کریکلم سپاہ صحابہ سے پوچھ کر پرائمری کلاسوں کا نصاب بناتا ہے۔باقائدہ کالعدم جماعتوں کے تحفظات نوٹ کئے جاتے ہیں۔یہ ن لیگ کی باطنی پالیسی ہے۔نواز شریف نے سادہ سا بیان دے کر جان چھڑا لی۔سب اقلیتوں کو خائف کرکے ملک سے بھگا دیا گیا ہے۔لبرل اور سیکولر توانتہا پسند نہیں ہوتے۔بلکہ بہتر کردار والے مسلمان ہوتے ہیں جو حقوق العباد کے داعی ہوتے ہیں۔ہم نے اس وقت ایک آگ جلا رکھی ہے۔اس پر ہم نے پریشر ککر رکھ کر اس کے سرے پر فوج کی بھاری سیٹی لگا رکھی ہے۔مگر عوام کو ککر کے نیچے آگ بڑھانے کی خوب اجازت دے رکھی ہے۔ابلیس نے خوب اپنی بات منوائی ہے۔خوفِ خدا نام کو نہیں۔عدلیہ،انتظامیہ،سیاسی لیڈرز،علمائے سُو،بیوروکریٹ،سب کرپٹ ہو چکے ہیں بلکہ یزیدی حکم کے تابع ہیں۔یہاں ہر روز حسین شہید ہوتے ہیں۔یزیدی اقتدار قائم ہے۔یہ لال مسجد اور ملاں برقع پوش کی خواہشات کی تکمیل ہے۔یہ فرنگی،ہندو،نصاریٰ کے اسلام کے خلاف سکیم ہے۔میر جعفر ،میر صادق بن کر برائے نام کے مسلمان ان کے ایجنٹ بن چکے ہیں۔توہین رسالت کی بجائے

توہین انانیت کا قانون ہے۔نہ اقلیتیں محفوظ ہیں نہ کوئی مشعل خان۔اس سے قبل بہت سے بے گناہ افراد اس قانون کی بھینٹ چڑھے۔اس قانون کو مس یوز کر کے اسلام کو بدنام کیا جارہا ہے۔جبکہ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں کسی ایسے قانون کا دور دور پتہ نہیں چلتا۔جس طرح ان فرقہ ہائے اسلام نے قرآن کی تاویلیں کر کر کے اپنے مفادات کو مدنظر رکھ کر سینکڑوں قوانین بنا لئے ہیں۔یہ بھی ایک ضیاء الحق کے زمانے کا قانون ہے۔حکومت پاکستان جب توہین رسالت کے مرتکب ممالک سے تعلقات بحال رکھتی ہے تو پاکستان میں نام نہاد غیرت دکھا کر بے گناہ شہریوں کا قتل عام کیوں کیا جارہا ہے۔اس پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے تاکہ ساری قوم مطمئن ہو جائے۔ساری دنیا میں ایسا کوئی امتیازی قانون نہیں۔اس ملک خداداد میں اسلام پر کوئی عمل نہیں ہو رہا۔ہر لحاظ سے قوم ہنود و یہود و نصاریٰ سے قدم ملا کر چل رہی ہے تو ایسے امتیازی قوانین کا کیا فائدہ۔جبکہ ہمارے ملک کا صدر ڈاکو، زانی، شرابی، چعور، بے غیرت، تو بن سکتا ہے مگر قادیانی یا کوئی غیر مسلم نہیں بن سکتا جبکہ قائداعظم کی کابینہ میں سب مذاہب کے لوگ شامل تھے۔یہ کس کا پاکستان ہے۔قائداعظم کا پاکستان نہیں تو یہ مخالف پاکستان علمائے سُو کے ہاتھوں اغوا ہو چکا ہے۔آیئے مل کر روشن خیالی سے میثاق مدینہ کو رائج کرنے کی کوشش کریں۔ورنہ اس نام نہاد اسلامی ملک میں کوئی بھی محفوظ نہ رہے گا۔کئی مشعال خان، اور معصوم مسلم غیر مسلم اس بے لگام وانصرام ملک کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔مجھے کوئی بھی مسلمان حضرت نبی کریم ﷺ کی زندگی کا یا خلفائے راشدہ کی زندگیوں کا واقعہ ایک واقعہ ہی دکھا دو کہ کسی نے اُن کی توہین کی ہو اور اسے مشعال خان کی طرح بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہو۔اس کو ایسے مارا جائے کہ موت بھی جلدی نہ آئے۔اس کو مارتے وقت نبی کریم ﷺ کی حدیث بھی یاد نہ آئے۔وہ بھی میت کو غسل دیتے وقت ''میت کو نیم گرم پانی سے نہلاؤ جیسے پانی خود استعمال کرتے ہو'' تا اسے تکلیف نہ ہو۔نبی اکرم ﷺ نے میت کے متعلق بھی ایسا فرمایا مگر آج کے زمانے کے محبِ رسول نبی ﷺ کے سب فرمانوں کو پسِ پشت ڈال کر ایک شخص کو جو صرف 23 سال کا تھا۔سفاکیت اور بربریت سے خون کر دیا گیا۔اس کو مارتے وقت

سب ''نعرہ تکبیر'' ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند کر کے اپنے زعم میں خدا کو خوش کر رہے تھے۔مگر خدا نے جو انسان کے لئے ایک ''ضابطہ حیات'' نازل فرمایا۔''یعنی قرآن کریم'' اس میں سب کھول کر بیان فرمایا کہ'' دین میں کوئی جبر نہیں۔'' ''نبی ﷺ کی زبانی کہلاوایا'' تمہارے لئے تمہارا دین میرے لئے میرا دین'' لکم دینکم ولی الدین۔ان مارنے والوں کو قرآن پاک کی یہ آیت بھی نہ نظر آئی کہ ''جسنے کسی بے گناہ انسان کا خون کیا گویا اس نے پوری انسانیت کا خون کیا'' ان مارنے والوں کو قرآن پاک کی آیت ''رسول اللہ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے'' بھی نظر نہ آئی۔مارنے والوں کے ذہن میں بس یہ بھرا تھا کہ'' مشعال کو مار کر اسلام کو بچایا جائے اور خدا کو خوش کیا جائے۔مگر افسوس صد افسوس کہ ہلاکو خان اور چنگیز کی روح ان مارنے والوں میں آ چکی تھی۔ اسلام کی ایسی تعلیم ہرگز ہرگز نہیں ہے۔اسلام تو امن کا گہوارہ ہے اسلام تو کفار کے ساتھ بھی ہمدردی کا درس دیتا ہے۔اسلام تو انسانیت سکھاتا ہے اسلام تو بھوکے کو کھلانے کا نام ہے۔اسلام تو پیاسے کو پانی پلانے کا نام ہے۔مگر ان قاتل طلباء کو نئے برانڈ کا اسلام سکھایا گیا ہے۔جیسے کہ بریلوی، دیوبندی، احراری، مودودی، بخاری، مدنی، نقشبندی، قادری، رائے ونڈی، سپاہ صحابی، جھنگوی، جعفری، کربلائی، سمیع الحقی، مفتی محمودی، لوطی، وغیرہ وغیرہ۔انتہا پسندی کی یہ ظالم تنظیمیں ہی جو پاکستان اور اسلام کی حقیقت میں دشمن ہیں۔



# ڈُوالمیال کا بھونچال



مقتلوں کے منہ کھلے ہیں شہر کے ہر موڑ پر
شکمِ مقتل بھر رہے ہیں دینِ ملاں کے امام
(آدم چغتائی)

عقیدت سے بہت جشن نبی تم نے منا ڈالا
چراغاں کیلئے اللہ کا گھر تک جلا ڈالا
(عرشی ملک)

ڈُوالمیال گاؤں چوا سیدن شاہ کلر کہار، روڈ پر واقع ہے۔ جو چکوال سے 35 کلومیٹر دور ہے۔ آٹھ سو سال پہلے اس قصبے کی بنیاد شہاب الدین غوری کے ایک جنرل نے رکھی تھی۔ اس گاؤں نے اپنی شاندار فوجی خدمات کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ پہلی جنگ عظیم میں دوالمیال نے 460 جوان جنگ میں بھیجے اور دوسری جنگ عظیم میں 730 جوان بھیج کر دنیا میں ریکارڈ قائم کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں 36 جوان اور دوسری جنگ عظیم میں 9 جوانوں نے رُتبہ شہادت حاصل کیا۔ فوجی خدمات کے صلے میں منہ مانگا انعام توپ کی شکل میں بھی دیا گیا۔ جو کہ آج بھی ڈُوالمیال میں تالاب کے کنارے گاؤں کی زینت بنا ہوا ہے۔ جو کہ اس وقت جہلم سے بیل گاڑی پر لائی گئی تھی۔ یہ کام اس وقت ملک کیپٹن غلام محمد سینئر افسر نے سرانجام دیا تھا۔ پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی فوج میں بھرتی ہونے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس گاؤں میں پانچ لیفٹیننٹ جنرل بنے۔ اُن میں سے ایک کا مجھے علم ہے کہ جنرل نذیر ملک احمدی تھے۔ اور بہت سے جونیئر کمیشنڈ آفسر بھی تھے۔ بیس سے زیادہ کمیشنڈ اور نان کمیشنڈ افسران کا تعلق اس گاؤں سے ہے جن میں اکثر احمدی تھے اور ہیں۔ اس گاؤں کی برادری اعوان قوم سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں کی مسجد 1860 میں تعمیر ہوئی پھر 1890 کے بعد جب حضرت مرزا غلام احمد قادیانی صاحب نے دعویٰ امام مہدی کیا تو اس گاؤں کے نیک (اور امام مہدی کے منتظر) لوگوں نے اُن کی بیعت کر لی

۔آہستہ آہستہ نصف گاؤں کی برادری احمدی ہوگئی۔آپس میں ساری برادری کا کوئی اختلاف نہ تھا۔بہت ہی محبت اور میل جول سے یہ برادری ایک سو پچیس سال سے زائد عرصے سے باہم رہتی چلی آئی ہے۔

اس مسجد کا مینار 1927 میں تعمیر کیا گیا۔جو ہو بہو قادیان کے مینارے کی نقل ہے۔اور احمدی ہی اس مسجد کے وارث اور متولی رہے۔سارا روپیہ زیادہ تر ان لوگوں نے ہی خرچ کیا ہے۔اب بھی یہ مسجد احمدیوں کی ہی ملکیت ہے مگر پھر یوں ہوا کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کا نعرہ لگا کر بھٹو صاحب آنازل ہوئے۔خود نام نہاد مسلمان ہوتے ہوئے سعودی عرب کی سازش اور (مخالفین پاکستان) یزیدی ملاؤں کی شہ پر اپنے ہی محسن احمدیوں کو قانونی طور پر اپنے کرپٹ پارلیمنٹ ممبران سے قانونی طور پر غیر مسلم قرار دلوادیا۔اور اس گاؤں کے احمدی بھی اس ظالمانہ قوانین کی مجبوری سے دوسرے محکمہ جات میں بھرتی ہونا شروع ہو گئے۔کچھ لوگ اپنے رزق کی تلاش میں بیرون ممالک سدھار گئے۔اور پھر گاؤں کے کم ذات اہالیان کو مسجد چھیننے کا خیال آیا۔انہوں نے ایک درخواست دائر کردی۔23 سال بعد میں 1997 ایک حکم جاری ہوا کہ مسجد کو سیل کر دیا جائے۔جس کے خلاف احمدیوں نے اپیل کر دی۔احمدیوں نے نماز کی ادائیگی اُسی مسجد سے ملحقہ گلی میں ادا کرنا شروع کر دی۔آخر کار مسجد کا فیصلہ جماعت احمدیہ اسلامیہ کے حق میں ہو گیا۔اور مسجد احمدیوں کو مل گئی۔

اب مُلاں کا طالبانی عدل،اور جہلاء کا دباؤ،فرقہ پرستوں کا تعصب اس کی ملکیت نام نہاد مسلمانوں کے نام کر دے گا۔جس طرح یزید نے کیا تھا۔احمدی تو مظلوم اور کمزور ہیں اور صبر پر یقین رکھتے ہیں۔مگر اس اُمت کا یقین اللہ اور اس کے رسول پر نہیں ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکومتیں کس قدر غیر مسلموں سے خصوصاً اور اپنے ہی مسلمانوں سے کس قدر عدل و انصاف سے کام لیتے رہے ہیں۔اس دور کے نام نہاد مسلمان تو ہلاکو خان اور چنگیز سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔یہ کیا انصاف کریں گے۔مگر میرا خدا ایک منصف ہے وہ ضرور اپنے عدل کی چمکار دکھائے گا۔یہ حکومت جو کہ باقیاتِ ضیاء الحق ہے۔اس سے کوئی اُمید ممکن نہیں۔جماعت احمدیہ پاکستان میں عرصہ 42 سال سے جبر وظلم کا شکار رہی ہے۔اس کی نصف صد سے زیادہ مساجد چھینی گئی ہیں بلکہ سیل بھی کی گئی ہیں اور پھر جلائی بھی گئی ہیں۔سینکڑوں احمدی کارکنوں کو دن دیہاڑے شہید کیا گیا ہے۔ان کی جائیدادوں پر ناجائز قبضے کئے گئے۔

یہ اسلام کی تعلیم کے مطابق نہیں کیا گیا یہ اسلام آباد کی تعلیم اور لال مسجد کے برقع پوش مجاہدین کے حکم پر کیا گیا۔خدا دیکھ رہا ہے۔ یہ ناکام شکست خوردہ عناصر جو بنگلہ دیش سے بھی بھاگے تھے،کشمیر سے بھی بھاگے ہوئے ہیں۔ یہاں مذہب کے نام پر خون کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں۔عدل وانصاف ان کے گھر کی لونڈی بنی ہوئی ہے۔

دوسرا! یہ تو آپ کو علم ہے کہ شیطان تو انسان کیے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔اب ملک رشید آف کنیڈا جو اس فساد کی بنیادی جڑ ہے۔اس کی مالی معاونت سے پھر اس فتنے نے سر اٹھایا ہے۔ باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا ہے،اور عید میلا دالنبیؐ کے چکر میں پھر ختم نبوت کے نام پر سادہ لوگوں کو اشتعال دلا کر پھر فساد برپا کیا گیا۔انتظامیہ اور اکابرین جو پہلے ہی عدل وانصاف کا جنازہ پڑھ چکے ہیں۔ساری طاغوتی طاقتیں ،اس ملک کو توڑنا چاہتی ہیں ۔اور یہی مودودی ، احراری ، اسلامی ، علمائے اسلام ،علمائے جمیعت ،خاکسار،طالبان،سپاہ صحابہ،ج ھنگوی،جن کے افراد واصحاب اب تک اس ملک کے دشمن ہیں ۔دہشت گرد،فتنہ گر،ایمان فروش اور جنت فروش ہیں۔

ان لوگوں نے احمدیوں کو ہی نقصان دینا ہے۔احمدیت جوان کی ایک سو پچیس سال کی مخالفت کے باوجود ایک سایہ دار شجر بن چکی ہے۔جس کے پاس ایمان کی دولت ہے ایک خلیفہ وقت کی اطاعت میں دوصد ممالک میں پھیل چکی ہے۔اس کی ترقیات ان کے حسد کو بھڑکا رہی ہیں۔اس جماعت کا عالمی سالانہ بجٹ پاکستان کے سالانہ بجٹ سے کہیں زیادہ ہے، بین الاقوامی طور پر سب ممالک میں اپنا سکہ بٹھا چکی ہے۔ اسلام کی مبلغ ہے۔ ایک پُر امن جماعت جو ان کے ظلم برابر جھیل رہی ہے۔ پاکستان میں ہزاروں احمدی پابندِ سلاسل ہیں۔سینکڑوں شہادت کا رُتبہ پا چکے ہیں۔مگر جماعت احمدیہ پھر بھی پُر امن ہے۔اور اسلامی شرح پر سختی سے عمل پیرا ہے۔اپنے خدائے برتر کے حکم سے درودِ محمد ﷺ پڑھتے ہوئے سربسجود ہے۔ کہ خدا ہی ہے جس کو عزت دے یا ذلت دے۔ یہ نام نہاد مسلمان پاکستانی علمائے سُو کے پیچھے لگ کر تو اپنی عزت بھی اور ملک کی عزت بھی مٹی میں ملانے کے درپے ہیں۔اور خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے رستے سے سرگرداں ہیں۔






مصنف کتاب ہذا

**رانا عبدالرزاق خان**

بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان

ادیب وشاعر، کالم نگار، اینکر، صحافی

ایڈیٹر۔ ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

حال مقیم: وانڈزورتھ لندن برطانیہ

e-mail : ranarazzaq52@gmail.com, (M) 00-44-7886-304637


## قندیل علم

یہ کتاب معلومات کا خزینہ ہے۔ اس میں مختلف انواع واقسام کے موضوعات پر لکھا گیا ہے۔ بائیوگرافی، اردو ادب، سیاسی مضامین پر تبصرہ، ۱۶۰۔ عناوین پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ اس قسم کی کتاب جو ایک دلکش گلدستے کی مانند ہے۔ پہلے کم دیکھنے میں آئی ہے۔ پڑھنے سے بہت ہی اہم معلومات میسر آسکتی ہیں۔

# QINDEEL-E-ILM

BY

RANA ABDUL RAZZAQ KHAN, LONDON